

محبت لفظ ہے لیکن

حیا بخاری

kitaabghar.com

خوب صورت جذبوں کی باریکیاں بیان کرتی حیا بخاری کی ایک دل نشیں تحریر..... کتاب گھر کے قارئین کے لیے ایک تحفہ خاص

محبت لفظ ہے لیکن

حیا بخاری

نوٹ:-

اس ناول کے جملہ حقوق بنام کتاب گھر (http://kitaabghar.com) محفوظ ہیں۔ لہذا اس تحریر کی کسی بھی رسالے، ڈائجسٹ، میگزین، ویب سائٹ، سیل فون ایپ یا انٹرنیٹ پر کسی بھی شکل میں کاپی کرنا خلاف قانون ہے۔ خلاف ورزی کرنے والے کو قانونی کارروائی کا سامنا اور بھاری جرمانہ ادا کرنا ہوگا۔

قسط نمبر 1

”ماں باپ کے سامنے بہت سوچ سمجھ کر بولا کرو کیوں کہ کبھی کبھی ان کے سامنے بولا گیا کوئی بھی بر لیا اچھا کلام ہماری پوری قسمت پہ حاوی ہو جاتا ہے۔“

یہ پہلی مرتبہ نہیں تھا کہ وہ رات کو یوں اچانک کمرے سے باہر نکل گئے ہوں۔ معمولی بات تھی۔ پھر بھی نہ جانے کیوں انہیں کچھ غیر معمولی لگا آہستگی سے پیر چپل میں مقید کیے بنا چادر لیے وہ دبے پاؤں دروازے کی طرف آئی تھیں۔ خان جی طویل صحن عبور کر کے باہر آخری سرے پر بنی بیٹھک میں داخل ہو رہے تھے۔ وہ کسی رو بوٹ کی طرح اسی طرف چل دیں۔ نہ جانے ان میں اتنی جرات کہاں سے آ گئی تھی۔ حویلی کے سرداروں کی یوں ٹوہ لینے کی جرات کوئی کر بھی لیتا۔ کم از کم صنوبر بی بی جیسی نرم و نازک، ڈرپوک سی عورت کبھی نہیں کر سکتی تھی۔ پھر بھی نہ جانے کون سی ان دیکھی طاقت تھی۔ جو ان کو یہ سب کرنے پر مجبور کر رہی تھی۔ بہت تیزی سے صحن عبور کرتیں وہ اب دروازے سے قریب دیوار سے لگی کھڑی تھیں۔

”کیا خبر ہے دوراں؟“ خان کی بھاری آواز سننے ہی ان کا کمزور دل یک بارگی ڈوب سا گیا تھا۔

”کام ہو گیا خان جی۔۔۔“ مودبانہ لہجے میں انہوں نے کسی کو کہتے سنا تھا۔

”کام پکا ہے ناں۔۔۔؟“ خان کے لہجے میں اس مرتبہ فکر تھی۔

”بالکل صفائی سے کام کیا ہے خان۔۔۔ سب کو یہی لگے گا کہ بہن کی طرف سے لگے بدنامی کے داغ کو برداشت نہ کرتے ہوئے بڑے خان نے خود کشی کر لی۔“ سردی کی شدید لہر سے اُن کی ریڑھ کی ہڈی سنسنائی۔ بے ساختہ نکلنے کی چیخ کو منہ پہ ہاتھ رکھ کر انہوں نے بہ مشکل روکا تھا۔

”شباباش دوراں۔۔۔ مجھے تم سے یہی امید تھی۔“ خان جی کے لہجے میں اطمینان بھر گیا تھا۔

”اب سارے گاؤں میں اس بے غیرت کے چرچوں پر بڑے خان کی موت کی خبر حاوی ہو جائے گی۔۔۔ پھر کچھ دنوں میں ان دونوں کا بھی کوئی نہ کوئی بندوبست کرتا ہوں۔ تم ایسا کرو گاڑی نکالو، ہم ابھی لاش لے کر شہر روانہ ہوں گے۔ اور کسی کے ذمے لگا دو کہ گھر گھر اطلاع دے، دے۔ آخر سب گاؤں والوں کا پیارا خان مر گیا ہے۔“ وہ شیطانی قہقہہ انہیں اپنے اعصاب پہ تھوڑے کی طرح محسوس ہوا تھا۔ مزید ٹھہرنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ وہ تیزی سے کمرے میں واپس آ کر بیڈ پر لیٹ گئیں۔ دروازے کی طرف پشت کیے بند آنکھوں

سے سیل رواں تھا۔ ان کے اتنے اچھے بھائیوں جیسے جیٹھاب اس دنیا میں نہیں رہے تھے۔ وہ بہ مشکل بچکیوں پہ بند باندھنے میں کامیاب ہوئی تھیں۔

خان جی کمرے میں آئے اور چند لمحوں بعد واپس نکل گئے۔

”کچھ دنوں بعد ان دونوں کا بھی بندوبست کرتا ہوں۔“ منہ پر ہاتھ رکھے چیخوں کا گلا گھونٹتے وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

”کون دونوں۔۔۔؟“ ذہن میں اٹھتے سوال نے آہستہ آہستہ درد کم کرنا شروع کر دیا تھا۔

”اور کون ہے جسے خان اس طرح۔۔۔“ وہ ہاتھ کی پشت سے آنسو صاف کرتی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”میں۔۔۔“ خیال آیا فوراً ہی سرنفی میں ہل گیا۔

”گھر سے بھاگ جانے والی بہن اور وہ لڑکا۔۔۔ بھلا اور کون۔۔۔؟“ ذہن نے ایک اور راہ دکھائی۔

”نہیں ان دونوں کا تو کوئی اتنا پتا نہیں۔۔۔ مشکل ہے بہت مشکل۔۔۔“ دل مطمئن نہیں تھا۔

”تو پھر کون۔۔۔“ ننگے پیر ٹھنڈے فرش پر ٹپکتے ان کی ٹانگیں شل ہونے لگی تھیں۔۔۔ تبھی جاڑے کی خاموش تاریک رات میں

گاڑی کا انجن اسٹارٹ ہونے کی گونج سنائی دی تھی۔ وہ چونک کر دروازے کی طرف آئیں۔ اور بے ارادہ ہی نگاہ سامنے برآمدے میں نظر آنے والے دروازے پر جم سی گئی۔

”بی بی اور ولی۔۔۔؟“ لبوں نے خود بخود دہول کے ان پر سب واضح کر دیا تھا۔ وہ ڈر کے دو قدم پیچھے ہٹ گئیں۔

”یا اللہ۔۔۔“ درد کی تیز لہر نے ان کے دل کو اپنے حصار میں لیا تھا۔۔۔ اور پھر چند منٹ لگے تھے ان کو سوچنے میں۔۔۔ الماری کھول کر ایک بڑا بیگ نکالا، جو بے آسانی کمر پر لاد جا سکتا تھا۔ تیز بھاگنے کی صورت میں بھی اسے اٹھانا سہل تھا۔ خان شکار پر جاتے وقت ہمیشہ یہی بیگ ساتھ لے کر جاتے تھے۔ صنوبر کو یہ بیگ بہت پسند تھا۔

انہوں نے الماری کے نچلے حصے میں بنے سیف میں سے چند بھاری زیورات اور نقدی کی چند ہری گڈیاں بیگ میں ڈال دیں۔

بیگ اب بھی کافی ہلکا تھا۔ انہوں نے احتیاط سے سیف واپس بند کیا اور بیگ اٹھائے سامنے والے کمرے کی طرف چلی آئیں۔

”بی بی۔۔۔“ انہوں نے تیز آواز میں پکارا تھا۔ اور ان کی توقع کے عین مطابق دوسری دستک پر ہی دروازہ کھل گیا تھا۔

”کیا ہوا صنوبر۔۔۔؟“ ان کے چہرے پر تشویش تھی۔

”بی بی اپنے زیور نکالیں۔“ وہ ان کا ہاتھ تھامے انہیں اندر لاتے ہوئے بولیں۔

”کیا مطلب۔۔۔؟“ وہ حیران ہوئیں۔

”جلدی کریں بی بی۔۔۔“ وہ بڑھ کر خود الماری کھولنے لگیں۔ اب بی بی انہیں حیرت سے دیکھتے ہوئے ذرا سی کھلی الماری میں

موجود سیف کھولنے لگیں۔

”بتاؤ تو ہوا کیا ہے؟ کیوں چاہئیں زیور۔۔۔؟“ وہ لاک کھولتے ہوئے ان کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

”کہیں گلے کا تو پتا نہیں چل گیا۔“ ایک دم ہی انہیں خیال آیا تھا۔ ادھر صنوبر انہیں مکمل طور پر نظر انداز کر کے زیور اور نقدی بیگ

میں ڈالنے لگی تھیں۔

”صنوبر کیا کر رہی ہو؟“ وہ بے بس ہو گئیں۔

”جلدی کریں بی بی۔۔۔ ولی کو جگائیں۔۔۔ جلدی۔“ وہ تیزی سے ہاتھ چلاتے ہوئے بولیں۔

”لیکن کیوں؟“

”جلدی۔۔۔ میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گی۔۔۔ ابھی تو جلدی سے ولی کو جگائیں۔“ وہ کام ختم کر چکی تھیں سو تیزی سے بیگ

بند کر کے خود ہی بیڈ پر گہری نیند سوتے بچے کی طرف لپکیں۔

”ولی۔۔۔ ولی اٹھو۔۔۔“ ذرا سا کسمسا کے بچے نے اپنی پوری آنکھیں کھول دی تھیں۔ اس کی نیند میں ڈوبی آنکھوں میں بھی

جھلملاتی تیز روشنی اس کی ذہانت کا پتا دے رہی تھی۔

صنوبر نے جھٹ ولی کو خود سے لپٹا لیا۔ پھر اس کے دونوں گال کئی بار چوم لئے۔

”کیا ہو گیا ہے تمہیں صنوبر۔۔۔؟“ بی بی کو اب صحیح معنوں میں پریشانی لاحق ہوئی تھی۔

”آپ دونوں کو ابھی اسی وقت اس گھر، اس گاؤں سے کہیں دور جانا ہو گا بی بی، کہیں دور۔۔۔“ وہ ولی کو خود سے لپیٹے بھگے لہجے

میں بولی تھیں۔

”دور۔۔۔ لیکن کہاں اور کیوں۔۔۔؟“ وہ ناتجبی سے صنوبر کا روشن چہرہ دیکھے گئیں۔

”یہ تو میں بھی نہیں جانتی کہ کہاں۔۔۔ لیکن یہ جانتی ہوں کہ کیوں۔۔۔“ وہ اٹھ کر ان کے پاس آ گئیں۔

”اس لئے کہ۔۔۔ آپ اور۔۔۔“ وہ کہہ نہ سکیں بی بی ان کی طرف دیکھتی رہیں۔

”آپ کی اور ولی کی جان کو خطرہ ہے بی بی۔۔۔“ ان کی آنکھیں پھر برسنے لگیں۔ بی بی مسکرا دیں۔

”کوئی برا خواب دیکھ لیا ہے۔۔۔ تو بہ صنوبر تم بھی ناں۔۔۔“ وہ سوئے جاگے ولی کی طرف بڑھ گئیں اور اب اٹھ کر بیٹھا ہوا تھا۔

”سو جاؤ بچے۔۔۔“ وہ اسے واپس لٹانے لگیں۔

”نہیں، اٹھو ولی۔“ صنوبر تیزی سے ان کی طرف لپکیں اور لیٹے ہوئے ولی کو دوبارہ پکڑ کے بیٹھا دیا۔ پھر ادھر ادھر نگاہ کی۔ دور

کونے میں ولی کے جوگرز پڑے تھے اور ان سے کچھ دور بڑے خان کے جوگرز وہ جو توں کے دونوں جوڑے اٹھا کر بیڈ کے قریب آ گئیں۔

”یہ ولی کو پہنا دیں۔“ انہوں نے جو گرز بیڈ پر رکھ کر خود بی بی کے قدموں میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ اس بار بی بی نے خاموشی سے جوتے ولی کو پہنا شروع کر دیے تھے۔ وہ خود بی بی کے چپل اتار کر انہیں خان کے جو گرز پہنانے لگیں۔

”صنوبر یہ کیا؟“ بی بی چلیں۔

”جلدی بی بی۔۔۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔“ صنوبر نے جھپٹ کر مضبوطی سے ان کے پاؤں پکڑے اور لمحوں میں جو گرز پہنا دیے۔ پھر ولی کو سوٹر، دستانے اور اونی توپی پہنانے کے بعد دوبارہ بی بی کی طرف متوجہ ہو گئیں۔۔۔ تیاری مکمل تھی۔۔۔

”بی بی۔۔۔“ ان کی خوبصورت نیلی نیلی آنکھیں پھیلنے لگی تھیں۔

”کیا ہوا ہے صنوبر۔۔۔“ بی بی کا دل ڈوبنے لگا۔ انہوں نے صنوبر کے سرد ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

”وہ۔۔۔ وہ۔۔۔“ صنوبر بول نہ سکیں۔۔۔ کتنے ہی پل دبے پاؤں گزر گئے۔

”کاکی۔۔۔“ ولی جو مسلسل خاموشی سے سب کا روائی دیکھ رہا تھا نے صنوبر کو پکارا۔

”مجھے نیند آئی ہے کاکی۔۔۔“ اس کی پلکیں بھاری ہو رہی تھیں۔ صنوبر نے ایک نظر اسے دیکھا پھر بی بی کو تکتے لگیں۔

”خان آپ دونوں کو مار دے گا بی بی۔“ صنوبر کی زبان خشک ہونے لگی تھی۔

”کیا مذاق ہے صنوبر۔“ بی بی اب تنگ آ چکی تھیں۔

”بڑے خان۔۔۔“ وہ بولتے بولتے رکی، نہ جانے کیوں بی بی کا دل دوب ڈوب گیا۔

”انہوں نے بڑے خان کو مروا دیا ہے بی بی۔“ وہ رونے لگیں تھیں بی بی ساکت سی صنوبر کو دیکھتی رہیں۔

”وہ ولی کو بھی مارنا چاہتے ہیں بی بی۔۔۔ اس جاں نداد کے لیے آپ، ولی سب کو مار دینا چاہتے ہیں وہ۔“

”خان جی۔۔۔“ صنوبر کو بی بی کی آواز کسی گہری کھائی سے آتی محسوس ہوئی اور تھا بھی ایسا ہی۔

وہ اچھی طرح جانتی تھیں کہ بی بی واقعی ایک گہری کھائی میں جا گری تھیں۔ اور مزید گہرائی میں گرنے والی تھیں۔۔۔ وہ انہیں بچانے کی ایک کوشش کرنا چاہ رہی تھیں۔ آگے سب قدرت پہ تھا۔۔۔ ان کی قسمت پہ تھا۔

وہ یہ سب نہیں جانتی تھیں۔ نہ ہی جاننا چاہتی تھیں۔ بس انہیں ولی اور بی بی کو فی الحال کہیں دور بھیجنا تھا۔ جہاں خان کے خونی ہاتھ ان کو تلاش نہ کر سکتے۔۔۔

”بی بی۔۔۔“ صنوبر نے ساکت سی بی بی کو بلایا۔ وہ بے جان سی ان کو تکتے گئیں۔

”ہوش کریں بی بی۔۔۔ ولی کو بچالیں۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے صنوبر۔۔۔“ بائیں آنکھ سے ایک آنسو لڑھکتا ان کا گل چھو گیا۔

”میں اتنی رات کو یوں اچانک اتنا بڑا جھوٹ کیوں بولوں گی بی بی۔۔۔“ ان کی آنکھوں سے تو اترا آنسو بہہ رہے تھے۔

”خان۔۔۔“ انہوں نے دونوں ہاتھ منہ پر رکھ کے جیسے خود کو چلانے سے روکا تھا۔ اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھیں۔

صنوبر بھیگی آنکھوں سے ان کو آنسو بہاتا دیکھتی رہیں۔

”بی بی۔۔۔“ کچھ دیر بعد صنوبر نے دھیرے سے ان کا شانہ ہلاتے ہوئے ان کو پکارا تھا۔ وہ اب سسک رہی تھیں۔

”ولی کو بچالیں بی بی۔۔۔“ وہ دوبارہ بولیں۔

”ابھی سارے گاؤں میں خبر پھیل جائے گی۔ گاؤں والے جاگ گئے تو مسئلہ ہو جائے گا۔ آپ ابھی ولی کو لے کر نکل جائیں اور

کوشش کرنا کہ صبح کا اجالا پھیلنے تک آپ کسی بڑے شہر کی طرف نکل جائیں کیوں کہ خان صبح تک واپس آ جائیں گے۔۔۔ لالا کی لاش لے

کر۔“ اس نے ہاتھ کی پشت سے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

”اٹھو، بی بی دیر نہ کریں۔۔۔“ وہ دوبارہ سے ان کے کندھے سے لگ کر سوتے ولی کو جگانے لگیں۔

”بی بی ولی کو لے کر چلی جائیں۔۔۔“ اس نے اس بار ذرا تیز لہجے میں کہا تو بی بی چونک سی گئیں۔ پھر جلدی سے اٹھ کر بڑی گرم

شال الماری سے نکالی۔

”یہ شال پہن لیں۔“ وہ ان کی مدد کرنے لگیں۔ بیگ لینے کے بعد انہوں نے چادر اپنے اوپر پھیلا دی۔

”ان جو گزر کی وجہ سے آپ کو بھاگنے میں آسانی رہے گی۔ اگر خان کے کتوں کو خبر ہو گئی۔ انشاء اللہ میرے خیال میں صبح تک

آپ آرام سے گاؤں سے نکل جائیں گی۔“ وہ سر ہلا گئیں۔ صنوبر جگ میں رکھے ٹھنڈے پانی سے ولی کا منہ دھونے لگیں وہ بیدار ہو گیا۔

”چلو بچے۔“ بی بی نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔

”کہاں کا کی۔۔۔؟“ وہ معصومیت سے پوچھنے لگا۔

”شہر۔۔۔“ صنوبر اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولیں۔

”تمہیں شہر جا کے پڑھنے کا شوق تھا ناں۔۔۔ یوں سمجھو وہ خواب پورا ہونے کا دن آ گیا۔“

”سچ میں کا کی۔۔۔“ اس کی آنکھیں لودینے لگیں۔

”بالکل سچ۔۔۔“ وہ نم سی مسکراہٹ لبوں پر سجا گئیں۔

”جائیں بی بی۔۔۔ اللہ کی امان میں۔“ انہوں نے بی بی کو گلے لگا لیا۔

رات کی تاریکی اور سردی ایک ہی ڈھنگ سے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ صنوبر دروازے کی اوٹ سے سامنے دیکھ رہی تھیں۔

بی بی چادر تھامے ولی کا ہاتھ پکڑے قدم بہ قدم دور جا رہی تھیں۔ پچھلے صحن کی طرف مڑنے والی تاریک تنگ گلی کی طرف۔۔۔ جہاں دیوار کا ایک خستہ حصہ وہ آسانی سے عبور کر کے، اس خونخوار حویلی سے اپنے ولی کو بچا کر لے جاسکتی تھیں۔۔۔ ہاں شاید۔۔۔

☆.....☆.....☆

وہ کتنی دیر واش بیسن میں مسلسل بہتے پانی کو دیکھتا رہا۔ پھر ہاتھ کا پیالہ بنا کر بھر بھر کر خود کو بھگوایا۔ لیکن جلن تھی کے بڑھتی جا رہی تھی۔ تبھی اس کی نگاہ آئینے پہ پڑی تھی۔ ہاتھوں کا پیالہ بنا آواز کے ٹوٹ گیا تھا۔ یہ آئینے میں نظر آنے والا عکس اس کا اپنا تو نہیں تھا۔۔۔ تو پھر وہ کون تھی۔۔۔ جو بار بار اس کے سامنے آ جاتی تھی۔ اسے اس چہرے سے نفرت تھی پھر اسی قدر وہ چہرہ کیوں اس کی آنکھوں میں سمایا ہوا تھا۔ وہ پلٹ کر کمرے میں آ گیا اتنے سرد موسم میں بنیان میں ملبوس بھی وہ پسینے سے تر ہونے لگا تھا۔ اس نے سائیڈ ٹیبل پر دھری سگریٹ کی ڈبیا اٹھائی اور ایک سگریٹ نکال کر جلانے لگا۔ پھر ایک گہرا کش لیا ذرا دیر سانس روکی اور پھر دھوئیں کے مرغولے کو ہوا کے سپرد کر دیا۔

اگلے ہی لمحے اس کے جسم میں کرنٹ سا گزرا تھا۔ وہ مرغولہ ہوا میں ہی ساکت ہوا تھا۔ اور دھوئیں نے کسی بہت ہی خوبصورت چہرے کی شبیہ پکڑی تھی۔

وہی صورت ایک بار پھر اس کے سامنے تھی۔

”لالہ۔۔۔“ اس نے چلاتے ہوئے سائیڈ ٹیبل پر دھرے سامان کو ہاتھ کی زوردار ٹھوک سے دور پھینک دیا تھا۔ ایک دم شور سا گونجتا تھا۔

پھر مکمل خاموشی چھا گئی تھی۔۔۔

☆.....☆.....☆

رات جس قدر تاریک تھی، اسی قدر سرد بھی۔۔۔ قمری مہینے کی آخری راتیں ہونے کی وجہ سے چاند بھی غائب تھا۔ سردی سے اس کا ننھا سا وجود کپکپا رہا تھا۔ مگر وہ ماں کا ہاتھ مضبوطی سے تھامے بھاگا چلا جا رہا تھا۔

اسے اپنے پیر شل ہوتے محسوس ہوئے تھے۔ سانس جیسے اکھڑی ہوئی تھی۔ مگر پھر بھی وہ تیز سے تیز دوڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ماں کے قدم سے قدم ملا کر سب کچھ برداشت کیے کسی جنونی کی طرح دوڑتا چلا جا رہا تھا۔

رات کے خوفناک سناتے میں اسے کئی بھاری دوڑتے قدموں کی آوازوں کے ساتھ لوگوں کی چیخ و پکار بھی سنائی دے رہی تھی۔

شکاری کتوں کے بھونکنے کی آوازوں نے ماحول مزید ہشت زدہ بنادیا تھا۔ مگر پھر بھی وہ خوفزدہ نہیں تھا کیوں کہ اس کی ماں اس کے ساتھ تھی۔۔۔ اور وہ جانتا تھا کہ ماں کے ہوتے ہوئے اسے کوئی مصیبت چھو بھی نہیں سکتی تھی۔

بھاگتے بھاگتے وہ اتنا فاصلہ طے کر چکا تھا کہ سخت سردی کے باوجود بھی اس کا وجود پسینے میں بھیگ گیا تھا۔ شکاری کتوں کی آوازیں نزدیک سے نزدیک تر ہوتی محسوس ہو رہی تھیں۔ تبھی اس کا پاؤں کسی سخت چیز سے ٹکرایا۔ اسے بہت زور کی ٹھوک لگی۔ ماں کا مضبوط ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

”ماں۔۔۔“ وہ بہت زور سے چلایا تھا۔

☆.....☆.....☆

”باری۔۔۔ باری۔۔۔“ کوئی بہت دور سے اسے پکارا رہا تھا۔

اس نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی تھی لیکن تیز روشنی کی چھین نے اس کی یہ کوشش ناکام کر دی تھی۔

”باریال۔۔۔“ اس دفعتاً آواز قریب محسوس ہوئی تھی۔ اس نے اس بار آنکھیں کھول دی تھیں۔

”دیدے۔۔۔“ خود پر جھکی ماں کو دیکھ کر وہ تیزی سے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا تھا۔

”تم مجھے پکار رہے تھے۔۔۔“ وہ سائیڈ ٹیبل پر دھرے جگ سے پانی گلاس میں انڈیلتے ہوئے بولیں۔

”نہیں تو۔۔۔“ وہ صاف مکر گیا انہوں نے مسکراتی نگاہ اس کی طرف کی۔

”وہم ہوا ہے آپ کو۔۔۔“ ان کے ہاتھ سے گلاس لیتے ہوئے وہ نظریں چرا گیا تھا۔

”تم بھول رہے ہو۔“ وہ اس کے قریب ہی بیٹھ کر بیٹھ گئیں۔ ”ماؤں کو وہم نہیں ہوا کرتے۔“ وہ ان کی طرف دیکھنے لگا۔

”ماؤں کو تو الہام ہو جاتے ہیں۔“ وہ مسکرائیں۔

”توبہ ہے دیدے۔۔۔ آپ اب میری فکر کرنا چھوڑ دیں۔ میں اب بڑا ہو گیا ہوں۔۔۔“ وہ گلاس سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر ان کے ہاتھ تھامتے ہوئے محبت سے بولا۔

”بھول جاؤ باری۔۔۔“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھیں۔

وہ نظریں جھکا گیا۔

”سب بھول جاؤ۔۔۔ کب تک ان خوفناک یادوں کو ساتھ لگائے رکھو گے۔ بعض اوقات ماضی کو بھول جانے میں ہی بہتری ہوتی ہے بیٹا۔“

”بہت کوشش کرتا ہوں دیدے۔۔۔ لیکن کچھ بھی نہیں بھول پاتا۔ ماضی جیسے کسی عفریت کی طرح میرے دل و دماغ سے چمٹ

کر رہ گیا ہے۔“ وہ پریشان تھا دونوں ہاتھوں سے سر کے بال جکڑتا وہ انہیں بے حد ڈسٹرب لگا۔ اور وہ بھی اپنے لخت جگر کے دکھ سے اچھی طرح واقف تھیں۔ غیروں سے دکھ ملیں تو ان کا مداوا ہو بھی جاتا ہے۔ لیکن اپنوں کے ہاتھوں لگے زخم کبھی مندمل نہیں ہو پاتے بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ ناسور بن جاتے ہیں۔ اس مسلح حقیقت سے وہ خود واقف تھیں۔ لیکن وہ اپنے بیٹے کو اس حالت میں نہیں دیکھ سکتی تھیں۔

”تم اگر وہ سب نہیں بھول پاتے تو صرف اس لئے بیٹا! تم نے اپنے دل میں انتقام کو جگہ دے دی ہے۔ سب اللہ پر چھوڑ دو باری۔۔۔ اللہ ہی سب سے برا منتقم ہے۔“ وہ اس کے بال سہلانے لگیں۔۔۔

اور وہ ان کی طرف دیکھنے لگا۔۔۔

”سب کچھ اللہ پہ چھوڑ دینے میں ہی انسان کی بھلائی ہے بچے۔۔۔؟ تم بھی اپنا مقدمہ اللہ پر چھوڑ دو، تمہیں سکون مل جائے گا۔“ باری نے عقیدت سے ان کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

”آپ بہت بہادر ہیں دیدے۔۔۔“ باری نے ان کے ہاتھوں پر لب دھرتے ہوئے کہا۔

”تم بھی بہت بہادر ہو میرے بچے۔۔۔“ وہ مسکرائیں۔

”کیوں کہ تم زریاب ولی خان کے بیٹے ہو۔“ فخریہ لہجے میں کہتے ہوئے انہوں نے باریال کی پیشانی چوم لی۔ وہ بھی پُر سکون ہو کر مسکرا دیا۔

☆.....☆.....☆

کمرے میں قدم رکھتے ہی عجیب سی بو ان کی ناک سے ٹکرائی۔ سہراب علی خان نے بے اختیار ہی ناک پر ہاتھ رکھا۔

دن کے گیارہ بجنے والے تھے لیکن موٹے پردوں کی دبیز تہ نے کمرے کی تاریکی بڑھا رکھی تھی۔ وہ کھڑکیوں کی طرف بڑھے تو کوئی سخت سی شے ان کے پاؤں سے ٹکرائی۔ انہوں نے بمشکل خود کو گرنے سے بچایا۔

سچ، سچ کے قدم اٹھاتے بہت مشکل سے وہ کھڑکیوں تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ اور پھر دھیرے، دھیرے سے انہوں نے پردے ہٹا دیے۔ سورج کی تیز چمکتی شعاعیں راستہ ملتے ہی کمرے کو روشنی سے نہلا گئیں۔ بستر میں گہری نیند میں غرق وجود اس در اندازی پر ذرا سا کسمسایا اور چہرے پر تکیہ رکھ کر پھر محو خواب ہو گیا۔

انہوں نے ایک مسکراتی نظر اس وجود پر ڈالی اور پھر کمرے کا جائزہ لینے لگے کولڈ ڈرنکس کے خالی کین کے علاوہ کچھ ہوئے سگریٹ کے ٹکڑوں کے انبار لگے تھے۔ بیڈ کے بالکل قریب بہت سی، سی ڈیز زمین پر بکھری تھیں۔ سی ڈی پلیئر آن تھا اور مخصوص انگلش گانے بار بار ری پیٹ ہو رہے تھے۔ ایک مطمئن سی مسکراہٹ خان کے لبوں کو چھو گئی۔

وہ بالکل ویسا ہی تھا۔۔۔ جیسا وہ اسے بنانا چاہتے تھے۔ آوارہ، من موجدی اور سب سے بڑھ کر۔۔۔ بے پرواہ۔۔۔ رشتوں،

جذبات اور احساسات سے۔۔۔ نا سمجھ۔۔۔ خود پرستی کا شکار۔۔۔ انہوں نے اس کی خاص تربیت کی تھی۔ اسے مہم جو بنایا تھا۔ اس کی شخصیت میں اس قدر ضد اور بے پروائی کا بیج بویا تھا کہ وہ کسی خاطر میں نہ لاتا۔ اپنی مرضی کرتا۔۔۔ اس لئے انہیں اپنے سپوت میں اپنا مقصد حیات نظر آتا۔۔۔ وہ جس منظر کے متلاشی تھے وہ اب زیادہ دور نہیں تھی۔ محبت پاش نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے دھیرے، دھیرے قدم اٹھاتے وہ اس کے پاس بیڈ پر بیٹھ گئے تھے۔

”ضیا۔۔۔“ کالے گھنے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے انہوں نے نرمی سے اسے پکارا تھا۔ ان کی توقع کے عین مطابق اس نے ان کی پہلی آواز پر ہی آنکھیں کھول دیں۔ اور سیدھا لیٹ گیا۔

”با۔۔۔“ اس کی سرخ ہوتی آنکھوں میں حیرت جاگی۔

”اتنی صبح۔۔۔“ نیند سے بوجھل پلکیں لرز تیں، گر پڑتیں اور ضیا نیند بھگا تازہ بردستی انہیں دوبارہ کھلنے پر مجبور کر دیتا۔

”صبح کہاں یار۔۔۔؟ گیارہ بج رہے ہیں۔“ وہ مسکرائے تو ضیا اچھل کر بیٹھ گیا۔

”گیارہ بج گئے؟“ وہ اب بھی حیران تھا۔

”مجھے تو آج شہر کے لئے نکلنا تھا۔“ وہ شرمندہ ہوا۔

”تبھی تو تمہیں جگانے ہمیں خود آنا پڑا۔“ انہوں نے ہاتھ میں پکڑی بید کی چھڑی گھمائی۔

”بس با۔۔۔ میں ابھی تیار ہوتا ہوں۔“ وہ کہہ کر نیچے اترنے لگا کہ سہراب علی خان نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے رکنے پر مجبور کر دیا۔

”ضیا۔“ ان کے پکارنے پر وہ ان کی طرف دیکھنے لگا۔

”میں نہیں چاہتا کہ تمہیں بار، بار یاد دہانی کرائی جائے مگر ایک بات یاد رکھنا نہ جانے کتنے برس میں نے اس دن کا انتظار کیا ہے۔

کتنی راتیں انتقام کی آگ میں سلگ سلگ کر گزری ہیں۔ مجھے مایوس نہ ہونے دینا ضیا۔۔۔ تمہیں اس مقصد میں سو فیصد کامیابی حاصل کرنی ہے۔ سو فیصد۔۔۔“ ان کے لہجے اور آنکھوں میں عجیب سی شدت پسندی اتر آئی۔

”مجھے یاد ہے با۔۔۔ سر کے بدلے سر۔۔۔ ناک کے بدلے ناک۔۔۔ اور عزت کے بدلے صرف عزت۔۔۔“ وہ بھی اسی لہجے میں بولا تھا۔ اور ان کے اندر تک سکون اتر گیا تھا۔

ہر فکر سے آزاد، اخلاق کی قیود سے نابلد، دنیا میں صرف اپنی اور باکی پرواہ کرنے والا ان کا واحد سپوت ضیا خان ان کا فخر تھا۔

☆.....☆.....☆

آسمان کو زمین ہمارا عزم بناتا ہے۔

انسان اگر ارادہ کر لے تو خلا تک میں قدموں کے نشان چھوڑ سکتا ہے۔ اس دنیا میں کچھ بھی ایسا نہیں ہے جو انسان کے لیے ناممکن ہو۔ پختہ ارادہ اور مسلسل محنت ناممکن تک کو ممکن بنا دیتے ہیں۔

یہی سب اس نے کر دکھایا تھا نہ صرف پوزیشن لی تھی بلکہ اسکا لرشپ بھی حاصل کیا تھا اور سب سے بڑی کامیابی تو یہ تھی کہ وہ بقول امی، خاندان کی پہلی لڑکی تھی جو یونیورسٹی پڑھنے جا رہی تھی۔ اس خوشی نے اس کی نیندیں اڑا دی تھیں۔ کل یونیورسٹی میں اس کا پہلا دن تھا۔ آج وہ جلدی سونا چاہتی تھی لیکن نیند نہ جانے کہاں کھو گئی تھی۔ کروٹ بدلتے بدلتے تنگ آ کر اس نے لائٹ آن کر دی اور سر ہانے رکھی کتابوں کی ایک، ایک کر کے ورق گردانی کرنے لگی۔ تبھی ہلکا سا کھٹکا ہوا اور سین اندر آئیں۔

”امی آپ۔۔۔“ وہ حیران ہوئی۔

”آپ ابھی تک جاگ رہی ہیں۔؟“ کتابیں رکھ کر اس نے اٹھ کر بیٹھنے ہوئے ماں کے لیے جگہ بنائی۔

”تم بھی تو جاگ رہی ہو؟“ وہ مسکرائیں اسے ماں کی مسکراہٹ کھوکھلی سی لگی۔

”کل یونیورسٹی جانا ہے نا۔۔۔ تو بس شاید اسی خوشی میں۔۔۔“ وہ کھل کر مسکرا دی تھی۔

”لالہ۔۔۔!“ انہوں نے اس کا دایاں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔

”میری مانو بیٹا۔۔۔ یونیورسٹی مت جاؤ۔“ ان کے لہجے میں منت بھرا آئی۔

”کیوں امی۔۔۔؟“ اس نے بیزاری سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

”کیوں کہ میں نہیں چاہتی بیٹا کہ میرے ماضی کا کوئی بھی تاریک سایہ تمہارے حال یا مستقبل کو گہنا دے۔“ وہ متفکر تھیں۔ وہ

چپ رہی۔

”میری مان لو۔۔۔ بس حمزہ سے شادی کے لیے ہاں کر دو۔ بعد میں بھلے پڑھائی کرتی رہنا۔“

”پلیز امی۔۔۔!“ وہ بری طرح چڑ گئی۔

”آپ اپنی غلطی بار، بار ہم پر کیوں تھوپنا چاہتی ہیں۔“ اس کے انداز میں بدتمیزی تھی۔ سین لب کاٹنے لگیں۔

”اور پھر پھپھو کے مزاج سے آپ اچھی طرح واقف ہیں۔ حمزہ کے رشتے کے لئے ہاں کہہ کر آپ ساری عمر مجھے پھپھو کے طعنے

سننے پر مجبور کرنا چاہتی ہیں۔“ اس کی آواز بتدریج اور بچی ہو رہی تھی۔

”میری بات سمجھنے کی کوشش تو کرو بیٹا۔“ وہ اس کا ہاتھ سہلاتے ہوئے بولیں۔

”نہیں امی۔۔۔ اس معاملے میں تو ہر گز نہیں۔۔۔ باقی رہی یونیورسٹی کی بات تو بے فکر رہیں۔ آپ کی زندگی میرے سامنے

ہے۔ سودفعہ سوچوں گی ایسا کوئی بھی قدم اٹھاتے ہوئے۔“

”لالہ۔۔۔“ اس کے طنزیہ کاٹ دار لہجے نے انہیں اندر تک چھلنی کر دیا تھا۔ آنسو خود بخود پکلوں کی باڑھ پار کرنے لگے۔
 ”اب جائیں امی، مجھے نیند آرہی ہے۔“ وہ نظریں چراتے ہوئے بولی۔

سین خاموشی سے اٹھ کر کمرے سے باہر چلی گئیں۔ وہ کچھ دیر یونہی بیٹھی کڑھتی رہی۔ پھر لائٹ آف کر کے سونے لیٹ گئی۔

☆.....☆.....☆

”تم نے رات پھر امی کے ساتھ بدتمیزی کی۔“ وہ جانے کے لیے تیار تھی جب شاہ ویز تیز لہجے میں کہتا اس کے سر ہوا تھا۔
 ”امی خود میرے کمرے میں آئی تھیں۔ اور میں نے کوئی بدتمیزی نہیں کی۔ صرف یونیورسٹی نہ جانے سے منع کیا ہے۔“ وہ بال بناتے ہوئے بولی۔

”تو یہ بات تم آرام سے بھی تو کر سکتی تھیں۔“ اس کے بے نیاز سے انداز پر وہ مزید بھڑک اٹھا تھا۔
 ”تم ان سے کیوں نہیں کہتے کہ وہ مجھے منع نہ کرتیں۔“ وہ اب اس کی طرف مڑ چکی تھی۔

”وہ ہماری ماں ہیں لالہ۔۔۔ انہیں پورا حق حاصل ہے کہ جو چاہے بات کریں، جس چیز سے چاہیں منع کریں۔“ وہ دو قدم اس کے قریب ہوا۔

”لیکن انہیں یہ حق حاصل نہیں شاہ ویز کہ وہ ہم سے ہماری خوشیاں چھین لیں۔۔۔ ان سے جو غلطی سرزد ہوئی اس کی پاداش میں وہ ہماری چھوٹی، چھوٹی خواہشات کا گلا گھونٹ دیں۔“ وہ بیگ اٹھا کر چادر اوڑھنے لگی۔ شاہ ویز اس بار چپ چاپ اسے دیکھے گیا۔
 ”کبھی کبھی تم مجھے بالکل زریعہ پھپھو کی کا پی لگتی ہو۔ ان کی ہی طرح خود غرض اور بے رحم۔۔۔“ وہ ہونٹ چباتے ہوئے بولا۔
 ”تھینکس فار داکمپلیمنٹس۔۔۔“ وہ بے نیازی سے سر جھٹکتی باہر نکل گئی۔
 ”خدا تم پر رحم کرے لالہ۔۔۔“ وہ بڑبڑایا تھا۔

وہ سین کا سگا بیٹا نہیں تھا۔ ان کی بڑی نند کا بیٹا تھا۔ جو اس کی پیدائش کے وقت ہی دم توڑ گئیں تھیں۔ باپ نے دوسری بیوی کے ڈر سے اسے ساتھ رکھنے سے انکار کر دیا تھا۔ تب سین ہی تھیں جس نے اسے ایک ماں کا مکمل پیار دیا تھا۔ ان کی گود نے اسے پناہ دی تھی۔ اور یہ بھی حقیقت تھی کہ شاہ ویز نے بھی ہمیشہ سگے بیٹے سے بڑھ کر دکھایا، وہ سین کا دایاں بازو تھا۔ ان کی سگی اولاد انہیں اتنا نہ سمجھتی تھی جتنا کہ شاہ ویز۔۔۔ شاہ ویز ہی تھا جس نے ان کی زندگی میں آنے والی ہر کمی پوری کی تھی۔ اور یہی وجہ تھی کہ اگر انہیں کوئی ہرٹ کرتا تو مطلب وہ شاہ ویز کو ہرٹ کرتا۔۔۔

☆.....☆.....☆

”پاپا ہیں اندر۔۔۔؟“ چیونگم چباتے ہوئے بڑی بے فکری سے اس نے ٹیبل بجا کر سیکر یٹری کو اپنی طرف متوجہ کیا۔

”جی۔۔۔“ جواب سنتے ہی وہ آگے بڑھی تھی۔

”میم۔۔۔“ وہ چونک کے رکی۔۔۔ سیکریٹری ذرا ساجھیکی۔

”اچھو نیلی۔۔۔ اندر کچھ انٹرویوز اسٹارٹ ہیں آپ اگر کچھ دیر۔۔۔“

”شٹ اپ۔۔۔“ اس نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ اور سامنے موجود گلاس ڈور دھکیلتی اندر چلی آئی۔ سکندر حیات نے متحیر نگاہ اس پر ڈالی اور ان کے لبوں پر خوب صورت مسکان بکھر گئی۔

”مائی ڈول۔۔۔“ وہ کمرے میں موجود دوسرے فرد کو یکسر فراموش کر بیٹھے تھے۔

”یہ باہر کس کو بٹھا رکھا ہے پاپا۔۔۔ you should dismiss her now“ وہ خفا خفا انداز میں بولی۔ کرسی پر بیٹھا شخص پہلو بدل کے رہ گیا۔

”کیا ہوا؟“ وہ پریشان ہوئے۔

”اس نے مجھے اندر آنے سے روکا۔“ وہ خفا تھی۔

”اچھا چھوڑو، یہاں بیٹھو۔۔۔“ انہوں نے بات بدل دی اور اسے کندھوں سے تھام کر اپنی چیئر پر بٹھا دیا۔ اور تبھی اس کی نظر سامنے بیٹھے شخص پر پڑی تھی۔ اس کی گہری ڈارک براؤن آنکھیں اس کا طواف کرنے میں مصروف تھیں۔ نظر ملتے ہی اس شخص نے فوراً نگاہوں کا رخ بدل لیا تھا مگر وہ نگاہیں نہ پھیر سکی تھی۔

”so young man you can leave now“ انہوں نے مسکراتے ہوئے اس نوجوان سے کہا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”کل تک کامیاب امیدواروں کو ان کے فون نمبرز پر اطلاع کر دی جائے گی۔“ وہ یو بیسٹ آف لک۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا تھا جو اس نے فوراً ہی تھام لیا۔ اور دروازے کی طرف مڑ گیا۔

”سنو۔۔۔“ تبھی کمرے میں اس لڑکی کی آواز گونجی۔ وہ مڑا۔

”نام کیا ہے تمہارا؟“ اس کی آنکھوں میں اشتیاق تھا۔

”باریال۔۔۔ باریال ولی خان۔۔۔“ اس نے مودبانہ انداز میں جواب دیا اور باہر نکل گیا۔

”What happened Aman“ سکندر حیات نے پوچھا۔

”اسے جاب مل جانی چاہیے پاپا۔۔۔ کافی کام کا آدمی لگ رہا ہے۔“ امن نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

”میرا بھی یہی خیال ہے۔“ انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

”اچھا کیا لوگی بیٹا؟“

”بلیک کافی۔۔۔“

”او کے۔۔۔“ انہوں نے کہہ کر بیل کا بٹن دبا دیا تھا۔

☆.....☆.....☆

پانچ گھنٹوں کے طویل سفر نے اسے خاصا تھکا دیا تھا۔ بانے اس کی رہائش کا انتظام شہر سے دور ایک سرسبز فارم پر کیا تھا۔ یونیورسٹی میں ایڈمیشن تک اسے یہیں رہنا تھا۔ جب تک باکوئی دوسرا بندوبست نہ کر لیتے۔ سرسبز کھیتوں کے درمیان بنی پکی سڑک پر آتے ہی اس نے سب شیشے اتار دیئے تھے گاڑی کے۔۔۔ تازہ ٹھنڈی ہوائ نے اس کے شل اعصاب کو کافی پرسکون کر دیا۔ اس نے گاڑی کی رفتار کم کر دی۔

سڑک کے دونوں طرف جوار کے سرسبز کھیت تھے۔ یہاں دھول نہ ہونے کے برابر تھی۔ پندرہ منٹ کی ڈرائیو کے بعد ان کی کار ان کے آبائی فارم ہاؤس کے بلند و بالا لکڑی سے بنے گیٹ کے اندر داخل ہوئی۔ فارم کے گیٹ سے تین روپہ سڑکیں جاری تھیں۔ ایک دائیں، ایک بائیں اور ایک سیدھی سامنے کی طرف۔۔۔ اس نے گاڑی سامنے والی سڑک پر ڈال دی۔ رہائشی حصے میں بنے بنگلے کے سامنے اوپن گیراج میں آتے ہی اسے بے پایاں خوشی کے احساس نے گھیرا تھا۔ بانے اس کی پسند کے مطابق گھر کو کلر کر دیا تھا۔ اس کے اترتے ہی گھر کے سبھی ملازم بھاگے چلے آئے تھے۔

”سلام سردار۔۔۔“ سبھی ایک زبان بولے تو ضیاعی خان مسکرا دیا۔

”وعلیکم السلام۔۔۔ کیا حال ہے جمال چاچا۔۔۔“ وہ ادھیڑ عمر شخص سے مخاطب ہوا۔ وہ ہاتھ جوڑ کر سر جھکا گیا۔ وہ اندر کی طرف بڑھ گیا۔

”اور بی گل آپ کیسی ہیں؟“ سفید چادر میں ڈھکا وجود اس کے قریب آیا اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

”میں ٹھیک ہوں، سردار کیسے ہیں؟“ وہ مسکرائیں۔

”سردار نہ کہا کریں بی گل۔۔۔ مجھے اچھا نہیں لگتا۔“ وہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

”سردار کو سردار نہ کہوں تو اور کیا کہوں؟“ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”آپ نہ لوتب تک میں چائے بنا لیتی ہوں۔“

”ساتھ کچھ کھانے کے لیے بھی لے آئیے گا۔۔۔ بی گل۔۔۔ خان نے راستے میں کھانا نہیں کھایا تھا۔“ قریب کھڑے پرانے

ملازم دوراں نے ہدایت کی۔

”جی میں ابھی کچھ بنائے دیتی ہوں۔“ انہوں نے کہا اور کچن کی طرف چل دیں۔

”خان، فریش ہو لیں۔“ دورانے ضیا کو مخاطب کیا جو سر کے نیچے ہاتھ رکھے صوفے پر تقریباً لیٹے آنکھیں موند گیا تھا۔
”ہم۔۔۔“ وہ بھی فوراً اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

☆.....☆.....☆

”حمزہ آیا ہوا ہے؟“ وہ یونیورسٹی سے واپسی پر گھر کے اندر داخل ہوئی تو حمزہ کی بایک کھڑی تھی۔ شاہ ویز اسی وقت سودا سلف لایا تھا۔ وہ بے اختیار ہی پوچھ بیٹھی۔
”ہاں زرینہ پھپھو بھی ساتھ ہیں۔“ اس نے شاپرزاٹھاتے ہوئے بتایا تھا۔
”ہم۔۔۔“ وہ اندر جانے کے بجائے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔
”پھپھو سے تو مل لو۔“ وہ حیران ہوا۔
”تم لوگ مل لو۔۔۔ مجھے کوئی شوق نہیں۔“ تلخی سے کہتی وہ اوپر بھاگ گئی۔ لاؤنج سے باہر آتے حمزہ نے بھی اس کی یہ بات سن لی تھی۔

”نہ جانے لالہ اتنی بدگمان کیوں رہنے لگی ہے۔“ وہ اداس ہوا۔
”تم ٹینشن نہ لو، اس کا تو مزاج ہی ایسا ہے۔“ شاہ ویز شاپر زسنجالتا اندر کی طرف بڑھ گیا۔ حمزہ کچھ دیر وہاں کھڑا سوچتا رہا پھر اوپر چلا آیا۔ سامنے برآمدے میں گھٹنوں پر سر دیئے وہ دشمن جاں دکھائی دے گئی۔ وہ اور لالہ بچپن سے جس قدر قریب تھے۔ زرینہ کے برتاؤ اور طنز یہ لہجے نے ان دونوں کے درمیان اچھی خاصی دوری پیدا کر دی تھی۔ وہ ماں کی ساری غلطیوں کا کفارہ ادا کرنے کی کوشش کرتا لیکن ناکام ٹھہرتا۔۔۔

”کیسی ہو۔۔۔؟“ وہ اس کے قریب ہی فرش پر بیٹھتے ہوئے بولا تھا۔ لالہ نے سر نہیں اٹھایا تھا۔
”یہ بدگمانی کب ختم کرو گی لالہ۔۔۔“ وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے باتچی لہجے میں بولا تھا۔
”بدگمانی نہ خود پیدا ہوتی ہے نہ خود ختم۔۔۔ اور تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میری بدگمانی کی وجہ کیا ہے؟“ وہ سر اٹھائے بغیر تلخی سے بولی۔
”میں سمجھتا ہوں لالہ۔۔۔ تبھی کتنی کوشش کرتا ہوں اس خلیج کو پاٹنے کی جو امی اپنے لفظوں سے ہمارے رشتوں میں بنا دیتی ہیں۔“ وہ اسے منارہا تھا۔

لالہ نے سر اٹھایا۔

”بعض زخم بہت گہرے ہوتے ہیں حمزہ۔۔۔ ان کا کوئی مرہم نہیں ہوتا۔“ وہ تلخ ہوئی۔
”پھر میری تو سب سے بڑی بد قسمتی ہی یہی ہے کہ سارے زخموں کی وجہ میری ماں ہے۔“

”یہ صرف تمہاری سوچ ہے لالہ۔“ اسے افسوس ہوا۔

”حقیقت ہے یہ۔۔۔ اور کوئی بھی اسے جھٹلا نہیں سکتا۔ پھپھو کا رویہ، لوگوں کی باتیں یہ سب امی کے ایک غلط قدم کی دین ہیں۔

کسی کو روکنا، کسی کا منہ بند کرنا ہمارے بس میں نہیں۔۔۔ بس میں ہے تو صرف خود کو دھتکار کے لیے تیار رکھنا۔“

”وہم ہے تمہارا۔۔۔ مامی نے تمہاری تربیت اتنی اچھی کی ہے کہ کوئی تمہیں دھتکار نہیں سکتا۔“ وہ اسے دلاسا دے رہا تھا۔ وہ تلخی سے مسکرا دی۔

”تم جانتے ہو تمہارے ماں آج یہاں کیوں آئی ہے؟“ وہ اسے کہتے بے حد تمیز لگی لیکن وہ ضبط کیے بیٹھا رہا۔ لالہ وہ واحد ہستی تھی، جس کی کوئی بھی بات وہ آرام سے سہہ سکتا تھا۔

”نہیں۔۔۔ میں نہیں جانتا تم بتاؤ۔“ وہ سامنے دیکھنے لگا۔

”دادی نے میرے اور تمہارے رشتے کی بات چھیڑی ہے۔ پھپھو نے امی کو فون پر کھری کھری سنا دیں۔ اب دادی کی باری ہے وہ بھی لائیو، جاؤ۔۔۔ تماشا دیکھو۔۔۔“ تلخی سے کہہ کر وہ اٹھ کر اندر کمرے میں چلی گئی۔ دروازہ زوردار آواز کے ساتھ بند ہوا تو وہ بھی تیزی سے نیچے چلا آیا۔ کمرے سے آتے شور کی آوازیں لالہ کی بات کی گواہی دے رہی تھیں۔ وہ آگے نہ بڑھ سکا تھا۔

☆.....☆.....☆

وہ کتنے ہی سیاہ پہاڑوں کے درمیان کھڑا تھا۔ اس کے چاروں طرف سیاہ، سرمئی رنگ کے پہاڑ تھے۔ اور اس قدر بلند کے دن کے وقت بھی اسے شام کا گمان ہو رہا تھا۔ وہ حیران تھا کہ وہ وہ آیا تو یہاں آیا کیسے؟

اس نے ارد گرد گھوم، گھوم کر راستہ ڈھونڈنے کی کوشش کی لیکن بے سود۔۔۔ تھک ہار کر اس نے ایک قدرے تراشیدہ پہاڑ پہ چڑھنا شروع کر دیا، اس پہاڑ پہ جگہ جگہ ابھارتے، تبھی وہ آسانی سے چڑھتا گیا تھا۔ کافی دیر کی تک دود کے بعد وہ بالآخر چوٹی پر پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس نے چوٹی کے عین اوپر ذرا جھکے بڑے سے پتھر کو مضبوطی سے پکڑا اور جست لگا کر اوپر آ گیا۔ اور اگلے لمحے اسے حیرت کا شدید جھکا سا لگا تھا۔ دس بارہ سال کا ایک خوبصورت سالک چوٹی پر کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ ذرا سا چونکا۔ پھر دوقدم پیچھے ہٹا تھا۔

باریال نے دیکھا پیچھے جگہ بہت کم تھی۔۔۔ اور گہری کھائی تھی۔

”سنو۔۔۔ پیچھے نہ ہو۔“ وہ خوفزدہ ہو کے چلا یا۔

بچہ مزید پیچھے گیا۔ باریال کی سانس رکنے لگی۔

”سنو لڑکے۔۔۔“ وہ تیزی سے آگے کو بڑھا اور وہ بچہ پیچھے تبھی اس کے پیروں نے زمین چھوڑ دی تھی۔ باریال نے آگے بڑھ کر اس کا ایک ہاتھ تھام لیا تھا۔ اب وہ چوٹی پر گھٹنوں کے بل بیٹھا تھا۔ اور لڑکا نیچے اٹک رہا تھا۔ وہ چیخنے لگا تھا۔

”ڈرومت۔۔۔ میں تمہیں بچا لوں گا۔“ باریال نے تسلی دی اور اسے اوپر کھینچنے لگا۔ تبھی اچانک ہی اس کا ہاتھ بھینکنے لگا تھا۔ اس کے ہاتھ سے بچے کا ہاتھ پھسلنے لگا۔ وہ اسے تیزی سے اوپر کھینچنے لگا۔ لیکن اس بچے کا ہاتھ اس کے ہاتھ سے پھسلتا چلا گیا۔ باریال نے زور دار چیخ کے ساتھ آنکھیں بند کر لی تھیں۔

اور تبھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا تھا۔۔۔ خود کو اپنے کمرے میں بستر پر پا کر وہ ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا تھا۔

”نہ جانے یہ بچہ کون ہے؟ جو بار بار خوابوں میں آ کر مجھے ڈراسا دیتا ہے۔“ وہ پیشانی مسلتے لگا۔

جتنا وہ ان خوابوں سے دور بھاگنے کی کوشش کرتا تھا۔ وہ اسی قدر اسے تنگ کرنے چلے آتے تھے۔ وہ پانی پی کر سونے لیٹ گیا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اب اسے ساری رات نیند نہیں آئی تھی۔

☆.....☆.....☆

پشتو کے مشہور گلوکاروں کا لائیو کنسرٹ تھا۔ وہ بھی اپنے دوستوں کے ساتھ انجوائے کرنے چلا آیا تھا۔ لیکن بے ہنگم شور اور لمبے سفر کی تھکن کی وجہ سے جلد ہی اس کے سر میں شدید درد اٹھا تھا۔

”آریا وکے۔۔۔؟“ اسے پیشانی مسلتے دیکھ کر زید نے پوچھا۔

”ناٹ فیلنگ ویل یار۔۔۔“

”کیا ہوا تمہیں۔۔۔؟“ ابراہیم بھی پریشان ہو گیا۔

”معمولی سرد رد ہے۔ ڈونٹ وری۔۔۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”باہر چلتے ہیں۔“ ابراہیم نے کہا تو سب نے اس کی پیروی کی۔

باہر آ کر ضیا کو سکون محسوس ہوا۔

”میرے خیال میں، میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔“ ابراہیم نے پیش کش کی۔

”ہاں، میں شاید ڈرائیونگ نہ کر سکوں۔۔۔ تم مجھے چھوڑ کر گاڑی خود لے جانا۔“ اس نے بھی دوست کے لیے سہولت کی۔

”ہم چلتے ہیں تم اس کا خیال رکھنا۔“ زید نے کہا تو شاہد نے بھی اثبات میں سر ہلادیا۔

ابراہیم اسے ڈراپ کر کے۔۔۔ واپس چلا گیا تو وہ بی گل کو چائے کا کہہ کر اوپر اپنے کمرے میں آ گیا۔ اور بستر پر ڈھسے سا گیا۔ لیٹے، لیٹے اچانک اسے خیال سا آ گیا۔ اٹھ کر سائیڈ ٹیبل کی دراز سے ایک ننھا سا بیگ نکالا۔ یہ بیگ اسے باجی نے دیا تھا۔ اور بطور خاص تاکید کی تھی کہ اس کے اندر موجود کاغذ پر لکھی تمام ہدایات توجہ سے پڑھ کر ازبر کرے اور پھر کاغذ ضائع کر دے لیکن وہ اسے دراز میں ڈال کر بھول گیا تھا۔

کچھ سوچتے ہوئے اس نے بیگ کی زپ کھولی اور کاغذ نکال کر دیکھا۔ اوپر ایک نام لکھا تھا، نیچے کچھ مزید ہدایات تھیں۔ اس نے بے خیالی سے کاغذ پر نظریں دوڑائیں اور دوبارہ سے دراز کھول اس میں ڈال دیا۔ تبھی وہ ننھا سا بیگ اس کی گود سے پھسل کر نیچے جا گرا تھا۔ اور ایک پاسپورٹ سائز کی تصویر اس سے نکل کر باہر آ گئی۔ ضیا نے پیر کی مدد سے اسے قریب کیا اور جھک کر تصویر اٹھالی۔ وہ کسی بے حد خوبصورت لڑکی کی تصویر تھی۔ جس نے سفید رنگ کی شال سر پر لے رکھی تھی۔ اس کے شفاف چہرے پر بلا کی معصومیت تھی اور اس کی آنکھیں۔۔۔ جیسے سرے سے بھرے کالے کٹورے، بے حد سیاہ اور چمکدار آنکھیں۔۔۔ ایک پل کے لیے اسے یوں لگا جیسے وہ بھی اسے ہی تک رہی ہیں۔۔۔ حیرت سے منہ کھولے وہ ان کالی ساحر آنکھوں کو دیکھے جا رہا تھا۔ نہ سر کا درد رہا نہ کوئی اور خیال۔۔۔

”خان۔۔۔ چائے۔“ کا کا کی آواز پر وہ بری طرح چونکا۔ کا کا چائے رکھ کر واپس جا چکے تھے اور ضیا اپنی حالت پر حیران کے اسے کیا ہو گیا تھا۔ اس نے سر جھٹک کر دل ہی دل میں اپنے بابا سے عہد کی تجدید کی اور پین نکال کر تصویر کے پیچھے لکھنے لگا۔

”گل لالہ۔۔۔“ اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ سیٹی بجاتے ہوئے اس نے بیگ اور تصویر بھی دراز میں ڈال دیے تھے البتہ اس مرتبہ وہ دروازہ لاک کر نہا نہیں بھولا تھا۔

☆.....☆.....☆

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا، جب مانوس سے شور کی وجہ سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ لائٹ نہیں تھی البتہ کھڑکی سے اندر آتی چاند کی کرنوں نے کمرے کو کچھ نہ کچھ روشنی بخش دی تھی۔ پھر بھی اس کا دل بری طرح گھبرایا۔ وہی مانوس سا شور رات کے سناٹے میں ایک مرتبہ پھر گونجا تھا۔

”اوزگل۔۔۔“ وہ دھیرے سے بڑبڑائی۔ سیلپر زپاؤں میں پہن کر وہ کھڑکی کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ اور وہ نظروں کے سامنے تھی۔ سوئمنگ پول سے کچھ دیر لگے اہنی جھولے پر سفید لباس میں لمبے سیاہ بال کھولے چاند کی چاندنی میں وہ کوئی مقدس روح لگ رہی تھی۔ اتنی دور سے بھی وہ اس کے چہرے پر رقم اداسی یا آسانی پڑھ سکتی تھی۔

”جب آنکھوں سے خواب دیکھنے کا حق چھین لیا جائے ناں تو ان آنکھوں میں بس تنہائی اور وحشت گھر کر لیتے ہیں۔“ اوزگل نے اسے بتایا تھا۔ اور آج اسے واقعی یہ حقیقت لگ رہی تھی۔ لوہے کی کڑیوں کی آواز پھر سناٹا چیر گئی تھی۔

تبھی اس نے نیچے کسی کے چیخنے اور پھر اوزگل کو تیزی سے اٹھ کر ایک سمت دوڑتے ہوئے دیکھا تھا۔ کوئی بہت اونچی آواز میں چیخ رہا تھا۔ وہ ذرا جھک کر نیچے برآمدے کی سمت دیکھنے لگی اور پھر اندر سے چیخیں مارتا وجود اس کی نظروں کے سامنے تھا۔ اوزگل اسے سنبھالنے لگی تھی لیکن وہ وجود قایم نہیں آ رہا تھا۔

”ختم ہونے کو ہے۔ ختم ہونے کو ہے۔“ وہ چلانے لگی۔

”سب برباد ہو جائے گا“، اوزگل اسے پیار سے سہلاتے ہوئے اندر لے جانے لگی۔

”بھاگ جا تو بھی بھاگ جا۔۔۔ ورنہ سب برباد ہو جائے گا۔“ وہ اسے کمرے میں لے گئی تھی۔۔۔ آوازیں مدہم ہوتے ہوتے دم توڑ گئیں۔ وہ لمبی سانس لے کر دوبارہ بستر پر آ گئی۔

”لگتا ہے اللہ لوک کو پھر دورہ پڑا ہے۔ مجھے بھی بھیا کی طرح جلد شہر میں کسی اچھے کالج میں داخلہ لینا ہوگا۔ ورنہ یہاں رہ کر میں بھی ان سب کی طرح پاگل ہو جاؤں گی۔“ بستر پر لیٹتے ہوئے اس نے جیسے خود کو باور کرایا لیٹتے ہی گل مینہ کی آنکھ لگ گئی تھی۔۔۔ وہ ایک مرتبہ پھر نیند کی گہری وادیوں میں ڈوب چلی تھی۔

☆.....☆.....☆

”آگئیں تم۔۔۔؟“ وہ گھر کے اندر داخل ہوئی تو شاہ ویز کی مسکراہٹ نے اس کا استقبال کیا

”اُف آج تو گرمی نے برا حال کر دیا، اوپر سے بس میں اتنا رش۔۔۔“ وہ چادر اتار کر پیڈسٹل فین کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

”تو تمہاری اپنی چوائس ہے۔ کتنی مرتبہ آفر کی ہے کہ میں حاضر ہوں پک اینڈ ڈراپ سروس کے لیے۔۔۔ مگر نہ جی۔۔۔“ وہ خفا ہوتا چکن کی طرف بڑھ گیا۔

”تمہاری جاب لگنے کی دیر ہے۔ پھر دیکھتی ہوں کہاں رہتی ہے یہ آفر باقی۔۔۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”اچھا۔۔۔ فریش ہو لو۔۔۔ میں تمہارے لیے کھانا گرم کرتا ہوں۔“ اس نے چکن سے آواز دی۔

”کیوں، امی کہاں ہیں؟“ وہ حیران ہوئی۔

”وہ پھپھو کی طرف گئی ہیں۔۔۔ نانا نانا سرور ہی ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔

”کیوں۔۔۔ وہاں کیوں گئی ہیں؟“ اس کے لہجے میں تلخی در آئی۔

”کہہ رہی تھیں کافی دن ہو گئے ان کی طرف گئے ہوئے پھر ناراض ہوں گی۔“ چکن سے کھٹ پٹ کی آوازیں آنا شروع ہو چکی تھیں۔ وہ اپنا کام شروع کر چکا تھا۔ وہ چکن کی کھڑکی میں آٹھری۔

”اچھی طرح جانتی ہیں پھپھو کی عادت کو پھر بھی باز نہیں آتیں۔“ وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔

”اب دیکھنا کتنے دن مانیگرین کی تکلیف میں مبتلا رہیں گی۔“ اس نے پیش گوئی بھی کردی شاہ ویز مسکرا دیا۔

”نانو نے بھی یہی سمجھا یا تھا ان کو۔۔۔ مگر تم جانتی ہو، امی کب کسی کی مانتی ہیں۔“ وہ ٹرے میں کھانا رکھتے ہوئے بولا اور باہر نکل آیا۔

”بری بات لالہ۔۔۔“

”کیا بری بات۔۔۔ اچھی طرح جانتی ہیں کہ سب لوگ بات، بات پہ ان کے ماضی کا تذکرہ چھیڑ دیتے ہیں۔۔۔ ہمیں بھی کئی

دفعہ گھر سے بھاگی ہوئی عورت کی اولاد کا طعنہ سہنا پڑتا ہے۔۔۔ لیکن وہ۔۔۔ انہیں کچھ خیال ہی نہیں۔۔۔ مزہ آتا ہے جیسے ان کو یہ سب طعنے سننے میں۔۔۔ دوسروں کو خود موقع دیتی ہیں کہ وہ ان کو اور ان کی وجہ سے ہمارے کریکٹر پر بھی باتیں کریں۔“ وہ اس موضوع سے کس قدر رکھی ہوتی تھی وہ اچھی طرح سمجھ سکتا تھا۔

”اچھا یہ لو۔۔۔ موڈ صحیح کرو اپنا۔“ شاہ ویز نے بات بدلی اور بھاپ اڑاتے ابلے ہوئے گرم ماگرم چاول، رائیہ اور دیسی گھی کا تڑکا لگی دال دیکھتے ہی شاہ ویز نے اس کا چہرہ کھلتا دیکھا تھا۔

”ارے واہ۔۔۔ امی نے میری فیورٹ ڈش بنائی تھی۔ اور تم نے ایویں سارا ٹائم مجھے باتوں میں لگائے رکھا۔“ حسب معمول وہ ساری واردات اس کے سر تھوپ کر خود بری الذمہ ہو چکی تھی۔ اور رغبت سے کھانا کھانے لگی۔۔۔ وہ مسکرا کر اسے دیکھے گیا۔

☆.....☆.....☆

”کیا ہوا ہے باری؟ مجھے تم کچھ پریشان لگ رہے ہو؟“ صبح سے ہی وہ انہیں کھویا، کھویا لگ رہا تھا۔ اور اب ناشتہ بھی صحیح ڈھنگ سے نہیں کر رہا تھا تو وہ پوچھے بنا نہیں رہ سکی۔

”کچھ نہیں دیدے۔۔۔“ وہ چونکا پھر سیدھا ہو کر ہی بیٹھ گیا۔

”کچھ تو ہے بچے۔۔۔ کیا پھر سے وہی خواب تنگ کرنے لگا ہے۔“ انہوں نے اندازہ لگانے کی کوشش کی۔

”دیدے۔۔۔“ اس نے جیسے ان کی بات سنی نہ تھی۔ دھیرے سے پکارا تھا۔

”جی دیدے کی جان۔۔۔“ ان کے لہجے میں محبت در آئی۔

”کیا میرا کوئی جھوٹا بھائی تھا۔“ اس کے سوال پہ ان کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔

”نہیں۔۔۔ میں تمہیں کئی دفعہ بتا چکی ہوں کہ تم زریاب خان کی اکلوتی اولاد ہو۔“

”پھر وہ لڑکا کون ہے؟“ وہ پیشانی مسلتے لگا۔

”کون لڑکا؟“ وہ خود پریشان ہو گئیں۔

”وہ میرے خواب میں آتا ہے دیدے۔۔۔ ہمیشہ کسی نہ کسی مصیبت میں۔۔۔ لیکن میں چاہنے کے باوجود اسے نہیں بچا پاتا۔“

وہ انہیں بے حد ڈسٹرب لگا۔

”اپنے خوابوں کو اپنے اوپر طاری مت کر لیا کرو، یہ سب خیال ہوتے ہیں خالی خولی دھواں۔۔۔“ وہ اسے تسلی دینے لگیں۔

”اب ناشتا کرو اور خود کو پرسکون کرو۔۔۔ آج تمہارا پہلا دن ہے آفس میں۔۔۔ خوش، خوش جاؤ۔“

”ہم۔۔۔ م۔۔۔“ وہ اثبات میں سر ہلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد البتہ دیدے خود کتنی ہی دیر تک اس کے خواب کے متعلق سوچتی رہی تھیں۔

☆.....☆.....☆

وہ باہر نکل کر جیسے ہی بایک اسٹارٹ کرنے لگا۔ اس کا سیل فون بج اٹھا۔ اسکرین پہ شاہ ویز کا نام دیکھتے ہی اس کے لبوں پر بہت پیاری مسکان چل گئی۔

”کدھر غائب ہے شہزادہ۔۔۔“ کال پک کرتے ہی شاہ ویز کی کھلکھلاتی آواز سنائی دی تھی۔

”آج شام تیری طرف آنے والا تھا۔۔۔ جاب مل گئی ہے مجھے۔۔۔ سوچا تھا مل کر ہی بتاؤں گا۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”اورے واہ یار۔۔۔ مبارک!۔۔۔“ وہ چہک اٹھا۔

”خیر مبارک۔۔۔“

”ابھی آ جاؤ ناں۔۔۔“ شاہ ویز نے کہا۔

”نہیں ابھی تو آفس کے لیے نکل رہا ہوں شام کو ملتے ہیں۔“ اس نے بایک پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”اوکے، اوکے۔۔۔ ملتے ہیں پھر۔۔۔ اللہ حافظ۔۔۔“ شاہ ویز نے فون بند کر دیا تھا اور مسکراتے ہوئے اس نے بایک

اسٹارٹ کی تھی۔

☆.....☆.....☆

”خان“ گہری نیند میں وہ کسمسا یا ضرور مگر کروٹ بدل کر فوراً ہی دوبارہ سو گیا۔

”چھوٹے خان جی۔۔۔“ دوسری پکار پہ اس نے دھیرے سے آنکھیں کھولیں۔

”کیا ہے کا کا؟“ نیند میں ڈوبی آواز میں پوچھا گیا۔

”خان! آپ کے دوست آپ کا پوچھ رہے ہیں۔“ دوراں نے مودب لہجے میں کہا۔

”کہہ دو میں سو رہا ہوں۔“ اس نے واپس جانے کا اشارہ کیا۔

”کہا ہے خان۔۔۔ مگر وہ کہہ رہے ہیں کہ آپ نے آج، ان کے ساتھ کہیں جانے کا وعدہ کر رکھا ہے۔“ کا کا نے مزید بتایا۔

”یاد ہے مجھے۔۔۔ مگر ابھی میرا بالکل بھی موڈ نہیں ہے کا کا۔“ اس نے انکار کیا۔

”جی خان جی۔۔۔“ مودب لہجے میں کہتا وہ مڑ گیا۔

”اچھا رکیں۔۔۔“ وہ ابھی دروازے کے قریب ہی تھے جب وہ اٹھ بیٹھا، وہ مڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔

”آپ جائیں۔۔۔ میں آ رہا ہوں۔“ وہ انگڑائی لیتے ہوئے بولا۔۔۔ دوراں باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ تیار ہو کر باہر لاونچ میں آیا تو وہ اس کے منتظر تھے۔

”چلو۔۔۔“ چابی گھماتا ان سب کو جیسے حکم دیتا وہ باہر کی طرف بڑھاتا تھا۔

”بڑی جلدی ہے شہزادے کو۔۔۔“ زید خباثت سے ہنسا۔

”سچ یار۔۔۔ سنا تھا کہ رئیس زادے عاشق مزاج اور پیشہ پھینک ہوتے ہیں آج اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ لیا۔“ شاہد نے

مسکراتے ہوئے کہا۔

”کیونکہ مرد کی یہی شان ہے شہزادے۔۔۔“ ضیا مڑ کر دو قدم آگے آیا۔۔۔

”لیکن ایک بات یاد رہے کہ یہ سب صرف یہاں تک۔۔۔ یونیورسٹی میں تم میں سے کوئی بھی نہ تو لڑکیوں کی طرف پھٹکے گا نہ ہیا

وبا شوں کی طرح یوں بات کرے گا۔“ اس نے شہادت کی انگلی دکھاتے ہوئے ان سب کو وارن کیا۔

”یہ کیا بات ہوئی؟“ زید چڑ کر بولا۔

”میں نے کہہ دیا ناں۔۔۔“ ضیا اس کی خفگی کو خاطر میں نہ لایا۔

”کیا مطلب ضیا۔۔۔“ ابراہیم حیران ہوا۔

”وقت آنے پر مطلب بھی سمجھا دوں گا۔“ اس نے جان چھڑائی۔

”اب چلو۔۔۔“ اس نے باہر کی طرف اشارہ کیا۔ سب نے سر ہلا دیا۔

☆.....☆.....☆

حزہ اور اقرا کو وہاں آئے کافی وقت ہو چلا تھا۔ لیکن لالہ ابھی تک ان کے سامنے نہیں آئی تھی۔ حمزہ نے محسوس کیا تھا کہ ہرگز رتے

دن کے ساتھ لالہ ان سب سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ پہلے تو کبھی کبھار گفتگو ہو ہی جاتی تھی۔ لیکن اب تو وہ سامنے آنے سے بھی کترانے لگی

تھی۔ حمزہ کی تو گویا جان پر بن آئی تھی۔ اقرا تو نانو مامی کے ساتھ بھی کافی مگن رہتی۔ لالہ کی سنجیدہ طبیعت کی وجہ سے وہ خود بھی اس سے

فاصلے پر ہی رہتی۔ لیکن حمزہ کے لیے یہ فاصلے جاں گسل تھے۔

”مامی شاہ ویز کہاں ہے؟“ چائے ختم کر کے اس نے سین سے پوچھا۔

”ایک دو جگہ انٹرویو تھے اس کے۔۔۔ آتا ہی ہوگا۔“ انہوں نے بتایا۔

”اور لالہ۔۔۔؟“ جھجکتے ہوئے اس نے پوچھ ہی لیا تھا۔

”آج جلدی آگئی تھی یونیورسٹی سے کہہ رہی تھی کہ کبوتروں کا پنجرہ صاف کرے گی شاید اوپر ہی ہو۔۔۔“ اسے بتا کر وہ پھر اقرا کو

اپنے ہاتھ کے بنے کپڑوں کے نمونے دکھانے لگیں۔ حمزہ کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر اٹھ کر سیڑھیاں پھلانگتا اوپر آ گیا۔ سامنے ہی لالہ کبوتروں کو

چپکارتی دانہ ڈال رہی تھی۔ اس کی نظر حمزہ پر پڑی۔۔۔ لیکن وہ فوراً ہی رخ پھیر گئی۔

”کیسی ہو؟“ وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا اس کے قریب آ گیا۔

”ٹھیک ہوں۔“ اس نے اس کی طرف دیکھے بغیر ہی جواب دیا۔

”آج کل کیا مجھ سے پردہ کرنے لگی ہو؟“ وہ اس کے سامنے آ گیا۔

”اگر ایسا کچھ ہے تو مجھے بتا دو۔۔۔ میں خود ہی تمہارے لیے آسانی کر دوں گا۔“

”تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔۔۔ میں خود اپنا آپ چھپا تو لیتی ہوں۔“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

”انسان تب چھپ سکتا ہے جب اسے کسی کی نظریں نہ پہنچ سکیں۔“ وہ اس کے قریب ہوا۔

”تم تو میری نظروں میں اس قدر گہرا عکس پا گئی ہو کہ اور کچھ نظر ہی نہیں آتا۔“ اس کی نظروں کی سچائی پر وہ نظریں بدل گئی۔

”آج پھپھو نے یہاں آنے کی اجازت کیسے دے دی۔“ وہ بات بھی بدل گئی۔

وہ ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا۔

”اقر کو کچھ شاپنگ کرنی تھی سو چاتم سے بھی ملتا چلوں۔“ دونوں ہاتھ پینٹ کی جیب میں ڈالے وہ اسے دیکھ رہا تھا۔ سفید شیفون

کے سوٹ پر گلابی دوپٹے میں اس کی سفید رنگت مزید نکھر گئی تھی۔ وہ چاہ کر بھی اس کے چہرے سے نظریں نہیں ہٹا پارہا تھا۔

”وہ۔۔۔ مطلب گھر جا کے شاپنگ کا بہانہ بتانا ہے۔“ وہ ہنس دی۔

”میری مجبوری کا مذاق مت بنایا کرو۔۔۔“ وہ خفا ہوا۔

”تم محبت جیسے خالص جذبے کا مذاق مت بنایا کرو۔“ وہ بھی تیز لہجے میں بولی۔

حمزہ بے بسی سے لب کاٹنے لگا۔

”تم تو بنا بولے، بنا کہے میری ہر بات سمجھ لیا کرتی تھیں لالہ۔۔۔“ وہ اس کا بازو تھام کر اسے جھٹکا دیتے ہوئے بولا۔

”تو پھر اب یہ اجنبیت کیوں؟“ اس کی آنکھوں میں لالہ کو اپنا عکس صاف نظر آیا تھا، اس کے دل کو کچھ ہوا لیکن سختی سے خود کو کوئی

بھی نرمی برتنے سے روکا تھا اور ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑوایا۔

”کیونکہ میں اپنی اور اپنی ماں کی اوقات اور تمہاری اور تمہاری ماں کی مجبوریوں سے اچھی طرح واقف ہوں۔“ وہ تلخ ہوئی تھی۔

”مذہر ہاں ایک بات یاد رکھنا حمزہ علی زیدی۔۔۔ کمزوری لڑکی ہونے کے باوجود میں تمہیں کسی معاملے میں کوئی رعایت نہیں دے

سکتی۔۔۔ تمہاری ماں کے معاملے میں تو بالکل بھی نہیں۔۔۔ ویسے بھی میرا ماننا ہے جہاں عزت پر حرف آئے۔۔۔ وہاں سے ہٹ جانا ہی

بہتر ہے۔“ وہ سخت لہجے میں بولی۔

حمزہ لب پکلتا رہا۔۔۔

”اب جاؤ۔۔۔ ورنہ تمہاری ماں کو شک ہو جائے گا۔“ تلخی سے کہتی وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔۔۔ حمزہ وہیں کھڑا اسے جاتا

دیکھتا رہا۔

☆.....☆.....☆

”گاڑی ایک قدرے تاریک لیکن کشادہ گلی میں داخل ہوئی تو وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ یہ تاریکی صرف چند قدم کے فاصلے تک محدود تھی۔ دورویہ دو منزلہ عمارتوں کے درمیان پہنچتے ہی ہر طرف جیسے اجالے پھیل گئے تھے۔ نک سب سے تیار عورتیں ٹیرس پہ کھڑی آنے والوں کا جیسے استقبال کر رہی تھیں۔ ضیا کی نئی چمچاتی ہونڈا سوک دیکھ کر ان سب میں شور سا اٹھا تھا۔ کچھ نے تو باقاعدہ سیٹیاں، بجا بجا کر ان کو اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔

ذرا دور جا کر قدرے بڑے شیشے کے خوبصورت کام سے آراستہ بنگلو کے سامنے ان کی کارر کی تو چوکیدار نے فوراً گیٹ وا کر دیا۔ وہ جیسے انہی کا منتظر تھا گاڑی سے اتر کر صاف ستھری پتھریلی روش پر چلتے وہ اندرونی دروازے تک آئے تو ایک ادھیڑ عمر عورت نے ان کا استقبال کیا۔ اس نے اتنا زیادہ میک اپ کر رکھا تھا کہ ان سبھی کو اس کی شخصیت سے عجیب سی کراہیت محسوس ہوئی۔ ان پر صدقہ واری ہوتی وہ ان سب کو اوپر ایک ہال کمرے میں لے آئی۔ یہ کمرہ بے حد خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔ سرخ رنگ کا نرم مخملیں کا رپٹ اور اس پر سجائے ہی آرام دہ کیشن۔۔۔ زید نے اس عورت سے مقامی زبان میں کچھ کہا۔ اور ضیا کا ہاتھ تھامے کھڑکیوں کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔ ابراہیم اور شاہد نے بھی ان دونوں کی تقلید کی تھی۔ تبھی کمرے میں جیسے گھنٹیاں سی بجی تھیں۔ سب کی نظریں یکبارگی ہی انھیں اور سامنے بنے چھوٹے سے گول دروازے پر جھولتی۔ بجتے موتیوں کی لڑیوں پر جا کر ٹھہر گئیں ان سب کی نظروں میں حیرت اور ستائش کا ملا جلا تاثر ابھرا تھا۔ تیکھے گلابی رنگ کا فراک پہنے بڑا سا ہرا دوپٹہ سر پر سجائے ہو کوئی اپسرا تھی۔ وہ یونہی مہبوت سے اسے دیکھ گئے۔ اس کے کمرے میں آتے ہی سازندوں نے ساز چھیڑ دیئے تھے اور آداب بجالانے کے بعد وہ نازک اندام بدن تھر تھرانے لگا۔ وہ اس قدر مہارت سے کلاسیکل رقص پیش کر رہی تھی کہ وہ دم بخود اسے دیکھ جا رہے تھے۔ اس کا وجود گویا ہوا کے دوش پر لہرا رہا تھا۔ اور کبھی ایسا محسوس ہوتا کہ اس کے قدموں کے نیچے زمین نہ ہو بلکہ وہ سمندر کی لہروں پر سہج سہج کر قدم دھر رہی تھی۔

وہ چاروں مہبوت سے اسے دیکھ جا رہے تھے۔ رقا صہ کی گھاگ نظریں مسلسل رقص کے باوجود بغور ان کا جائزہ لینے میں مصروف تھیں۔ خانم نے ہی تو سمجھایا تھا اسے۔۔۔

”یہاں آنے والا ہر مرد شکار ہوتا ہے۔ اب یہ تم پہ ہے کہ کتنا اچھا شکار ڈھونڈتی ہے۔“ ڈھول کی تھاپ پہ اس نے پیر مارے تھے۔

”مرد کی آنکھیں اس کے خاندان، اس کے اسٹیٹس کا پتہ دیتی ہیں غریب ہوگا تو آنکھوں میں بھوک، ہوس ہوگی۔۔۔ امیر ہوگا تو

ستائش اور اطمینان کہ مال اس کی حیثیت سے بڑھ کر نہیں۔۔۔“ وہ ان کے قریب آچکی تھی شاہد اور زید کے لبوں پر شیطانی مسکراہٹ تھی۔ ابراہیم کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ جیسے وہ یہاں زبردستی لایا گیا تھا۔ اور ضیا اس کی آنکھوں میں ساکت سا سکون۔ اور اس ناچتی حسینہ کی تیز نظروں نے ضیا علی خان کو تاڑ لیا تھا۔ وہ ناچتے ناچتے اس کے قدموں میں بچھنے لگی۔ اس کا دوپٹہ کھسک گیا اور لمبے کالے ریشم جیسے بال ضیا کا دامن چھونے لگے، دھیرے دھیرے ناگن کی طرح بل کھاتی وہ دور ہونے لگی تو ضیا نے بڑھ کر نہایت نرمی سے اس کے بال پکڑ لیے۔ وہ ٹھٹھکی اور قدرے ناگواری سے اسے دیکھنے لگی۔ اس نے بال چھوڑ دیے۔

”ضیا میرے خیال میں چلنا چاہیے۔“ ابراہیم نے فوراً کہا۔

”تم لوگ جاؤ۔۔۔ میں یہیں رہوں گا کچھ دیر۔۔۔“ تکیے سے ٹیک لگاتے ہوئے اس نے آرام سے کہا تھا۔ وہ خاموشی سے زید اور شاہد کو اشارہ کرتے ہوئے اٹھ گیا۔ ادھیڑ عمر عورت لبوں پر مسکان سجائے اب اس کی زبان سمجھ رہی تھی۔ ضیا کی نظریں البتہ اب بھی اس پری پیکر پر جمی تھیں۔۔۔



ناول ”محبت لفظ ہے لیکن“ ابھی جاری ہے۔ اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی 10 تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

رنگارنگ کہانیوں سے سجا، خوبصورت اور دلکش

سوہنی ڈائجسٹ

SohniDigest.Com

اگر آپ بھی لکھ رہے ہیں اور اردو قارئین کی تلاش میں ہیں تو اپنی کہانیاں Inpage میں کمپوز (ٹائپ) کر کے پورے اعتماد کے ساتھ سوہنی ڈائجسٹ میں بھیجئے۔ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔

ابھی sohnidigest@gmail.com پر ای میل کریں۔

قسط نمبر 2

”ماں باپ کے سامنے بہت سوچ سمجھ کر بولا کرو کیوں کہ کبھی کبھی ان کے سامنے بولا گیا کوئی بھی بر لیا اچھا کلام ہماری پوری قسمت پہ حاوی ہو جاتا ہے۔“

”کہاں تھے تم دونوں؟“ گھر جلدی پہنچنے کی تمام تر کوششوں کے باوجود انہیں واپسی میں شام ہو گئی تھی۔ اور حسب توقع زرینہ بیگم ان کے استقبال کے لیے دروازے پر ہی موجود تھیں۔

”آپ کو بتا کر تو گئے تھے۔“ حمزہ بانیک اندر لا کر جامن کے درخت کے نیچے کھڑی کرتے ہوئے بولا۔ اقرار البتہ خاموشی سے اندر چلی گئی تھی۔ وہ بھی اندر آ گیا۔ زرینہ اس کے پیچھے تھیں۔

”یہ نہیں بتایا کہ تم لوگ نانو کے گھر بھی جاؤ گے؟“ حمزہ کے بڑھتے قدم رک گئے وہ مڑا۔

”آپ کو کس نے بتایا؟“ اس کی تیز نظریں ماں پر جمی تھیں۔

”تم جانتے ہو رضیہ میسر پرانی دوست ہے۔“ وہ نظریں چراتے ہوئے سین کی پڑوسن کا نام لیتے ہوئے بولیں۔ حمزہ کی آنکھوں میں بے یقینی سی دوڑ گئی۔

”امی۔۔۔ آپ۔۔۔ اوہ مائی گاڈ!“ بے بسی سے وہ سردونوں ہاتھوں میں تھام کر وہیں صوفے پر ڈھکے گیا۔

”ہاں تو کیوں جاتے ہو وہاں۔۔۔؟“ زرینہ بھلا کب ہار مانتی تھیں۔

”تو کیا فرق پڑتا ہے امی۔۔۔ وہ ہماری نانی کا گھر ہے، ہمارے سگے ماموں کا گھر ہے۔“ وہ غصے سے چلا اٹھا تھا۔

”فرق پڑتا ہے حمزہ۔۔۔“ انہوں نے بھی آواز دھیمی نہ کی تھی۔

”میں نہیں چاہتی کہ اماں کی طرح مجھے بھی کسی ان چاہی بہو کو قبول کرنا پڑے۔“ ان کے لہجے میں بلا کی کاٹ تھی۔

”یہ صرف آپ کی سوچ ہے امی۔۔۔ ورنہ نانو سین مامی سے بے حد محبت کرتی ہیں۔“ اس نے اٹھ کر اماں کو کندھوں سے تھام لیا۔

”یہی توجہ داتا ہے ان ماں، بیٹی کو۔۔۔ اماں کو بس میں کر رکھا ہے انہوں نے“ وہ فوراً ہی اپنی بات سے مگر گئی تھیں۔ حمزہ تا سلف سے انہیں دیکھے گیا۔

”اور پھر وہ لالہ! اُف چلتی پھرتی آفت ہے۔ اگر اس کا جادو تم پر چل گیا ناں تو گئی میں کام سے۔“ انہوں نے ہاتھ جھاڑے۔

”وہ ایسی بالکل بھی نہیں ہے۔“ وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

”اوہو۔۔۔ ہمدردی ہونے لگی ہے۔۔۔ ارے جتنی معصوم وہ دکھتی ہے ناں، ویسی ہے ہی نہیں، اپنا معاملہ خود نہ سیت کر لے تو نام بدل دینا۔“

”امی۔۔۔ پلیز۔۔۔“ تیز لہجے میں ٹوکتا وہ کمرے میں گھس گیا۔ البتہ دروازہ زور سے بند کرنا نہ بھولا تھا۔ زریہ منہ بنا کر رہ گئیں۔
”توبہ کریں امی۔۔۔ لالہ ایسی بالکل بھی نہیں ہیں۔ بلکہ ہمارے جانے پہ تو کمرے سے باہر بھی نکلتیں۔۔۔“ اقرانے فریج سے سیب نکال کر دانتوں سے کترتے ہوئے کہا تو وہ مزید چڑ گئیں۔

”یہی تو ادائیں ہیں بی بی! کہ تم لوگ اس کانٹس لو۔۔۔ حمزہ کو اپنی طرف راغب کرنے کے انداز۔۔۔ ہائے، ہائے۔۔۔“ وہ اپنے دونوں ہاتھ مسلنے لگیں۔

”کہیں میرے سینے پہ مونگ دلنے کے لیے یہیں نہ رہ جائے۔“ ان کو فکر ستائی سیب کھاتی اقرانے برا سامنہ بنایا۔
”اور تم کیا یہ ہر وقت ٹھوستی رہتی ہو۔“ ان کی نظر اقرانے پر پڑ چکی تھی۔ اس نے نظریں اٹھا کر اللہ سے مدد مانگی تھی امی اب اس کے پیچھے پڑ چکی تھیں۔

”کچھ اس منحوس سے ہی سیکھ لے۔۔۔ کچھ حلیہ ہی درست کر لیا کر۔“ ان کو فکر لاحق ہوئی۔
”اور ہاں یہ ہر وقت بھائی، بھائی کہہ کر شاہ ویز سے نہ لپٹ جایا کر۔ ایک دفعہ اس کے دل میں بہن کی صورت چڑھ آگئی ناں تو ساری عمر بہن ہی بنی رہ جائے گی۔ شاہ ویز سے اچھا لڑکا بھلا کہاں ملے گا۔ کچھ فاصلہ رکھا کر۔۔۔ تاکہ تیرے اس کتراؤ کے بارے میں سوچے۔۔۔“ زریہ نہ جانے کیا کہے جارہی تھیں۔ اقرانوں کو ہاتھ لگائے گئی اور حمزہ دل ہی دل میں ماں کی دوغلی شخصیت سے متنفر سا ہوا تھا۔

☆.....☆.....☆

سکندر اپنی بیٹی امن کے ساتھ مل کر ایک ساتھ دو تین بزنس چلا رہے تھے۔۔۔ وہ زیادہ تر آفس کا کام دیکھتے۔ سائٹ کا تقریباً سارا کام امن کے ذمے تھا۔۔۔ اسے سائٹ پر درگزر سے کام کروانے۔ صحیح مشینری کا انتخاب کرنے اور کم وسائل سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے میں کمال مہارت حاصل تھی۔

تمام نئے امپلائز میں سے قابل لوگ اس نے اپنے ساتھ رکھ لیے تھے۔ جن میں باریال ولی خان کو نمایاں مقام حاصل تھا۔ باریال نہ صرف یہ کہ بے حد ذہین تھا بلکہ اپنے کام کے ساتھ بے حد مخلص بھی۔۔۔ امن کے ساتھ، ساتھ سکندر صاحب نے بھی نوٹ کیا تھا کہ وہ وقت کی پرواہ کیے بغیر اپنے کام میں مگن رہتا، ڈیزائننگ اور انٹیریئر میں اس کا ذہن کمال کا تھا۔۔۔ کسی بھی عمارت کی کنسٹرکشن یا ڈیکوریشن میں درپیش کوئی بھی مسئلہ وہ چٹکیوں میں حل کر لیتا۔۔۔ بہت جلد اس نے سکندر اور امن کی نگاہوں میں ایک خاص مقام بنالیا تھا

امن کے ساتھ تو اس کی اچھی خاصی فرینڈ شپ ہو چکی تھی۔ اور ان دونوں کے درمیان باس اور ورکر کا رشتہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ امن ہمیشہ اسے ایک دوست کی طرح ٹریٹ کرتی۔۔۔ اور آفس سے ہٹ کر اس کی نجی زندگی میں بھی دلچسپی لینے لگی تھی۔

آفس ٹائم کے دوران ہی ایک مرتبہ باریال کو ایمبر جنسی میں گھر جانا پڑ گیا تھا کہ دیدے کی طبیعت بے حد خراب ہو گئی تھی۔ تب امن نہ صرف خود اسے گھر لے گئی بلکہ دیدے کو اسپتال بھی پہنچانے میں مدد کی۔ اور جب تک ان کی طبیعت سنبھل نہ گئی، وہ سایہ بن کر باریال کے ساتھ رہی۔ اس واقعے نے امن کی قدر باریال کے دل میں اور بھی بڑھادی۔ وہ احسان مند تھا اور امن۔۔۔ وہ جس طرح سے اپنے اور باریال کے تعلق کو سوچنے لگی تھی۔ باریال کو اس کا شائبہ تک نہیں تھا۔

☆.....☆.....☆

”یہ کہاں کی دوستی ہوئی؟ اپنے تائم تو ہمیں ساتھ لے کے گھومتا پھرے اور جب ایسی موج آئے ہاتھ تو ٹھڈا مار دے۔“ زید نے باہر آتے ہی ضیا کو گالی سے نوازا تھا۔ اس نے گلی میں پڑے ایک پتھر کو زوردار ٹھوکر رسید کی۔ پتھر اڑتا ہوا سامنے والے بنگلے کی کسی کھڑکی کا شیشہ توڑ گیا تھا۔

”جلدی بیٹھو۔“ ابراہیم ڈرائیونگ سیٹ سنبھال چکا تھا۔ فوراً چلایا اوپر سے انہیں کسی نے غلیظ گالی دی تھی۔ ان کے بیٹھتے ہی ابراہیم نے گاڑی تیزی سے آگے بڑھادی تھی۔

”میں تو خود بھی اٹھنا چاہ رہا تھا۔“ ابراہیم نے سامنے دیکھتے ہوئے سادہ لہجے میں کہا۔
 ”سچ۔۔۔ اگر ضیا سے پرانی دوستی نہ ہوتی تو کبھی اس کے ساتھ یہاں نہ آتا۔“ وہ گاڑی مین روڈ پر لے آیا تھا۔
 ”تم تو خیر بہت لکی ہو ابراہیم، تمہیں دایاں بازو مانتا ہے وہ۔“ زید رشک سے بولا تھا۔
 ”اسکول کے زمانے سے ساتھ رہا ہے ہمارا۔۔۔ اور سچ کہوں تو یہ سب ضیا کا ہی احسان ہے کہ آج میں تعلیم یافتہ ہوں۔“ وہ موٹر کاٹتے ہوئے بولا۔

”اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کی دوستی نے تمہیں بھی کچھ کم فائدہ نہیں پہنچایا۔“ ابراہیم کی بات پہ وہ دونوں خباثت سے ہنس دیے۔
 ”لیکن ایک بات پہ تو بہت حیران ہوں۔“ شاہد ہاتھ سر کے پیچھے رکھتا سیٹ پر تقریباً لیٹ گیا۔
 ”کس بات پر۔۔۔؟“ زید دو سیٹوں کے درمیان ذرا آگے ہوا۔
 ”اپنا ضیا ایسا تھا نہیں۔۔۔ اور خاص کر ایسی عورتوں کو منہ لگانے والا تو ہرگز نہیں۔“ شاہد بولا۔
 ”شراب اور شباب کی لت تو اسے اس کے بابا نے ڈال دی ہے۔“ ابراہیم نے انکشاف کیا۔
 ”وہ کیوں۔۔۔؟“ وہ حیران رہ گئے۔

”شاید ان کے اندر کوئی خوف ہے ضیا کے بارے میں۔“ ابراہیم نے اندازہ لگایا۔

”اکلوتا سپوت ہے، ڈرتے ہوں گے کسی حسینہ کے پلو سے ہی نہ بند جائے۔“ زید نے اندازہ لگایا۔

”شاید۔۔۔“ ابراہیم نے مختصر جواب دیا۔

”پھر تو یہ خوف بے معنی ہے، عشق ہوتے وقت بھلا کہاں کچھ یاد رہتا ہے۔ اسے بھی جب محبت ہوگی تب لت و ت سب بھول

جائے گا۔“ وہ دونوں قہقہہ لگا کے ہنس پڑے۔ ابراہیم دھیرے سے مسکرا دیا تھا۔

☆.....☆.....☆

”دیدے۔۔۔ میں ذرا شاہ ویز کی طرف جارہا ہوں۔ آپ دروازہ بند کر لیں۔“ بانیک کی چابیاں اٹھاتا، دیدے کو آواز دیتا وہ

باہر کی طرف بڑھا۔

”پھر تو تم کھانا بھی کھا کر آؤ گے۔“ دیدے اداس ہو گئیں۔ وہ مسکراتا ہوا ان کے قریب آ گیا۔

”آپ جانتی تو ہیں دیدے نوکری نہ ملنے کی وجہ سے پریشان ہے وہ۔ بس اسی لیے جارہا ہوں ورنہ سچ کہوں تو نوکری کے بعد

اب میں خود بھی فراغت کو ترسنے لگا ہوں۔ پھر بھی وعدہ ہے کہ وہاں کھانا نہیں کھاؤں گا۔ آپ کے ساتھ ہی آ کر کھاؤں گا۔“ اس نے ماں کو

تسلی دی۔

”شاہ ویز تو ماشاء اللہ سے گولڈ میڈلسٹ ہے ناں۔۔۔؟“ انہوں نے استفسار کیا۔

وہ اثبات میں سر ہلا گیا۔

”پھر بھی ابھی تک اسے نوکری نہیں ملی؟“ وہ حیران ہوئیں۔

”اس ملک میں ڈگری نہیں دیدے سفارش چلتی ہے۔“ وہ تلخ ہوا۔

”یہ تو ہم بندوں کے مفروضے ہیں بچے۔۔۔ ورنہ ملتا وہی ہے جو اس مالک کا حکم ہوتا ہے۔“ انہوں نے آسمان کی طرف سر اٹھا

کر کہا۔

”لیکن حق تلفیاں صرف یہیں ہوتی ہیں دیدے۔۔۔ نیچے زمین پر۔۔۔ چھوٹے سے چھوٹے عہدے سے لے کر بڑے

عہدوں تک جس کی جس قدر طاقت ہے، ہڑپ کر جاتا ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ ہضم بھی کر جاتا ہے۔“ اس کے چہرے پر طنز

مسکراہٹ پھیل گئی۔

”پتا ہے دیدے خود مجھے آفس کے منیجر نے بتایا ہے کہ میری سیٹ پر بہت نگہری سفارش تھی لیکن صرف میم امن کی وجہ سے مجھے یہ

سیٹ ملی ہے۔ کیوں کہ انہوں نے صاف کہہ دیا تھا کہ انہیں سفارشی نہیں قابل آدمی چاہیے اگر وہ اسٹینڈ نہ لیتیں تو میں ابھی تک جگہ، جگہ دھکے

کھا رہا ہوتا۔ جب تک یہ نظام تبدیل نہیں ہوتا، شاہ ویز جیسے قابل لوگوں کو ہمیشہ اسی مایوسی کا شکار رہنا پڑے گا۔“ دیدے اس بار خاموش رہیں کیوں کہ اس کی بات میں وزن تھا۔

”اچھا، تم جاؤ دیر ہو رہی ہے رات کو جلدی واپس آنے کی کوشش کرنا ورنہ دل ہولتا رہتا ہے۔“ انہوں نے باریال پہ دم کرتے ہوئے اسے ہدایت کی۔ وہ سر ہلاتا مڑ گیا۔ دیدے دروازے تک اس کے پیچھے آئیں۔

”اور کھانا وہیں کھا لینا۔ شاہ ویز خوش ہو جائے گا۔“ ان کی آواز سن کر باریال ولی خان کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ وہ دروازہ بند کی چکی تھیں۔

اس کی ماں تھی ہی ایسی۔۔۔ پروقار۔۔۔ پر خلوص۔۔۔ وفا کا پیکر۔۔۔ محنت شعار۔۔۔ جوانی میں ہی بیوگی کی چادر اوڑھ لینے کے باوجود سخت ترین حالات کا سامنا ہونے کے بعد بھی انہوں نے بہت حوصلے سے بڑی عزت اور شان والی زندگی گزاری تھی۔ بقول دیدے کے اس کے باپ نے کافی سارا زیور اور پیسہ ان کے لیے چھوڑا تھا جو ان دونوں کے لیے کافی تھا۔ باری یہ سب جانتا تھا لیکن پھر بھی انہوں نے یہ سرمایہ محفوظ کر رکھا تھا، باریال کے لیے۔۔۔ اپنی گزر بسر کے لیے انہوں نے ایک پرائیویٹ سکول میں جاب کر لی تھی۔ تنخواہ میں ان دونوں کا گزرا رہ آسانی ہو جاتا تھا۔ سرٹیفکیٹ سے ملنے والا منافع بھی وہ کمیٹیوں میں استعمال کر کے جمع کرتیں۔ اور کچھ رقم جمع ہوتے ہی نئے سرٹیفکیٹ بنوا لیتیں۔

باریال کی تعلیم کے بعد تو اس کی نوکری کے بھی خلاف تھیں۔۔۔ وہ چاہتی تھیں کہ باریال اپنا ہی کوئی بزنس شروع کر دے۔ لیکن وہ نئے دور کے تقاضوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ پہلے کسی اچھے پروجیکٹ میں کام کر کے تجربہ حاصل کر لے، کاروبار کیا اونچ نیچ سمجھ لے تبھی کہیں اپنا مال انویسٹ کرے۔۔۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ جلد بازی یا کم عقلی سے کسی بھی قسم کا نقصان اٹھائے اور جنت بی بی اس بات پہ متفق بھی ہو گئی تھیں۔

جاب اچھی تھی سیلری ٹیکج بھی اچھا تھا۔ لیکن اس جاب میں سب سے بڑی خوشی باریال کو یہ تھی کہ اسے آفس اور سائٹ دونوں جگہ کام سنبھالنے کا موقع ملا تھا۔ اور اس طرح کے کنسٹرکشن اور میٹنگ کے حوالے سے بہت سے اہم نکات وہ بہت جلدی سمجھ گیا تھا۔ اب وہ دن زیادہ دور نہیں تھا جب وہ بہت جلد اپنے کواب کی بنیاد رکھ دیتا، دنیا کے سب سے سستے اور معیاری ہوٹل بنانے کا خواب۔۔۔ جہاں سب کو یکساں سہولت ملے۔ اور اسے یقین تھا کہ منزل اب زیادہ دور نہیں تھی۔

☆.....☆.....☆

”سبین، بات سنو بیٹا۔۔۔“ وہ عصر کی نماز پڑھ کر فارغ ہوئیں تو اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑی اماں نے پکار لیا، وہ سیدھی ان کی طرف آ گئیں۔

”جی اماں۔۔۔“

”ادھر آؤ۔۔۔ میری بات سنو۔۔۔“ ان کو ہاتھ سے پکڑ کر وہ اندر لے آئیں۔

”بیٹھو ادھر۔۔۔“ اپنے بستر پر بیٹھاتے ہوئے وہ ادھر ادھر دیکھنے لگیں۔

”کیا ہوا ہے اماں۔۔۔؟“ سین الجھ گئی۔

”ابھی رضیہ آئی تھی ناں۔۔۔“ انہوں نے اپنی پڑوسن کا کہا۔

”خالہ رضیہ۔۔۔؟“

”ہاں ایک دو رشتوں کا بتا رہی تھی اپنی لالہ کے لیے۔“ اماں بتانے لگیں۔ نہ جانے کیوں سین کا چہرہ بجھ سا گیا۔

”خاندانی لوگ ہیں، لڑکے بھی اچھی پوسٹوں پر ہیں۔“

”لیکن اماں۔۔۔“

”لیکن ویکن کیا سین۔۔۔ سچ کہوں تو زینہ کے رویے نے میرا دل توڑ دیا ہے۔“ وہ تاسف سے کہتی تنکیے سے ٹیک لگا گئیں۔

خود بخود سین کی آنکھیں جھک گئیں۔ جیسے یہ سب ان کا ہی قصور ہو۔

”تم کیوں نظریں جھکاتی ہو۔“ اماں نے ہاتھوں کا پیالہ بنا کر ان کا چہرہ اس پیالے میں بھر لیا۔

سین ان کے بیٹے ارتضیٰ کی محبت تھی، کتنا مان، کتنی محبت دی تھی اس نے سین کو۔۔۔ بے شک سین نے اپنے گھر سے بھاگ کر

ارتضیٰ کے لیے سب کچھ چھوڑ دیا تھا۔ لیکن وہ گواہ تھیں کہ ان کے بہو، بیٹے نے کوئی غلط اقدام نہ اٹھایا تھا۔ شریعت کے تمام اصولوں کے

مطابق عزت سے ایک دوسرے کو اپنایا تھا۔

”ارتضیٰ ہوتا تو تب میں دیکھتی زینہ کیسے کوئی بات کرتی ہے تیرے بارے میں۔۔۔ میں تو ماں ہوں۔۔۔ مجبور ہو جاتی ہوں

خاموش رہنے پر۔“ وہ شرمندہ تھیں۔

”ارے نہیں اماں۔۔۔“ انہوں نے فوراً اماں کے ہاتھ تھام لیے۔

”مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ زینہ کیا کہتی ہے، آپ ارتضیٰ، شاہ ویز اور لالہ کے بعد مجھے کسی اور رشتے سے کوئی مطلب رہا ہی

نہیں۔۔۔ لیکن۔“ وہ کچھ سوچنے لگیں۔

”لیکن کیا؟“

”بات لالہ کی ہے اماں۔۔۔ ابھی تو حمزہ کے متعلق آپ کی طرف سے کی گئی رشتے والی بات پر ہی غصہ ہے، ایسے میں ان نئے

لوگوں کے متعلق کوئی بھی بات اسے اور نہ بھڑکا دے۔“ وہ الجھ سی گئی تھیں۔

”تم اس کی فکر نہ کرو۔۔۔ اسے میں سمجھا لوں گی۔ ویسے بھی میری بات نہیں ٹالے گی وہ۔۔۔ تم دیکھ لینا۔“ انہوں نے پر اعتماد لہجے میں کہا۔

”دیکھ لیں آپ۔۔۔ میں تو بس یہ چاہتی ہوں میری بیٹی خوش رہے۔“
 ”آمین۔۔۔ آمین۔۔۔“ اماں نے فوراً ہاتھ کھڑے کر دیے تھے دعا کے لیے۔ سین دھیرے سے مسکرا دی تھی۔

☆.....☆.....☆

یہ کمرہ بے حد کشادہ تھا جہازی سائز بیڈ پر تازہ پھولوں کی پیتیاں اس کی سانسیں مہکائے دے رہی تھیں، عجیب سی مدہوشی ذہن پر چھائی جا رہی تھی۔ نہ جانے یہ کمرے کے خوبصورت ع معطر ماحول کا اثر تھا یا اس مشروب کا جو اسے یہاں آتے ہی نوازا گیا تھا۔ تبھی ایک طرف لگی موتیوں کی لڑیاں گنگنائیں۔ اس نے چونک کر سامنے دیکھا۔ وہ وہی اسپر ا تھی لیکن اس وقت وہ سلک کے پھسلنے ریشمی لباس میں ملبوس تھی جو مکمل طور پر سادہ تھا چہرہ میک اپ سے عاری تھا۔ وہ دھیرے دھیرے چلتی اس کے قریب ہی آ کر بستر پر بیٹھ گئی۔ ضیا کی نگاہیں اس کی کشادہ پیشانی سے ہوتیں اس کے عنابی لبوں پر آٹھہریں۔

”کیا نام ہے تمہارا؟“ اس کے لبوں کو تکتے اس نے سوال کیا تھا۔

”زمرہ۔۔۔“ ننھا سا گلابی دہانہ ذرا سا وا ہوا اور عنابی لب دوبارہ سے ایک دوسرے سے جڑ گئے۔

”کہاں کی ہو؟“ اس کی خوبصورت کالی آنکھوں میں حیرت جاگی تھی لیکن ضیا کی آنکھیں ابھی تک اس کے لبوں پر جمی تھیں ایسے ہی لب اس نے کہیں دیکھے تھے۔۔۔ لیکن کہاں کب اسے یاد نہیں آ رہا تھا۔

”یہاں سے دور ایک گاؤں ہے وہاں سے آئی ہوں۔“ اس نے گاؤں کا نام بتا کر جواب دیا۔ اور لمبے بالوں کی ایک لٹ نکال کر اسے انگلی پر پلینے لگی۔

”باپ نے بیچا؟“ ضیا کی آواز میں تاسف ابھرا۔۔۔ وہ چونکی پھر اس کی آنکھوں میں خشکی اتر آئی۔

”باپ بھی کبھی بیچا سکتا ہے۔“

”اس دنیا میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“ وہ مسکرایا اور بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائی۔

”مثلاً۔۔۔“

”جیسے تم یہاں آ گئی ہو۔ ورنہ تم نے کبھی سوچا ہوگا بھلا۔۔۔؟“ اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔۔۔ اس بار زمرہ خاموش رہی۔

”اور جیسے میں۔۔۔ ضیا علی خان۔۔۔ صرف ایک رات کے تعلق کے لیے اتنے پیسے اڑا کر تمہارے پاس بیٹھا ہوں۔۔۔“

دونوں ہاتھ سر کے پیچھے رکھتے ہوئے وہ شرارت سے بولا تھا۔ نہ جانے کیوں سر چکرانے لگا تھا۔

”کم از کم میں نے تو کبھی نہیں سوچا تھا۔“

”کیا مطلب۔۔۔“ زمزمہ کی آنکھوں میں حیرانی ابھری۔

”مطلب یہ کہ میں ایسے تعلقات پر یقین نہیں رکھتا۔“ اس نے صاف گوئی سے کہا۔

”تو پھر تم نے اتنے پیسے کیوں ضائع کیے؟“ اسے ضیا کے لیے اتنا افسوس ہو رہا تھا کہ وہ خود بھی حیران تھی۔ کیوں کہ وہ اب جس جگہ سے تعلق رکھتی تھی وہاں صرف پیسہ اہمیت رکھتا تھا۔ احساسات اور جزبات یہاں کبھی سانس نہ لیتے تھے۔ تو اسے ضیا کے اس نقصان پر افسوس ہونا۔۔۔ واقعی اچھنبے کی بات تھی۔

”تمہارے لبوں کی وجہ سے۔“ ضیا کی بات پر وہ ہتھکڑی لگا کر ہنس دی تھی۔

”سچ کہہ رہا ہوں۔“ اسے برا لگا۔

”مطلب تم جس سے محبت کرتے ہو اس کے ہونٹ میرے لبوں سے ملتے ہیں۔“

”محبت۔۔۔“ وہ چونک کر سیدھا ہوا۔

”ہاں۔۔۔ اتنی ٹرپ سے تو یہی ظاہر ہے۔“ زمزمہ نے کندھے اچکائے۔

”نہیں“ ضیا نے نفی میں سر ہلایا۔

”ایسی کوئی بات نہیں۔۔۔ بلکہ میں تو یاد بھی نہیں کر پا رہا کہ ایسے ہی لب میں نے دیکھے کہاں ہیں؟“

”تم پاگل ہو۔“ زمزمہ کو وہ پاگل ہی لگا۔

”شاید۔۔۔“ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ لہجہ بھی لڑکھڑانے لگا تھا۔

”اگر ایسی جگہ پہ نہیں آتے تو ڈرنک بھی نہ کرتے۔“ وہ کمرے میں رکھے فریج سے اس کے لیے لیمن جوس نکالتے ہوئے بات

بدل گئی۔

”مجھے یقین تھا، یہ مجھے نشہ نہیں دے پائے گی۔“ وہ پھر سے ٹیک لگا گیا۔ زمزمہ نے گلاس اس کی طرف بڑھایا۔

”کچھ شراہیں اور حسن بہت خاص ہوتے ہیں، مدہوش کر ہی دیتے ہیں۔“ ضیا نے دھیرے سے گلاس تھام لیا تھا۔ وہ مرنے لگی

کے ضیا نے ہاتھ تھام لیا۔

”یہاں بیٹھو۔۔۔ میں تمہیں یونہی کچھ دیر اپنے قریب محسوس کرنا چاہتا ہوں۔“ وہ چپ چاپ بیٹھ گئی ضیا جوس پینے لگا۔

”جس کی ایک جھلک نے تمہیں اس قدر دیوانہ بنا دیا ہے خان! اس کی قربت تو تمہیں مار ہی دے گی۔“ اسے پھر سے اپنے لبوں

کو تکتا دیکھ کر وہ دھیرے سے مسکرائی تھی۔

”ضیاعلی خان مٹنے کے لیے نہیں مٹانے کے لیے پیدا ہوا ہے۔“ اس نے زمزمہ کی نازک کلائی اس قدر مضبوطی سے پکڑی کہ وہ کراہ اٹھی۔

”خان، چھوڑو۔۔۔“ اس کی موٹی کالی آنکھیں پانیوں سے بھر گئیں۔ ضیاعلی نے فوراً ہی اس کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔ اور اسکے بیڈ کو چھوتے کالے ریشمی بال ہاتھوں میں لے لیے تھے۔

”مجھے لگا تم لوگوں کو درس سننے کی عادت ہوگی۔“

وہ پہلی مرتبہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بات کر رہا تھا۔ زمزمہ نے آنکھوں میں بھر آنے والے آنسوؤں کو بہہ جانے دیا تھا۔

”ہمیں درد محسوس ہی نہیں ہوتا۔۔۔ لیکن آج نہ جانے کیوں پھر لگا کسی اپنے نے درد دیا ہو جیسے۔“ ضیاعلی کی آنکھوں میں دیکھتی وہ

بکھری گئی۔ بلا ارادہ ہی ضیاعلی اس کے گالوں پر لڑھکتا وہ موتی اپنی پوروں پر چن لیا تھا۔ اور پھر فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

”میں چلوں گا۔“ اٹھتے ہوئے وہ ذرا سا لڑھکھڑایا۔ زمزمہ نے تیزی سے اسے بازوؤں سے پکڑ کر سنبھالا دیا تھا۔

”ابھی مت جاؤ خان۔۔۔ طبعیت سنبھل جائے تو۔۔۔“ ضیاعلی نے ہاتھ اٹھا کر جیسے اسے مزید بولنے سے منع کیا تھا۔ پھر جیب

سے والٹ نکال کر چند نیلے نوٹ زمزمہ کے قدموں میں اڑائے تھے۔ اور مڑ کر باہر نکل گیا تھا۔

”خان۔۔۔!“ اس کی آواز گلے میں ہی دم توڑ گئی۔

☆.....☆.....☆

شاہ ویز کے گھر سے نکلتے، نکلتے اسے واقعی دیر ہو گئی تھی۔ رات کے بارہ سے بھی اوپر کا ٹائم ہو چلا تھا۔ اسے یقین تھا دیدے اس کے انتظار میں ابھی تک جاگ رہی ہوں گی۔ تبھی اس کی بایک ہوا سے باتیں کر رہی تھی۔ مین سڑک سے ذیلی سڑک پر موڑ کاٹتے ہوئے

بھی اس نے بایک کی رفتار کم نہ کی تھی اور اگلے ہی لمحے اسے اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہوا تھا۔ صرف چند قدم کے فاصلے پر پڑا بے حس

و حرکت وجود دیکھ کر اس نے تیزی سے بریک لگا لی تھی۔ جس قدر تیزی سے بریک لگی تھی اسی قدر شدت سے اس کی بایک ہوا میں اچھلی تھی

۔ اس نے ہینڈل چھوڑ دیے تھے۔ ذرا دیر ہوا میں رہنے کے بعد وہ زور سے سڑک کے کنارے اگی خود رو جھاڑیوں میں جا گرا تھا۔ موٹر

سائیکل بھی کچھ فاصلے پر جھاڑ جھنکار سے الجھ کر سڑک کے نیچے جانے سے بچ گئی تھی۔ درد کی تیز لہر نے اس کے وجود کو اپنے حصار میں لیا تھا۔

ایک درخت کا سہارا لے کر کپڑے جھاڑتے ہوئے وہ اٹھا اور پھر اچانک یاد آتے ہی وہ تیزی سے اس بے جان وجود کے پاس آیا تھا۔

تمبیس، چوبیس کی عمر کا وہ لڑکا ہوش و خرد سے مکمل طور پر بیگانہ تھا۔ اس کے چہرے اور بازوؤں پر ہلکی چوٹوں کے نشان تھے۔ آج

کل شہر میں لوٹ مار کی وارداتیں بڑھ گئی تھیں۔ لمحے کے ہزارویں حصے میں وہ سمجھ گیا تھا کہ مین روڈ پر ضرور اس کی کسی بد معاش گروپ سے

جھڑپ ہوئی ہوگی۔ وہ اسے لوٹنا چاہ رہے ہوں گے اور اس کی مزاحمت پہ وہ اسے مار پیٹ کے یہاں پھینک گئے ہوں گے۔

لڑکا کسی اچھے خاندان سے لگ رہا تھا۔ چاند کی روشنی میں اس کا قیمتی لباس اور اس کا بھرا، بھرا چہرہ اور صحت مند وجود اسے کسی امیر فیملی کا سپوت ظاہر کر رہا تھا۔ باریال نے چند پل اس کا چہرہ تھپتھپایا، وہ ذرا کسمسایا پھر آنکھیں موند گیا۔ باریال نے دیکھا اسے کوئی سیریس چوٹ نہیں لگی تھی۔ پھر بھی نہ جانے کیوں وہ اٹھ نہیں پارہا تھا۔ باریال نے اسے ذرا سائیڈ پر کیا۔ پھر اپنی باینک کھڑی کی اور سڑک سے ذرا نیچے کنارے پر بنی چھوٹی سی نالی جو شاید قریبی کھیتوں میں پانی پہنچانے کے کام آتی تھی میں سے پانی ہاتھ کی مٹھی میں بھر کر اس نوجوان کے چہرے پر ڈالنے لگا۔ ذرا سی کوشش کے بعد اس لڑکے نے آنکھیں کھول دی تھیں۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

”امیر طبقے کی بگڑی ہوئی اولاد۔۔۔“ ایک پل میں باریال کی سوچ اس کے متعلق بدل چکی تھی۔

”اگر تمہارا گھر یہیں قریب ہے تو میں تمہیں چھوڑ سکتا ہوں وہاں تک۔“ اس کے لہجے میں اب متوقع نرمی مفقود تھی۔

”یہیں قریب ہی فارم ہاؤس ہے میرا۔“ اس نے لڑکھڑاتے لہجے میں جواب دیا۔

”اتنی زیادہ پی رکھی تھی تو گھر سے باہر نہ نکلتے۔“

”وہ اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے جھوٹ بول گیا۔۔۔ کیوں؟ خود بھی نہیں جانتا تھا۔“

”حیرت ہے حالت تو انہی جیسی ہی ہے۔“

باریال اس کی مدد کرنے لگا۔

”ٹیکسی سے آ رہا تھا نہ جانے انہوں نے کیا کھلا دیا، لگتا ہے سب لوٹ کر لے گئے۔“ اب وہ اپنی جینز کی پائٹیں ٹٹول رہا تھا۔

”سب توقع سب جیسا خالی تھیں۔“

”چلو تمہیں فارم ہاؤس تک چھوڑ دوں۔“ باریال باینک پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

”شکریہ۔۔۔“ وہ بے جھک اس کے پیچھے بیٹھ گیا۔ باینک درست حالت میں تھی بس کئی جگہوں سے رگڑ کھائی تھی۔

”ویسے تمہاری قسمت اچھی تھی ورنہ میں یہ شارٹ کٹ کبھی نہیں لیتا۔ ہمیشہ مین روڈ سے جاتا ہوں۔“ باینک اشارت کرتے ہوئے باریال مسکرایا۔

”قسمت تو آج خراب تھی میری، ورنہ میں بھی کبھی اس طرح ٹیکسیوں میں سفر نہیں کرتا۔“ اس کے سر میں شدید درد ہو رہا تھا اس نے سر باریال کے کندھے پر رکھ دیا۔

”خیال سے بیٹھو، اب نیچے گر گئے تو میں نہیں سنبھال پاؤں گا۔“ باریال کندھے پر اس کے سر کا بوجھ محسوس کرتے ہوئے دوستانہ لہجے میں بولا۔

”بس یہ لیفٹ والی پکی سڑکی۔۔۔“ مین روڈ سے کافی آگے جا کر اس نے باریال کو مخاطب کیا تھا۔ اس نے باینک موڑ دی تھی۔

”آج رات یہاں رک جاؤ اس طرف راستہ ویسے بھی سنسان ہے۔ کہیں تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔“ بڑے پھاٹک کے سامنے بایک رکتے ہی اس نے اتر کر بار پال کو آفر کی تھی۔

”نہیں، میری ماں میرا انتظار کر رہی ہوگی۔“ مسکرا کر کہتے اس نے بایک واپس موڑ لی تھی۔

نہ کوئی تعارف ہوا نہ کوئی اہم بات۔۔۔ پھر بھی نہ جانے کیوں وہ شخص ضیاء علی خان کو بے حد اپنا سا لگا تھا۔۔۔ وہ دیر تک اس کی بایک کی گرد کو تکتا رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

ہمیشہ جس بات سے ان کو ڈر لگتا تھا وہی ہو جاتی تھی۔ آج بھی بالکل ویسا ہوا تھا۔ جیسا ہونے کا ان کو ڈر تھا۔ دادی نے لالہ کے رشتے کے لیے جس فیملی کو مدعو کیا تھا۔ ان میں سے ایک عورت ان کے پرانے گھر کی ہمسائی نکلی۔۔۔ اور سب کے سامنے اس نے سین اور ارضی کی ڈرامائی شادی کے متعلق سب کچھ بیان کر دیا۔ ان کی ذومعنی باتیں سن کر دادی انہیں خود ہی منع کر کے جانے کا کہنے والی تھیں لیکن کیا کیجئے کرموں کا کہ اسی وقت لالہ بھی اس دن جلدی چھٹی لے کر گھر آ گئی۔ اور بالکل اتفاقیہ طور پر نہ صرف گھر آئے مہمانوں کی زیارت ہو گئی بلکہ دادی اور ان کے کڑوے کیسلے جملوں کا تبادلہ بھی۔۔۔ اور اب ان سب کے جانے کے بعد اس نے ایک طوفان مچا رکھا تھا۔ میز پر دھرا کھانے کا سارا سامان زمین بوس ہو چکا تھا۔ کراکری کے نئے سیٹ شور مچاتے کرچیوں کی صورت یہاں وہاں بکھرے پڑے تھے۔ دادی چپ کا دامن تھامے کمرے میں جا گھسی تھیں۔ اور اب لالہ کے غصے کی توپ کا رخ براہ راست ماں کی طرف تھا۔

”جب تک آپ اپنا یا میرا مذاق نہ بنوالیں، آپ کو چین کیوں نہیں پڑتا امی۔۔۔“ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ماں کو بازوؤں سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالے۔

”اس میں میری کیا غلطی لالہ؟“ وہ بے بسی سے اسے دیکھتی رہ گئیں۔

”غلطی۔۔۔ کیا غلطی ہے آپ کی۔۔۔ ابھی آپ یہ بھی مجھ سے پوچھ رہی ہیں؟“ اسے اور غصہ آیا۔

”لالہ بچے اتنا غصہ کیوں کرتی ہو تم؟“ وہ اس کے قریب آ کے اس کے ہاتھ تھام گئیں لالہ نے ایک جھٹکے سے ان کے ہاتھوں سے اپنے ہاتھ چھڑا لیے تھے۔

”کیوں کہ صرف یہ غصہ ہی میرے اختیار میں ہے۔ خود کشی حلال ہوتی تو شاید وہی کر لیتی۔“ اس نے ہاتھ کی پشت سے سختی سے گالوں پر لڑھکتے آنسو گر کر مٹا ڈالے، سین ساکت سی اسے دیکھ گئیں۔

یہ ان کی لالہ تو نہ تھی، ان کی لالہ میں تو ان کی جان تھی، کم گو، بے حد نفیس اور نرس مکھسی لالہ۔۔۔ لیکن ارضی کی موت کے بعد جیسے زرینہ اور خاندان والوں نے نظریں پھیری تھیں۔ لفظوں کے تیروں سے ان کے وجود کو چھلنی کیا تھا، تب سے ان کی لالہ بھی کہیں کھو گئی تھی، حد تو

یہ تھی کہ اسے ماں کہ آنسو نظر نہ آتے تھے۔ صرف لوگوں کے طعنے اور رویے وہ محسوس کر لیتی تھی۔ اور رفتہ رفتہ ان سے کتنی دور ہوتی جا رہی تھی۔

”میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں امی۔۔۔ یوں لوگوں کو گھر میں بلا کر میری انسٹل نہ کروایا کریں۔“ وہ رو دی۔

”ان کی زبانی مجھے بار بار یہ باور نہ کرایا کریں کہ میں ایک گھر سے بھاگی ہوئی عورت کی بیٹی ہوں۔“ اس کی ہچکیاں بندھنے لگیں۔ سین کو لگا ان کی ٹانگیں ان کا ساتھ چھوڑ گئیں۔ وہ وہی پاس رکھی کرسی پر ڈھسے سی گئیں۔

”اگر آپ کو میری طرف سے کوئی فکر ہے ناں!“ وہ ایک دم تیز لہجے میں کہتی ہوئی ان کے قریب آئی۔

”کہ میں بھی کہیں آپ کی طرح کوئی ایسا ویسا قدم نہ اٹھا لوں۔“ سین کا دل کٹنے لگا۔

”تو بے فکر رہیے۔۔۔ لیکن پلیرز آئندہ کسی بھی ایسے ڈرامے کا اہتمام ہو ناں اس گھر میں۔۔۔ تو میں قسم کھاتی ہوں میں خود کو ختم کر لوں گی۔“ چلا کر کہتے ہوئے وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

سین کے دل میں اٹھنے والی ددر کی تیز لہر کس قدر شدید تھی۔۔۔ لیکن وہ ہاتھ سے سینہ مسلتے ہوئے دوبارہ خاموشی سے کام میں لگ گئی تھیں۔ کھڑکی سے جھانکتی دادی کی آنکھیں بھگینے لگی تھیں۔

☆.....☆.....☆

”تم نے مجھے اتنی ایمر جنسی میں کیوں بلایا؟“ اقرار کے بانیک پر بیٹھتے ہی اس نے سوال کیا۔

”کالج کے پیچھے نہر پر چلو پھر سب بتاتی ہوں۔“ وہ بے فکری سے چیونگم چباتے ہوئے بولی۔ آغا نے موٹر سائیکل آگے بڑھادی۔

کچھ دیر بعد ہی وہ پانچے اوپر کیے نہر کے ٹھنڈے پانی میں پاؤں ڈبوئے بیٹھی تھی۔ جامن کے قد آور درخت سے ٹیک لگائے آغا نے کچھ دیر سینے پر ہاتھ باندھے خاموشی سے اس کے بولنے کا انتظار کیا تھا پھر خود ہی بول پڑا۔

”اب کچھ بولو گی بھی۔۔۔ یا کینک منانے آئی ہو۔“ اس کے لہجے میں بیزاری تھی۔

”بتاتی ہوں اتنا چڑکیوں رہے ہو؟“ اقرار نے چیونگم چباتے ہوئے اسے گھورا تھا۔

”ہاں تو چڑچڑانہ ہوں تو اور کیا کروں۔۔۔“ وہ آستین چڑھاتا اس کے قریب ہی ہری گھاس پر بیٹھ گیا۔

”سارا دن نوکری کی تلاش میں ادھر ادھر دکھے کھاؤ اور پھر میڈم کا فون آئے تو بھاگتے آؤ ورنہ پھر ان کے مزاج ہی نہیں ملتے۔“

وہ اب اسے چڑا رہا تھا۔

”تم جانتے ہو ہمیشہ تمہی بلاتے ہو، میں نے پہلی بار بلایا ہے۔“ وہ بھلا کہاں ہارنے والی تھی فوراً منہ بناتے ہوئے جواب دیا۔

”اب بات بھی کر لو میں نے پھر ضروری کام سے جانا ہے۔“

”تو بے آغا۔۔۔ ہوا کے گھوڑے پر سوار رہتے ہو۔“ وہ خفا ہوئی۔

”اچھا، خفا تو نہ ہو، آغا نے اس کام میں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

”اماں ناں میرے اور شاہ وزیر بھائی کے متعلق سوچنے لگی ہیں۔“ آغا کے کھامے ہاتھ میں پہنے بریسلٹ سے کھیلنے ہوئے اس نے کہا۔
”کیا سوچنے لگی ہیں۔“ وہ ناتجہی سے بولا۔

”ان کے اور میرے رشتے کے بارے میں۔۔۔ اور کیا؟“ آغا کے ہاتھ سے ایک دم ہی اس کا ہاتھ چھوٹ گیا۔

”تم نے کیا کہا؟“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

”میں نے ابھی تو کچھ نہیں کہا لیکن تم جانتے ہو میرا جواب کیا ہوگا، وہ دلکشی سے مسکرائی۔

”اور اگر وہ نہ مانیں تو۔۔۔؟“ اس کا دل نہ جانے کیوں دھڑک سا اٹھا تھا۔

”تو تم جانتے ہو میں نے صرف دو کام کرنے ہیں۔“

”وہ کیا۔۔۔؟“ اس نے پوچھا

”یا تیرے ساتھ بھاگ جاؤں گی یا۔۔۔“

وہ اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”یا زہر کھالوں گی۔“ اس کے لہجے میں سچائی تھی۔ وہ تم سے تو پر آگئی

”میری خاطر اتنا سب چھوڑ دے گی۔“ وہ حیرانی سے مسکرایا

”تمہیں پابھی تولوں گی ناں۔۔۔“

”اچھا زیادہ ہیر و من نہ بن۔ تیری اماں، بھائی کو پتا چل گیا ناں تو لگ پتا جائے گا، اس ٹائم پوچھوں گا۔“ آغا نے مذاق اڑایا۔

”تو کیا پوچھے گا۔ میں خود بتا دوں گی۔“ اس نے بھی دونوں ہاتھ جھاڑے۔

”آغا تو اپنی ماں کو بھیج ناں۔۔۔“ اقرار کو اچانک ہی خیال آیا۔

”کوئی فائدہ نہیں یار۔۔۔ خالہ نے فوراً انکار کر دینا ہے۔ دعا کر کوئی اچھی نوکری مل جائے تب شاید بات بن جائے۔“

”آمین۔۔۔ میری تو یہی دعا ہے کہ کم از کم شاہ وزیر بھائی سے پہلے تجھے نوکری مل جائے کیونکہ پھر اماں ضرور کوئی نہ کوئی مسئلہ کھڑا

کر دے گی میرے لیے، وہ پریشان سی ہو گئی۔

”اچھا تو پریشان نہ ہو۔۔۔ اب چل تجھے کالج کے گیٹ تک چھوڑ دوں۔ تیرا بھائی پہلے آ گیا ناں تو بہت مسئلہ ہو جائے گا۔

”ہاں صحیح ہے۔“ اقرار نے بھی تائید کی اور دونوں بانیک کی طرف بڑھ گئے۔

☆.....☆.....☆

”میں سوچ رہی تھی تمہیں اب آفس کی طرف سے گاڑی مل جانی چاہے۔“ وہ سائٹ سے آفس واپس آئے تو اسے اپنی بائیک کی طرف واپس جاتا دیکھ کر اس نے کہا۔

”میرے خیال میں تو ابھی بائیک ہی صحیح ہے۔“ وہ مسکرایا
 ”ہاں لیکن پھر بھی۔۔۔ سائٹ وغیرہ پر جانے کے لیے کافی مسئلہ ہو جاتا ہے نا۔۔۔“
 ”آفس کی اتنی گاڑیاں ہیں، کہیں بھی کام پہ جانے کے لیے ہر وقت تیار ہوتی ہیں، ایسا بھی کوئی ایشیو نہیں۔“ سفید شرٹ اور بلیک پیئٹ میں اس کی ملائی سی رنگت کچھ مزید نکھر گئی تھی۔

”اگر کوئی شخصیت سحر کر سکتی ہے پہلی ہی نظر میں ختم کر سکتی ہے تو وہ واقعی باریال ولی خان کی شخصیت ہے“ باریال کی طرف دیکھتے ہوئے امن نے خود سے دل میں اعتراف کیا تھا۔

”میرے خیال میں مجھے چلنا چاہیے۔“ اس کی طویل خاموشی پہ وہ ذرا اونچی آواز میں بولا۔ امن چونک گئی۔
 ”میں پھر بابا سے بات کرتی ہوں۔“ امن کے کہنے پر وہ سر نفی میں ہلا گیا۔
 ”میں نے کہا ناں ضرورت نہیں ہے۔“

”اچھا ہے ناں۔۔۔ گاڑی ہوگی تو کبھی کبھی مجھے بھی ڈراپ کر دو گے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی
 "you can drive"

”پھر بھی کبھی کبھی دل کرتا ہے کوئی ایسا دوست بھی ہوناں جو ڈرائیو کرے اور ہم مزے سے گانے سنیں۔۔۔“ اس کی بات پہ باریال نے قہقہہ لگایا۔

”یہ کام تو پھر میری بائیک بھی کر سکتی ہے گاڑی کی کیا ضرورت ہے۔“ اس نے آفر کی۔
 ”مطلب تم آج اپنی بائیک پہ مجھے گھر چھوڑنے کے لئے تیار ہو۔“ وہ اچھلی
 ”بالکل!“ وہ بائیک پر بیٹھتے ہوئے بولا
 ”لیکن آہستہ چلاؤ گئے۔“ وہ بے حد خوش تھی۔
 ”وعدہ۔۔۔“

امن اس کے پیچھے بیٹھ گئی۔ اس نے ایک ہاتھ باریال کے کندھے پر رکھ دیا۔
 ”چلیں۔“ باریال نے پوچھا۔

”لیں۔۔۔“ اس نے سرخوشی سے جواب دیا۔ اور اس دن امن کو احساس ہوا تھا کہ ہواؤں میں اڑنا دراصل کسے کہتے ہیں۔ وہ

بے حد خوش تھی۔۔۔ بے انتہا خوش۔۔۔

☆.....☆.....☆

”خان، آج ساتھ والے قبیلے کے لوگوں کے کچھ ڈنگر (جانور) ہمارے کھیتوں میں آگئے گھسے تھے۔“ بید کی چھڑی گھماتے سہرا بعلی خان کے ہاتھ ایک دم رک سے گئے تھے۔

”نقصان ہوا؟“ بھاری لہجے میں پوچھا گیا۔

”جی خان۔۔۔ خاصی فصل خراب کر دیا ہے۔ لیکن ساتھ والے گاؤں کے لوگ جرمانہ بھرنے کا کہہ رہے ہیں۔“ منشی علمدار نے بتایا۔

”انہیں کہہ دو۔۔۔ ہمیں جرمانہ نہیں چاہیے۔“

”جی خان۔۔۔“ منشی حکم ملتے ہی سلام کرتا چلا گیا۔

”شاہ سوار۔۔۔“ وہی بھاری آواز گونجی

”جی حضور۔۔۔“ ایک تو تنومند سا آدمی فوراً آگے کوچکا۔

”جانتے ہوناں حویلی کے اصول۔۔۔؟“

”جی خان۔۔۔“ وہ مودب لہجے میں بولا۔

”کان کے بدلے کان عزت کے بدلے عزت۔۔۔“ خان نے چھڑی گھمائی۔

”فصل کے بدلے فصل، خان۔۔۔“ شاہ سوار کے چہرے پر خبیث سی مسکراہٹ رہ گئی۔

”آگ لگا دو کھڑی فصلوں کو۔۔۔ اور خیال رہے کوئی بندہ نظر میں نہ آئے۔“ انہوں نے ہدایت کی۔

”جی خان۔۔۔“ وہ سر ہلا گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

وہ تھا ہی اتنا پروقار اور ساحر شخصیت کا مالک کے جو دیکھتا مڑ کر ایک بار ضرور دوبارہ دیکھتا۔۔۔ اس کی چال میں شیر جیسا دبہ

تھا۔ جیسے دنیا کو فتح کرنے نکلا ہو۔ سفید شلوار قمیض پر کندھوں پر ڈالی کریم کلر کی بڑی سی مردانہ مثال اس کی شخصیت کو چار چاند لگا رہی تھی۔

فرکس ڈیپارٹمنٹ کے لان میں بیٹھا ہر فرد اگر اس وقت کسی طرف متوجہ تھا تو وہ صرف ضیاعلی خان کی ہی ذات تھی لوگوں کو مسلسل

اپنی طرف تکتا پا کر خود بخود اس کے لبوں پر مسکراہٹ مچلی تھی۔ اور اس کے دائیں گال میں ذرا اوپر بننے والا ڈمپل بے حد گہرا اور اس قدر

خوبصورت تھا کہ کتنے دلوں کو اپنی دھڑکتیں اس ڈمپل میں دھڑکتیں محسوس ہوئی تھیں۔

انہی میں سے ایک گل لالہ بھی تھی۔۔۔ برآمدے کی سیڑھیوں پر پڑتھی لالہ کی نگاہ یونہی بھٹکی تھی۔ اور جیسے ضیاعلی خان کے اس

خوبصورت روپ میں کھو کر رہ گئی تھی اس کے یا قوتی لب حیرانی سے ذرا سے واہوئے تھے۔ اور تبھی بالکل اتفاقیہ طور پر ضاعلی خان کی نگاہ ان لبوں پر پڑی تھی۔

ملائی جیسی رنگت میں دکھتے انگاروں کے جیسے یا قوتی ہونٹ اور ان کے بالکل اوپر لبوں پر کالائیل۔۔۔ وہ بے اختیار سا ہوا تھا۔ اور پھر سب لوگوں نے کی دیکھا تھا بے اختیار ضاعلی خان ایک شان سے لالہ کی طرف بڑھتا چلا گیا تھا۔ اسے اپنی طرف آتا دیکھ کر لالہ بھی چونک گئی تھی۔ پرس اور دیگر چیزیں سنبھالتی وہ تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ اس کے قریب آنے سے پہلے وہاں سے ہٹ جانا چاہتی تھی۔۔۔ لیکن عین اسی وقت اس کا پین نیچے گرا تھا۔ وہ جھکی۔۔۔ ضیا کے پشاوری چپل میں مقید پاؤں اس کی نظروں کے سامنے تھے۔ جھٹ سے پین اٹھا کر وہ سیدھی ہوئی۔ ضیا اس کے قریب بے حد قریب کھڑا تھا۔ اس کی نظریں اب بھی اس کے ہونٹوں پر جمی تھیں۔ ”کوئی بات کرو“ وہ کسی رو بوٹ کے سے انداز میں بولا تھا۔ وہاں موجود لڑکے لڑکیاں سرگوشیاں کرنے لگے تھے۔ are you mad لالہ کو ایک دم سے غصہ آنے لگا اور ان لبوں کو ہلتا دیکھ کر ضاعلی خان کے ہونٹ پھر سے مسکرا دیے تھے۔ ”کمال ہو تم۔۔۔“

اس کی بات سن کر لالہ جھٹ سے وہاں سے مڑی تھی۔ ”میری پہلی وش پوری کرنے کے لیے شکریہ مس لالہ۔۔۔“ اور قدم بڑھاتی لالہ کے قدم پتھر کے ہوئے تھے۔ ”وہ اس کا نام جانتا تھا۔ لیکن کیسے۔۔۔؟ جب کہ اس نے اس سے پہلے کبھی اسے دیکھا نہیں تھا۔ نہ ہی وہ اسے جانتی تھی۔ پھر وہ کون تھا۔۔۔؟“ مسکراتا وہ اس کے قریب سے گزرا تھا اور وہ کتنے ہی پل اس کی خوشبو کو اپنے ارد گرد محسوس کرتی رہی تھی۔۔۔ دھڑکتے دل کے ساتھ۔۔۔

☆.....☆.....☆

”لالہ رکو۔۔۔“ گروہ اپنی ہی سوچوں میں مگن گم سم کلاس کی طرف جا رہی تھی۔ جب نمرہ کی آواز نے اسے رک جانے پر مجبور کیا نمرہ کلاس کی وہ واحد لڑکی تھی جو لالہ سے دوستی بڑھانے میں کامیاب ہوئی۔ لالہ کسی سے بھی زیادہ بات کرنے کی روادار نہ تھی لیکن نہ جانے نمرہ کی شخصیت کی معصومیت تھی یا اس کا خلوص کے وہ اس کے قریب آتی گئی۔

”یہ کزن ہے تمہارا۔۔۔؟“ نمرہ نے کلاس روم کی گلاس ونڈو سے ٹیک لگائے ضاعلی خان کی طرف اشارہ کیا جو دوستوں کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھا لالہ نے اس سمت الجھی نگاہ ڈالی اور پھر سے پھیر لی۔

”میں اسے نہیں جانتی۔“ لالہ نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے صاف انکار کیا۔ نمرہ کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔
”کیا مطلب نہیں جانتی؟“ وہ حیران تھی۔

”انہیں جانتی۔۔۔ مطلب نہیں جانتی۔۔۔ اس شکل کے کسی بھی شخص سے میری کوئی واقفیت نہیں ہے نمرہ۔۔۔“ اس نے وضاحت دی۔

”پھر یہ تمہارا نام کیسے جانتا ہے لالہ، نمرہ اب بھی حیران تھی۔
”جبکہ آج اس کا یہاں پہلا دن ہے۔“ اور نمرہ کی بات سن کر وہ مزید الجھ گئی تھی۔
”مجھے کیا پتا۔۔۔“ وہ چڑ کر کہتی آگے بڑھ گئی۔
”مجھے تو دال میں کچھ کالا لگتا ہے۔“ نمرہ اس ہم قدم ہوئی۔

”بیٹا یونیورسٹی مت جاؤ۔۔۔ میں نہیں چاہتی لالہ۔۔۔ میرے ماضی کا کالا سایہ یہ تمہارا حال یا مستقبل گہنا دے۔“ سین کی آواز نے اس کی روح کے کواڑ بجا دیے تھے وہ سر جھٹک گئی۔
”دال کالی ہو یا پیلی، مجھے اس سے کوئی مطلب نہیں نمرہ۔۔۔ میری چاہ صرف میرے خواب ہیں۔“ اس نے اندر ہی اندر خود کو مضبوط کیا اور آئندہ ضیاء علی خان کو مکمل نظر انداز کرنے کا تہیہ کیا۔ اس نے خود سے عہد کر رکھا تھا کہ وہ ماں کے دامن پر لگے چھینٹے نہ صرف اپنی محنت اور کردار سے مٹائے گی۔۔۔ بلکہ خود کو بھی ثابت کرے گی۔

☆.....☆.....☆

گاؤں پر اترنے والی صبح بے حد چمکدار تھی سنہری کرنوں نے ہر چیز کو عجیب سنہری رنگ بخشا تھا۔ ہر چیز جھلما اٹھی تھی۔ سردیوں میں ایسی دھوپ ان، انگ میں عجیب ہی سرشاری بھر دیتی ہے۔

ڈیرے کے وسیع احاطے میں دھوپ میں ہی چار پائی پر بیٹھے سہراب علی خان لوگوں کے مسائل بڑی توجہ سے سن رہے تھے۔ جو نیچے زمین پر بھیچھی چوڑی چٹائی پر دائرے کی صورت بیٹھے تھے۔ تبھی ڈیرے کی ننھی سی چار دیواری کے پار کچی سڑک پہ دھول اڑاتی پولیس کی گاڑی پران کی نظر پڑی۔ گھنی مونچھوں تلے دبے ہونٹ دھیمے سے مسکرا دیے تھے۔

”حان، پولیس۔ ایک آدمی تیزی سے اطلاع دینے لگا۔ خان نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش رہنے کا حکم دیا تھا۔ گاڑی ڈیرے کے چوہدر دروازے کے باہر ہی رک گئی۔ ایس ایچ او، دو سپاہیوں کے ساتھ ان کی طرف آیا۔

”السلام علیکم خان جی۔۔۔“ آگے کو نکلی ہوئی توند سے پھسلتے بیلٹ کو بار بار جھٹکے سے اونچا کرتا ایس ایچ او ادب سے مخاطب ہوا۔
”کیسے ہیں ایس ایچ او صاحب۔“ سہراب خان نے سلام کا جواب دیتے ہوئے ان کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”خیریت تو تھی، آج اتنی صبح۔۔۔ سہراب خان نے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے پوچھا۔

”وہ خان۔۔۔“ وہ ذرا آگے کی طرف جھکا۔

”خبر تو آپ تک پہنچ ہی گئی ہوگی۔۔۔“ سرگوشی کی۔

”کون سی خبر ایس ایچ اوصاحب۔۔۔ کھل کر بات کریں اپنا ڈیرا ہے۔“ وہ ویسے ہی پر اعتماد لہجے میں بولے تو۔۔۔ وہ کھسیا نا سہراب خان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے۔

”خان۔۔۔ شہباز خان کے کھیتوں میں رات آگ بھڑک اٹھی تھی۔“ اب کی بار اس کی آواز بھی دم دار تھی۔ سہراب خان سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔

”نقصان تو نہیں ہوا ناں۔۔۔؟“ وہ فکر مند تھے۔

”کافی نقصان ہو گیا ہے، کھڑی فصل تباہ ہو گئی ہے۔“ وہ بغور سہراب علی خان کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ہمیں ہمدردی ہے ان سے۔۔۔ جاؤں گا شام تک افسوس کرنے۔۔۔ اور جو بھی مدد ہو سکی کروں گا۔“ ان کے چہرے پر سادہ سا تاثر تھا۔

”خان لیکن میں آپ کو یہ بتاتے نہیں آیا۔“ وہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بولا۔

”صاف بات کرو ایس ایچ او۔۔۔“ وہ اب چڑنے لگے تھے۔

”گاؤں کے کچھ لوگوں نے آپ کے آدمی شاہ سوار کو دیکھا تھا موقع پر۔۔۔ ان کو آپ کے آدمیوں پر شک ہے خان۔۔۔“ پہلی بار سہراب خان کے ابرو تن گئے تھے لیکن چہرے پر سکون سا تھا۔

”میرے ہی اس قدر ذلیل کام کیوں کرنے لگے جب کہ ہمارے ان سے اچھے تعلقات ہیں رہبات شاہ سوار کی تو وہ کسی کام سے گی شہر اہوا ہے۔ اس کے اس کام میں ملوث ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ ان کی آواز میں یقین تھا، ایس ایچ او اور الجھنے لگا تھا۔

”جو بھی ہے خان ہمیں تفتیش تو کرنی پڑے گی، شاہ سوار اور آپ کے دوسرے آدمیوں سے بات، پوچھ گچھ۔۔۔“ وہ جیسے اجازت لے رہا تھا۔

”لاکھ بسم اللہ۔۔۔ ہماری طرف سے آپ کو مکمل اجازت ہے۔“ سہراب خان نے جیسے مونچھوں کو تاؤ دیتے انہیں خدا حافظ کہا تھا۔ وہ سر ہلاتا مڑ گیا۔ سہراب خان کی پیشانی پہ سلوٹیں نمودار ہوئی تھیں۔

☆.....☆.....☆

”مے آئی کم ان میم؟“ بھاری مردانہ آواز پر سبھی کی نظریں دروازے کی سمت اٹھی۔ آنکھوں میں ایک دم سے ہی ستائش سی ابھری تھی۔ بلیو جینز پہ بلیک شرٹ پہنے، آستینیں فولڈ کیے ضیاعلی خان دروازے میں استادہ تھا۔

”ضیاعلی۔۔۔“ میڈٹم تبسم کے لب اسے دیکھ کر خود بخود مسکرا اٹھے تھے۔ صبح جب ان کی گاڑی راستے میں خراب ہو گئی تھی۔ تب اتفاقاً ان کی ملاقات ضیاعلی سے ہوئی تھی اور اس کی گاڑی میں بیٹھ کر صرف بیس منٹ کی ڈرائیو میں وہ اس کی خوش مزاجی سے کافیا پیرس ہو چکی تھیں۔

”آ جاؤ۔۔۔“ انہوں نے اجازت دی۔ ایک ہاتھ میں ایک دوکتا بیٹھا تھا وہ ایک شان سے چلتا اندر آیا تھا۔

”شہزادہ لگتا ہے قسمے۔۔۔“ نمرہ نے کتاب میں گم بیٹھی لالہ کو کہنی مار کر متوجہ کیا۔ وہ چونک کر سامنے دیکھنے لگی ٹھیک اسی وقت ضیاعلی کی نگاہ بھی اس کی طرف اٹھی تھی اور وہ رک گیا تھا۔

”یہ ہیں آپ کے نئے ساتھی ضیاعلی خان۔۔۔“ میڈٹم تبسم تعارف دینے لگیں۔

”کچھ ذاتی وجوہات کی بنا پر انہوں نے ہمیں لیٹ جوائن کیا لیکن خیر دیر آید درست آید۔۔۔“ ان کے کہنے پر سبھی مسکرا دیے تھے۔ ضیاعلی ابھی تک اسے ہی دیکھے جارہا تھا۔ اس کی سرمئی سی لودیٹی آنکھوں میں ناجانے کیا سحر تھا۔ وہ زیادہ دیر اس کی طرف دیکھ نہ پائی تھی نظریں جھکا گئی تھی۔

"have a seat Zia" میڈٹم نے اسے اجازت دی۔ لالہ نے جھکی نگاہوں سے دیکھا تھا۔ سیاہ بوٹوں میں مقید قدم دھیرے سے آگے بڑھے دانستہ یا نادانستہ جب وہ بالکل اس کے قریب سے گزرنے لگا تھا اس کا پین لالہ کے قدموں میں گر پڑا تھا وہ رک گیا تھا لالہ کا دل تیز تیز دھڑکنے لگا وہ جھکا بہکتی خوشبو نے لالہ کو اپنے حصار میں لیا تھا۔ اس نے جھکے سے پاؤں پیچھے کیے تھے۔ ضیاعلی نے جی پین اٹھایا اور پھر آگے بڑھ گیا۔۔۔ لالہ البتہ دیر تک دل کو نہ سنبھال پائی تھی۔

☆.....☆.....☆

”باری۔۔۔“ وہ آفس میں لیپ ٹاپ پر مصروف تھا۔ جب خوشی سے چمکتی وہ اس کمرے میں داخل ہوئی۔ باری متوجہ نہیں ہوا تھا۔ وہ اپنے کام میں بری طرح محو تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے انگلی سے ٹیبل بجائی وہ چونکا اور سیدھا ہو کے بیٹھ گیا۔

”کچھ لائی ہوں تمہارے لیے۔۔۔“ اس نے دو پیکٹ اٹھا کر ٹیبل پر رکھے۔

”میرے لیے“ وہ حیران ہوا۔

”ہاں“ وہ مسکراتے ہوئے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

”جانتے ہونا۔۔۔“ پاپا کچھ دنوں تک تمہاری پروموشن ڈیکلین کرنے والے ہیں۔“ دونوں ہاتھوں کا پیالہ بنا کر ان پر ٹھوڑی ٹکاتے ہوئے وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئی بولی۔

”تو“ وہ ذرا سا پیچھے ہو کے ٹیک لگاتے ہوئے بولا۔

”تو سہیل اب ہر وقت تم اس سادہ سے لباس میں نظر نہیں آؤ گے۔“

”کیوں اس لباس میں کیا برائی ہے؟“ اس نے مزید حیران ہوتے ہوئے اپنی سفید کاٹن کی شرٹ کے کالر چھوتے ہوئے

پوچھا۔ وہ کھل کر مسکرا دی۔

”نیجر بن جاؤ گے اب تم۔۔۔ مطلب سبھی کچھ اب تم ہینڈ کرو گے۔۔۔ اور میں چاہتی ہوں تم دور سے پہچانے جاؤ۔۔۔ وہ دیکھو

سکندر انٹر پرائزز والا باریال ولی خان جا رہا ہے۔“ اس کی آنکھوں میں عجیب سی لوجھکھکنے لگی تھی۔

اس دفعہ مسکرانے کی باری باریال کی تھی۔

”میڈم، انسان لباس سے نہیں، اپنی قابلیت سے پہچانا جاتا ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ اپنی قابلیت سے میں ضرور ایک دن

پہچانا جاؤں گا۔“ اس کی آواز میں یقین تھا۔

”کچھ بھی ہو باری۔۔۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”کل سے تم انہی کپڑوں میں آفس آؤ گے کوئی بہانہ نہیں۔“ وہ بائین ہاتھ کی انگلی ہونٹوں پہ سجائے گم سا بیٹھا رہا، وہ جاتے جاتے مڑی۔

”میری بات مانو گے۔۔۔“ ہمیشہ کی طرح حکم دے کر وہ ایک مرتبہ پھر متنی انداز میں اس سے پوچھ رہی تھی جیسے اسے یقین نہ تھا

باریال اس کی بات مانے گا۔ باریال کھلکھلا دیا تھا۔

”شیوریم۔۔۔“ اس کے مودب انداز پر وہ سکون سی ہو کر ہاتھ ہلاتی باہر چلی گئی۔ اور وہ پریشان سا اس کے دیے گفٹس چیک

کرنے لگا۔

☆.....☆.....☆

”امی۔۔۔“ آفس کے لیے نکلتے وقت اسے کچھ خیال آیا تو واپس کچن کی کھڑکی میں آ کر پکارا۔۔۔ برتن دھوتی زربینہ کے ہاتھ

ایک دم رکے تھے۔

”نانو کی طبیعت خراب تھی، میں جلدی آ جاؤں گا؟ آپ تیار ہے گا پھر چلیں گے۔“ حمزہ کی بات پر ان کا منہ بن گیا تھا۔ دوپٹے

سے ہاتھ پونچھتی وہ باہر آئیں۔

”تمہیں بڑی خبر ہوتی ہے نانو کے گھروالوں کی۔“ انہوں نے گھروالوں پر زور دیتے ہوئے کہا۔ شک بھری نگاہ حمزہ کو گھور رہی تھی۔

”شاہ ویز کا فون آیا تھا رات کو۔۔۔ اسی نے بتایا۔“ بامشکل خود پر ضبط کرتے ہوئے اس نے نرمی سے جواب دیا تھا۔

”اور ہاں امی پلیز ادھر کوئی ایسی بات مت کیجئے گا جس سے نانو خفا ہو جائیں۔“ اس نے ہمیشہ کی طرح ماں کو ہدایت دی۔ وہ تو

بھڑک ہی اٹھیں۔

”نا نوخفا ہو جائیں یا تمہاری رانی۔۔۔“ تلخی سے کہا گیا۔

”امی پلیز۔۔۔!“ وہ انہیں روکتا بایک کی طرف بڑھ گیا۔

”اولاد وہ تم میری، ہر ایک رنگ سے واقف ہوں تمہارے۔۔۔“ وہ تیزی سے کہتی اس کے پیچھے آئیں۔

”اور کسی غلط فہمی میں مت رہنا کہ وہ لالہ بی بی تم پر تھو کے گی بھی۔“ حمزہ کے بڑھتے قدم ایک دم رکے تھے۔

”ارے کوئی اوباش امیر زادہ نہ پھنسا لیا ناں تو میرا نام بدل دینا۔“ وہ ایک ایک لفظ چباتے ہوئے بولیں۔

حمزہ بایک کھڑی کر کے ان کے قریب آکھڑا ہوا۔

”کسی کی بیٹی کے بارے میں بات کرتے ہوئے آپ کو ذرا بھی خوف نہیں آتا کہ آپ کی بھی ایک بیٹی ہے۔“ وہ ان کی آنکھوں

میں جھانکتے ہوئے بولا۔

”یہی تو فرق ہے۔“ انہوں نے لب کاٹتے ہوئے کہا۔

”وہ میری بیٹی ہے سین کی طرح کسی آوارہ عورت کی نہیں۔۔۔“ حمزہ کے لیے وہاں مزید رکنا دشوار تھا مٹھیاں بھینچتا صحن میں

پڑی پلاسٹک کی بالٹی کو زوردار آلات رسید کرتا وہ بایک کے پاس آیا تھا۔

”میرا انتظار مت کیجئے گا، میں کھانا باہر ہی کھا لوں گا۔ مجھے دیر ہو جائے گی۔“ وہ بایک لیے غصے سے کہتا باہر کی طرف بڑھا۔

”ہاں، ہاں ان منحوسوں کے بارے میں کچھ کہو تو غصہ تو تمہیں آئے گا ناں۔۔۔“ کالا جادو جو کیا ہے ان کلموں ہی نے۔“ وہ اس کے

پیچھے آتے ہوئے بولیں۔ وہ بنا پلٹے تیزی سے گھر سے نکل گیا تھا۔

”رات کا کھانا بھی باہر ہی کھا کے آنا۔۔۔“ دروازے کی اوٹ سے انہوں نے تلخ لہجے میں کہا تھا۔

”بلکہ ان چہیتوں کے گھر ہی کھانا۔“ ایک اور طنز میں بچھا تیر۔۔۔ اس نے غصے سے مکا بایک کو جڑ دیا تھا۔

☆.....☆.....☆

کلاس ختم ہوتے ہی وہ نمبرہ کے ساتھ کیٹین جانے کے بجائے ڈیپارٹمنٹ کے پچھلے لان کی طرف آگئی۔ اگیزامز سر پر تھے اور وہ

جلد از جلد اپنے نوٹس مکمل کر لینا چاہتی تھی۔ اس طرف بہت کم لوگ آتے تھے سو فارغ وقت میں وہ کافی سارا کام نمٹا سکتی تھی۔ سنبل کے پیڑ

کے نیچے سب سے بے خبر وہ کتابوں میں غرق تھی اور نمبرہ اتر فون لگائے گانوں پر سر دھنتی چیونگم چباتی ارد گرد کا جائزہ لینے میں مصروف تھی۔ وہ

اس طرف پہلی بار آئی تھی اور وہ دل ہی دل میں اس بات پر افسوس کر رہی تھی۔ زیادہ لوگ نہ ہونے کی وجہ سے اس طرف نہ صرف سکون تھا

بلکہ سبزہ بھی کافی تروتازہ تھا۔ یہاں اگلے لان کی نسبت پھولدار درختوں کی تعداد بھی کافی زیادہ تھی۔ اور سب پورے خزاں کی آمد پر بے

حسین منظر پیش کر رہے تھے۔

”لالہ۔۔۔“ اسے اچانک ہی خیال آیا۔ میوزک آف کرتے ہوئے اس نے کتاب میں گم لالہ کو مخاطب کیا جو ساتھ ساتھ تیزی سے صاف اوراق کو رنگین بھی کئے جا رہی تھی۔

”ہم۔۔۔“ اس نے ویسے مصروف انداز میں جواب دیا۔ بنا اس کی طرف دیکھے۔

”تم نے ایک بات نوٹ کی۔“ ایئر فون گھاس پراچھالتے ہوئے اس نے پوچھا۔

”نہیں۔“ ویسے ہی مصروف انداز میں صاف جواب آیا۔

”لیکن میں نے نوٹ کی ہے ناں۔۔۔“ وہ چڑ کر کہتے ہوئے اس کا شانہ ہلا گئی۔

”کیا ہے نمرہ۔۔۔؟“ لالہ ناراض ہوئی۔

”لکھنے دو جلدی ورنہ اہم پوائنٹس دماغ سے مس ہو جائیں گے۔۔۔“ اس کا ہاتھ اسی قدر تیزی سے چلتا رہا۔

”لالہ۔۔۔“ اس نے پین لالہ کے ہاتھ سے چھپٹ لیا۔ وہ بے بس نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ نمرہ کے چہرے پر ناراضگی تھی لالہ مسکرائی۔

”اچھا بتاؤ، وہ کتابیں سائیڈ پر رکھتے ہوئے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”کیا نوٹ کر لیا تم نے۔۔۔“ بند مٹھی پر ٹھوڑی جمائے وہ اسے پوچھنے لگی۔

”مجھے لگتا ہے ضیاع علی خان تمہیں پسند کرنے لگا ہے۔“ اس نے اپنا قیاس بتایا اور لالہ کا تو منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

”تمہیں بھی لگتا ہے ناں؟“ کمال اعتماد سے پوچھا گیا۔

”اس بے ہودہ بات کے لیے تم نے میرے کتنے اہم پوائنٹس مس کر دیئے۔“ لالہ اس کی بات کو بالکل نظر انداز کرتے ہوئے تاسف سے بولی۔

”یہ بے ہودہ بات نہیں ہے۔“ وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔

”نمرہ۔۔۔“ شہادت کی انگلی دکھاتی لالہ تلملائی۔

”میں نے اکثر دیکھا ہے لالہ۔ تم جہاں ہوتی ہو وہ وہیں پہنچ جاتا ہے۔ کلاس کے دوران بھی میں نے دیکھا ہے اکثر وہ تمہیں دیکھتا رہتا ہے۔“

”اس کا مطلب تم اس کی طرف دیکھتی رہتی ہو۔“ لالہ نے دائیں آنکھ دباتے ہوئے اسے چڑایا تھا۔ واقعی یا صرف بات بدلنے کی کوشش کی تھی۔ نمرہ بھی نہ سمجھ سکی تھی۔

”شاید۔۔۔ مگر میں نے ہمیشہ نہ جانے کیوں؟ اسے تمہیں ہی کھوجنا ہوا محسوس کیا ہے۔“ نمرہ نے اس کی بات آرام سے ہوا میں اڑادی تھی۔ اس بار لالہ خاموش رہی تھی کیوں کہ واقعی یہ سچ تھا۔ وہ بالکل میں جانتی تھی کہ ضیا علی خان کون تھا۔۔۔ لیکن وہ اتنا سمجھ سکتی تھی کہ وہ واقعی اس کی طرف متوجہ رہتا تھا۔

دانستہ یا نادانستہ کوئی نہ کوئی ایسی حرکت ضرور کر جاتا کہ خود لالہ کو اپنا کردار مشکوک لگنے لگتا۔ وہ ہمیشہ اس سے کتراتے تھی۔ پہلو بچا کے نکل جاتی۔۔۔ اسے یقین تھا اس طرح سوائے اسے ضیا کی اس پیش رفت کا اندازہ اور کسی کو نہیں ہوگا۔ لیکن آج نمرہ کے منہ سے سن کر اسے حقیقی معنوں میں پریشانی ہوئی تھی۔ اس کا مطلب تھا یہ صرف اس کا اپنا وہم نہیں تھا۔ ضیا کو باقی لوگ بھی نوٹ کرنے لگے تھے۔

”ویسے کہوں تو مجھے کافی اچھا لگتا ہے۔ تم دونوں کی جوڑی لگے گی شاندار۔۔۔“ نمرہ کے شرارتی قمقمے پر وہ چونکی تھی۔

”شٹ اپ نمرہ۔۔۔“ غصے سے کہتی وہ کتابیں اٹھانے لگی۔

”اس میں شٹ اپ والی کیا بات ہے؟“ وہ منہ بنا گئی۔

”اگر آئندہ تم نے ایسی کوئی بھی بات کی جس میں، میں اور ضیا ایک ساتھ شامل ہوں تو ہماری دوستی ختم سمجھنا نمرہ۔۔۔“ وہ بیگ اٹھاتی کھڑی ہوئی۔

”پاگل ہو تم۔۔۔“ حیران سی نمرہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اتنی چھوٹی سی بات پہ دوستی ختم کر دو گی۔۔۔؟“ اس کے لہجے میں خفگی تھی۔

”چھوٹی سی بات تمہارے لیے ہے۔۔۔ میں نہیں چاہتی میرے حوالے سے اس طرح کی باتیں پوری یونیورسٹی کی زبان پر آ جائیں۔ ایک پل لگتا ہے ایسی باتوں کو پھیلنے میں نمرہ۔۔۔ اور میرے خواب بہت اونچے ہیں اور ان خوابوں کے راستے میں کوئی ضیا علی خان نہیں آئے گا، نہ میں آنے دوں گی۔۔۔“ سخت لہجے میں کہتی وہ آگے بڑھ گئی۔

”اچھا سوری۔۔۔“ نمرہ نے فوراً معذرت کی تھی۔ اور اگلے ہی پل خود سے آگے جاتی لالہ اچانک رک جاتی تھی۔ تبھی وہ اس سے ٹکرائی تھی اس نے حیرت سے سر اٹھایا تھا اور اگلے ہی پل لالہ کی طرح اس کے قدم بھی ساکت ہوئے تھے۔ بلیک کلر کی شلوار میں ملبوس وہ بلاشبہ ضیا علی خان ہی تھا۔ وہ بلاشبہ ساحر شخصیت کا مالک تھا۔ اس کی آنکھوں میں جس قدر غرور تھا۔ عنابی لبوں پر اسی قدر دوستانہ مسکراہٹ رقص کرتی رہتی تھی۔ تنے کا لری بلیک قمیض شلوار میں ملبوس، آستین فولڈ کیے، سنہری رووؤں والی کلائی پہ ڈارک براؤن کلر کے دھاگے میں محفوظ تعویذ باندھے بڑی شان سے اس نے وہی بایاں ہاتھ اسے دیکھ کر بلایا تھا جیسے وہ اس کا پرانا شناسا تھا۔

”میں نے کہا تھا ناں۔۔۔“ نمرہ نے لالہ کے مزید قریب ہوتے ہوئے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ لالہ تیز قدموں سے آگے بڑھی۔ وہ سیڑھیوں کے قریب آئی۔

”لالہ۔۔۔“ بالکل اچانک سامنے آکر پکارا گیا تھا۔ لالہ نے نظریں اٹھائیں۔ وہ اب بھی مسکرا رہا تھا۔ اسی وقت شاہد اور ابراہیم بھی وہاں آگئے تھے۔

”اس بدتمیزی کا مطلب“ لالہ نے غصے سے پوچھا۔

”میرے ساتھ مل کر ایک کپ کافی پیوگی۔“ اتنی دیر انا نہ آفر پر لالہ کا چہرہ جہاں لال ہو گیا نمرہ کا نہ جانے کیوں پورا منہ کھل گیا تھا۔

”جنہم میں جاؤ تم۔۔۔“ وہ سائیڈ سے نکلتے ہوئے بھڑکتے ہوئے لہجے میں بولی۔

”تمہیں وہاں کافی پینی ہے تو جنہم ہی سہی۔۔۔ ضرور چلوں گا“ اس کے ویسے ہی سادہ لہجے پہ شاہد اور ابراہیم کو ہنسی آگئی نمرہ نے

بمشکل اپنے قہقہے کا گلابا دیا تھا۔ لالہ نے البتہ اس دفعہ مڑ کر بھی نہ دیکھا تھا۔

”پاگل ہے ناں۔“ لالہ کے ہم قدم ہوتے ہوئے اس نے جیسے تائید چاہی تھی۔

”بالکل بھی نہیں۔۔۔“ لالہ کے جواب پر اسے حیرت ہوئی۔

”گبڑے ہوئے ماں باپ کی گبڑی ہوئی اولاد ہے۔“ لالہ کے اگلے الفاظ پر اس نے تائید میں سر ضرور ہلادیا تھا۔

☆.....☆.....☆

شاہ سواران کا سب سے قابل آدمی تھا۔۔۔ اس نے سہراب علی خان کے لیے بڑے، بڑے کام کیے تھے لیکن کبھی کسی کی نگاہوں

میں نہیں آیا تھا۔ لیکن اس بار بازی بالکل الٹ گئی تھی۔ گاؤں کے کئی لوگوں نے اسے وہاں دیکھا تھا جہاں آگ لگی تھی۔ اپنے قبیلے کے لوگوں

کو سنبھالنا زیادہ مشکل نہ تھا۔ لیکن مخالف قبیلے کا نقصان ہوا۔ اور ان کے لوگوں کو خریدنا ان کے بس میں نہیں تھا۔ تبھی انہوں نے فی الفور شاہ

سوار کو شہر کے قریب ایک قدرے سنسان علاقے میں رہنے کی ہدایت کی تھی۔ اور ٹھیک دو دن بعد آج وہ خود بھی اس کچے پرانے کھنڈر نما

مکان میں موجود تھے۔ شاہ سوار سر جھکائے شرمندہ سا کھڑا تھا۔

”اس واقعے سے میں کیا سمجھوں شاہ سوار۔۔۔؟“ مونچھوں کو تاؤ دیتے انہوں نے دائیں ہاتھ پکڑی چھڑی گھمائی۔

”یہی کہ تم نا کارہ ہو گئے ہو؟“ ان کا لہجہ تلخ ہوا۔

”نہ خان۔۔۔“ وہ ان کے قدموں پر گر پڑا۔

”ساری عمر آپ کی خدمت کی آئندہ بھی کرتا رہوں گا۔ آپ حکم کریں خان آپ کو میری ضرورت نہیں رہی میں اپنے ہاتھوں سے

اپنی جان لے لوں گا۔“ بھاری قد و قامت والا مرد بچوں کی طرح ہاتھ باندھے رو رہا تھا۔ وہ ان کا وفا دار آدمی تھا۔ انہیں کوئی شک نہیں تھا۔

وہ اگر اسے کہہ دیتے تو واقعی اپنی جان بھی لے لیتا۔

”تمہارا گناہ اتنا بھی بڑا نہیں کہ اس کی سزا میں، میں اپنا اتنا قیمتی آدمی کھودوں۔ لیکن تم جانتے ہو الیکشن قریب ہیں ذرا سی بات

سے کس قدر نقصان پہنچ سکتا ہے۔“

”اپنی غلطی مانتا ہوں خان۔۔۔ شرمندہ ہوں میں۔۔۔“ وہ ہاتھ باندھے جھکا رہا۔

”یہ تو شکر ہے ایس ایچ او بکاؤ نکلا۔۔۔ ورنہ اس بار واقعی مجھے تمہیں کھونا پڑتا۔“ ان کی آواز میں تاسف سا ابھرا سردی لہر شاہ سوار

کی ریڑھ کی ہڈی سنسنائی۔۔۔ سہراب علی خان اٹھ کھڑے ہوئے۔

”آئندہ خیال رکھوں گا خان۔۔۔“ وہ مزید جھکا۔

”خیال ہی رکھو تو اچھا ہے شاہ سوار۔۔۔ آئندہ ایسی غلطی ہو تو میرے سامنے آنے کی غلطی نہ کرنا۔“ انہوں نے تیز لہجے میں کہا۔

”حکم خان۔۔۔“ وہ ہاتھ باندھے بولا۔ سہراب علی خان باہر کی طرف مڑے تھے۔ شاہ سوار کی انکی سانسیں پھر سے جیسے بحال

ہوئی تھیں۔



ناول ”محبت لفظ ہے لیکن“ ابھی جاری ہے۔ اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی 10 تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

رنگارنگ کہانیوں سے سجا، خوبصورت اور دلکش

سوہنی ڈائجسٹ

SohniDigest.Com

اگر آپ بھی لکھ رہے ہیں اور اردو قارئین کی تلاش میں ہیں تو اپنی کہانیاں Inpage میں کمپوز (ٹائپ)

کر کے پورے اعتماد کے ساتھ سوہنی ڈائجسٹ میں بھیجئے۔ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔

ابھی sohnidigest@gmail.com پر ای میل کریں۔

قسط نمبر 3

”ماں باپ کے سامنے بہت سوچ سمجھ کر بولا کرو کیوں کہ کبھی کبھی ان کے سامنے بولا گیا کوئی بھی برایا اچھا کلام ہماری پوری قسمت پہ حاوی ہو جاتا ہے۔“

اس نے دھیرے سے کھڑکی کا پردہ ذرا سا اٹھا کر نیچے باہر گلی میں جھانکا۔ اس کی توقع کے عین مطابق دوراں خان جیپ سے ٹیک لگائے موبائل فون پر مصروف تھا۔۔۔ کچھ دیر بات کرنے کے بعد اس نے ڈرائیور کو اشارہ کرتے ہوئے خود بھی سیٹ سنبھالی اور جیپ روانہ ہو گئی۔

”یہ کون لوگ ہیں خان۔۔۔ جو روز آپ کا پیچھا کرتے ہیں؟“ زمزمہ نے لیمن جوس کا گلاس اسے تھماتے ہوئے پوچھا۔

”میرے بابا کے آدمی۔۔۔“ وہ گلاس تھام کر کونے میں پڑے سنگل صوفے پر جا کر بیٹھ گیا۔

”مطلب آپ کے باپ۔۔۔“ وہ حیران تھی۔

اس نے جوس کا سپ لیتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

”لیکن اس طرح آپ کے پیچھے۔۔۔ کیوں؟“ وہ خاموشی سے جوس پیتا رہا۔

”کیا ان کو آپ پر اعتبار نہیں؟“ وہ مزید بولی۔

”نہیں۔۔۔ ایسی بات نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ زمزمہ اس کے سامنے ہی بیڈ پر بیٹھ گئی۔

”بائس تسلی کرتے ہیں کہ واقعی میں ویسا بن رہا ہوں کہ نہیں جیسا وہ چاہتے ہیں۔“ اس نے گلاس میز پر رکھ دیا۔

”کیا مطلب۔۔۔؟ آپ کے بابا چاہتے ہیں کہ آپ ایسے بنیں؟“ اس کی کالی آنکھوں میں حیرت جاگی۔۔۔ دونوں ہاتھوں

سے اس جگہ کا اشارہ دیتے ہوئے بولی۔

”ہاں۔۔۔ بالکل۔۔۔“ اس کی حیرانی پہ وہ مسکرایا تھا۔

”اتنے خوبصورت اور قابل بیٹے کو بھلا کون باپ بگاڑنا چاہے گا۔“ وہ تاسف سے سر ہلا گئی۔

”جب اپنوں سے دکھ ملتے ہیں ناں۔۔۔ تو آدمی کچھ بھی کرنا چاہتا ہے۔۔۔ کر سکتا ہے۔“ وہ دونوں ہاتھ گھٹنے پر رکھے ذرا سا جھکا۔

”پھر بھی۔۔۔ ایسی بھی کیا وجہ کہ انسان اپنی اولاد کو خود ہی برباد کر دے۔“ وہ قطعی طور پر نفی کرتے ہوئے بولی۔

”میں برباد ہوا ہوں؟“ اس نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں۔۔۔“ وہ فوراً نفی میں سر ہلا گئی۔

”لیکن ٹھوکر لگتے دیر نہیں لگتی خان۔۔۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی سیاہ آبشار سا اس کی کمر پر بکھر گیا تھا۔

”اب میں اپنے ساتھ آپ کے لیے بھی دعا کیا کروں گی کہ میرا رب آپ کو کسی بھی طرح کی ٹھوکر سے بچائے رکھے۔“ اس نے

گویا عادی۔

”تم دعا پہ یقین رکھتی ہو؟“ وہ اشتیاق سے پوچھنے لگا۔

”بہت زیادہ۔۔۔“ وہ مڑی۔

”حیرت ہے۔۔۔“ ہاتھ سر کے پیچھے رکھتے ہوئے اس نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا لی۔

”حیرت تو مجھے ہے۔“

”وہ کس بات کی؟“ اس بار حیران ہونے کی باری ضیا کی تھی۔

”یہی کہ کوئی کسی سے اتنی محبت بھی کر سکتا ہے کہ صرف اس کے وجود کی منہی سی تشبیہ کے لیے بھی اتنا پیسہ، اتنا وقت ضائع کرتا

ہے۔“ اس کا اشارہ اپنے لبوں پر موجود تل کی طرف تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا۔

”تمہیں مزید بھی حیرت ہوگی جب تم یہ جانو گی کہ مجھے اس وجود سے کس قدر نفرت ہے۔“ دائیں ہاتھ کی مٹھی بھینچتے ہوئے وہ ضبط

سے ہونٹ کاٹنے لگا تھا۔

”کتنے حساب ہیں میرے اس جان پر اسے تو شاید خبر ہی نہیں۔“ اس کی خوبصورت آنکھوں میں ایک دم ہی انتقام کی آگ شعلے

دینے لگی تھی۔

”میری بے اختیاری میری توجہ، میرا التفات یہ سب تو صرف دانے ہیں جو اسے پھنسانے کے لیے میں استعمال کرتا ہوں۔ ورنہ

جو زخم انہوں نے میرے خاندان کو دیے ہیں۔۔۔ وہ تو میری نفرت کے بھی لائق نہیں اور محبت۔۔۔“

”مجھے بھی حیرت ہے خان۔۔۔ وہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس کے قدموں میں آ کے بیٹھ گئی۔ اس کی بات پر ضیا کی نظریں

اس عنابی دہانے پر جم سی گئیں۔

”کیونکہ محبت کھیل نہیں ہے، بازی ہے۔ کھیل میں دوبارہ چانس مل جاتا ہے۔ بازی الٹ جائے تو کبھی نہیں پلٹتی۔ سوچ سمجھ کر

کھیلنا اس میں تو بندہ حیت کے بھی ہار جاتا ہے اور آپ کو خود ہارنے کی تیاریوں میں لگے ہو۔

”مطلب۔“ اس کی بات پر وہ الجھ گیا۔

”مطلب بے حد صاف ہے خان۔۔۔“ وہ مسکرائی۔ اور پھر دھیرے سے گنگنا نے لگی تھی۔

”یہ لفظوں کی شرارت ہے۔۔۔“

سمجھ کر کچھ بھی لکھنا تم۔۔۔

محبت لفظ ہے لیکن۔۔۔

یہ اکثر ہو بھی جاتی ہے۔۔۔“

اور ضیاء علی خان نے دیکھا تھا ہر منتظر سٹ گیا تھا۔۔۔ لالہ مسکراتے ہوئے گنگنا رہی تھی بس۔۔۔۔۔

☆.....☆.....☆

”لالہ چائے بنا دوں۔۔۔“

سرشام ہی وہ کتابیں لے کر بیٹھی تھی۔ لیکن ضیاء علی خان ان کے حواسوں پر چھایا رہا تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھا اس کا آتے ہی پہلے دن سے تی الام کی طرف مائل ہونا اسے بری طرح کھٹک رہا تھا۔

”دل لاکھ اس کی سارح شخصیت کے حق میں دلائل دیتا، اس کی خوبیاں گنواتا، اس کی بے قراری، بے اختیاری پر پھل پھل دھڑکتا۔۔۔ لیکن حقیقت تھی کہ لالہ مرتضیٰ ان لڑکیوں میں سے نہیں تھی۔۔۔ جودل کی صدا پر لبیک کہہ کر فیصلہ لے لیتی ہیں۔۔۔ وہ ہمیشہ دماغ سے سوچتی تھی۔ دماغ کی مانتی تھی۔۔۔ اور دماغ ضیاء علی خان کو دیکھ کر ہی نہ جانے کیوں کچھ ایسے سنگنزدے دیتا تھا کہ لالہ جیسی پراعتماد لڑکی گھبرا جاتی۔۔۔ خوف سا بھر جاتا تھا اس کے دل میں جاتا تھا اس کے دل میں۔۔۔۔۔ وہ لڑکا کون تھا۔۔۔ کیوں اس کے پیچھے پڑ گیا تھا۔ وہ سوچ سوچ کر پریشان رہنے لگی تھی۔ گھر میں بھی کسی سے ذکر کرنا اسے مناسب نہیں لگا تھا کچھ۔۔۔ لیکن اب وہ خود تھکنے لگی تھی۔

آج بھی شام سے رات ہو گئی تھی۔ لیکن وہ صرف ضیاء کے متعلق ہی سوچتی رہی تھی۔ کھلی کتابیں میز پر اس کی منتظر ہی پڑی رہیں۔ نہ جانے کون سا پہر تھا جب سین اس کے کمرے کی لائٹ جلتی دیکھ کر اندر چلی آئیں۔ اسے کتابوں میں گم دیکھ کر انہوں نے چائے کا پوچھا تو وہ بری طرح چونک گئی۔ پین بھی ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے جا گرا۔

”کیا ہوا لالہ۔۔۔“ سین اسے یوں گھبراتا دیکھ کر دہل گئیں۔

”کچھ نہیں امی۔۔۔“ اس نے فوراً خود کو سنبھالا تھا۔

”کچھ تو ہے لالہ۔ تم مجھے کچھ پریشان لگ رہی ہو۔“ وہ اس کا سر سہلانے لگی۔ نہ جانے کیوں لالہ کی آنکھیں جلنے لگیں۔ اندر کوئی لاوا سا تھا جو پھر تپش سی دینے لگا تھا۔ وہ آج تک اپنی ماں کو نہیں سمجھ سکی تھی۔ نہ جانے کیوں ہو کبھی کبھی اس طرح کی جعلی محبت نچھاور کرتی تھیں اس پر۔۔۔ جب کہ وہ جانتی تھی کہ انہوں نے ہمیشہ اس سے زیادہ شاہ ویز کو اپنا مانا تھا۔ اس کے قریب رہی تھیں۔۔۔ اور سب سے بڑھ کر اس کی زندگی کو یہ تلخ حوالہ انہوں نے ہی تو دیا تھا۔ اس نے نامحسوس طریقے سے ان کا ہاتھ اپنے سر سے ہٹا دیا تھا۔

”میں ٹھیک ہوں، آپ جانیں سو جائیں مجھے بھی نیند آرہی ہے۔“ وہ بددلی سے کہتی بیڈ پر آگئی تھی۔ سین اس کا ایک دم سے پھر بدلتا روپ دیکھ کر سست رہ گئی تھیں۔

”امی لائٹ بھی آف کرتی جائیے گا۔“ کبل میں چہرہ چھپاتے ہوئے اس نے آواز دی تھی۔ انہونی نے خاموشی سے لائٹ آف کی اور دروازہ بند کر کے چلی گئیں۔

”اگر آپ نے یہ ایک غلط قدم نہ اٹھایا ہوتا۔ نانا جان کی عزت رکھ لی ہوتی تو آج یوں قدم قدم پر مجھے خوف نہ گھیرتا۔۔۔ میں بھی دوسری لڑکیوں کی طرح ایک پر اعتماد زندگی جیتی۔۔۔ قدم قدم پہ ٹھوکر کا ڈر میرے دل سے یوں نہ چٹ جاتا جیسے کوئی آسیب کسی پرانے برگد کے پیڑ سے آپ نے سب کچھ پاکے میرا سب کچھ کھودیا۔۔۔ عزت، اعتماد اور اس دنیا کو فیس کرنے کا حوصلہ۔۔۔ کاش، کاش میں بھی دوسری لڑکیوں کی طرح آج اس خوف، اس بے عزتی کے احساس سے آزاد ہوتی۔۔۔ میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی سین زیدی۔۔۔“

باقی ساری رات وہ یونہی روتی تکیہ بھگوتی رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

کلاس ختم ہوتے ہی سب لڑکے لڑکیاں باہر چلے گئے تھے۔ نمر وہی کتابیں اٹھا کر نکلے گی لیکن پھر اسے ایک طرح بیٹھا دیکھ کر واپس پلٹی۔

”کیا ہوا“

”میں یہیں رہوں گی کچھ دیر۔۔۔“

”تم ضیاعی خان سے چھپ رہی ہوا لالہ؟ نمرہ نے اسے گھورا۔

”مجھے نہیں پتا۔۔۔“ وہ بے بسی سے لب کاٹنے لگی۔

”حیرت ہے اس طرح تو اس سے اور شے ملے گی“ نمرہ کو حقیقتاً اس کی کمزوری پر غصہ آ رہا تھا۔

”جب تمہارے دل میں کوئی بات نہیں ہے تو تم کیوں چھپو۔“ وہ اس کے قریب بیٹھ گئی۔

”میں نے ہمیشہ ماں کے حوالے سے بہت طعنے سنے ہیں نمرہ۔۔۔ جانتی ہو؟“ وہ نمرہ کی آنکھوں میں دیکھنے لگی۔ اس کی کالی سیاہ آنکھیں ڈبڈبائے لگیں۔

”میری ماں نے گھر سے بھاگ کر شادی کی۔ میرے نانا میرے ماموں بہت بڑے رئیس تھے۔ پھر بھی امی نے میرے ابو کی

محبت کی خاطر سب کی محبت داؤ پر لگا دی۔“ اس کے گال بھینگے لگے اور نمرہ۔۔۔ وہ تو بت سی بن گئی تھی۔

”یہ بھی نہ سوچا کہ عورت کی زندگی میں ایک شخص کی محبت کے علاوہ کتنے لوگوں کی عزت بھی تو اہم ہوتی ہے نا۔۔۔“ اس کے

یا تو تنی لب کچپکانے لگے تھے۔

بند کھڑکی کے شیشے کے اس پار کھڑے وجود نے کچھ نہیں سنا تھا لیکن نہ جانے کیوں اس گلابی دبانے کی لرزش اسے ساکت کر گئی تھی۔ اس نے یونہی باہر کی تلاش سے مایوس ہو کر کھڑکی کے شیشے سے ناک لگا کے اندر دیکھنے کی کوشش کی تھی کہ شاید وہ ابھی اندر ہو اور وہ وہاں موجود بھی تھی مگر یوں ترچہ اور لرزتے ہوئے۔۔۔

”لالہ۔۔۔“ نمرہ اسے تسلی کے دو لفظ بھی نہ بول سکی۔

”اور ان کو تو پروا بھی نہیں نمرہ۔۔۔ کسی کے زہر میں بجھے تیران کی بیٹی کو کتنی اذیت دیتے ہیں۔۔۔ وہ ماں ہو کر بھی سمجھتیں، میں ان سے نفرت کرتی ہوں نمرہ۔۔۔ بے حد نفرت۔۔۔“ وہ رونے لگی تھی۔ نمرہ نے بہت آہستگی سے اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو صاف کیے تھے۔ اور بت بنے ضیاء علی خان نے نہ جانے کیوں ایک پل کے ہزارویں حصے میں اسے آئندہ کبھی یوں روتے ہوئے نہ دیکھنے کی دعا کی تھی۔

☆.....☆.....☆

سہراب علی خان حویلی کے وسیع و عریض لان میں بیٹھے زمینوں کے حساب کتاب چیک کر رہے تھے۔ جب حویلی کے کن خاص ملازم نے گاؤں کے دو تین معززین کے آنے کی اطلاع دی تھی۔ انہوں نے اسے اجازت دے کر رجسٹر بند کر دیے اور انتظار کرنے لگے۔ نظریں البتہ حویلی کے بڑے سے آہنی گیٹ پر رہیں۔ کچھ دیر بعد ہی انہوں نے دو تین ادھیڑ عمر آدمیوں کو اندر آتے دیکھا تھا۔ وہ مونچھوں کو تالا دینے لگے پیشانی پہ فوراً سلوٹیں نمودار ہو گئیں۔

”سلام خان جی۔۔۔“ انہوں نے آتے ہی مودبانہ انداز میں کہا۔۔۔ سہراب علی خان مسکرا دیے۔

”علیکم السلام۔۔۔“ علیکم السلام۔۔۔ انہوں نے بھی گرم جوشی سے جواب دیتے ہوئے ان کو بیٹھنے کے لیے کہا۔

”کیسے ہیں آپ سب؟ اور ماسٹر ہدایت آپ سنائیں۔“ سب کو مخاطب کرتے ہوئے انہوں نے آخری جملہ ماسٹر ہدایت کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”اللہ کا کرم ہے خان۔۔۔ آپ جیسے مہربان ہیں ہمارے ساتھ۔۔۔ سب اچھا ہی ہوگا۔“ وہ شکر گزار ہوئے۔

”ہم تو ہمیشہ ہی آپ سب کے ساتھ رہے ہیں۔ مگر لگتا ہے اب آپ لوگوں کو ہمارا آپ کا خیال رکھنا اچھا نہیں لگ رہا۔“ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں پھنساتے وہ ذرا آگے کو جھکے تھے۔

”نہیں نہیں، سردار۔۔۔“ وہ تینوں فوراً ہاتھ جوڑنے لگے۔

”جس طرح آپ نے اس گاؤں کی خدمت کی ہے۔ بھلا اور کون کر سکتا تھا۔“ ماسٹر ہدایت نے ماتھے پر نمودار ہوتے پسینے کے

قطرے صاف کیے۔

”اچھا۔۔“ وہ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ تیز نظریں اب بھی ماسٹر ہدایت کو ہی دیکھ رہی تھیں۔

”سنائے، آج کل کسی اہم مشن پر ہے ماسٹر ہدایت“ مونچھوں کو ایک بار پھر سختی سے مروڑتے ہوئے پوچھا گیا تھا۔ دونوں دیگر افراد ماسٹر ہدایت کو دیکھنے لگے تھے جن کے چہرے پر طاری ہوتی گھبراہٹ بہت واضح تھی۔

”وہ۔۔۔ خان۔۔۔ در۔۔۔ اصل۔۔۔“ وہ بول نہ سکا۔

”خان۔۔۔ آپ تو جانتے ہیں کہ گاؤں کے بچوں کی تعلیم و تربیت میں ماسٹر ہدایت کا کتنا ہاتھ ہے۔ کتنے عرصے سے یہ ضلعی انتظامیہ سے رابطے میں تھے کہ کسی طرح گاؤں کی بچیوں کو ریگولر نہیں تو کم از کم پرائیویٹ طور پر بڑی کلاسز کے امتحانات میں بیٹھنے کی اجازت اور انتظام کیا جائے۔ آپ تو جانتے ہیں ناں خان گاؤں سے شہر جا کر پرچے دینا پھر رہائش اور سفری اخراجات۔۔۔“ ماسٹر ہدایت کے بجائے ماسٹر علم دین تفصیل بتاتے ہوئے بولے۔

”بس اسی لیے ماسٹر ہدایت نے شہر جا کر یونیورسٹی کی انتظامیہ سے بھی ملاقات کی۔ انہوں نے یہ راستہ دکھایا کہ اگر ماسٹر ہدایت ایک درخواست پر تقریباً سو، ڈیڑھ سو افراد کے دستخط لے کر آجائیں۔ جس میں وہ اس چیز کی خواہش ظاہر کریں کہ وہ واقعی بچوں کو آگے پڑھانے کے حق میں ہیں تو یونیورسٹی انہیں پرائیویٹ طور پر امتحان دینے کے لیے ہال، اساتذہ اور دیگر سہولیات کا انتظام کر دے گی۔ بس اسی لیے کئی دن سے ماسٹر ہدایت اسی چیز پر کام کر رہے تھے۔“ وہ تفصیل بتا کر خاموش ہوئے۔۔۔ سہراب علی خان کے لبوں پر مسکراہٹ آٹھری۔

”تو یہی تو ہم کہہ رہے ہیں کہ ماسٹر صاحب۔۔۔ اتنے بڑے کام کے لیے آپ نے مجھ سے مشورہ کرنا بھی مناسب نہیں سمجھا۔۔۔ واہ بھئی۔۔۔“ مسکراہٹ میں تلخی سی گھلنے لگی۔

”نہیں خان ہم تو بس۔۔۔“ اس مرتبان سے بھی بات نہیں بن پائی تھی۔

”خیر۔۔۔ میں خود بھی سوچ رہا تھا کہ بہت جلد ہی گاؤں میں اپنی بچیوں کے لیے بڑے اسکول اور کالج کے لیے آواز اٹھاؤں گا لیکن کیا کریں ایک تو یہ مسئلے مسائل اوپر سے زمینوں بکھیڑے سو کام ہوتے ہیں۔ پھر آنے والے الیکشن کے کام۔۔۔ اچھا کیا آپ لوگوں نے۔۔۔ اب مجھے کم از کم اس طرف کی پریشانی سے توجہ مل جائے گی۔“ ملازم چائے کی ٹرے میز پر رکھ کر چلا گیا۔ انہوں نے اشارے سے سب کو چائے پینے کی دعوت دی۔

”نہیں، نہیں خان۔۔۔ ہم کیا ہماری اوقات کیا۔۔۔ آپ سے زیادہ ہمارا بھلا کون سوچ سکتا ہے۔“ ماسٹر علم دین نے ماسٹر ہدایت کو آنکھوں ہی آنکھوں اشارہ کیا۔

”بالکل خان۔۔۔“ ماسٹر ہدایت نے جیب سے ایک سفید کاغذ نکالتے ہوئے کہا۔

”مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوئی خان جی۔۔۔“ انہوں نے کاغذ کے پرزے کرتے ہوئے شرمندہ لہجے میں کہا۔
 ”اب ہمارے بچے بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کریں گے۔“ ماسٹر علم دین خوشی سے چہکے۔

”مجھے بس کچھ وقت دیں۔ الیکشن کی مصروفیات ختم ہوتے ہی میں انشاء اللہ سب سے پہلے اسی بات کو آگے بڑھاؤں گا۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے ان کو یقین دلادیا۔
 ”شکریہ خان۔۔۔“ وہ مشکور تھے کچھ دیر انہوں نے یونہی خان سہراب سے کئی دیگر مسائل بھی ڈسکس کیے۔ ان کے جاتے ہی شاہ سواران کے پاس آیا تھا۔

”ان لوگوں کی جرأت بڑھنے لگی ہے خان۔۔۔“

”چیونٹی کے پر نکل آئیں تو کچھ کر نہیں پاتی۔۔۔ شاہ سوار بس مرجاتی ہے۔ تم بھی بس تماشا دیکھو۔۔۔“ گھنی مونچھوں تلے بھرے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ مچلی ”تو کیا آپ واقعی۔۔۔“ وہ بولنے لگا تھا جب خان نے ہاتھ اٹھا کر اس کی بات کاٹ دی تھی۔
 ”اگلے سال کا وعدہ کیا ہے ان سب سے اور اگلا سال کس نے دیکھا ہے۔“ مغرور لہجے میں کہتے وہ قہقہہ لگا گئے تھے۔ شاہ سوار سر ہلاتے ہوئے ہنس دیا تھا۔

”باجی۔۔۔“ دوراندرونی برآمدے سے گل مینہ نے انہیں پکارا تھا۔ شاہ سوار دیوار کی طرف رخ پھیر گیا تھا۔ حویلی کی عورتوں میں صرف گل مینہ ہی تھی جس میں ان کی جان بستی تھی۔ اور وہ بلا روک ٹوک کہیں بھی آتی جاتی تھی۔ اس وقت بھی اسے طرف دیکھ کر جہاں عورتوں کا آنا بالکل منع تھا۔ انہیں غصہ آنے کے بجائے ان کے چہرے پر شفیق سی مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔
 ”جی۔۔۔ باکی جان۔۔۔“ انہوں نے فوراً بانہیں پھیلا دی تھیں۔ گل مینہ ان کے قدموں میں ہی بیٹھ گئی۔
 ”باجی مجھے بھی بھائی کے پاس شہر جانا ہے۔ کالج میں داخلہ لینا ہے۔“ وہ فرمائش کرنے لگی۔
 ”کہا ہے میں نے ضیا سے۔ شہر میں نیا گھر ملتے ہی تمہیں بھی بھجوادوں گا۔“ وہ اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے
 ”سچ بابا۔۔۔“ وہ چہکی۔

”بالکل سچ۔۔۔ باکی جان“ انہوں نے جھک کر بیٹی کے سر پر بوسہ دیا تھا۔ بچیوں کی آزادی و تعلیم کے سخت خلاف سراب علی خان کے اصول اگر کبھی کوئی توڑ سکتا تھا تو صرف گل مینہ تھی سہراب علی خان اس بیٹی کے لیے ہر اصول، ہر ضد توڑ سکتے تھے۔ بھول سکتے تھے۔ اور وہ ہمیشہ ہی بھول جاتے تھے۔ انسان اپنے پیاروں کے ذریعے ہی آزمایا جاتا ہے۔ اور اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ ابھی ان کی رسی کافی لمبی چھوڑی گئی تھی۔ جہاں کوئی بھی ڈر اساکھاؤ نہیں تھا۔۔۔ ان کے ہاتھ میں طاقت تھی اور سب ان کو اپنے اختیار میں لگنے لگا تھا۔

زندگی میں واقعی کئی بار ایسا ہوتا ہے کہ بالکل اجنبی لوگ آپ کو اپنے دل کے بے حد قریب محسوس ہوتے ہیں۔ کوئی رشتہ نہ ہونے کے باوجود وہ بے حد اپنے اپنے محسوس ہوتے ہیں۔ ان کی شخصیت، ان کی مسکراہٹ ذہن کے پردے سے جیسے چمٹ کے رہ جاتی ہے۔ لاکھ جھگو، اترتے ہی نہیں۔ بلاوجہ ہی یاد آتے ہیں اور آتے چلے جاتے ہیں۔ ان کی دوپٹکی ووری برداشت سے باہر ہو جاتی ہے۔ ساتھ ہو تو ساری کائنات کہیں بہت پیچھے رہ جاتی ہے اور ساتھ نہ ہو تو تب بھی ساری کائنات ویرزن لگنے لگتی ہے۔ وہ بھی بالکل نہیں سمجھ پارہی تھی۔

چند دن پہلے وہ جس شخص کے وجود سے بھی بالکل انجان تھی نہ جانے کیوں ملتے ہی دل کی دھڑکنوں کا باسی ہو چلا تھا۔ یہ بھی نہیں تھا کہ وہ اس کی زندگی میں آنے والا پہلا مرد تھا۔ وہ ایک بزنس ٹائیکون کی بیٹی تھی۔ ایک بڑے لینڈ لارڈ کی اکلوتی اولاد۔۔۔ امیر زادے اس کی فرینڈ لسٹ میں رہتے۔۔۔ وہ چند دن ان کے ساتھ ہنٹے کھیلنے گزرتی اور جیسے ہی اس کے اور اپنے رشتے کو لے کر سنجیدگی سے سوچنے لگتے وہ خاموشی سے راہ بدل دیتی۔ اسے لوگوں کو توڑنا اور چھوڑنا ہمیشہ سے ہی پسند رہا تھا۔ لیکن۔۔۔ اس بار اسے لگا تھا۔۔۔ پہلی بار اسے بھی کسی سے سچی محبت ہوئی تھی۔ کوئی تھا جو اس کی سانسوں میں بسنے لگا تھا۔ اور وہ ہی تھا باریال ولی خان۔۔۔

اس کے ہوتے ہوئے سارے منظر پس منظر ہو جایا کرتے تھے۔۔۔ اور اس کے نہ ہوتے ہوئے سارے منظر خزاں رنگ۔۔۔ اب بھی گاڑی کے بونٹ پر بیٹھی تھی وہ اور وکرز سے بات کرتا وہ اس کے سامنے کھڑا تھا تیز دھوپ میں اس کا اجلا شفاف عکس امن کے بلیک گلاسز کی اسکرین پر لودے رہا تھا۔ نہ جانے وہ کب سے کام میں بزی تھا۔ اور وہ صرف اسے دیکھنے میں اس کی آنکھوں کی چمک اس کی ذہانت کی گواہی دیتی تھی۔ آنکھوں میں چھل دیتی ہلکی سی نمی اس کے ہمدرد ہونے کا پتا دیتی۔ اس کی چال ڈھال میں غضب کی نمکنت تھی کسی دیو مالائی کردار کی طرح وجہ پر سحر شخصیت تھی اس کی جو دیکھتے ہی اگلے کو اپنے حصار میں جکڑ لیتی تھا۔ اس پر ایک بار پڑنے والی بلا ارادہ نگاہ ایک بار واپس ضرور پلٹتی تھی۔

وہ بات کرتے کرتے ہمیشہ نہ جانے کیوں دونوں ہاتھوں کی پوائنٹنگ فنگر ز کو ملا کے لبوں پر رکھ دیتا۔ اور یہ ادا اس پر جیتی بھی خوب تھی۔ اور سب سے اہم خوبی اس کا مضبوط کردار تھا۔ امن نے دیکھا تھا۔ وہ اس کے ساتھ رہ کر اس کی ہر طرح کی عنایات کو سمیٹتے ہوئے بھی ہمیشہ دونوں کے درمیان ایک فاصلہ رکھتا تھا۔ اس نے تعلقات کی ایک حد متعین کر رکھی تھی۔ اور نہ کبھی اس حد سے خود گزرتا اور نہ امن کو کراس کرنے دیتا تھا۔۔۔ امن کا ماتحت ہونے کے باوجود ان دونوں میں کافی دوستی ہو چکی تھی۔۔۔ اس کے باوجود وہ بے حد کامیابی سے ایک مناسب فاصلہ رکھے ہوئے تھا اور امن چاہ کر بھی تاحال یہ فاصلہ مٹا نہیں پائی تھی۔ وہ اس کے قریب جانا چاہتی تھی اسے اپنے اندر پلنے والے تمام احساسات بتانا چاہتی تھی۔ لیکن فی الحال باریال ولی خان اسے کوئی موقع نہیں دے رہا تھا۔

”کچھ بھی ہو باریال ولی خان۔۔۔“ دوور کرز کے درمیان کھڑا بلڈنگ میٹرل چپک کرتا باریال اس سے قطعی بے خبر کھڑا تھا۔ جب وہ خود سے کلام کرتے ہوئے بولی تھی۔

”تمھارا ہر راستہ میری طرف ہی نکلنے والا ہے۔ میں تمھیں کسی اور منزل کا راہی نہیں ہونے دوں گی۔۔۔ کبھی نہیں۔“ وہ مسکرائی تھی۔۔۔ دوور کھڑے باریال نے نہ جانے کیوں اسی پل بالکل اچانک اس کی طرف دیکھا تھا اور فوراً نگاہیں پھیر لی تھیں۔

☆.....☆.....☆

آج صبح سے زرینہ آئی ہوئی تھیں۔ سین صبح سے کچن میں بزی تھیں۔ انہیں زرینہ کی خاطر داری کرنا ہمیشہ سے اچھا لگتا تھا۔ وہ ان کے شریک حیات کی بہت لاڈلی بہن تھیں۔ اور اسی لیے سین کو بھی ان کی کا طرداری کر کے بہت اچھا لگتا تھا۔ اماں کا البتہ منہ بنا ہوا تھا۔ جس وقت سے زرینہ آئی تھیں وہ دل ہی دل میں لالہ کے آنے سے پہلے اس کے جانے کی دعا کرتی رہی تھیں تسبیح کے دانے مسلسل گراتے دل ہی دل میں وہ جل تو جلال تو کاورد جاری کیے ہوئے تھیں لیکن زرینہ کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ آج بھی وہ کھانا کھائے بغیر نہیں جانے والی تھیں۔

”بھابی ذرا حمزہ کو فون کر کے کہہ دیں کہ اقرار کو کالج سے لے کر سیدھا ادھر ہی آجائے۔“ سین نے تازہ جوس کا گلاس ان کو تھمایا تو فوراً نیا حکم صادر ہوا۔ اماں کا منہ مزید برا ہوا۔

”ویسے اماں یہ لالہ کیسے آتی جاتی ہے۔ شاہ ویز جاتا ہے کیا؟“ اچانک ہی انہیں خیال آیا تھا اور اماں نے دل ہی دل میں ان کے شیطانی دماغ کو سوگالیاں نوازی تھیں۔

”بس سے آتی جاتی ہے۔ شاہ ویز بیچارہ تو خوشو سارادن ادھر ادھر نوکری کی تلاش میں پھرتا رہتا ہے۔“ سین نے بتایا۔ اماں کا ماتھا ٹھنکا۔

”لو۔۔۔ اب ہمارے خاندان کی لڑکیاں بسوں میں مردوں کے کندھوں کے ساتھ لٹک کر سفر کریں گی۔“ تیز طرار لہجے پر اماں کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔

”خبردار۔۔۔“ ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو ہی گیا۔ فوراً ٹوکا گیا۔

”اتنے برسوں بعد پہلی بار میں نے اپنی بچی کو دوبارہ خوش دیکھنا شروع کیا ہے۔ خبردار جو اس کے سامنے کوئی ایسی ویسی بات بھی کی ہو۔“ انہوں نے بیٹی کو آنکھیں دکھائیں۔

”ہاں، ہاں میں تو کچھ نہ بولوں گی۔ لیکن کل کو اپنی ماں کی طرح کوئی گل کھلا کے آئے گی ناں۔۔۔ تو۔۔۔“

”زرینہ۔۔۔“ اماں کی تیز آواز نے انہیں جملہ پورا کرنے سے روک دیا۔

”آگے کچھ بھی سوچ سمجھ کر بولنا تیرا گھری نہیں ہے یہ۔۔۔“ صاف جتلا یا گیا۔

”میرے باپ بھائی کا تو ہے ناں اماں۔۔۔“ وہ بھی تیز لہجے میں بولیں۔

”ان دونوں کو مرے سال گزر گئے۔ اب یہ گھر میری سین کا ہے جتنی جلدی مان لے اچھا ہے۔۔۔“ وہ اماں تھیں ان کی سگی ماں۔۔۔ سین نہیں کے ان کے آگے دب جاتیں۔

”کردیا ناں پرایا اماں۔۔۔“ وہ فوراً منہ بسور نے لگیں سین پریشانی سی ان کی طرف بڑھیں۔

”جتلا دیا ناں کہ اب یہ گھر میرا نہیں۔۔۔“ آنکھوں سے ٹپ ٹپ موٹے آنسو نکلنے لگے۔

”آپ ناراض نہ ہوں، اماں تو بس ایسے ہی۔۔۔“ سین نے نظروں ہی نظروں میں اماں سے التجا کی اور زینہ کو منانے لگی۔ زینہ چادر سنبھالنے لگیں۔

”بس کردو، میں تمہارے ان چونچلوں میں آنے والی نہیں۔ اور ہاں۔۔۔“ سین کو سناتی وہ اماں کی طرف مڑیں۔

”اب دیکھنا اماں مرجاؤں گی پر اس گھر میں قدم نہیں رکھوں گی۔“ انہوں نے دھمکی دی۔

”جاؤ جاؤ بی بی۔۔۔ تیسرے دن نہ آ جانا تو اماں نہ کہنا۔ بے شک ابا کہہ دینا۔ بے نیازی سے جیسے مکھی اڑائی گئی۔

”میں بھی واپس آ جاؤں تو آپ بھی میرا نام بدل دینا۔“ چادر لیٹتی غصے سے تن فن کرتی وہ باہر نکل گئیں سین پچاری روکتی رہ گئیں۔ اماں نے البتہ شکر کی تسبیح کے دانے گرانے شروع کر دیے تھے۔

☆.....☆.....☆

نامانوس سی آواز نے ان کی گہری نیند کی لگا میں کھینچی تھیں۔ کچھ دیر یونہی آنکھیں موندے ہی اس آواز کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔

پھر دھیرے دھیرے آنکھیں کھول دیں۔ اگلے ہی پل وہ جھٹکے سے اٹھ بیٹھا تھا۔ یہ اس کا اپنا کمرہ نہیں تھا اس نے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ وہ زمزمہ کے کمرے میں موجود تھا۔ تو کیا اسے نیند آ گئی تھی۔

”اسے یاد تھا کہ وہ آج سارا دن ہے ہلکے سر درد مبتلا رہا تھا۔ اس نے اپنے سب دوستوں کے ساتھ شکار پر جانے کا پروگرام بنا

رکھا تھا۔ لیکن پھر اس سر درد کی وجہ سے وہ ان کو چھوڑ کر کچھ دیر کے لیے سکون تلاش نہ جانے کیوں زمزمہ کے پاس چلا آیا تھا۔

زمزمہ نے اسے کڑک دودھ کے ساتھ سر درد کی دوا بھی دی تھی۔ وہ بس چند لمحوں کے لیے سستانے لیٹا تھا۔ اور شاید باقی وقت آرام سے سوتا رہا تھا۔

نامانوس سی آواز اب واضح تھی۔ وہ سسکیاں تھیں، کوئی روتے وقت اپنی آواز دبانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے کمرے میں

زمزمہ کی تلاش میں نظریں دوڑائیں۔ وہ وہاں نہیں تھی۔ وہ بیڈ سے اتر کر سلیر پہنٹا اٹھ کھڑا ہوا۔ آواز کمرے کے سامنے بنے کھلے چبوترے

سے آرہی تھی۔ وہ خاکی چادر میں خود کو لپیٹتا وہاں چلا آیا۔ کمرے اور چبوترے کے درمیان لگی چٹن کو ہٹاتے ہی جو منتظر اس نے دیکھا اس کے

ہوش اڑانے کے لیے کافی تھا۔

☆.....☆.....☆

اس قدر شدید سردی میں رات کے اس سرد ترین پہر میں ٹوٹے پھوٹے اس بوسیدہ سے چبوترے کے فرش پر سفید چادر میں سفید کپڑوں میں ملبوس دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے زمزمہ سسکیوں سے رو رہی تھی۔

اس نے چبوترے پر لگا بلب آف کر رکھا تھا لیکن آس پاس کے سبھی جھروکوں پر گلی ٹیوب لائٹس کی تیز روشنی میں اس کا وجود عجیب سا نور لیے ہوئے تھا۔

اس سے عجیب تر منظر اس نے آج تک نہیں دیکھا تھا۔ ایک کوٹھے پر ایک حسن پری، کمائی کے عروج کے وقت جب سب جھروکوں میں روشنیاں چل چلی جاتی تھیں، روشنی بجھائے اندھیرے میں گم نہ جانے تخیل پر یوں دوزانو بیٹھ کر کیا کر رہی تھی۔

”کیا یہ بھی نماز۔۔۔؟“ اسکے دل نے سوال کیا۔

”ہاں گناہوں کا بوجھ ہکا کرنے کی ایک ناکام کوشش شاید۔۔۔“ وہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھے اسے دیکھنے لگا۔ اس کی دعا کافی طویل تھی۔ اور اس پورے عرصے میں اس کی بند پلکوں سے آنسوؤں کا سیلاب جاری تھا۔

اس کے چہرے پر اس قدر معصومیت اور نور طاری تھا کہ وہ ٹمٹکی باندھے اسے دیکھ چلا گیا تھا۔

اب وہ سجدے میں پڑی تھی۔۔۔

شاید ضبط چھوڑنے لگی تھی۔۔۔ ہارنے لگی تھی۔

حوصلے کی طنائیں چھوٹنے کو تھیں۔۔۔ اس کا نازک سراپا رات کی دھیمی روشنی میں دھیرے دھیرے لرز رہا تھا۔

وہ منتظر تھا۔ وہ اٹھے اور وہ سوال کرے۔۔۔ کیونکہ سوال کرنا ہی فرض بنتا تھا۔۔۔ اس پلید مقام پر اس قدر پاک کام کیوں۔۔۔ وہ دل کو دو، دو کام کرنے پر آمادہ کیوں کر رکھے ہوئے تھی۔

وہ گناہ اور توبہ کو ساتھ ساتھ لے کر کیسے چل رہی تھی۔ جس جھروکے میں بن سنور کر اس کی بوسیدہ لکڑی کے بنگلے سے لٹک لٹک کر گاہک تلاشتی، اس کے خستہ فرش پر یوں سجدہ ریز وہ کیونکر ہو سکتی تھی۔۔۔ ہو پار ہی تھی۔

سوال اٹھتے چلے آ رہے تھے۔۔۔ سجدہ طویل تر ہوتا جا رہا تھا۔

اور اسے حیرت تھی اس قدر سردی میں وہ بھی اس کے انتظار سے بیزار نہیں ہو رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

سین زربینہ بیگم کی اس دن کی حرکت سے کافی پریشان تھیں۔ بار بار ان کو فون بھی ملتا رہی لیکن انہوں نے فون اٹھایا نہ وہ آئیں۔

”خواہ مخواہ ہی اس کی فکر میں گھل رہی ہو۔ آج نہیں تو کل ضرور آجائے گی۔ دیکھ لینا۔۔۔“ اماں نے بہو کی پریشانی ہمیشہ کی طرح

بھانپ لی تھی۔

”آپ کو بھی کیا ضرورت تھی اماں، زرینہ بی کو تو بولنے کی عادت ہے۔ جب میں برا نہیں مانتی تو آپ کیوں ان کو اس طرح ناراض کر دیتی ہیں۔“ انہوں نے اماں سے پیار بھرا شکوہ کیا۔

”تو بھلے نہ مان لالہ تو مانتی ہے ناں۔“ اماں کو تاسف نے آگھیرا۔

”کیا سمجھتی ہو تم ان لوگوں کی باتوں کی وجہ سے تمہارے اور لالہ کے درمیان جو فاصلے در آئے ہیں میں ان سے بے خبر ہوں؟“ انہوں نے جھریوں زدہ ہاتھوں میں سین کا نرم ہاتھ تھا تو نہ جانے کیوں سین کی آنکھیں بھینگنے لگیں۔

”اس زرین کی وجہ سے اور لوگوں نے بھی شہ پکڑی ہے۔ اور میں نہیں چاہتی کہ میرے مرضی کی نشانیاں، روح پر زخم لیے کر لاتی رہیں۔ میں زرینہ کی خفگی برداشت کر سکتی ہوں مگر تیرے اور لالہ کے آنسو نہیں۔“ انہوں نے سین کو خود میں سمولیا تھا۔ ضعیف آنکھوں نے دو آنسو ان کے کرب پر وارد دیے تھے۔

اسی وقت باہر حمزہ کی بانیک چنگھاڑی تھی۔

”لوگی تمہاری زرینہ۔۔۔“ اماں نے مسکراتے ہوئے ان کو خود سے الگ کیا۔

”حمزہ ہوگا۔۔۔“ وہ بے یقین تھیں۔

”وہی ہے۔“ اماں نے شرارت سے بانیں آنکھ دبائی۔ اسی وقت دروازہ کھلا اور حمزہ اور اقرا کی ہمراہی میں زرینہ اندر چلی آئیں۔ سین نے سب کو مسکرا کر خوش آمدید کہا۔

”السلام علیکم اماں۔۔۔“ زرینہ کمال اعتماد سے ماں کے گلے لگی۔

”وعلیکم السلام“ اماں نے بھی بانیں پھیلا دیں۔

”کیسی ہے ثمنینہ۔۔۔“ ان کی اگلی بات پر سب حیرت سے انہیں دیکھنے لگے تھے۔

”کون ثمنینہ اماں۔۔۔“ انہوں نے حیرت سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اقرا اور حمزہ کی آنکھوں میں بھی حیرت کا تاثر تھا۔

البتہ سین کے ہونٹ اماں کی شرارت سمجھ کے مسکرا دیے تھے۔۔۔

”لے۔۔۔ بھول گئی۔۔۔ تو نے ہی تو کہا تھا کہ آئندہ اس گھر میں قدم رکھوں تو نام بدل دینا۔۔۔ بس میں نے تیرا نام بدل

دیا۔۔۔ اقرا اور حمزہ کا قہقہہ بے ساختہ تھا جو ماں کی گھوری دیکھ کر اگلے ہی پل دم توڑ گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

”ایسی بری جگہ پہ کوئی یوں سجدے میں گر گڑا سکتا ہے۔۔۔ تم نے تو آج مجھے شک کد کر دیا ہے۔“ وہ شاید رات بھر یونہی روتی رہتی

سجدے میں گر کر۔۔۔ اگر ضیا کی موجودگی کے احساس نے اسے چونکا نہ دیا ہوتا۔ ربط میں توجہ نہ رہی تو رابطہ بھی ٹوٹ گیا۔ وہ چہرہ صاف کر کے اندر آئی تو وہ بھی اس کے پیچھے چلا آیا۔

اس کے صوفے پر بیٹھتے ہی اس نے زمزمہ سے پوچھا تھا۔

”جده کوئی اچھی یا بری نہیں ہوتی خان۔۔۔ اچھا یا برا اسے ہمارا عمل بناتا ہے۔“ سفید چادر کو کھول کر اپنے ارد گرد لپیٹتی وہ کوئی اپسرا لگ رہی تھی۔ ضیا کو نظروں کا رخ پھیرنا پڑا۔

”مطلب۔۔۔“ وہ ناتجہی سے دور پڑے گلاس باؤل کو دیکھنے لگا جس میں دورنگ برنگی مچھلیاں تیر رہی تھیں۔

”مطلب یہ کہ اگر کوئی اس جگہ اپنا گھر بنانا تو اس جگہ کا استعمال اچھا ہوتا۔ مسجد بنانا تو اور زیادہ اچھا ہوتا۔ لیکن دنیا والوں نے یہاں پر مجرا خانہ آباد کر لیا اس میں اس جگہ کا بھلا کیا قصور۔۔۔؟“

”میں پھر بھی نہیں سمجھا؟“ وہ واقعی نہیں سمجھ پایا تھا۔

”بس پھر چھوڑو آپ۔۔۔ کچھ باتیں کونا سمجھ ہی رہے دو خان۔“ وہ تھکے تھکے انداز میں بولی۔

”تم بیڈ پر چلی جاؤ۔“ وہ اس کے قریب آٹھرا۔ تھکن اس قدر زیادہ تھی کہ وہ انکار نہ کر سکی اور گرم بستر میں آگئی۔ ضیا وہیں صوفے پر بیٹھ گیا۔

”ایک بات پوچھوں۔۔۔؟“ ضیا نے اجازت چاہی۔

”جی۔۔۔“ زمزمہ مسکرا دی۔

”پہلی دفعہ جب میں تمہارے کمرے میں آیا تھا تو تم نے مجھے تم کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ اور اس کے بعد ہر ملاقات میں آپ اس کی وجہ جان سکتا ہوا؟“ ہاتھوں کی مٹھیاں بنائے ٹھوڑی اس کے اوپر رکھے اس نے سوال کیا۔

”کیونکہ۔۔۔“ زمزمہ تکیے کا سہارا لے کر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ کمرے میں اپنے اوپر کھینچ لیا۔

”اس دن مجھے لگا تھا میری دعا رد ہوگئی۔ اور آپ میرے پہلے گا ہک ہیں۔ لیکن اسی دن آپ کے چلے جانے کے بعد مجھے احساس ہوا تھا کہ دعا رد ہوئی تھی نہ قبول۔۔۔ بلکہ آپ کی صورت مجھے ایک امید دکھا دی گئی تھی۔ اور شاید یہ روشنی بھی کہ دعا مانگنا نہ چھوڑو۔

”اب اس بات کا مطلب؟“ وہ اٹھ کر اس سے کافی فاصلے پر بیڈ کے سرے پر بیٹھ گیا۔

”میں جب سے یہاں آئی ہوں، کوئی بھی ایسا آدمی نہیں تھا جو میری طلب کرتا۔۔۔ لیکن پھر بھی مجھے ہمیشہ ہی یہ خوف کھائے جاتا کہ کون ہوگا جو مجھے رد نہیں کر پائے گا۔ مجھے خریدے گا اور پھر میں بھی اس سیلن زدہ جگہ کی بدبودار کائی کی طرح گلنے سڑنے لگوں گی۔“ وہ کمرے میں اتر آئی اور آہستہ آہستہ چلتی اس چمک کے قریب آگئی۔ ضیا بھی اس کے پیچھے آگیا تھا۔

”مطلب تمہیں لگتا ہے کہ میں تمہاری کسی دعا کے طفیل یہاں بھیجا گیا ہوں اور میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔“ وہ اس کی بات پر طنز اُٹھنا۔

”ہاں خان ایسا ہی ہے۔“ وہ پر یقین لہجے میں بولی۔ اس کے لہجے میں اس قدر یقین تھا ضیا گنگ رہ گیا تھا۔

”پتا ہے خان، رات کے اس پہر جب اس محلے ہر جھروکے پہ روشنیاں، بجلیاں اور نسوانی حسن چمکتا ہے تو میرے جھروکے پر اندھیرا کیوں رہتا ہے۔“ وہ مڑ کر چلتے ہوئے اس کے قریب آرکی۔ ضیا نے ایک ٹرانس کی کیفیت میں نفی میں سر ہلایا تھا۔

”کیونکہ یہاں میں کسی انسان کو نہ یاد کرتی ہوں نہ کسی انسان سے مدد مانگتی ہوں۔ یہاں صرف میں اور میرا خدا ہوتے ہیں، میں روتی ہوں، اسے پکارتی ہوں تو بہ کرتی ہوں معافی مانگتی ہوں۔ اور اگلی شام پھر ناچ ناچ کر، کسی امیر زادے کے سامنے لگی لائن میں کھڑی ہو جاتی ہوں۔ اور وہ آرام سے مجھے دھتکار کر مجھ سے شکل و صورت میں کہیں کم لڑکی کو چین سب کو حیران چھوڑ جاتا ہے۔ اب تو خانم بھی مجھ سے عاجز آنے لگی تھی۔۔۔ اور تب آپ نے مجھے چن لیا اور اس دن مجھے یقین ہو چلا تھا کہ

کہ میرے خدا نے میری دعائیں، میرے آنسو رد کر دیے ہیں۔۔۔ لیکن پھر آپ کی ذات نے تو مجھے باور کرایا کہ میرا کرلانا اس نے سن لیا، میں نے غلطی کی تھی، گناہ کی دلدل میں آ پھنسی تھی لیکن مجھے بہر حال گناہ سے نفرت تھی۔۔۔ میں نے غلطی کی بھی تو بہ کی اور گناہ سے پناہ مانگی۔۔۔ اور جس نے پناہ دینے کا وعدہ کیا تھا۔۔۔ اس نے مجھے پناہ دی۔۔۔ میری دعا بظاہر قبول نہیں ہوئی۔ مجھے یہاں سے چھٹکارا نہ ملا لیکن میری دعا رد بھی تو نہیں ہوئی ناں۔۔۔ میں گناہ میں رہ کر بھی پناہ میں رہی۔“ اس کی آواز اس کا چہرہ بھیگنے لگا تھا۔

”میں نے اسی لیے تو بہ معافی، گریہ کے اوقات بڑھا دیے۔۔۔ اور پھر کیا ہے جو میرے رب کے لیے ناممکن ہے۔ صرف وہی ذات پاک ہے جو سب کر سکتا ہے۔ آپ کے آنے کے بعد میرا یہ یقین اور پختہ ہو گیا ہے اور امید بڑھ گیا ہے۔ وہ ضرور مجھے معاف کر دے گا۔“ وہ ٹھنڈے فرش پر ڈھے سی گئی اور دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رووی تھی۔ اور ضیا علی خان نے اس رات جان لیا تھا۔ کوئی عورت طوائف نہیں ہوتی، بس حالات کے ہاتھوں ہار جاتی ہے۔ اس نے شکر کیا تھا کہ زمزم نہیں ہاری تھی۔

☆.....☆.....☆

”لڑکیاں نہ جانے کیوں اپنے دل کو شیشے کی طرح رکھتی ہیں یا شاید ان کے دل بے ہی شیشے کی طرح ہوتے ہیں، کسی کا بھی عکس جھلما جائے ایک بار اس آئینے میں بار بار اسی کو تلاشتی ہیں۔ ایک بت گتراش لیتی ہیں، خود ہی سوچ لیتی ہیں کہ وہ کردار و اخلاق اور زبان کا کس قدر بلند ہوگا۔

”میں کہتی ہوں عورت کو مات دینی ہو تو اس سے محبت کر لو۔۔۔ چاروں شانے چت کرتی ہے محبت میں یہ۔۔۔“

رات بھیگتے بھیگتے اپنے آخری سفر پر روانہ ہو چلی تھی۔ سردی کی رات کو خدا حافظ کہنے اور صبح کو خوش آمدید کرنے والی ٹھنڈی ہوا میں تیزی آئی تھی۔ جھروکے کے آغاز پہ لگی جتن ہلنے لگی تھی۔ ہاتھوں کی بند مٹھی پر ٹھوڑی جمائے ضیا علی خان کی نظریں اس کے روتے، بولتے وجود پر آ پڑی تھیں۔

”میری شادی میرے کزن سے ہوئی تھی، چچا زاد تھا میرا۔۔۔“ وہ مزید بتانے لگی۔ جب ضیاء نے اچانک اس کی بات کاٹی۔
 ”اوہ تو مطلب تمہیں تمہارے شوہر نے بچا۔“ اس کی آواز میں تاسف تھا۔

”کسی بھی بات کے متعلق غجلت میں اندازے نہیں لگایا کرتے خان ورنہ صرف خسارے ہاتھ آتے ہیں۔“ وہ تلخی سے مسکرائی تھی۔

”انہی اندازوں نے تو میری زندگی تباہ کر دی۔“ اس نے گیلیے گال رگڑ کے صاف کیے۔ ضیاء نے ان کی بارخاموش رہا تھا۔

”وہ مجھے بے حد چاہتا تھا۔۔۔ حد سے زیادہ۔۔۔ اور اس کی چاہ میرے سارے سسرال والوں کی آنکھوں میں کھلنے لگی تھی۔ میرا

نام لے کر وہ جیسے سانسیں لیتا تھا۔۔۔ میں دکھائی نہ دیتی تو اس کی جان پر بن آتی۔۔۔ میرے گھر والوں نے اس کو مجھ سے بدظن کرنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی لیکن وہ میرا تھا۔۔۔ اسے بس میری چاہ تھی وہ کسی کی بات پر کان نہ دھرتا۔۔۔ حتیٰ کہ میرے سسرال والوں نے مجھ پر گھٹیا ترین الزام تک لگائے لیکن وہ ان سنی کر گیا۔ لیکن میں نہ کر سکی خان۔“ وہ سسکی

”اس کی ایک کزن ہمارے گھر رہنے آئی تھی۔ اس کی ماں، میری چاچی کے خاندان سے تھی۔ چاچی کے دور پرے کے رشتے

داروں کی بیٹی۔۔۔ نہ جانے کیوں پہلے ہی مجھے اس کا آنا کھکا تھا۔ پھر بھی میں نے کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ لیکن کچھ دن بعد ہی مجھے پتا

چلا کہ میرے شوہر عبدل خان کی شادی پہلے اسی سے ہونے والی تھی۔ لیکن اس نے ضد کر کے مجھ سے شادی کی تھی۔ میری دیورانی، میری

ساس بہانے بہانے سے ان دونوں کو قریب کرتیں۔۔۔ اور مجھے باتوں میں بھی سنا دیتیں کہ پہلے تو ان کی ایک دوسرے

میں دلچسپی تھی۔ پھر ایک دن مجھے دیورانی نے بتایا کہ اس نے رات عبدل اور مینا کو چھت پر دیکھا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ واقعی رات

جب میری آنکھ کھلی تھی تو عبدل کمرے میں نہیں تھا۔ اور میں نے اس کی بات پر بھروسہ کر لیا۔“ زمزمہ کی آنکھیں برسنا شروع ہو گئیں تھیں۔ وہ

رونے لگی تھی۔ بہت دیر تک وہ یونہی ساکت بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔۔۔ پھر دھیرے سے اپنی چادر اور کوٹ سنبھالے اور کمرے سے باہر نکل

گیا۔۔۔ وہ روتی رہی تھی۔۔۔

☆.....☆.....☆

”نمرہ کے اصرار پر وہ اس کے ساتھ بازار آ تو گئی تھی مگر اب بری طرح بچھتا رہی تھی۔ بازار میں کافی رش تھا۔ کندھے سے کندھا

مس ہوئے جاتا تھا۔ اسے بے انتہا کوفت ہو رہی تھی۔

”پتا نہیں لوگ کیسے روز روز بازار کے چکر لگاتے ہیں میرا تو دل گھبرا جاتا ہے۔“

آن بازار میں رش واقعی کچھ زیادہ ہی تھا کہ خود نمرہ کو گھٹن سی محسوس ہو رہی تھی۔

”چل آؤں کریم کھاتے ہیں۔“ سامنے ہی آؤں کریم والے کو آتا دیکھ کر اس کا دل لپچایا۔ لالہ کا ہاتھ کھینچے وہ زبردستی اسے وہاں

لے آئی۔ لالہ نے بمشکل ہاتھ میں پکڑ سے شارپز سنبھالتے ہوئے اپنی فیورٹ آؤں کریم تھامی۔

”چل واپس شو اسٹور پر ملتے ہیں۔ بس دو تین شوز اور۔۔۔“ لالہ اسے گھور کے رہ گئی۔ اور پھر وہ سامنے سے رش سے بچتے بچاتے آتے موٹر سائیکل سوار ایسے خود کو ٹکرانے سے بچانے کے لیے تیزی سے پیچھے کی طرف مڑی تھی۔ اور پیچھے بالکل قریب اس شخص کے چوڑے سینے سے بہت بری طرح ٹکرائی تھی۔ ہاتھ میں پکڑی آئس کریم اب مقابل کے خوب صورت بلیک کورٹ پر لگی اس کا منہ چڑا رہی تھی۔ اس نے نظریں اٹھا کر سوری کرنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ اپنے سامنے ضیاعلی خان کو دیکھتے ہی سارا لحاظ ایک پل میں ہوا ہوا تھا۔

”دیکھ کر نہیں چل سکتے، اندھے ہو کیا؟“ بدتمیزی سے کالی سیاہ آنکھوں سے گھورتے ہوئے پوچھا گیا۔ رنگ بدلتی خوب صورت نگاہیں اس پر جم سی گئی تھیں۔

”اوہ بی بی۔۔۔ خان تو۔۔۔“ گن مین فوراً آگے آیا تھا کہ ضیاعلی نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔ ”دوران غلطی میری ہی ہے۔“ لالہ نے دیکھا تھا وہ جمسکر اتا تو اس کے دائیں گال پر پڑنے والی لکیر کافی گہری ہو جاتی اور رنگ بدلتی آنکھیں بھی مسکرا دیتیں۔ وہ نظریں ہٹا نہیں پائی تھی۔

”مجھے ان کے مڑنے کی خبر رکھنی چاہیے تھی نا۔۔۔“ اس کی سادگی پر نمرہ دل ہی دل میں سو جان سے فدا ہوئی۔ ”جیسے کہ ہمیشہ رکھتا ہوں۔۔۔“ وہی دوستانہ قاتل مسکراہٹ نمرہ نے بت بنی کھڑی لالہ کو کہنی ماری۔ لالہ چونکی پھر آئس کریم سے تھڑے دونوں ہاتھ بھی اس کے کوٹ پر گر ڈالے تھے۔

”لالہ۔۔۔“ نمرہ چیخنی۔

”آئندہ مجھ سے ٹکرانے کی کوشش کی نا تو آج تو کپڑے خراب کیے ہیں اگلی بار شکل خراب کر دوں گی۔“ اس نے شہادت کی انگلی دکھا کے وارن کیا۔

”آپ کے لیے کچھ بھی۔“ وہ کارنش بجالایا تھا سینے پر ہاتھ دھرے۔ وہ غصے سے پلٹی تھی اور نمرہ اسے صلو اتیں سناتی ہوئی۔

☆.....☆.....☆

”پاگل ہو تم۔۔۔“ نمرہ کو اس کی ذہنی حالت پر شک وہ رہا تھا۔ ”اتنا ہینڈسم بندہ ٹکرا جائے تو بندہ آرام سے سوری ہی کر دیتا ہے۔ کیا پتا بات ہی بن جائے۔“ وہ شرارت سے کھلکھلائی۔۔۔ لالہ نے اسے غصیلی نگاہوں سے دیکھا۔ وہ کندھے، غلطی تمہاری ہی تھی نہ مانو وہ اور بات ہے۔“ لالہ خاموشی سے چلتی رہی۔ ”واہ ایک تو چوری اوپر سے سینہ زوری۔۔۔“ وہ مزید بڑبڑائی۔

”ایک تو اس بیچارے کا اتنا پیارا کوٹ خراب ہو گیا۔ اوپر سے برس بھی شہزادی ہی رہی تھیں، سبحان اللہ۔۔۔“ مزید سنایا گیا۔
 ”تم دومنٹ کے لیے چپ نہیں رہ سکتیں۔“ وہ بھڑک اٹھی۔
 ”لالہ“ نمرہ کہاں اسے سن رہی تھی۔

”ادھر دیکھو۔۔۔“ لالہ نے ریٹورنٹ کے اندر جانے سے پہلے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا۔ سفید شرٹ کی آہٹیں
 فولڈ کیے ان کی طرف ہی دیکھ رہا تھا وہ خراب کوٹ اتار چکا تھا۔
 ”ہائے تو میری طرف دیکھ رہا ہے۔ نمرہ نے پوری باجھیں کھول کے ضیا کی طرف دیکھتے ہوئے ہاتھ ہلایا۔ ضیا نے بھی جیسے ہاتھ
 کے اشارے سے جواب دیا تھا۔

”مروتم۔۔۔“ اسے کمر پر دھپ رسید کرتی وہ گلاس ڈور دھکیلتے اندر چلی گئی۔
 ضیا کی ڈمپل زدہ مسکراہٹ کے جواب میں مسکراہٹ اچھالتی نمرہ نے بھی تیزی سے اس کی تقلید کی تھی۔
 ☆.....☆.....☆

”سناتم نے۔۔۔“ وہ لیپ ٹاپ پر کام کر رہا تھا جب زرینہ بیگم غصے سے ہانپتی کانپتی اندر آئیں۔
 ”کیا ہو گیا امی۔۔۔“ نظریں ہٹائے بغیر اس نے پوچھا۔
 ”ابھی رضیہ کا فون آیا تھا۔“ لالہ کی پڑوسن کا نام سنتے ہی لالہ کا حلق تک کڑوا ہو گیا تھا۔
 ”وہ لالہ بیگم اپنی یونیورسٹی کی کسی دوست ل کے ساتھ شاپنگ کرنے گئی ہے۔“ زرینہ بیگم نے ایک ایک لفظ چبا کر ادا کیا۔
 ”یہ رضیہ خالہ کو کوئی اور کام نہیں کہہ سارا دن ادھر ادھر کی لگائی، بجھائی کرتی رہتی ہیں۔“ وہ تلخ ہوا۔
 ”کہیں کچھ نہیں کرتی۔ صرف مجھے بتاتی رہتی ہے خوار ہے میری۔۔۔ ورنہ سین اور اماں کہاں کچھ ظاہر کرتی ہیں۔“ زرینہ انتہائی
 بدنظن تھیں حمزہ کو افسوس ہوا۔

”اچھا مجھے کام ہے مجھے کم از کم ان بکھیڑوں سے دور رکھیں۔“ وہ تنگ آ کر بات ہی ختم کر گیا۔
 ”تمہارے بھلے کے لیے بتاتی ہوں تمہاری نظروں میں مجھے اس کی تصویر نظر آتا ہے، اب تم تو بچے ہو۔ میں ماں ہوں، میرا فرض
 ہے کہ تمہیں اس کی حقیقت سے آگاہ کروں۔“ وہ اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے فکر مند سی بولیں۔
 ”مجھے بس آپ معاف کر دیں امی۔۔۔“ وہ تملاکر کہتا اٹھ کھڑا ہوا۔
 ”اقرار۔۔۔ اقرار۔۔۔“ کمرے سے باہر آ کر وہ پکارا تھا۔
 ”ارے بہن کو کیوں آواز دے رہے ہو اسے کیا پتا لالہ کے بارے میں۔“ زرینہ بدحواس ہوئیں۔
 ”تو بہ امی۔۔۔“ حمزہ مزید چڑ گیا۔

”مجھے بس اسے ایک کپ چائے کا کہنا تھا۔“ ضبط سے وہ لب کاٹنے لگا تھا۔

”وہ تو ایسے کہو ناں۔۔۔“ زرینہ کھسیانی ہنسی ہنس دیں۔

”میں بنا دیتی ہوں ناں چائے“ فوراً پکن کی طرف بڑھیں۔

”کیوں۔۔۔ اقرار کہاں ہے۔۔۔“ حمزہ نے ویسے ہی پوچھ لیا۔

”آج سہیلی کے گھر روپ اسٹڈی کرنی تھی۔ بس وہیں ہوگی۔“ انہیں بتانا پڑا۔

”کس سہیلی کے گھر؟“ اسے غصہ آنے لگا۔

”یہ تو میں نے نہیں پوچھا؟“

”دوسروں کے بجائے اپنی بیٹی کی خبر رکھا کریں امی ہمارے لیے یہی اچھا ہوگا۔“ غصے سے کہتا وہ اندر چلا گیا زرینہ زیر لب پھر

اسے کچھ سنانے لگی تھیں۔

☆.....☆.....☆

ریسٹورنٹ کے اندر چھوٹے چھوٹے لکڑی سے کیبن بنائے گئے تھے۔ یہ کیبن خالصتاً فیملی کے لیے استعمال ہوتے تھے تاکہ

بانکسی مشکل کے ایک فیملی آرام دہ اور پرسکون ماحول میں کھانا انجوائے کر سکے۔ ایک طرف کھلی جگہ پر نوجوان لڑکوں کے لیے اور مردوں

کے لیے علیحدہ انتظام تھا۔ لالہ اسے لیے آگے کی طرف آگئی۔

”میری آئس کریم تو ضائع ہوگئی۔۔۔ یہاں جوس پی لیں گے آرام سے۔“ اس قدرے کونے والے کیبن کی طرف اشارہ

کرتے ہوئے کہا۔ تبھی بالکل اچانک اس کے ہاتھ سے کلچ چھوٹا تھا اور سامنے والے کیبن کے پردے کے ذرا پیچھے اندر کی طرف گر پڑا۔

اس نے تیزی سے جھک کر اٹھایا اور سیدھی ہونے لگی کہ پردہ اس سے الجھ کر ایک طرف کھسک گیا۔ سامنے نظر آنے والا منظر لالہ کے ہوش

اڑانے کے لیے کافی تھا۔ سامنے بیٹنج پر ایک لڑکے کا ہاتھ تھا سے ب بیٹھی بلاشبہ وہ اقرار ہی تھی اسے دیکھتے ہی وہ ایک جھٹکے

سے اٹھی تھی۔ ساتھ بیٹھے نوجوان کے چہرے پر بھی گھبراہٹ طاری ہوئی تھی۔

”لالہ تم۔۔۔ تم یہاں؟ اقرار کی زبان لڑکھڑا گئی تھی۔



ناول ”محبت لفظ ہے لیکن“ ابھی جاری ہے۔ اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی 10 تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

قسط نمبر 4

”ماں باپ کے سامنے بہت سوچ سمجھ کر بولا کرو کیوں کہ کبھی کبھی ان کے سامنے بولا گیا کوئی بھی برایا اچھا کلام ہماری پوری قسمت پہ حاوی ہو جاتا ہے۔“

”یہ سوال تو مجھے تم سے پوچھنا چاہیے۔“ لالہ کے لہجے میں خود بخود تلخی اُٹھ آئی تھی۔ نمرہ نا سنجھی سے البتہ ان سب کو دیکھے جا رہی تھی۔ لالہ کی آنکھوں میں یکنخت لودیتی شناسائی سے وہ اتنا تو سمجھ گئی تھی کہ وہ سب ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ لیکن اس وقت کی پتویشن اس کی سمجھ سے باہر تھی۔ تبھی وہ لالہ کے پیچھے خاموشی سے کھڑی تھی۔

”ایکسیکوزمی میم۔۔۔ آپ پلیز آگے کوئی سیٹ دیکھ لیں۔“ ویٹران کو یوں کھڑا دیکھ کر کچھ اور سمجھا تھا۔ تبھی فوراً پیشہ ورانہ لہجے میں کہتا ان کا جھگڑا نمٹانے چلا آیا تھا۔

”نہیں کوئی مسئلہ نہیں ہے ہم چاروں ساتھ ہیں۔“ لالہ نے سمجھداری سے فی الحال اس کو تو سر سے ٹالا۔ وہ سر ہلاتا تیزی سے مڑ گیا تھا۔

”اٹھو، چلو میرے ساتھ۔“ لالہ نے آگے بڑھ کر اقرار کا ہاتھ پکڑا۔

”میں خود چلی جاؤں گی۔“ وہ پیچھے ہوئی۔

”یہ ہے کون اقرار؟“ آغا کو غصہ آنے لگا۔

”اس کے آس پاس دوبارہ نظر آئے ناں تو بتاؤں گی کہ میں اس کی کون ہوں۔“ جھٹکے سے کھینچ کر اس کو اٹھاتی لالہ نے ساتھ آغا کو بھی وارن کیا تھا۔

”چلو اب۔“ اسے اپنے آگے کرتے ہوئے لالہ نے دکھا دیا تھا۔ اب کی بار اس نے کوئی مذاحمت نہیں کی۔ خاموشی سے آگے

چلنے لگی تھی نمرہ بھی ان کے پیچھے تھی۔ آغا ساکت سا کھڑا رہا۔

کچھ دیر بعد ہی وہ ٹیکسی لے کر گھر جا رہے تھے نمرہ سارا راستہ خاموش رہی تھی اور اسی عادت کی وجہ سے وہ لالہ کو عزیز تھی۔ وہ خواہ مخواہ کسی کی بات میں مداخلت نہیں کرتی تھی معاملات کی نزاکت کو وہ فوری بھانپ لیتی تھی۔ لالہ نے پہلے نمرہ کو گھر چھوڑا پھر اقرار کو لیے گھر کے قریب ہی پارک میں آگئی تھی۔ اقرار نے ابھی تک اس سے دوبارہ کوئی بات کرنے کی ہمت نہیں کی تھی۔ البتہ اس کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ کس قدر گھبرائی ہوئی ہے۔ اور اسکے ذہن میں کوئی جھوٹ گھڑنے کے لیے کس قدر سوچ بچار جا رہی ہے۔

ٹھنڈی نرم گھاس پر بیٹھتے ہی اس نے سب سے پہلے حمزہ کو کال ملائی جو اس نے دوسری بیل پر پک کر لی تھی۔

”ہیلو حمزہ۔۔۔ اقرار میرے ساتھ ہے تم اور پھوپھو پریشان مت ہونا۔“ اس کے کچھ بولنے سے پہلے ہی وہ تیز لہجے میں بولی تھی۔

وہ حیران ہوا۔

”لیکن وہ تو۔۔۔“

”ہاں۔۔۔ پھر بتاؤں گی ابھی مجھے شاپنگ کرنی ہے بائے۔۔۔“ وہ جانتی تھی اقرار نے کوئی نہ کوئی بہانہ گھڑا ہوگا گھر پر۔۔۔ تبھی

وہ زیادہ بات نہیں کر سکتی تھی حمزہ سے۔ فون بند کر کے اب اس کی نظریں اقرار پر جمی تھیں۔ جو گھاس پر نظریں گاڑے انگلیاں مروڑ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر شرمندگی تھی مطلب اس کے سدھرنے کے چانسز تھے۔ وہ اسے سنبھال سکتی تھی۔

”اقرار کون تھا وہ لڑکا۔۔۔؟“ اس نے براہ راست ہی بات کرنے کا سوچا۔ گہری نظریں اقرار کے گھبرائے چہرے پر جمی تھیں۔

”مجھ سے جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں۔۔۔“ کافی دیر اس کے بولنے کا انتظار کرنے کے بعد اس نے خود ہی دوبارہ بات

شروع کی۔

”اگر اس لڑکے کو اچھی طرح جانتی ہو تو سب مجھے سچ، سچ بتا دو۔۔۔ میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ یہ ساری بات اور آج کا یہ

واقعہ تمہارے اور میرے درمیان رہے گا۔“ اس کی بات پر اقرار نے پہلی بار نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ لالہ نے صاف محسوس کیا تھا کہ اس کی بات پر اقرار کی آنکھوں میں چمک سی ابھری تھی۔

”امی آپ کو اور ممانی کو اتنا ہرٹ کرتی ہیں آپ پھر بھی یہ بات چھپالیں گی سچ میں۔۔۔؟“

اس کی بات سن کر لالہ نے ایک لمبی سانس کھینچی اس سے صاف ظاہر تھا کہ اقرار صرف آج کے واقعے سے ہی نہیں گھبرائی تھی بلکہ

اسے یہ بھی ڈر تھا کہ اسے کسی اور نے نہیں بلکہ لالہ نے دیکھا تھا جو پھوپھو کے نامناسب رویے کی وجہ سے ان کی ساری فیملی سے دور ہوتی گئی تھی۔ اقرار کو یقیناً اس سے یہ خوف تھا کہ وہ اس کی ماں سے بدلہ لینے کے لیے اس موقع کا بخوبی فائدہ اٹھا سکتی تھی۔ تبھی وہ شاید زیادہ خوفزدہ بھی لگ رہی تھی۔

”میں تمہاری ماں کی طرح تو ہرگز نہیں ہوں کہ سگے رشتوں کے دامن پر کیچڑ اچھالوں۔ تم کھل کر بات کر سکتی ہو مجھ سے۔“ نہ

جانے کیوں خود بہ خود اسکے لہجے میں تلخی سی گھل گئی تھی۔ اقرار کا سر مزید جھک گیا تھا۔

”اس کا نام دانیال ہے آغا کے نام سے جانتے ہیں سب۔“ گھاس پہ شہادت کی انگلی پھیرتے وہ دھیمے لہجے میں بتانے لگی۔

”تم ایک دوسرے کو کب سے جانتے ہو؟“ لالہ اہم بات کی طرف براہ راست آتے ہوئے بولی۔

”دو سال سے۔۔۔ آغا ہماری گلی میں ہی رہتا ہے۔ ایک دو گھر چھوڑ کر۔“ اس نے بتایا لہجے میں سچائی تھی۔

”میں اور وہ ایک دوسرے کو بے حد چاہتے ہیں، آغا اچھا لڑکا ہے سب لوگ اس کی تعریف کرتے ہیں، اچھا پڑھا لکھا ہے بس ابھی بے روزگار ہے۔“ اس نے سب کچھ تفصیل سے بتایا۔

”پھپھو جانتی ہیں سب؟“ لالہ کی گہری نظریں اقرا کے چہرے پر جمی تھیں۔

”جی۔۔۔ اس کی فیملی کو اچھی طرح جانتی ہیں لیکن ہمارے بارے میں نہیں۔“ اس نے ہاتھ روکتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے

جھاڑ کر صاف کیا تھا۔

”ہاں وہ تو پتا ہے مجھے۔۔۔“ لالہ نے سر ہلایا۔

”خیر۔۔۔ میں یہ نہیں کہتی کہ آغا برا لڑکا ہے۔“ وہ سیدھی ہو کے بیٹھ گئی۔ اقرا کی نظریں اب اسے دیکھ رہی تھیں۔

”لیکن وہ تمہارے لیے ہے تو ناخرم۔۔۔ اور میں نہیں چاہتی کہ تمہارا مان، تمہارا یقین کبھی ٹوٹے۔ اس لیے اب تم آغا سے کبھی

یوں اکیلے ملنے نہیں جاؤ گی۔“ اس نے دو ٹوک فیصلہ سنایا۔

”لیکن۔۔۔“ اقرا بری طرح مچلی۔۔۔ لالہ نے ہاتھ کھڑا کر کے اسے کچھ بھی بولنے سے روک دیا۔

”تم ابھی نا سمجھ ہو اقرا۔۔۔ پھر جس طرح پھپھو دوسروں کی بیٹیوں پہ کچھڑا اچھا لیتی پھرتی ہیں، میں نہیں چاہتی کہ کسی کی آہ

تمہارے دامن سے آ لپٹے۔ اسی لیے تمہیں میری اتنی سی بات تو ماننی پڑے گی۔۔۔“ اس کے لہجے میں سختی در آئی اقرا انگلیاں مروڑنے لگی۔

”رہی بات آغا کی۔۔۔ تو تم جانتی ہو حمزہ مجھ سے کس قدر فرینک ہے میں کوشش کروں گی کوئی مناسب موقع دیکھتے ہی اس کے

متعلق حمزہ کی رائے جان سکوں۔“ اقرا کا نرم و ملائم ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے اس نے جیسے اسے حفاظت کا احساس دلایا تھا۔ اقرا

کے مضطرب چہرے پر مطمئن سی مسکراہٹ چمکی تھی۔

”سچ میں۔۔۔ آپ بات کریں گی بھیا۔۔۔ میرے اور آغا کے لیے؟“ پرامید نظروں سے خود کو گھورتی اقرا نہ جانے کیوں

اس سے اسے بے حد بدتمیز اور آوارہ سی لگی تھی۔

”کہہ دیا ناں۔۔۔ لیکن اب تم اس سے کبھی بھی کہیں بھی نہیں ملو گی۔“ سخت لہجے میں کہتی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اقرا نے بھی اس کی

تقلید کی۔

”اور یہ بات بھی یاد رہے اقرا۔۔۔“ ٹیکسی کو رکنے کا اشارہ کرتے ہوئے اس نے اچانک ہی اسے مخاطب کیا تھا اقرا چونک کر

اسے دیکھنے لگی۔

”اگر حمزہ آغا کی شخصیت سے ذرا بھی مطمئن نہ ہوا تو تمہیں اس راہ سے پلٹنا ہو گا۔۔۔ ورنہ میری امی کا حال تو تمہارے سامنے

ہی ہے۔“ تلخ لہجے میں کہتی وہ ٹیکسی میں سوار ہوئی تھی۔ اقرا کو البتہ اپنی جگہ سے ہلنے میں وقت لگا تھا۔

☆.....☆.....☆

شام بہت اداس تھی۔۔۔ سورج جاتے جاتے لہورنگ بکھیرنے پر تلا ہوا تھا۔ شہر سے دور نہر کے کنارے بے حد سکون تھا۔ پھر بھی ہر سواضطراب پر پھیلا نے میں کامیاب ہوتا جا رہا تھا۔ ہر طرف نارنجی شعاعیں آج کچھ زیادہ ہی شوخ ہو کر سرخ سی دھنکے لگی تھیں گہرے سبز فراک پر سفید رنگ کا بڑا سادو پٹہ لیے جامن کے پیڑ کی موٹی جڑ پر بیٹھی زمزمہ اس وقت بالکل اسی اداس منظر کا حصہ لگ رہی تھی۔ قریب ہی دو تین پکی اینٹوں کی سیٹ بنائے ضیا ننھے، ننھے کنکراٹھائے نہ جانے کیوں بار بار نہر کے ساکت پانی میں ہلچل مچا دیتا۔

”اس دن کے بعد میں کبھی اس شخص پر اعتبار نہ کر سکی۔۔۔ اور ضد میں آ کر میں ہر وقت بنے سنور نے لگی گھر کی چار دیواری سے باہر جھانکنے لگی۔ کوئی تیسرا راستہ ڈھونڈنے لگی۔۔۔ وہ مجھے چھوڑ سکتا ہے، میں اس سے بھی پہلے اسے چھوڑ سکتی ہوں۔ تھی ناں بے وقوف عورت۔۔۔“ وہ تلخی سے مسکرائی ضیا نے پتھر نیچے گیلی مٹی پر اچھال دیے اور مورتی بنی زمزمہ کو دیکھنے لگا۔ جو اس لہورنگ شام میں بے حد زخمی، زخمی لگ رہی تھی۔ بے حد بکھری ہوئی۔

”دل کے راستے اتنے کچے کیوں ہوتے ہیں ضیا ایک بار کوئی پھسل جائے۔۔۔ دل سے ہی نکل جاتا ہے۔“ اس نے اچانک ہی ضیا کو مخاطب کیا۔۔۔ ضیا خاموشی سے اسے دیکھ گیا۔

”لیکن وہ تو نہیں پھسلا تھا پھسل تو میں گئی اس کا اعتبار نہ کر کے خود کو بھی اعتبار کے قابل نہیں رکھ سکی۔“ وہ دور آسمان پر چھاتے اندھیرے کو دیکھنے لگی۔ جو دھیرے دھیرے اس کے وجود کے ساتھ ساری کائنات پر چھانے لگا تھا۔

”انہی دنوں مجھے اکبر ملا۔۔۔ وہ سوات سے تھا۔ ہمارے گھر کے سامنے والے ہوٹل میں کام کرتا تھا۔۔۔ مجھے دیکھتے ہی میرا دیوانہ ہو گیا۔“ وہ ہنسی تھی اور ضیا کو یوں ہنستے وہ گویا ماتم کرتی محسوس ہوئی۔

”پہلے پہل اس نے پتھر میں لپٹے خط میرے لیے ٹیس پر پھینکے۔۔۔ میں نہ جانے کیوں نہ گھبرائی نہ غصہ ہوئی۔ وہیں کھڑے کھڑے بڑی ادا سے پڑھتی، مسکراتی تم نے سنا ہے ضیا۔۔۔ ایک مرتبہ کسی نے کہا تھا کہ ہر عورت میں طوائف ہوتی ہے اور ہر طوائف میں ایک عورت۔۔۔ موقع ملنے ہی باہر آ جاتی ہے۔ بس میرے اندر کی بھی طوائف جاگ اٹھی تھی

بے جا غصے اور اندازوں کی وجہ سے۔۔۔ اکبر نے ایک قدم آگے بڑھایا۔۔۔ میں نے دس قدم۔۔۔ اور پھر ہم دونوں کو ایک دوسرے کے سوا کچھ اور دکھائی نہیں دیتا تھا۔۔۔ فیصلے کی گھڑی آئی۔۔۔ اور پھر اکبر کی باتوں میں آ کر میں چار دیواری کا تقدس پامال کرتے ہوئے گرد آلود راہوں کی مسافر بننے نکل پڑی۔ اکبر نے کہا تھا کہ کسی محفوظ مقام پر پہنچتے ہی خلع کا مقدمہ کر کے طلاق لے لیں گے اور پھر ہماری اپنی دنیا ہوگی۔۔۔ صرف میں اور وہ۔۔۔ اس کی پلکیں جھپکنے لگی تھیں ضیا پھر پتھر چننے لگا۔

”کاش یہ مجھے انہی چھوٹے کنکروں سے سنگسار کر دے“ زمزمہ نے اسے دیکھتے ہوئے سوچا۔

”محفوظ مقام آیا۔“ ضیا نے دور نہر میں پتھر اچھالتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں" زمزمہ نے گرم شال کو اپنے گرد لپیٹتے ہوئے کہا۔ سردی ایک دم ہی زیادہ لگنے لگی تھی۔

"خانم کا اڈہ۔" وہ قہقہہ مار کر ہنسی۔۔۔ ضیا کو نہ جانے کیوں غصہ سا آیا۔۔۔ ایک ساتھ کتنے ہی پتھر زور سے اچھال دیے۔ پانی میں ایک دم شور سا اٹھا تھا۔

"اس نے مجھے ایک کنواری لڑکی بنا کر میرے زیادہ دام اینٹھنے چاہے۔ میں پتھر بنی اپنا سودا ہوتا دیکھتی رہی۔۔۔ پھر جیسے میں مرکز دوبارہ زندہ ہوئی تھی۔ موت کے بعد حساب شروع ہوا تھا۔ میں نے اپنے اعمال کی سزا بھگتنی تھی تو میں تیار تھی۔۔۔ لیکن اس کا فائدہ کیوں ہوتا۔ میں نے خود خانم کو ساری بات بتادی۔ سچ، سچ وہ حیران رہ گئی۔ پھر اس نے مجھے بتایا اکبر ایسے ہی دور دراز کے علاقوں کی بچیاں ورغلا کر لاتا تھا۔ اور مہنگے داموں بیچ کے چلا جاتا تھا۔ اکبر اس دوران قہقہے لگا کر ہنستا رہا۔ اور پھر میں نے اس کی ہنسی کو مار دیا۔ وہ آنکھیں پھاڑ کر مجھے دیکھنے لگا تھا۔" وہ پھر ہنس رہی تھی۔

"تم نے کیا کیا؟" ضیا کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالے اس کی طرف مڑا تھا۔

"میں نے خانم کو کہا، میں خود تمہارے ساتھ کام کرنے کے لیے تیار ہوں، اسے پیسے دینے کی ضرورت نہیں اور آرام سے جا کر ایک کونے میں بیٹھ گئی۔ خانم کی تو باپچیں کھیل گئیں، اکبر البتہ مجھے مارنے کے لیے آگے بڑھا۔ خانم نے اپنے آدمیوں سے اس کی وہ درگت بنائی کہ ساری عمر وہ مجھے بھول نہیں سکے گا۔

"اور تمہارا شوہر۔۔۔" ضیا کے کے اچانک پوچھنے پر وہ جھٹکے سے اٹھی تھی۔ کندھوں کے گرد لپٹی ہوئی چادر زین گئی تھی۔

"میرے خط نے اسے سب سمجھا دیا ہوگا۔ وہ تو ہمیشہ ہی میری بات مانتا تھا۔"

"میں تو نہ جاسکی۔۔۔ لیکن پتا کروایا تو پتا چلا تھا کہ وہ ملک ہی چھوڑ گیا ہے۔ لیکن میرے ساتھ بے وفائی نہ کر سکا۔ اس کے گھر والے لہو کو قصور وار کہتے ہیں۔ لیکن اب کیا فائدہ ضیا۔۔۔"

"تمہیں لوٹ جانا چاہیے زمزمہ۔۔۔" ضیا اس کے قریب آیا تھا۔

"اللہ نے آج تک تمہاری حفاظت کی ہے۔" اس کے لہجے میں امید تھی۔

"مجھے لگتا ہے ضیا میں سب سہ لوں گی اب۔۔۔ لیکن وہ جو پہلی نظر مجھ پر ڈالے گاناں مجھ پر۔۔۔ زخمی شکوہ زدہ، بہورنگ وہ میں برداشت نہیں کر پاؤں گی۔" وہ دونوں ہاتھ منہ پر رکھے پھوٹ پھوٹ کے رو دی تھی۔ ضیا نے آگے بڑھ کر اور چادر اٹھا کے اس کے سر پر ڈال دی تھی۔

☆.....☆.....☆

شام کے سائے گہرے ہونے لگے تھے اور اتر ابھی تک گھرواپس نہیں لوٹی تھی۔ زیرینہ بیگم کی پریشانی بڑھنے لگی تھی تو مجبوراً حمزہ کے کمرے کا رخ کیا۔۔۔

وہ بے فکر سالیپ ٹاپ پر مصروف تھا۔ وہ کچھ دیر تذبذب کے عالم میں دروازے میں کھڑی سوچتی رہیں۔ اس وقت حمزہ کو اقرا کے بارے میں بتائیں نہ بتائیں۔ وہ اس کے غصے سے واقف تھیں۔ نہ صرف ان سے خفا ہوتا بلکہ اقرا کو بھی خوب سناتا۔ انہیں اقرا پہ بھی غصہ آ رہا تھا۔ انہوں نے بار بار تاکید بھی کی تھی کہ عصر کے بعد گھر آجائے لازمی۔۔۔ لیکن اب کافی دیر ہو چکی تھی۔ انہیں لگا مزید دیر نہیں کرنی چاہیے۔ وہ اندر آ گئیں۔

"حمزہ۔۔۔" پریشان لہجے میں انہوں نے پکارا تو حمزہ چونک گیا۔

"امی۔۔۔" وہ فوراً اٹھتے ہوئے ان کے پاس آیا تھا۔

"کیا ہوا امی خیریت۔۔۔؟" ماں کے پریشان چہرے نے اسے سچ میں پریشان کر دیا تھا۔

"اقرا ابھی تک گھر نہیں آئی۔" انہوں نے ڈرتے ڈرتے کہا تھا۔

"اف۔۔۔" حمزہ نے گہری سانس کھینچی تھی۔

"آپ نے تو میرا دم نکال لیا تھا۔۔۔" وہ مطمئن سا مسکرایا تو زری نے اسے اچھنبے سے دیکھنے لگیں۔

"کیا مطلب صبح کی گئی ہے شام ہو رہی ہے، اس میں کوئی پریشانی والی بات نہیں؟" انہیں غصہ آ گیا۔

"بالکل۔۔۔" اس نے مسکراتے ہوئے ہیں ماں کو اپنے ساتھ لگایا اور دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

"کیونکہ کہ وہ کسی غیر کے ساتھ نہیں گئی۔ لالہ کے ساتھ ہے وہ۔" لیپ ٹاپ پر نظریں جماتے ہوئے اس نے سادہ لہجے میں بتایا تھا اور زری نے بیگانگی کے چہرے پر ابھرنے والے غصے اور نفرت کے تاثر کو تو نہ دیکھ پایا تھا۔

ٹھیک اسی وقت دروازہ بجا تھا۔

"لیں۔۔۔" وہ آ بھی گئیں۔ "کہہ کر وہ اٹھ کر چھلاوے کی طرح باہر کی طرف بڑھ گیا تھا۔ اور زری نے غصے سے لب کھلتی دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی اس کے پیچھے باہر چلی آئیں۔

"مجھے پتا تھا کہ تم دونوں ہی ہوگی۔" چہرے پر مسکراہٹ اٹھادی چلی آ رہی تھی۔

زری نے بیگانگی سے بیٹے کے چہرے پر بولتے جذبات دیکھے تھے خوشی امی کے انگ اٹکے پھوٹ رہی تھی۔

"سوری دیر ہوگی۔ السلام علیکم پچھو۔۔۔" مختصر جواب دے کر لالہ زری نے کی طرف بڑھی تھی۔ اور زری نے اقرا کی طرف جو نہ جانے کیوں خود کو کسی مجرم کی طرح لالہ کے سائے میں چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"تو اب تم بھی لالہ کی طرح شام تک آوارہ گردیاں کروگی۔۔۔" سخت لہجے میں کہتی انہوں نے اقرا کی نازک کلائی اس قدر سختی سے پکڑی تھی کہ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر گئے تھے۔ لالہ البتہ ان کی بات پر بے بسی سے لب کھل گئی۔

"کیا کر رہی ہیں امی چھوڑیں۔" حمزہ تیزی سے ماں کی طرف آیا تھا۔

"یہ تم مجھ سے پوچھ رہے ہو حمزہ بجائے بہن سے باز پرس کرنے کے۔" وہ الٹا حمزہ پہ برسے لگیں۔

لالہ کی آنکھیں جلنے لگیں وہ اچھی طرح سمجھتی تھی کہ یہ سب صرف اس وجہ سے تھا کہ اقراء لالہ کے ساتھ آئی تھی۔ اگر اس وقت وہ کسی اور دوست کے ساتھ آئی ہوتی بھلے اس لڑکے کے ساتھ تو زرینہ بیگم کا رویہ بالکل الٹ ہوتا۔ وہ صرف اقراء کی بات کا پردہ رکھتیں بلکہ حمزہ اگر کچھ کہنے کی بھی جرات کرتا تو اس سے بھی بھڑ جاتیں۔ اسے وقتی تاسف گھیرنے لگا تھا۔۔۔ کاش وہ اقراء کو اس آوارہ لڑکے کے ساتھ دیکھ کر مکمل انکسور کر دیتی۔۔۔ کوئی داغ تو زرینہ بیگم کے دامن کو بھی چھو گزرتا۔۔۔ لیکن وہ جانتی تھی وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ زرینہ بیگم سے نفرت اپنی جگہ لیکن اقراء اسے سگی بہنوں کی طرح ہی عزیز تھی۔

وہ معصوم تھی اور لالہ ہر گز نہیں چاہتی تھی کہ اپنی ماں کا کیا کبھی بھی پتھر بن کر اس کی راہ میں آئے۔

"خدا کی پناہ، سب کچھ جانتے ہوئے تم دونوں آنکھیں بند کیسے کر سکتے ہو۔۔۔ کل کلاں کوئی اونچ نیچ ہو گئی تو میں۔۔۔"

"امی پلیز۔۔۔" حمزہ نے غصے سے ماں کو ٹوکا۔

"امی وہ تو دیر ہو گئی تو میں لالہ آپ کی طرف چلی گئی۔" اقراء نے بات بتائی۔ اسے ڈرتا تھا کہ کہیں امی کی باتوں کے رد عمل میں لالہ

سچ ہی نہیں اگل دے۔

"کیوں دیر ہو گئی تھی تو گھر نہیں آ سکتی تھی۔" زرینہ اور تپ گئیں۔

"امی ہو کیا گیا ہے آپ کو۔۔۔ لالہ کے ساتھ آگئی تو اچھی بات ہے ناں۔۔۔" حمزہ نے دوبارہ ماں کو ٹوکا۔

"میں تم لوگوں کی طرح آنکھیں بند نہیں کر سکتی۔۔۔ تم لوگ تو بچے ہو۔۔۔ تمہیں ابھی لوگوں کو سمجھنا کہاں آتا ہے۔" تیز نظروں سے لالہ کو گھورا۔ وہ اقراء کی دیکھنے لگی۔ لیو پٹنزیہ مسکراہٹ سی مچلی۔۔۔ اقراء کا دل ڈوب سا گیا۔

"امی۔۔۔ پلیز۔۔۔" حمزہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کیسے ماں کو چپ کراتا۔۔۔ چپ سی کھڑی لالہ اسے خود سے صدیوں کی

دوری پر دکھائی دینی لگی۔

"میں چلتی ہوں۔۔۔" ہاتھ لانگ کوٹ کی جیب میں ڈالے اس نے مسکراتے ہوئے اقراء سے کہا تھا۔

کوئی اسے رکھنے کے لیے نہیں کہہ سکا تھا کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔

"میں چھوڑ دیتا ہوں" حمزہ آگے ہوا۔۔۔ لالہ نے ایک طنزیہ نگاہ اس کے وجود پر ڈالی تھی۔

"تمہیں شرم تو نہیں آتی ناں حمزہ۔۔۔" آنکھوں کے ساتھ ساتھ لبوں نے بھی زہر سا لگاتھا حمزہ ساکت سا وہیں جم گیا۔

"دیکھا۔۔۔ دیکھی اس کی بے شرمی؟" زرینہ کے منہ سے جھاگ اڑنے لگا اقراء نے لپٹ گئی۔

"آئندہ خیال رکھنا اقرار۔۔۔" جاتے جاتے اس نے مڑ کر اقرار کو جن نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ اقرار اندر تک کانپ گئی تھی اور حمزہ چونک گیا تھا۔ کوئی بات تو تھی جو لالہ نے اقرار کو نظروں کی زبانی سمجھائی تھی۔ اور شاید وہ سمجھ بھی گئی تھی۔ تبھی اس نے اقرار کے چہرے کا رنگ بدلتے دیکھا تھا۔

اس نے کھلے دروازے کی طرف دیکھا۔۔۔ چوکھٹ خالی تھی۔۔۔ لالہ کب کی جا چکی تھی۔ زریںہ کی آواز اب بھی اس کے کانوں کے پردے چٹخا رہی تھی۔ مگر اب وہ بے حس سا کھڑا تھا۔

☆.....☆.....☆

سردی بڑھ رہی تھی۔۔۔ راستے دھند میں غائب ہونے لگے تھے۔۔۔ دونوں طرف سے رواں دواں ٹریفک کی روشنیاں بھی اس دھند میں کہیں غائب ہوتی جاری تھیں۔ اندھیرے کو مٹانے میں ناکام۔۔۔ لاگت کوٹ کی جیب میں ہاتھ، اونٹنی شال اوڑھے وہ اندھیرے اور دھند سے بے پروا فٹ پاتھ پر چلی ت جارہی تھی۔ گرم نمکین پانی ہر منظر مزید دھندلانے لگا تھا۔
وہ زریںہ کی اکلوتی بھتیجی تھی۔۔۔ ان کے اکلوتے بھائی کی واحد اولاد۔۔۔ پھر بھی جس حقارت سے وہ اسے دیکھتی تھیں۔۔۔ لالہ کا دل کرتا وہ اسی وقت زمین میں زندہ درگور ہو جاتی۔۔۔ زریںہ پھپھو کی باتیں ان کے طعنے جس قدر اسے ان سے بدظن کرتے۔۔۔ اسی قدر وہ اسے ٹھیک بھی لگتی تھیں۔

ایسا اس لیے تھا کہ اس نے کئی بار پھپھو کو امی کے سامنے ان کے منہ پر بے غیرتی اور بے حیائی کے طعنے دیتے سنا تھا انہوں نے تو لالہ کو بھی بے شرم کہا تھا۔ لیکن اس کی ماں کی نظریں ہی ہمیشہ جھکی تھیں۔۔۔ وہ خود کے لیے تو کیا لالہ کے لیے بھی کبھی ایک لفظ نہ بول سکی تھیں۔ اور یہ بات ایک بار نہیں لالہ نے ہمیشہ نوٹ کی تھی۔۔۔ اور اسے پتا چلا کہ پھپھو کی آنکھوں میں عزت کا فخر تھا اور امی کی آنکھوں میں محبت کا داغ۔۔۔ جو انہیں ہی نہیں لالہ کو بھی نظریں جھکانے پر مجبور کر دیتا تھا۔

"میں آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گی امی۔۔۔ کبھی نہیں۔۔۔" سختی سے آنکھیں رگڑتے ہوئے اس نے ایک مرتبہ پھر جیسے خود کو باور کرایا تھا۔۔۔

"کیا ہوں میں۔۔۔" راستے ویران ہونے لگے تھے۔ وہ یونہی بے پرواہ سمت کا تعین کیے بنا چلتی رہی۔
"گل لالہ۔۔۔ بدکردار ماں کی بد نصیب بیٹی" کھبے پہ لگے بلب کی روشنی میں اسے فٹ پاتھ پر پتھر نظر آیا تھا۔ زوردار ٹھوکر رسید کرتے ہوئے اس نے جیسے غصہ اس پتھر پر نکالا تھا۔

"اوئے۔" غصیلی بھاری مردانہ آواز پر اس نے چونک کر سامنے دیکھا تھا۔ وہ تین مرد تھے۔ بڑی بڑی مردانہ شالیں اوڑھے فٹ پاتھ کے کنارے بیٹھے شاید نشہ کرنے میں مصروف تھے۔ پتھر شاید سیدھا انہی کو پڑا تھا۔ تبھی انہی میں

سے ایک شخص تقریباً غرایا تھا۔ وہ تینوں کھڑے ہو رہے تھے۔ فاصلہ زیادہ نہیں تھا لیکن نہ جانے کیوں لالہ انہیں نہیں دیکھ پائی تھی۔ اسے آج یقین آیا تھا کہ غصہ واقعی حرام چیز ہے۔ انسان کو بڑی سے بڑی مشکل میں پھنسا سکتا ہے۔۔۔ ان تینوں کے چہروں پر پھیلے غصے پر اب شیطانیت غالب آنے لگی تھی ہونٹوں کے ساتھ آنکھوں میں بھی شیطانی مسکراہٹ چمکنے لگی تھی۔

"مجھے حوریں کیوں نظر آنے لگی ہیں اکبر۔۔۔" مکروہ چہرے والے اس شخص نے دانت نکالتے ہوئے لڑکھڑاتے لہجے میں کہا۔ "چھوڑو یار۔" دوسرے نے لالہ کی طرف پیش قدمی کی۔ لالہ بے اختیار دق قدم پیچھے ہوئی۔ سڑک ویران تھی۔ یہ ایک ذیلی سڑک تھی سو ٹریفک بالکل نہیں تھی۔۔۔ اس کا دل بے قابو ہونے لگا۔ حواس ساتھ چھوڑنے لگے۔

"زما جانان را غلے۔۔۔ زما جانان را غلے۔۔۔" وہی مکروہ چہرے والا زور زور سے گنگنا نے لگا۔ لالہ کو لگا بس یہی ایک لمحہ تھا اس کے پاس۔۔۔ ورنہ وہ ساری عمر اس جگہ سے ہم نہیں پائے گی۔ اس نے ان قریب آتے سایوں کو خوفزدہ ہو کر دیکھا اور اس سے پہلے کہ وہ مکروہ چہرے والا اس کے بالکل قریب پہنچ کر اسے پکڑنے کی کوشش کرتا۔۔۔ اس نے پلٹ کر دوڑ لگا دی تھی۔ وہ جانتی تھی وہ تینوں نشے میں تھے دوڑ بھی لیتے تب بھی مین روڈ تک اس سے پہلے نہیں پہنچ سکتے تھے۔ تب تک وہ کسی سے مدد لے سکتی تھی۔ وہ پاگلوں کی طرح دوڑتی ہوئی مین روڈ پر آئی تھی۔ بلب کی زرد روشنی میں لڑکھڑاتے قدموں سے وہ ابھی تک اس کے پیچھے تھے۔ اس نے ذرا دیر ٹھہر کر سمت کا تعین کیا اور پھر ایک طرف دوڑنے لگی پتا نہیں اسے سڑک ناپتے کتنی دیر ہو چکی تھی۔

مین سڑک پر بھی اکا دکا ٹریفک تھی۔ اس کی ادنیٰ شال پھسلتے پھسلتے اس کے شانوں سے ہوتی فٹ پاتھ پر گر گئی وہ ذرا دیر رک کے اسے اٹھانے لگی تھی۔ جب گاڑی کی تیز ہیڈ لائٹس نے اس کی آنکھیں چند ہیادیں تھیں۔ وہ چند پل کے لیے بے بس سی وہیں گر گئی۔ لینڈ کروزر اس کی سائیڈ پر رک چکی تھی۔ لائٹس ابھی تک اس کے وجود کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔

لینڈ کروزر کا دروازہ کھلا اور بھاری بوٹوں میں مقید قدم دھک سی پیدا کرتے آہستہ آہستہ چلتے اس کے قریب آئے تھے۔ وہ بمشکل شال اٹھا کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ سامنے کھڑے شخص کو پہچاننے میں اسے ایک منٹ سے بھی کم لگا تھا۔ اس کا دل بے تحاشہ دھڑک اٹھا تھا۔ "گاڑی میں بیٹھو۔" لالہ نے دیکھا اس کے گال کا گڑھا کافی گہرا ہو گیا تھا۔

"میں، میں خود چلی جاؤں گی۔" تیزی سے شال اپنے گرد لپیٹی اس نے اپنا اعتماد بحال کرنا چاہا تھا۔ "گاڑی میں بیٹھو لالہ۔" ڈپل ایک سیکنڈ میں غائب ہوا تھا۔ آواز میں بھی سختی در آئی تھی۔

"میں نے کہا ناں۔۔۔" اس نے کہنا چاہا کہ تبھی اس نے اسلحہ برادر آدمیوں کو تیزی سے اپنے دائیں بائیں جگہ سنبھالتے دیکھا تھا۔ وہ ساکت رہ گئی تھی۔

"فکر مت کرو یہ تمہیں ہاتھ نہیں لگائیں گے۔" وہ پھر مسکرا رہا تھا۔

لالہ کو اس کی مسکراہٹ زہر لگی۔

"اب خود بیٹھو گی یا میں۔۔۔" ذومعنی لہجے میں کہتا وہ لالہ کو مزید سلگا گیا۔

"کیوں کہ خیر سے میں ان کی طرح شریف تو بالکل بھی نہیں ہوں۔ اگر تم خود نہ بیٹھیں تو میں ہاتھ بھی لگا سکتا ہوں۔" وہ دو قدم آگے آیا تھا۔ لالہ تیزی سے اس کے پہلو سے ہوتی فرنٹ سیٹ پر جا بیٹھی تھی۔ جس کا دروازہ ایک ملازم اسی کے لیے کھول چکا تھا۔

"تم سب ٹیکسی لے کر آ جانا فارم۔۔۔ میں خود آ جاؤں گا۔" دروازہ خود بند کرتے ہوئے اس نے اپنے آدمی سے کہا تھا۔ اس نے سر ہلاتے ہوئے فوراً چابی اسے پکڑا دی تھی۔ وہ گھوم کر فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا تھا۔

گاڑی اسٹارٹ ہوتے ہی لالہ چونکی تھی۔

"ان سب کو تو بیٹھنے دیں۔" وہ پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے بولی۔

"کیوں۔۔۔؟" گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے اس نے معصومیت سے پوچھا تھا۔

"کیا مطلب کیوں؟ میں یوں اکیلے آپ کے ساتھ کہیں نہیں جاؤں گی۔" وہ چلتی گاڑی کا دروازہ کھولنے کی کوشش کرنے لگی۔ اسے ناکامی ہوئی تھی۔

"میں کسی کا ڈرائیور نہیں ہوں۔" مسکراتے ہوئے جواب آیا تھا۔ لالہ کو لگا وہ اس کی بے بسی پہ مسکرا رہا تھا۔ اسے غصہ آنے لگا۔

"ہاں، تو یہی تو میں کہہ رہی ہوں، میرا ڈرائیور بننے کی بھی آپ کو کوئی ضرورت نہیں ہے۔" وہ سخت لہجے میں بولی۔۔۔

"تمہارے لیے تو میں کچھ بھی۔۔۔ بن سکتا ہوں۔" لکیر سا ڈمپل گہرا ہوا تھا۔ لالہ کا دل کیا اپنے لمبے ناخن اس کے ڈمپل میں

گھسیڑ دے۔

"کچھ بھی مطلب۔۔۔" لالہ نے پوچھا تھا۔ اور اسی لمحے اس نے گاڑی روک دی اچانک۔۔۔ گاڑی کے ٹائر زور سے

چرچرائے تھے۔ لالہ نے بمشکل خود کو سنبھالا تھا۔

"کچھ بھی مطلب۔۔۔" وہ پورے کا پورا اس کی طرف رخ پھر گیا تھا۔ لالہ کی دھڑکنیں بند ہونے لگی تھیں۔

"کچھ بھی مطلب کچھ بھی۔۔۔" اس کی آنکھوں میں کتنے رنگ تھے۔ وہ سمجھ نہیں سکتی تھی۔ اس کے الفاظ اس قدر صاف تھے کہ

لالہ بخوبی سب مطلب سمجھ سکتی تھی۔ لیکن اس کی آنکھیں۔۔۔ اسے بے ساختہ اس سے بے انتہا خوف آیا تھا۔ وہ سمٹ کے بند کھڑکی سے جیسے چٹ کے رہ گئی تھی۔

"ضیا۔۔۔ دور ہٹو پلینز" اسے تنکے وہ زور سے چلائی تھی۔ اور حیرت انگیز طور پر وہ فوراً مسکراتے ہوئے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا تھا۔

گاڑی دوبارہ اسٹارٹ کر دی تھی۔ لالہ نے تیزی سے موبائل نکالا۔ بیٹری ختم ہو چکی تھی سیل آف تھا۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ وہ کسی

کو بھی انفارم نہیں کر سکتی تھی۔ نہ ہی کوئی اس سے رابطہ کر پارہا ہوگا۔ سب کس قدر پریشان ہوں گئے اور ضیا۔۔۔ ضیا نے جانے اسے کہاں لے کر جانے والا تھا۔ کیا کرنے والا تھا وہ اس وقت کو کو سننے لگی جب وہ اس سے خوفزدہ ہو کر اس کی گاڑی میں بیٹھ گئی تھی۔ اس کی آنکھیں بھینکنے لگی تھیں۔ لالہ نے ضیا کو دیکھا جو چیونگم چباتا آگے دیکھ رہا تھا بلیک کلر کی شلوار قمیض میں اس کی سفید رنگت مزید نکھر سی گئی تھی۔ اس کی شخصیت میں عجیب سا وقار تھا۔ وہ اپنی شخصیت کے بالکل الٹ تھا۔ شکل و صورت سے تو شریف ہی لگ رہا تھا۔ لالہ کے دل کو ڈھارس سی ہونے لگی تھی۔

"اکثر مکر وہ چہرے انہی خوب صورت چہروں کے پیچھے چھپے ہوتے ہیں۔۔۔" نئی سوچ نے پھر سے اس کے رونگٹے کھڑے کر دیے۔ اسٹیرنگ پر مضبوطی سے جھے وہ اس کے ہاتھ کو دیکھنے لگی۔ جس پر ڈارک پراؤن کلر کا گندھا ہوا دھاگہ بے حد بچ رہا تھا۔

"کیا کروں میں۔۔۔" وہ بڑبڑائی۔

"نیچے اترو۔" مسکراتے ہوئے ضیا نے جواب دیا تھا۔ وچوکی گاڑی رک چکی تھی۔

"یہاں،، یہاں کیوں اتروں۔۔۔" وہ بدبذائی۔

"کیوں، یہاں نہیں اترو گی تو کیا میرے ساتھ میرے گھر چلنے کا ارادہ ہے۔" وہ اس کی طرف جھکتے ہوئے شرارت سے بولا تھا۔ لالہ نے حیرت سے سامنے دیکھا تھا۔ اور اگلے لمحے اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔ گاڑی کی ہیڈ لائٹس کی روشنی میں گلی کا منظر بے حد واضح تھا گلی خاص طویل تھی جو اس وقت بالکل ویران تھی گلی کے بالکل آخری سرے پر ذرا سا ترچھا بنا ہوا گیٹ اس کے گھر کا تھا۔

"اترو گی یا گاڑی اسٹارٹ کر دوں؟" وہی دوستانہ بھاری مسکراتا لہجہ۔۔۔

"لیکن میں نے تو تمہیں ایڈریس نہیں بتایا۔" وہ سامنے دیکھتے ہوئے گم صم سی بولی۔

"تم نے تو شاید مجھے اپنا نام بھی نہیں بتایا تھا۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا اور لالہ کی طرف دیکھا جواب واقعی گھبرائی ہوئی لگ رہی تھی۔

"مجھے تمہارے ایک، ایک پل کی خبر ہے لالہ۔۔۔" اس کی طرف جھکتے ہوئے اس نے عجیب سے لہجے میں کہا تھا۔ لالہ کو اس کی آنکھوں سے خوف سا آرہا تھا۔ اس نے دروازہ کھولنا چاہا لیکن نہ کھلا۔ ضیا نے ذرا سا آگے ہو کے اس کے قریب ہوتے ہوئے اس کے لیے دروازہ کھول دیا تھا۔ وہ تیزی سے باہر نکل گئی تھی۔ گھر کا دروازہ کھلا تھا۔ تبھی وہ فوراً اندر غائب ہو گئی تھی۔ ضیا نے مسکراتے ہوئے گاڑی واپس موڑ لی تھی۔۔۔ اسے یقین تھا کہ آج رات تو اس نے لالہ کے ہوا بوں میں جگہ یقیناً پائی تھی۔ وہ سیٹی بجانے لگا تھا۔ گاڑی کی اسپڈ بھی بڑھادی تھی۔

☆.....☆.....☆

طویل گلی کر اس کر کے اس نے گیٹ کو ذرا سا دھکا دے کر دیکھا تھا۔ گیٹ کھلا تھا۔ وہ تیزی سے اندر آ گئی اور اتنی ہی تیزی سے گیٹ دوبارہ بند بھی کر دیا تھا۔ سامنے ہی برآمدے میں فون پر شاہ ویز کسی سے بات کرنے میں مصروف تھا۔ ٹیوب لائٹ کی تیز روشنی میں

س کے چہرے پر چھائی پریشانی واضح نظر آرہی تھی۔ اس سے کچھ فاصلے پہ ہی جائے نماز پر بیٹھی سین آنسوؤں سے تر چہرہ لیے اس کے لیے ہی دعا گو تھی شاید۔۔۔ گیٹ کے کھٹکے پر دونوں چونکے تھے پھر لالہ نے ان دونوں کو ہی تیزی سے اپنی طرف آتے دیکھا تھا۔ سین تو قریب آتے ہی اس سے لپٹ گئیں۔

ان کی گرم آغوش میں نہ جانے کیوں اس کے اندر کی تپش مزید بڑھ گئی۔ ضیا کے خوف پر زریں پھپھو کی کڑوی کسلی باتیں اور طعنے غالب آئیگے۔ اس کی پلکیں بھگنے لگی تھیں۔ وہ بے آواز رونے لگی تھی۔

"کہاں تھیں، اتر کے ساتھ تھیں نا تم۔۔۔ پھر حمزہ کے بغیر وہاں سے کیوں نکلیں۔۔۔ وہ بھی رات کے وقت۔۔۔ مجھے فون کر کے بلا لیا ہوتا۔۔۔" شاہ ویز نے اس کا بازو دھیرے سے تھام کر اسے ماں سے الگ کیا تھا اور سوالوں کی بوچھاڑ کر دی تھی۔ وہ سمجھ گئی تھی حسب عادت زریں پھپھو اسے بھی کوئی کہانی سنا چکی تھیں۔ شاہ ویز بولتا جا رہا تھا اور وہ بت بنی سن رہی تھی۔ اندر کا شور زیادہ تھا۔ باہر کی آوازیں سنائی ہی نہیں دے رہی تھیں۔

"تھکی ہوئی آئی ہے شاہ ویز۔۔۔ ابھی اسے کچھ آرام کرنے دو۔۔۔ نہ جانے کیسے اس وقت گھر آئی ہے۔" سیب نے اسے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔

"یہی تو میں پوچھنا چاہ رہا ہوں امی۔۔۔ کہ آخر اسے اس وقت اکیلے آنے کی ضرورت کیا تھی؟" وہ سخت غصے میں تھا۔ اور اس کا غصہ بجا تھا۔ شہر کے حالات جس قدر خراب تھے، مرد بھی زیادہ دیر رات کو گھر سے باہر نہیں رکتے تھے اور آج اتنی دیر اسے پاگلوں کی طرح ڈھونڈ ڈھونڈ کے وہ کس قدر خوار ہوا تھا وہ ہی جانتا تھا۔

"حمزہ چھوڑ نا چاہ رہا تھا لیکن پھپھو نے منع کر دیا۔" نے صاف بتا دیا لہجہ اب بھی بھیگا ہوا تھا۔

"زریں پھپھو۔۔۔" شاہ ویز کا تو منہ کھل گیا۔

"آف میرے خدا۔۔۔" وہ سر پکڑ کر رہ گیا۔

"حمزہ نے بھی کچھ نہیں کہا۔۔۔" سین جیسے گہرے صدمے سے بولیں۔

"بے غیرت لوگوں کے بچے بھی بے غیرت ہوتے ہیں امی۔" ایک ایک لفظ چبا کر کہتی وہ اپنی اصلی جون میں واپس آئی تھی۔ "اچھا چھوڑو تم اندر جا کر آرام کرو میں کچھ کھانے کے لیے لاتی ہوں۔" امی ہمیشہ کی طرح زریں پھپھو کی بات چھڑتے ہی بات بدل گئی تھیں۔ اسے اندر ہی اندر تاسف گھیرنے لگا اور اس کی ماں ان کے خلاف دو لفظ کیوں نہیں بولتیں کے سن کر اس کی بھی کچھ روح شانت ہو۔

"نہیں، میں اب سوؤں گی۔ آپ لوگ بھی آرام کریں۔" وہ صاف لہجے میں منع کرتی کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

"سنو۔۔۔" شاہ ویز بھاگ کے اس کے قریب آیا تھا۔ وہ رکی۔

"آئندہ زریں پھپھو کی طرف جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔۔۔ اور جہاں بھی دیر ہو جائے مجھے بلا لیا کرو۔۔۔ یوں اکیلے نہ نکل پڑا کرواؤ گے۔۔۔" اس کے لہجے میں مہمانیوں کی دھونس تھی۔ وہ اداسی سے مسکرا دی اور سر اثبات میں ہلاتے ہوئے کمرے میں چلی گئی۔

"امی، اب آپ بھی جا کر سو جائیں۔" اس کے جاتے ہی شاہ ویز نے ماں سے کہا۔

"لیکن اس نے کھانا تو کھایا نہیں۔" وہ اداس تھیں۔

"پتا ہے ناں آپ کو۔۔۔" وہ ماں کو شانوں سے تھامتان کے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

"کتنی چڑ جاتی ہے وہ زریں پھپھو کی باتوں سے۔۔۔ ابھی کہاں ہوگی اسے بھوک۔۔۔ لیکن آپ بالکل بے فکر رہیں بڑی ہو گئی ہے لالہ۔۔۔ بھوک لگے گی تو اٹھ کر خود ہی کچھ بنالے گی۔" اس کی آواز میں تسلی تھی سین کو اس کی بات پر یقین کرنا ہی پڑا تھا۔

☆.....☆.....☆

حویلی کے پائیں باغ میں برآمدے سے کچھ دور جلتے الاؤ کے ارد گرد لکڑی کی چوکیوں پر بیٹھے سبھی نفوس خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ سب سے زیادہ گل مینہ بول رہی تھی اور اس کی باتوں پر سہرا ب علی خان کے باری قہقہے اور اوزگل کی دھیمی دھیمی ہنسی کسی جھرنے کے گرنے کی سی آواز پیدا کر دیتی۔۔۔ سرد خاموش ماحول میں چٹختی لکڑیوں اور ان سب کی دھیمی دھیمی گفتگو بے حد خوب صورت سماں باندھ رہی تھی۔

"با۔۔۔ جی۔۔۔ آپ نے کہا تھا اس ہفتے مجھے بھی بھائی کے پاس شہر بھیج دیں گے۔"

الاؤ پہ ہاتھ سینکتی گل مینہ کو اچانک ہی یاد آیا۔

"کہا تو تھا لیکن اب سوچ رہا ہوں کہ اپنے وعدے سے مکر جاؤں۔" گھنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ مینہ تو رپ اٹھی۔

"وہ کیوں با۔۔۔ جی۔" وہ اٹھ کر ان کے پاس ہی زمین پر بیٹھ گئی۔ چہرے پر ایک دم مایوسی لودینے لگی۔ انہوں نے دایاں بازو اس کے گرد لپٹتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لگا لیا تھا۔

"وہ اس لیے کہ تمہارے بعد بھلا میرا کیا ہوگا؟" انہوں نے پیار سے کہتے ہوئے اس کی پیشانی چوم لی اوزگل نے رشک سے ہنسی چھوٹی بہن کو دیکھا وہ جانتی تھی کہ اس کے بابا کی زندگی میں اگر کوئی انسان اہم تھا تو صرف گل مینہ ہی تھی۔

ضیا اور اس کی حیثیت ثانوی تھی۔ سہرا ب کی کائنات کا محور گل مینہ تھی۔ ضیا ان کا واحد سپوت تھا، ان کا وارث۔۔۔ انہیں اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز تھا۔ لیکن بہر حال ان کے کچھ اصول انہیں ضیا سے بھی زیادہ پیارے تھے لیکن اوزگل نے دیکھا تھا۔ جہاں بات گل مینہ کی آتی تھی۔ وہاں وہ اکثر اصول بھی توڑ دیتے تھے۔۔۔ اور ایک دفعہ اس نے ہی مذاق میں کہا تھا

"با۔۔۔ جی اپنے اصولوں پر مجھے اور ضیا کو قربان کر دیں مینہ۔۔۔ وہ گل مینہ پر یہ سارے اصول ہی قربان کر دیں گے۔" اسے یاد تھا اس کی بات پر باجی خوب دل کھول کر ہنسنے لگی تھی۔ اور آخر میں مسکراتے ہوئے گود میں بیٹھی معصوم سی گل مینہ کی پیشانی چومتے ہوئے کہا تھا۔

"ایسا ہو بھی سکتا ہے گل مینہ میں تو میرا دل دھڑکتا ہے۔"

"با۔۔۔ جی" گل مینہ کی تیز نروٹھی آواز پر وہ چونکی با۔۔۔ جی اب بھی مسکرا دیئے تھے سرخ و سفید چہرے پر الاؤ میں جلتی آگ کا آتش رنگ اسے مزید نکھار بخش رہا تھا۔ اوز گل کو ان کی گھنی مونچھوں تلے شرارت سے مسکراتے ہوئے بے حد خوبصورت لگے تھے۔

"اچھا مذاق کر رہا تھا۔" انہوں نے پیار سے اسے ساتھ لگایا۔

"تم دونوں تیاری کر لو، میں نے ضیا سے کہہ دیا ہے۔ جلد ہی تمہارا کسی اچھے پرائیویٹ کالج میں داخلہ ہو جائے گا۔" انہوں نے بالآخر خوشخبری سنائی گل مینہ تو اچھل پڑی۔

"سیج با۔۔۔ جی"

"ہاں۔۔۔ با۔۔۔ جی کی جان۔۔۔ لیکن یہ تو بتاؤ میں تو تمہارے بغیر رہ نہیں سکتا۔۔۔ تم مجھ سے اتنی دور رہ کر کیسے گزارہ کرو گی۔" انہیں تشویش تھی۔

"یہ چار پانچ گھنٹوں کی تو مسافت ہے۔۔۔ با۔۔۔ جی۔۔۔"

پھر بیٹیاں کہاں ساری عمر ماں باپ کے گھر رہتی ہیں۔" اس نے شرارت سے کہیں پڑھا فلسفہ سنایا تھا۔ لیکن اوز گل نہ جانے کیوں سہم سی گئی اس نے لیکھت با۔۔۔ جی کے چہرے پر چھپائی مسکراہٹ غائب ہوتے دیکھی تھی۔ اسے لگا آگ کا الاؤ ابھی پھیل جائے گا۔ سب بھسم کر جائے گا کیونکہ اس نے دیکھا تھا اس کے باجی کو بیٹیوں کی شادی کے نام سے بھی چڑھتی۔ وہ ان سے بے حد محبت کرتے تھے انہیں خود سے جدا کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے لیکن یہ گل مینہ۔۔۔

اسے گل مینہ پر غصہ آنے لگا۔ اسے لگا مسکراتے باجی اب خواہ مخواہ بگڑ جائیں گے۔۔۔ سارا ماحول دہشت ناک ہو جائے گا۔ محبت مسکراہٹ اور یہ فیسوں۔۔۔ سب ایک لمحے میں ختم ہونے والا تھا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔" با۔۔۔ جی کی دھیمی آواز پر اس نے چونک کر سر اٹھایا تھا۔ الاؤ کے دوسری طرف آگ کے لپکتے شعلوں میں با۔۔۔ جی کے سرخ پڑتے چہرے پر اب بھی ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ گہری مسکراہٹ سجائے گل مینہ ان سے خوشی سے پلپتی جا رہی تھی۔ اوز گل کی نظریں ان دونوں پر جم سی گئیں۔۔۔ گل مینہ کی قسمت پر اسے رشک سا آنے لگا تھا۔ گل مینہ کیا تھی ان کے لیے۔۔۔ "اس نے ان دونوں کو تکتے ہوئے سوچا۔"

"آزمائش ہے۔۔۔ آزمائش ہے تو۔۔۔" قہقہے لگاتی اللہ لوک بالکل اچانک ہی گل مینہ کے قریب آچلائی تھی۔ وہ اس قدر اچانک وہاں آئی تھی کہ کوئی بھی اسے آتا نہ دیکھ سکا تھا نہ کچھ دیر تک حرکت کر سکا تھا۔

"پکڑ ہوگئی تیری۔۔۔ پکڑ ہوگئی۔۔۔" وہ اب قہقہے لگا، لگا کر کہتی الاؤ کے قریب آچکی تھی۔ اور اس سے پہلے کہ ان میں سے کوئی کچھ سمجھتا اس نے دونوں ہاتھوں میں جلتی لکڑیاں اٹھالی تھیں۔ دونوں لکڑیوں کے سروں پر شعلے لپک رہے تھے۔

"مہلت ختم ہونے لگی ہے۔" وہ آگ سہراب علی خان کو دکھانے لگی۔ انہوں نے بنا خوفزدہ ہوئے خوف سے چلاتی گلی مینہ کو حفاظت سے اپنے پیچھے کیا اور دھیرے دھیرے اللہ لوک کے قریب آنے لگے تھے۔ یہی حرکت اللہ لوک کے پیچھے کھڑی اوزگل نے بھی کی تھی۔ دھیرے دھیرے وہ بھی اللہ لوک کے قریب آنے لگی تھی۔

"تیری مہلت ختم۔۔۔ تیری مہلت ختم۔۔۔" وہ چلا رہی تھی۔

"خالی ہاتھ رہ جائے گا تو۔۔۔ پکڑ بڑی سخت ہے۔۔۔ تیری پکڑ ہوگئی۔۔۔" وہ بھڑکتی لکڑی ان کی طرف بڑھاتے ہوئے دیوانہ

وار کہتی اور وہ جھٹکے سے پیچھے ہو کر اپنا چہرہ جلنے سے بھی بچاتے اور اسی قدر تیزی سے مزید آگے بھی ہو جاتے پھر اس سے پہلے کہ سہراب علی خان ان تک پہنچنے اوزگل نے انہیں جا لیا تھا اور جھٹکے سے ان کے ہاتھ سے لکڑیاں لے کر الاؤ کی طرف اچھال دی تھیں۔

اللہ لوک پھرسی گئی تھیں۔ مزید چلانے کئیں، اوزگل نے ان کا کمزور وجود بانہوں میں سمیٹ لیا تھا۔

"بی بی جانے۔۔۔ بی بی جانے۔۔۔" وہ ان کو بچوں کی طرح پککارنے لگی تھی۔

"آگ بھڑک رہی ہے بچے میں نے خود دیکھا۔۔۔ آگ بھڑک رہی ہے، تندور گرم کر لیے گئے ہیں۔۔۔ وہ تیز تیز لہجے میں اوزگل کو بتانے لگیں۔

"پکڑ ہوگئی ہے۔۔۔ پکڑ ہوگئی ہے۔۔۔" وہ اب سسکتی بڑبڑاتی اللہ لوک کے وجود کو تھامے اندر کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ڈری سہمی گل مینہ سہراب علی خان کے مضبوط وجود سے چمٹ گئی تھی اور وہ وہیں کھڑے ضبط سے مٹھیاں بھینچ رہے تھے۔ اللہ لوک کی چٹختی آواز اب بھی

ساری حویلی کا سناٹا چیرے دے رہی تھی۔ نجانے کیوں الاؤ کی آگ مزید بھڑکنے لگی تھی۔

"لگتا ہے زندہ قبروں میں ایک اور اضافے کا وقت آ گیا ہے۔" انہوں نے نخوت سے سوچا تھا۔

☆.....☆.....☆

"اس نے اپنے آپ کو بستر کے بجائے لقمہ صحرائیں پتی ریت پر پڑا پایا تھا۔ وہ بڑا کراٹھ بیٹھا تھا۔ اور پھرتی ہی تیزی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس نے ایک گھبرائی ہوئی نگاہ چاروں طرف دوڑائی تھی۔ اس کے چاروں طرف ریت کا نہ ختم ہونے والا صحرا تھا۔ سخت تیز چمکدار دھوپ میں چمکتی ریت کو دیکھتے ہی اس کی نظریں بھی جلنے لگی تھیں۔

"یہ میں کہاں آگیا۔" وہ ششدر سادل میں سوچ رہا تھا۔

"اور اب میں یہاں سے نکلوں گا کیسے۔" وہ مزید پریشان ہوا اور پھر چند لمحے یونہی مایوس سا کھڑا ارد گرد دیکھتا وہ چلنے لگا تھا۔ اسے یقین تھا کچھ دیر گرم ریت پر چلنے کے بعد اس کے پیروں میں چھالے نکل آئیں گے کیونکہ اس کے پیرنگے تھے اسے یہ بھی معلوم تھا کہ کچھ دیر بعد سخت دھوپ اور گرم ہوا اسے جھلسا دینے والی تھی۔ اس پیاس سے مر جاتا تھا۔ کیونکہ فی الحال اس کے پاس کچھ بھی ایسا نہیں تھا کہ ان سخت ترین عوامل کا مقابلہ کر سکتا اور سمندر جیسے وسیع صحرا میں بھی ایسا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا کہ جو اس کے لیے مددگار ثابت ہوتا۔ اسے اپنے لئے بے حد سے لمبی سی محسوس ہوئی تھی۔

اس نے کچھ دیر لمبی سانسیں لیں اور پھر ایک طرف دوڑنا شروع کر دیا۔ پورے پندرہ منٹ پاگلوں کی طرح دوڑتے ہوئے وہ اچانک ٹھٹک کر رہ گیا تھا۔ اسے اچانک ہی احساس ہوا تھا کہ اس قدر تیز دھوپ میں اور گرم ریت پر چلنے کے باوجود بھی اسے تپش محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

یہ سب صرف اس کا خیال تھا سر پر آگ برساتے سورج کو دیکھ کر اسے پہلا احساس یہی ہوا تھا کہ ریت گرم ہوگی اور وہ جھلسا دینے والی لو کی طرح۔۔۔ اور پیاس کی شدت سے وہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کے جان دے دے گا۔

لیکن اب اسے احساس ہوا تھا، اس قدر شدید گرمی میں بھی ریت نرم اور ٹھنڈی تھی اور وہ اب بھی اتنی گرم نہیں تھی کہ اس کی تپش اسے جلا کر رکھ دیتی۔۔۔ وہ صحیح معنوں میں حیران رہ گیا تھا۔ ماجرا تھا تو کیا تھا؟ اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔۔۔ گرم نہ سہی پھر بھی وہ اس لائق صحرا میں زیادہ وقت نہیں گزار سکتا تھا۔ وہ اپنی شرٹ کے بٹن کھولتا دوبارہ چلنے لگا تھا۔

اس نے کافی فاصلہ طے کر لیا تھا لیکن اب بھی اس ریت کے سمندر کی حد نظر نہ آ سکتی تھی۔ تبھی اس نے کچھ شور سنا تھا۔ وہ کچھ دیر سمت کا اندازہ لگانے کے بعد بے تحاشا اس سمت دوڑا تھا۔ کچھ دور دوڑنے کے بعد ہی آوازیں واضح ہو گئی تھیں۔۔۔ وہ کسی کے چلانے کی آواز تھی۔۔۔ کوئی مدد کے لیے پکار رہا تھا۔۔۔ وہ اور تیز بھاگنے لگا۔۔۔

دیت کے سمندر میں کوئی نقطہ سا ابھرا تھا۔ اس نے بھاگنے کی رفتار بڑھا دی۔ فقط بڑا ہونے لگا تھا۔ یہ سرخ اینٹوں سے بنا کنواں تھا آواز اس کنوئیں کے اندر سے آرہی تھی۔ وہ تیزی سے کنوئیں کے قریب آیا تھا اس نے کافی اونچی منڈیر سے نیچے جھانکنا جھولتے ڈھول کو مضبوطی سے تھامے کوئی لڑکا مدد کے لیے مسلسل پکار رہا تھا۔ وہ کافی گہرائی میں تھا وہ اس کا مکمل چہرہ نہیں دیکھ پا رہا تھا۔

"سنو۔۔۔" اس نے ہاتھوں کا پیالہ بنا کر زور سے پکارا تھا۔ کنوئیں کی دیواروں سے سرکراتی اس کی آواز کی گونج بے حد شدید تھی۔ وہ لڑکا اوپر کی طرف دیکھے لگا۔

"ڈرومت تم کس کے رسی تھا مے رہو" اس نے لڑکے کو حوصلہ دلاتے ہوئے کہا۔

"میں ابھی تمہیں اوپر کھینچ لوں گا۔" اس نے مزید زور سے چلاتے ہوئے اس بچے کو تسلی دی اور تیزی سے ڈھول سے بندھی رسی کو اوپر کھینچنے لگا۔ بچی آہستہ آہستہ اوپر آنے لگا۔ اس کا سرخ و سفید خوب صورت چہرہ اب واضح نظر آنے لگا تھا۔ بے حد خوب صورت آنکھیں اپنے مسیحاہ جی تھیں اس کی آنکھوں میں چمکتی امید واضح دیکھ سکتا تھا۔ اس کے ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے۔ ڈھول کافی اوپر آ گیا تھا۔ اور عین اسی وقت ڈھول جھٹکا کھا کے ذرا سانیچے کھسکا تھا۔ بچے کے منہ سے زوردار چیخ نکل گئی باریال نے دیکھا ڈھول کے بالکل قریب بندھی رسی پرانی ہونے کے باعث گل سی گئی تھی تبھی وہ شاید اس صحت مند بچے کا وزن برداشت نہیں کرتے ہوئے جگہ، جگہ سے ادھرٹنے لگی تھی۔

"ڈرومت میں ابھی تمہیں نکال لوں گا۔" اپنی پریشانی پر قابو پاتے ہوئے اس نے بچے کو تسلی دی۔ اور مزید تیزی سے رسی کھینچنے لگا۔ جس قدر بچہ اوپر آ رہا تھا اسی قدر باریال کا جوش بڑھتا جا رہا تھا۔ اور پھر اچانک دھک سا لگا تھا رسی ایک دم ہی اس کے ہاتھ میں آئی تھی۔ باریال نے گھبرا کر پہلے رسی کو پھر تیزی سے آگے بڑھ کر کر نیچے کنویں میں گہرائی میں گرتے ڈھول کو دیکھا تھا۔ لڑکا خوفزدہ پھٹی لگا ہوں سے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ وہ لمحہ بہ لمحہ اس سے دور جا رہا تھا اور پھر وہ کسی نقطے کی طرح اندھیرے میں گم ہونے لگا تھا۔

"بھائی" بچے کی روح فرسا پکار پر وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا تھا۔ لائٹ نہیں تھی شاید۔۔۔ اسی وجہ سے کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ پسینے میں شرابور باریال نے تیز تیز سانس لیتے ہوئے خود کو نارمل کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے دل کی دھڑکن کمزور سی ہونے لگی۔ اس نے جلدی سے تکیے کے نیچے رکھا موبائل اٹھایا اور فلیش جلا کر سائیڈ ٹیبل پر پڑی منضی سی بوتل اٹھالی۔ دوالینے کے بعد کچھ دیروہ یونہی بیٹھا سوچتا رہا تھا۔ یہ نہیں تھا کہ وہ کوئی نفسیاتی مریض یا ڈپریشن کا شکار تھا لیکن نجائے کیوں

پچھلے دس سال سے اس طرح کے خواب آ، آ کر اسے پریشان کرتے رہتے تھے۔ دیدے نے کافی دم دعا بھی کروائی۔ ڈاکٹر سے بھی کنسلٹ کیا لیکن سب بے سود۔۔۔ کبھی ہفتوں تو کبھی مہینوں بعد آنے والا یہ خواب جب آتا تو نہ جانے کتنے ہی دن باریال بے چین ہی رہتا۔۔۔ یادداشت میں رہ جانے والی چند کڑیوں سے نئی کڑیاں ملاتا، اس کا کھوج لگانے کی کوشش بھی کرتا مگر ناکام ہی رہتا۔

ڈاکٹر کے مطابق ان خوابوں کا تعلق اس کے ماضی سے تھا۔ کوئی ایسا واقعہ جو وہ بھول نہیں پار رہا تھا۔ وہ خود کسی حادثے کا شکار ہوا ہوگا اور یہ خوف اس کے دل میں بیٹھ گیا۔

لیکن۔۔۔ باریال خوف جانتا تھا کہ نظر آنے والا بچہ وہ خود ہرگز نہیں تھا وہ تو ہمیشہ اسے بچانا چاہتا ہے۔۔۔ حادثہ اس کے ساتھ تو نہیں کسی اور کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہ کون ہے؟ کیوں اسے مدد کے لیے پکارتا ہے؟ باریال کو لگتا تھا اس خواب کا تعلق اس کے مستقبل سے تھا۔۔۔ جلد یا بدیر۔۔۔ کہیں ناکہیں وہ لڑکا، کسی نہ کسی صورت اس سے ٹکرانے والا تھا۔ اسے بس تھوڑا سا ہوشیار رہنا تھا۔

اس نے دونوں ہتھیلیوں کی مدد سے چہرے سے پسینہ صاف کیا اور اٹھ کر آئینے کے سامنے آٹھرا۔
کیوں کہ حقیقت میں، میں اسے گرنے نہیں دوں گا۔۔۔ وہ جو کوئی بھی ہے میں اسے ضرور بچالوں گا۔" اس
نے آئینے میں اپنی نظروں میں دیکھتے عہد کیا تھا۔

☆.....☆.....☆

اس رات وہ سو نہ سکی تھی۔ ساری رات جاگتے گزری تھی اور وجہ ضیا کے ساتھ ساتھ اقرار بھی تھی۔ ضیا کا اپنی طرف التفات محسوس
کر کہ وہ اس قدر خوفزدہ نہ ہوئی تھی جس قدر اقرار کو اس لڑکے کے ساتھ دیکھ کر اقرار اسی سال کالج آئی تھی کم عمری تھی اور نا سمجھ بھی۔۔۔ لیکن
وہ لڑکا اسے شاہ ویز کا ہم عمر لگا تھا۔ شکل سے سنجیدہ معلوم ہونے کے باوجود وہ لڑکا اسے اچھا نہیں لگا تھا۔ آوارہ ٹائپ ہی لگا تھا۔
ساری رات اسے رہ رہ کر پھپھو کے طعنے بھی یاد آتے رہے تھے۔ دل چاہتا تھا وہ اس معاملے کو ایسے ہی چھوڑ دے۔ بے پروا
ہو جائے۔ جس طرح اس نے ساری عمر ماں کے کردار کے طعنے سنے ہیں، ویسے ہی پھپھو کے نصیب میں بھی لکھے جائیں لیکن یہ ایک حقیقت
تھی وہ ایسی نہیں تھی۔ وہ چاہ کر بھی ایسی نہیں بن سکتی تھی۔ نہ ہی ایسا کوئی منفی قدم اٹھانے کا سوچ سکتی تھی اسے بہر حال کچھ کرنا تھا کیا کرنا تھا؟ یہ
وہ نہیں سمجھ پا رہی تھی۔ ساری رات سوچنے سمجھنے کے بعد آخر وہ اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ اسے جلد از جلد حمزہ کو اس بارے میں ہوشیار کرنا تھا۔
وہ ان دونوں کو ایک ساتھ دیکھ چکی تھی اور اسے اچھی طرح اندازہ بھی ہو رہا تھا کہ ان دونوں کو ہی یہ بات نہ صرف کھٹک رہی ہو بلکہ
وہ اس معاملے کو ڈسکس کرنے کے لیے جلد از جلد دوبارہ ملنے کی کوشش بھی کریں گے۔۔۔ اور یہ بھی ممکن تھا کہ وہ لڑکا اقرار کے ڈر کا فائدہ اٹھا کر
اسے کسی انتہائی قدم کے لیے بھی اکساتا۔۔۔ اور اگر اقرار کسی ایسے اقدام کے لیے راضی ہو جاتی تو معاملہ ہاتھ سے نکلتے دیر نہیں لگتی تھی۔
اور لالہ ہرگز نہیں چاہتی تھی کہ اقرار جیسی معصوم لڑکی صرف ماں کے کرموں کا پھل ساری زندگی طعنے برداشت کر کر کے گزار دیتی۔
لیکن لالہ یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ کچھ باتیں تو بس اوپر ہی طے کر دی جاتی ہیں۔۔۔ اور جو صرف ہمارے اعمال کی کھیتی ہوتی ہیں۔
ساری رات کی بے سکونی سے سر میں شدید درد ہوا تھا۔ وہ یونیورسٹی بھی نہ جاسکی تھی۔ دوا لے کر آرام کرنے لیٹی تو دوپہر میں امی
کے جگانے پر ہی آنکھ کھلی۔ امی نے اسے نمبرہ کے آنے کا بتا کر فریش ہونے کو کہا تو وہ حیران سی رہ گئی۔ پٹھک میں آئی تو نمبرہ کو اپنا منظر پایا۔
"ایک دن نہیں آئی تو تم گھر تک ہی پہنچ گئی۔" دوستانہ لہجے میں کہتے ہوئے اس نے نمبرہ کو چڑایا، وہ منہ بنا کے مسکرا دی۔
"دیکھ لو تمہارے بغیر چین نہیں ملتا۔" اس کے لہجے میں بھی خلوص تھا۔۔۔ وہ تھی بھی ایسی۔۔۔ خالص جذباتوں سے گندھی نرم
مزاج سی لڑکی۔۔۔

"اور کوئی اور بھی بہت بے چین تھا شکر کرو وہ نہیں آیا۔۔۔" نمبرہ کی اچانک مذاق میں کہی گئی بات پہ اس کے چہرے کا رنگ اڑا
تھا۔ ضیاعلی خان کا سراپا جیسے نظروں میں آسمایا تھا۔

"لالہ۔۔۔" نمرہ نے یوں اسے گم سم ہوتے دیکھا تو بول اٹھی۔

"ہاں۔" وہ بری طرح چوکی۔

"کیا ہوا لالہ تم ٹھیک تو ہوناں۔" نمرہ پریشان ہو گئی۔

"کچھ نہیں۔۔۔ میں ٹھیک ہوں۔" لالہ اداسی سے مسکرائی

"اچھا ستوبریلنگ نیوز دینے آئی ہوں تمہیں۔" نمرہ اسے متوجہ کرتے ہوئے بولی۔

"نیکسٹ منٹھ ہم ٹور پر جا رہے ہیں، آج میم تبسم نے بتایا تم بھی چلو گی ناں۔۔۔"

"کس طرح کا ٹور۔۔۔" تفریح کا جان کر ہمیشہ کی طرح لالہ کا منہ بن گیا تھا۔ نمرہ کا چہرہ سمجھ سا گیا۔

"مری جائیں گے۔۔۔ کچھ اور تفریحی مقامات پر بھی۔۔۔ یونیورسٹی ٹور ہے یا۔۔۔ میم تبسم بھی ہمارے ساتھ ہی جائیں گی اب

تم بچھڑا نہ ڈال دینا۔۔۔" اس نے لالہ کو وارن کیا۔

"جاؤ تم لوگ مزے کرو۔۔۔" لالہ مسکرائی۔

"کیا مطلب؟" نمرہ سمجھ گئی تھی اس کا جواب پھر بھی سننا چاہتی تھی۔

"تم جانتی ہو میں یہ سب انفرڈ نہیں کر سکتی۔" اس نے سادہ لہجے میں منع کر دیا۔ اسی وقت سین چائے کے ساتھ لوازمات لیے

اندر آئیں۔

"آئی سمجھائیں ناں اسے اتنی مشکل سے تو مری دیکھنے کا موقع مل رہا ہے۔ اب یہ ساتھ نہیں ہوگی تو میں وہاں جا کر کیا کروں

گی۔" نمرہ نے سین آنٹی سے مدد چاہی وہ نا سنجھی سے لالہ کو دیکھنے لگیں۔

"امی، یونیورسٹی ٹور پر جا رہی ہیں سب دوست۔۔۔ بس یہ نمرہ کی بچی چاہتی ہے کہ میں بھی چلوں لیکن آپ تو جانتی ہیں ناں۔۔۔"

"تو اس میں کیا مسئلہ ہے لالہ۔۔۔؟" انہوں نے اس کی بات کا ٹٹے ہوئے کہا۔ لالہ حیرانی سے ماں کی دیکھنے لگی۔ وہ سین جو گھر

سے اس کے نکلنے یونیورسٹی جانے تک کے خلاف رہی تھیں۔ شہر سے باہر جانے کے لیے اس قدر آسانی سے مان گئی تھیں۔

"اچھا ہے ناں تھوڑا ریلیکس ہو جاؤ گی۔ یہاں تو تم سارا دن پڑھائی اور ادھر ادھر کی فضول باتوں ٹینشن میں خود کو ہلکان کیے رکھتی

ہو کچھ دیر اس سب سے دور پر فضا مقام پر اپنے دوستوں کے ساتھ انجوائے کرو گی تو اچھا لگے گا تمہیں۔۔۔"

"لیکن امی۔۔۔" وہ حیرانی سے پوچھنے لگی۔

"آپ کو میری فکر نہیں رہے گی۔"

"نمرہ ہے ناں تمہارے ساتھی جس کی اتنی اچھی بہن جیسی دوست ہو اس کی بلا کیا فکر کرنی۔"

"یہ ہوئی ناں میری آٹنی والی بات۔۔۔" نمرہ چلاتے ہوئے ان سے لپٹ گئی۔ سین محبت سے مسکرا دیں۔ لالہ کی نظروں میں البتہ سوچ کے سائے گہرے تھے۔۔۔ کوئی تھا جو اس کی سوچوں پر سوار تھا۔

☆.....☆.....☆

”باجی آپ نے بلایا۔۔۔“ اسٹڈی روم کا جہازی سائر دواڑہ دھکیلتی وہ وہیں رکتے ہوئے بولی تو اپنی مخصوص چیئر پر بیٹھے باجی نے کتاب سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھا۔

یہ کمر اس حویلی کا سب سے بڑا کمر تھا۔۔۔ ملازموں سے سنا تھا کہ یہ کمر اسہراب علی خان کے بڑے بھائی نے بہت محبت سے بنوایا تھا۔ تین کمروں کی درمیانی دیواریں ہٹا کر تینوں کمروں کی چھتوں کو جگہ جگہ خوب صورت منقش ستونوں کا سہارا دے کر اسے ایک وسیع و عریض ہال کی شکل دی گئی تھی۔ اس کمرے کی بردیوار پر فرش سے چھت تک بہت خوب صورت اور نفیس طرز کے بک شیلف بنائے گئے تھے جن کے ساتھ ہر کونے میں اوپری حصے تک رسائی کے لیے منقش لکڑی کی سیڑھی بھی رکھی گئی تھی۔

اوزگل کو یہ کمر ہمیشہ سے بہت اڑیکٹ کرتا تھا۔ اس نے سنا تھا کہ اس کے تایا کو کتابوں سے عشق تھا اور اس عشق کی گواہی یہ کمر خود تھا۔ نہ جانے کیسے یہ جنون اوزگل میں منتقل ہوا تھا۔ اسے بھی کتابوں سے عشق تھا حالانکہ وہ صرف ڈل پاس تھی لیکن کتابوں کے جنون میں اس کا علم حائل نہیں ہو سکا تھا۔ کبھی کبھی اس کا دل کرتا وہ فراغت سے اس کمرے کے خوابیدہ ماحول میں بیٹھ کر سارا دن کتابیں پڑھتے ہوئے گزارے۔ لیکن یہ کمر صرف باجی کے زیر استعمال تھا اور یہاں کسی کو بھی آنے کی اجازت نہیں تھی گل مینہ آسکتی تھی لیکن اسے کوئی ایسا شوق نہیں تھا کتابوں کو دیکھ کر تو وہ یوں بھاگا کرتی جیسے کوئی بدروح دیکھ لی ہو سو اوزگل کا یہ جنون ایک خواب ہی رہا تھا۔ اب بھی اسے باجی نے یہاں بلایا تھا لیکن وہ دروازے پر ہی رک گئی تھی۔ آگے نہ جاسکی تھی۔

"آ جاؤ بچے۔" باجی نے اس کی ہچکچاہٹ محسوس کرتے ہوئے آواز دی۔

تو وہ دھیرے دھیرے اس کمرے کا فسوں اپنے اندر اتارتی ان کے قریب آ گئی۔

"میں نے گل مینہ کا ایڈمیشن کروا دیا ہے۔ کل ضیا آئے گا تو تم لوگ اس کے ساتھ ہی جاؤ گے۔" باجی نے کتاب میز پر رکھتے ہوئے اسے بتایا۔

"ہم لوگ۔۔۔" وہ حیران ہوئی۔

"ہاں تم بھی گل مینہ کے ساتھ جاؤ گی۔" وہ ابھی سمجھدار نہیں ہے کہ اکیلے رہ سکے۔ جب تک اس کی تعلیم مکمل نہیں ہو جاتی تم اس کے ساتھ ہی رہو گی۔ اور اس طرح مجھے نضیا کی بھی گ فکر نہیں رہے گی۔ ملازموں کا کیا مجھڑو سا۔۔۔ کس چیز کا خیال رکھتے ہیں کس چیز کا نہیں رکھتے۔۔۔" انہوں نے اوزگل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم میری سمجھدار بیٹی ہو تم وہاں ان دونوں کے پاس ہو گی تو میں بھی بے فکر رہوں گا ان کے چہرے پر سکون بھری مسکراہٹ تھی۔
اوزگل کا دل بے پایاں خوشی سے بھر گیا تھا۔

"آپ بے فکر رہیں باجی۔۔۔" اس کے چہرے سے سچی خوشی چھلکنے لگی تھی۔

"اب تم لوگ پیکنگ کر لو تا کہ بعد میں پریشانی نہ ہو۔ ضیا کو تو جانتی ہو تم۔۔۔ آندھی طوفان کی طرح آتا ہے چلا جاتا ہے۔
ضیا کا نام لیتے ہی ان کے لہجے میں مٹھاس گھلنے لگی تھی۔
"جی باجی۔۔۔" مودب لہجے میں کہتی وہ باہر نکل گئی۔

☆.....☆.....☆

مری کی خوب صورت وادی میں داخل ہوتے ہی کن من سی بارش نے ان کا استقبال کیا تھا۔ ہر طرف بکھری روئی کے گالوں جیسی شفاف برف ان سب کی آنکھوں میں روشنی بھر گئی تھی۔ سبھی نفوس بے حد خوش تھے چیر، پائن، شاہ بلوط کے اونچے اونچے درخت شام کے سائے کو پھیلنے میں مزید مدد دے رہے تھے۔

بس میں سوار لڑکے لڑکیاں کھڑکیوں کے پردے ہٹائے قدرت کی صنایع کو دیکھنے اور سراہنے میں مصروف ہو چکے تھے۔ لالہ کی نظریں بھی بارش کے قطروں سے دھندلتے شیشوں پر جمی تھیں۔ اس کی سائنڈ پر ڈھلوان میں لگے درخت اور گہری کھائی تھی۔ اسے ان درختوں کو دیکھ کر حیرت ہوئی تھی۔ ڈھلوان میں لگے درخت اور نیچے کھائی میں جا بجا موجود رہائشی مکان اور پتھروں سے بنی مسجدیں سب اسے ورطہ حیرت میں ڈالی رہی تھیں۔ بارش کے قطروں نے جب منظر دھندلانے شروع کیے تو اس نے سردی کی پروا کیے بغیر تیزی سے شیشہ ہٹا دیا تھا۔ بارش کی چھینٹیں اندر آرہی تھیں اور اس کے کندھے سے لگی کھڑکی کے پار تکتی نمرہ اور اس کا چہرہ بھگو گئی تھیں نمرہ جھٹکے سے پیچھے ہوئی اور لالہ پیچھے ہونے کے بجائے مزید آگے یوں کے تازہ ٹھنڈی ہوا اور پھوار اس کا چہرہ چھونے لگی سفید کا مدار چادر سر سے ڈھلک سی گئی تو جیسے اس کے ریشمی بالوں کو نوید جی ات ملی تھی۔ کالی سیاہ ٹیٹس اس آزاد ہوتے ہی اس کے خوب صورت پر روص کرنے لگیں۔۔۔ ڈور اسٹیپ پر ٹھہرے ضیا کی نگاہ سب سے ہوتی اس پری پیکر پر آٹھری تھی اور پھر گویا واپس پلٹنا ہی بھول گئی۔ اس کو چار سو چاندنی سی بکھرتی محسوس ہوئی۔ سونا سا چمکتا محسوس ہوا تھا لمبی کالی پلکیں گرائے چہرہ کھڑکی کے قریب کیے وہ نہ جانے کون سا سراپے اندر اتار رہی تھی۔

"لالہ شیشہ بند کر دیا سردی ہے، بیمار پڑ جاؤ گی۔" زہرہ نے دور سے اسے پکارا تھا۔ ضیا نے گھنی پلکوں یو گیا رگی اٹھتے دیکھا۔
"ہائے محسوس تو کرو۔ مری مجھے ویلکم کر رہا ہے۔" مسکراتے ہوئے اس نے ایک غرور سے کہا تو سب لڑکیوں نے مل کر اوئے ہوئے کا نعرہ لگایا۔ لالہ اور نمرہ شرارت سے ہنس دیں دو خوبصورت رنگ بدلتی سی جھلک دیتی آنکھیں بھی مسکرائی تھیں۔ اور پھر اچانک ہی ضیا نے آگے بڑھ کر چلتی بس کا دروازہ کھول دیا تھا۔

"اوائے" پائیدان پر بیٹھے بچارے لڑکے جو سیٹ نہ ملنے کی وجہ سے قربان ہوئے تھے تڑپ کے اٹھے سب ان کی طرف متوجہ ہوئے تھے کی طرف ہوئے تھے۔

"یہ کیا ضیا۔۔۔" سامنے بیٹھی میم تبسم نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

"میم دیکھیں تو مری کسی کو ویکلم کر رہا ہے۔" گہری مسکراتی نظروں سے اس نے لالہ کو تکتے ہوئے کہا۔

"واؤ۔۔۔" سب نے تعریفی انداز میں کہتے ہوئے ہلکی ہلکی تالی بجانا شروع کی تھی۔ لالہ نے بس ایک نظر ضیا علی خان کو دیکھا اور اپنی سائڈ کا شیشہ بند کر دیا تھا۔ باقی سب البتہ اب ضیا کی تقلید میں کھلے شیشوں سے موسم انجوائے کر رہے تھے۔ گاڑی میں کچھ بے سروں نے تال بھی چھیڑ دیے تھے۔

☆.....☆.....☆

"باری۔۔۔" دیدے کی پکار پر اسی نے سر اٹھا کر ماں کو دیکھا۔ پھر لپ ٹاپ بند کر کے سائڈ پر رکھ دیا۔ ماں جب بھی اس کے پاس ہوتی وہ یونہی سارے کام سمیٹ لیا کرتا تھا۔ دیدے اس کے قریب ہی صوفے پر بیٹھ گئیں۔

"تمہارا کام کافی بڑھ گیا ہے انہوں نے محبت پاش نظروں سے اس کے وجود کو حصار میں لیا تھا۔

"کچھ دنوں کی بات ہے دیدے۔۔۔" سائٹ کا کام ختم ہوتے ہی فارغ ہو جاؤں گا۔" ان کا ہاتھ تھامتے ہوئے وہ ادب سے بولا تھا۔

"اصل میں، میں سوچ رہی تھی کہ۔۔۔" دیدے بولتے بولتے رک سی گئیں۔

"کیا ہوا دیدے۔۔۔" وہ پریشان ہو گیا۔

"تمہیں امن کیسی لگتی ہے۔" ان کی اگلی بات پہ وہ حیران ہوا تھا۔

"یہ اچانک امین میم کیسے یا آگئیں آپ کو۔۔۔؟" وہ حیرانی سے ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

"ہر وقت تو پرچھائی طرح تمہارے ساتھ رہتی ہے اس میں یاد آنے والی کون سی بات ہے۔" دیدے برا منا گئیں۔

"اف۔۔۔" وہ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

"آپ کچھ الٹا سوچ رہی ہیں ناں دیدے۔۔۔" وہ سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"تو کیا غلط سوچ رہی ہوں؟" دیدے نے الٹا اس سے سوال کیا۔

"بالکل غلط۔۔۔" وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

"لیکن کیوں؟" دیدے بھی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"اتنی پیاری تو ہے وہ پھر دیوانوں کی طرح تمہارے ارد گرد چکر کاٹتی رہتی ہے۔" بات کے آخر میں وہ شرارت سے مسکرائی تھیں۔
باریال نے خفا نظروں سے انہیں دیکھا تھا۔

"وہ صرف اور صرف میرے کام کی وجہ سے ہے دیدے ایسی کوئی بات نہیں جیسا آپ سوچ رہی ہیں۔" وہ صاف مکر گیا۔
"مجھے بچہ مت سمجھو باری۔" انہوں نے دھونس جمائی۔
"آپ بھی تو مجھے غلط سمجھ رہی ہیں دیدے اگر ان کو مجھ میں کوئی انٹرسٹ ہے بھی تو یہ یکطرفہ ہے۔" ٹھوس لہجے میں کہتا وہ ان کے سامنے کھڑا تھا۔ دیدے کی آنکھوں میں الجھن سی جاگی۔ ان کا بیٹا کبھی جھوٹ بولتا تھا نہ کچھ ان سے چھپاتا تھا۔
"لیکن وہ تو۔۔۔" انہیں افسوس ہونے لگا۔
"دیدے۔۔۔" اس نے ماں کو کندھے سے تھام لیا۔

"میرے کچھ خواب ہیں۔۔۔ پورے ہو جائیں تو ضرور سوچوں گا اس بارے میں۔۔۔ لیکن فی الحال صرف کام" مضبوط لہجے میں کہتا وہ ان کے شکوک بالکل مٹا گیا تھا۔ ان کی آنکھوں میں چھائی مایوسی خود باریال کو بھی اچھی نہیں لگی تھی۔ لیکن حقیقت بھی تھی سو وہ فی الحال ان کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

☆.....☆.....☆

جیسے ہوٹل میں ان کے ٹھہرنے کا انتظام کیا گیا تھا نسبتاً ویران جگہ پہ تھا۔ ہوٹل کی عمارت آگے کی طرف جبکہ کار پارکنگ اور لان پچھلی سائڈ پر رکھے گئے تھے۔

جہاں چاروں طرف لکڑی کی خوب صورت دیوار بنا کر کھائی سے کچھ آگے تک کا ایریا کور کیا گیا تھا۔ اس طرف کا نظارہ بہت دلکش تھا۔ ساری وادی وادی نظر آتی تھی۔ دور شفاف سڑکوں پر چلتی ٹریفک ڈھلوانی بر فیلی پہاڑ اور برف سے ڈھکے اونچے درخت جو سرشام دل لہہ رہے تھے، رات ہوتے ہی کسی آسب کی طرح لگنے لگے تھے۔

نمرہ کے ابو نے نمرہ اور لالہ کے لیے علیحدہ کمرے کا انتظام کر دیا تھا۔ باقی لڑکیوں نے میم تبسم کے ساتھ ہال کمرے کو چنا تھا نمرہ کا دل بھی وہیں انجوائے کرنے کا تھا۔ لیکن اسے چونکہ لالہ کی طبیعت کا اندازہ تھا تبھی اس نے باپ سے کہہ کر علیحدہ روم کا بندوبست کیا تھا۔ تاکہ لالہ وہاں صحیح معنوں میں انجوائے کر سکے۔

جس وقت وہ ہوٹل پہنچے رات ہو چکی تھی۔ سامان رکھ کر وہ دونوں باہر پچھلی طرف آگئی تھیں۔ اس طرف کونے میں ایک چھوٹا سا کیفے بھی کھلا تھا۔ ثمرہ فوراً اس طرف چلی گئی۔ لالہ دھیرے دھیرے چلتی لکڑی کی اس چھوٹی سی دیوار کے قریب آگئی۔ بارش کب کی رک چکی تھی لیکن ہوا میں نمی بدستور تھی۔ چاروں طرف اترنے والی کہر نے ہر منظر نگنا شروع کر دیا تھا پھر بھی دور سے کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس اور

عمارتوں پر لگے بلب کبھی جھلما جاتے تو بے حد اچھا لگتا وہ اس گرل کے بالکل قریب آ گئی۔ اور نیچے کھائی میں دیکھنے لگی جہاں پاتال کے اندھیرے چھائے تھے۔

"کتنے ہنستے مسکراتے لوگوں کو نکل گئی ہوگی یہ سیاہ کھائی۔" اس نے اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے سوچا۔
 "کاش یہ مجھے بھی نکل لے۔۔۔ ایک روتا بسورتا انسان کہ جس کی نہ کسی کو ضرورت ہے اور نہ جس کو کسی اور کی۔۔۔" اس کی آنکھیں جلنے لگیں لیکن اندھیرے میں دیکھنے کے قابل نہ ہوئی تھیں۔ منفی سوچوں نے ایک بار پھر اس کے دماغ کو اپنی شکنجے میں لیا تھا۔
 "لالہ۔۔۔ کافی۔۔۔" نمرہ نے اسے کافی مانگتے ہوئے پکارا جو اس نے خاموشی سے تھام لیا۔
 "اتنی تاریک کھائی میں دیکھتے ہوئے تمہیں خوف نہیں آتا۔۔۔" نمرہ نے گہری کھائی پر ایک نظر ڈالتے ہی جھرجھری سی لی۔
 "بدکردار ماؤں کی بیٹیوں کو شاید کسی چیز سے خوف نہیں آتا موت سے بھی نہیں۔" اس کی بات پر نمرہ چند لمحے ساکت رہ گئی تھی۔
 "اتنی گھٹی بات تم اس قدر آسانی سے کیسے کہہ سکتی ہو لالہ۔" اس کے لہجے میں تاسف سا سمٹ آیا تھا۔
 "ان کے ماضی کے متعلق تم جانتی بھی کیا ہو؟ اور پھر بھی تم ایسا کیسے کہہ سکتی ہو یار۔۔۔ ہیں تو تمہاری ماں ہی "اسے واقعی لالہ کی سوچ پہ افسوس ہو رہا تھا۔

"لوگوں کی زبانی روز سن لیتی ہوں ان کے ماضی کے متعلق قصے۔۔۔ جتنے نشتر روز میری روح سہتی ہے وہ کافی ہیں میری مان کا کردار جاننے کے لیے۔۔۔" اس کے لہجے کے ساتھ اس کی آنکھیں بھی بھگینے لگی تھیں۔
 "ایسا کچھ نہیں ہے لالہ۔۔۔ لوگوں کا تو کام ہی باتیں کرنا ہیں اور پھر سین آنٹی تھی۔۔۔ کتنی نائس ہیں۔۔۔ یقین کرو انہیں تو دیکھ کر دل میں احترام خود بخود ابھرتا ہے۔" نمرہ اسے سمجھانے لگی۔
 "احترام "لالہ کے لبوں پر طنز یہ مسکراہٹ مچلی۔
 "تم پہلی لڑکی ہو دادو کے بعد جس کے منہ سے امی کے لیے یہ لفظ سن رہی ہوں ورنہ گھر سے بھاگی ہوئی عورت کا اس دنیا میں کیا مقام ہے تم بھی اچھی طرح جانتی ہو۔"

"تم بہت نیکیو سوچتی ہو لالہ۔۔۔" نمرہ کافی کاسپ لیتے ہوئے دور چلتی بجھتی لائٹس کو دیکھتے ہوئے بولی۔
 "میرے خیال میں تمہیں کچھ اسپیس رکھنی چاہیے دل۔۔۔" اس کے لہجے میں خلوص تھا۔
 "کاش تم میری جگہ ہو تیں نمرہ۔۔۔ تم تب ہی سمجھ پاتیں۔" وہ بھی کافی پینے لگی اندر کی کڑواہٹ مزید بڑھنے لگی۔
 "شاید۔" نمرہ نے مختصر جواب دیا۔۔۔ وہ اس بحث کو اب ختم کر دینا چاہتی تھی۔

کھڑکی کے پردے ہٹا کر اس نے ایک نظر باہر دیکھا تھا۔ کھڑکی کے شیشے ابھی تک بارش کے قطرؤں سے تم تھے بھی باہر کے منظر دھندلا رہے تھے۔

مری کی پہاڑیوں پر اترنے والی شب سرد تاریک بھی تھی لیکن ہوٹل کے پچھلی طرف والا لان روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ "مری مجھے ویلکم کر رہا ہے۔" مسکراتی آواز پر اس نے بے خود سا ہو کر کھڑکی کھول دی۔ سرد ہوا کے جھوٹے نئے اسے چھوا اور انوکھی سی خوشبو اس کی روح تک میں سرایت کرنے لگی۔ اس نے کوٹ کے کالر اوپر کیے اور نیچے دیکھنے لگا۔

لان رات کے اس پہر سردی کے باوجود لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ صرف جس طرف کھائی تھی اس طرف تھوڑا سا ایریا ویران تھا اس طرف تھا بھی نسبتاً اندھیرا۔۔۔ ضیا کچھ دیروہیں دیکھتا رہا بلا ارادہ ہی۔۔۔ یونہی دیکھتے رہنے سے اچانک ہی کسی کا عکس واضح ہوا تھا۔ گرل کے بالکل قریب ہی دوسرے تھے جو اتنی دیر تک دیکھتے رہنے کے باعث آہستہ آہستہ واضح ہونے لگے تھے۔۔۔ وہ دولڑکیاں تھیں جو اس ویران قطعے پر کھڑی شاہد اس کھائی کے اندھیرے سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ سفید لمبی شال سے وہ فوراً لالہ کو پہچان گیا تھا۔ چند سیکن لگے تھے اسے سوچنے میں۔۔۔ وہ کھڑکی بند کرنے ہی لگا تھا کہ سائیڈ ٹیبل پر دھرا موبائل بجنے لگا۔ اس نے کوفت سے سکرین دیکھی۔

"با۔۔۔ جی" کا نام ہلنک کر رہا تھا لمبی سانس لیتے ہوئے اس نے خود کو کمپوز کیا اور کال پک کرتے ہوئے دوبارہ کھلی کھڑکی میں آٹھرا۔ "حال سنا بیٹے۔۔۔ با۔۔۔ جی۔۔۔ کی مسکراتی ہوئی آواز ابھری۔ نہ جانے کیوں وہ مسکرا نہ سکا۔ اس کی نظریں اب بھی دور کھڑی لالہ پر جمی تھیں۔

"ٹھیک ہوں با۔۔۔ جی۔۔۔" مختصر جواب دیا۔ "تو پھر کیا پروگرام ہے؟ کل آرہے ہونا۔۔۔ با۔۔۔ جی۔۔۔ نے پوچھا وہ مزید کھڑکی کے قریب ہو گیا۔ "نہیں۔۔۔ با۔۔۔ جی۔۔۔" اس نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد جواب دیا۔

"کیوں خیریت تو ہے نا۔۔۔؟" با۔۔۔ جی۔۔۔ پریشان ہو گئے۔ "میں کچھ دوستوں کے ساتھ مری آیا ہوا ہوں لیکن آپ فکر نہ کریں با۔۔۔ جی۔۔۔ میں ابراہیم کو کہہ دوں گا۔۔۔ وہ وہیں ہے۔ میری گاڑی لے کر پہنچ جائے گا۔" اس نے انہیں اطمینان دلایا۔

"کیوں؟" تم اپنی گاڑی میں نہیں گئے وہاں؟ دوراں خان ہے تمہارے ساتھ؟ مطمئن ہونے کے بجائے وہ مزید پریشان ہو گئے۔ "با۔۔۔ جی۔۔۔ یونیورسٹی ٹور پر آیا ہوں، اب سب کو تو ساتھ نہیں لاسکتا نا۔۔۔" وہ بیزار سا ہونے لگا۔ "یہ تو اچھی بات نہیں ہے بیٹا۔" "وہ خفا ہوئے۔ اس بار ضیا خاموش رہا تھا۔ "خیر تم ابراہیم کو کہہ دو کل آجائے بچیوں کو لینے"

"جی ہا۔۔۔ جی"

"اور ایک بات یاد رکھنا ضیاء تم میری بے آرام راتوں اور بے چین نیندوں کے گواہ ہو۔۔۔ میری ہر ٹپ ہر تکلیف کا قرض وصولنا ہے تمہیں وہ بھی سو سمیت۔۔۔ مجھے ناکامی نہیں چاہیے۔" ان کے تلخ لہجے پر ضیاء کی آنکھیں جلنے لگی تھیں۔

"بے فکر رہیں با۔۔۔ آپ کی تکلیف آپ کی شرمندگی میں بھول بھی نہیں سکتا۔۔۔ ایک، ایک پائی وصول کروں گا۔۔۔ سود سمیت ہی۔۔۔" اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک جاگتی تھی۔

"فون رکھتا ہوں، اپنا خیال رکھنا۔" انہوں نے فون بند کر دیا تھا۔ ضیاء نے سامنے دیکھا۔ لالہ وہاں نہیں تھی۔ اس نے غصے سے دیوار کو لات رسید کی تھی۔



ناول ”محبت لفظ ہے لیکن“ ابھی جاری ہے۔ اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی 10 تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

تزیلہ ریاض کا بہت خوبصورت نیا ناول

غم ہے یا خوشی ہے تو

ہر ماہ باقاعدگی سے کتاب گھر پر پیش کیا جا رہا ہے
نئی اقساط پڑھنے کیلئے وزٹ کریں

kitaabghar.com

بطور خاص کتاب گھر قارئین کے لیے لکھا گیا
عشاء کوثر سردار کا بہت خوبصورت اور طویل ناول

عطارد جزیرے کے خواب

ہر ماہ باقاعدگی سے کتاب گھر پر پیش کیا جا رہا ہے
نئی اقساط پڑھنے کیلئے وزٹ کریں

kitaabghar.com

قسط نمبر 5

”ماں باپ کے سامنے بہت سوچ سمجھ کر بولا کرو کیوں کہ کبھی کبھی ان کے سامنے بولا گیا کوئی بھی برایا اچھا کلام ہماری پوری قسمت پہ حاوی ہو جاتا ہے۔“

"باری۔۔۔ کو۔۔۔" وہ آفس سے نکلتا لفٹ میں سوار ہونے لگا تھا کہ امن کی تیز پکار پر رک کر مڑ کر دیکھنے لگا۔۔۔ وہ اس کے پاس سے گزرتی لفٹ کے اندر چلی گئی۔ وہ یونہی کھڑا اسے دیکھتا رہا۔

"آ جاؤ ناں۔۔۔" اس نے کہا۔ پھر اس کے اندر آتے ہی اس نے گراؤنڈ فلور کا بٹن پیش کر دیا تھا۔

"آج کسی اچھے سے ہوٹل میں لنچ کرتے ہیں۔" ایک جذب سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

موبائل پر کچھ چیک کرتا باریاں چونکا۔

"آج؟" وہ متذبذب تھا۔

"ہاں۔۔۔ اب بھی کی بات کر رہی ہوں۔" وہ منہ بنا گئی۔

"لیکن مجھے کچھ کام ہے۔" اس نے ٹالنا چاہا۔

"پلیز" وہ ہاتھی ہوئی۔

"ایکسٹری میلی سوری" اس نے پھر بھی معذرت کر لی۔ مایوس ہو کر امن موبائل پر مصروف ہو گئی۔ باریاں نے ایک گہری سانس

لے کر خود کو ہلکا سا محسوس کیا تھا۔ جب سے دیدے نے امن کے حوالے سے اس سے بات کی تھی۔ وہ محتاط ہو گیا تھا۔

امن اچھی لڑکی تھا۔ باریاں اسے پسند بھی کرتا تھا لیکن صرف ایک دوست کی حد تک ورنہ اس کے اور امن کے لائف اسٹائل میں

بہت فرق تھا۔ اتنے عرصہ شہر میں رہنے اور پڑھنے لکھنے کے باوجود وہ روایتی سادگی پسند چٹھان تھا۔ اسے عورتوں میں بھی وہی نسوانی مشرقی

سادگی پسند تھی۔ جیسے اس کی دیدے تھیں۔ باوقاری۔۔۔ امن ذرا مختلف تھی۔ وہ کچھ زیادہ ہی آزاد خیال تھی۔ بلا جھجک ہی سب مردوں سے

مصافحہ کر لیتی تھی۔ جبکہ باریاں مرد ہوتے ہوئے بھی کئی بار ایسے مواقع میں جب بزنس پارٹنر غیر ملکی ہوتے اور ہوتی بھی کوئی عورت تو صرف

سر ہلانے پر ہی اکتفا کر لیتا۔

امن لباس بھی مغربی ہی پسند کرتی۔ کھلے گلے والی شرٹس سلیولیس اور نائٹ جینز اس کا فیورٹ لباس تھا۔ کئی بار وہ اس قدر بھڑکیے

اور فٹ لباس پہن لیتی کہ باریاں اس سے بات کرتے وقت بھی نگاہ نیچی رکھتا۔ اور مارے حیا کے پسینہ پسینہ ہوتا رہتا جیسے امن نے نہیں اس

نے کچھ غلط پہن لیا ہو۔

امن سے لاکھ دوستی سہی۔۔۔ اسی فرق کی وجہ سے بہر حال وہ سب کچھ مشکل تھا جو دیدے سوچ رہی تھیں اور بقول دیدے کے امن بھی سوچ رہی تھی باریال کو اب واقعی محسوس ہونے لگا تھا امن اس میں دلچسپی لے رہی تھی۔ اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ مزید اس آگ کو شہہ دے تبھی اس نے خود کو مزید ری رو کر لیا تھا لیکن اسے قطعاً اندازہ نہیں تھا کہ امن یہ سب نہ صرف بخوبی سمجھ رہی ہے بلکہ اندر سے بے چین بھی ہو گئی تھی۔

اس وقت بھی وہ پہلے باریال کو معمولی سا جواب دے کر بظاہر فون پر معروف ہو گئی تھی لیکن اس نے بھی طے کر لیا تھا کہ باریال ولی خان نے کھانا اس کے ساتھ ہی کھانا تھا۔ وہ فون ہاتھ میں تھا مے لفٹ سے اس کے ساتھ باہر آئی تھی۔

"گھر جاؤ گے؟" پارنگ ایریا میں آتی ہی اس نے پوچھا۔ باریال نے صرف سر ہلانے پر ہی اکتفا کیا تھا۔ آفس سے اسے گاڑی بھی مل چکی تھی۔ وہ گاڑی کی طرف بڑھا۔ امن نہ جانے کیوں ہے بے چینی سے اس کے ہاتھ میں تھا مے سیل کو دیکھ رہی تھی۔ باریال گاڑی میں سوار ہو چکا تھا۔ مایوس سی ہو کر وہ بھی اپنی گاڑی میں بیٹھ گئی۔ اور اس سے پہلے کہ وہ انکیشن میں چابی گھماتی۔ اس کی نظریک ویو مرر میں باریال پر پڑی تھی۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ سنبھالے فون پر بزی تھا اور اس کے چہرے کے بدلتے زاویے امن کے چہرے پر مسکان بکھیرنے کے لیے کافی تھے۔ اس نے لفٹ میں ہی پاپا کو میٹج کر دیا تھا کہ کسی طرح بھی باریال کو اس کے ساتھ سائٹ کا کام دے دیں۔ باریال نے اسے لپٹ کے لیے منع کیا تھا اور امن سکندر کو فی الحال کوئی منع کرنے والا پیدا نہ ہوا تھا۔

اس نے باریال کو گاڑی لاک کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس نے نہایت پھرتی سے چابی انکیشن میں گھمادی تھی۔ اور ہلکا سا ٹرن لے کر نکلنے لگی تھی۔ جب اس نے باریال کو اپنی طرف ہاتھ ہلاتا دیکھا تھا۔ اس نے گاڑی روک دی۔ باریال اس کی گاڑی کی دوسری سائڈ سے آیا۔ امن نے اس کے لیے دروازہ کھول دیا تھا۔

"سوری ایچو نیلی سر نے ابھی کہا ہے کہ ہمیں نہر کے ساتھ والی مل کا وزٹ کر لینا چاہیے۔ انہیں بلڈنگ میٹریل کے متعلق کچھ غلط انفارمیشن ملی ہے۔" اس نے اندر بیٹھتے ہوئے امن تفصیل بتائی۔

"اوہ۔۔۔ نو پرابلم۔" وہ کھل کر مسکرائی۔

"میں ویسے بھی فارغ ہی تھی۔" باریال اس بار خاموش رہا تھا۔ گاڑی مین روڈ پر آچکی تھی۔ امن نے دھیمی آواز میں میوزک آن کر دیا۔ ایک نظر خاموشی سے بیٹھے باریال پر ڈالی۔ پھر مسکراتے ہوئے سیل پر "تھینک یگ مین" ٹائپ کیا اور پاپا کے نمبر پر سینڈ کر دیا۔ دوسرے لمحے ہی ان کا تہقہ موصول ہوا تھا۔ وہ مسکرا کے گنگنا نے لگی تھی۔

☆.....☆.....☆

”دوران خان! ضیا کیلے مری گیا اور تمہیں خبر ہی نہیں۔“ ضیا سے بات کے دوران بے شک سہراب علی خان خاموش ہو گئے تھے لیکن اسی وقت دوران کو فون کیا تھا۔ اس کی تو گویا جان پر بن آئی۔۔۔

”خان، ام نے بہت کہا لیکن چھوٹے خان ہی نے کہا کہ اگر انہیں ام، امارے آدمی یا اماری جیب دکھائی دی تو وہ کچھ بھی کر بیٹھیں گے۔“ مودب لہجے میں کہتا وہ سچ بتانے لگا۔

”تم نے مجھے بتایا دوران؟“ سہراب علی خان کا لہجہ مزید کڑا گیا۔

”وہ۔۔۔ خا۔۔۔ خان۔۔۔؟“ وہ بول نہ پایا۔

”تم لوگ ابھی کل جاؤ ٹھیک صبح چھ بجے تم مجھے مری سے کال کرو گے، میں انتظار کروں گا۔“ سخت لہجے میں حکم سنایا گیا۔

”جی خان۔“ وہ مستعد ہوا۔

”اور ہاں، ابراہیم کو یہاں بھیج دینا۔ بچیوں کو شہر جانا ہے۔ اور اس کے ساتھ گارڈز لازمی بھیجنا۔“ وہ مزید ہدایت دینے لگے۔

”حکم خان“ اس نے مؤدب لہجے میں کہا۔ سہراب علی خان نے کال بند کر دی۔ پیشانی پر البتہ فکر کی سلوٹیں گہری تھیں۔

☆.....☆.....☆

مری کے کہساروں پر اترنے والی اگلی صبح چمکدار تھی۔ بارش کے بعد نہ صرف مطلع صاف ہو گیا تھا بلکہ دھوپ بھی کافی تیز اور جاندار گیا۔ چڑ، سفیدے، شاہ بلوط اور پائے کے درخت عجیب ڈھنگ سے نکھرے تھے۔ کہیں کہیں پتوں پر چمکتے بارش کے قطرے تو کہیں برف کی ننھی ننھی ڈلیاں، ہر منظر جنت کی تصویر پیش کر رہا تھا۔ برف سے ڈھکی ایک طرف پہاڑیاں اور ان کی ڈھلوانوں پر بنے خوبصورت منقش گھر، صاف ستھری دھلی دھلی، سی گیلی سڑک اور دوسری طرف دل دہلائی اندھی کھائیاں قدرت نے کس فراخی سے صنایع بکھیری تھی کہ دل عیش عیش کراٹھتا تھا۔

صبح کی پہلی کرنوں نے بادلوں کے دھوئیں سے نجات پاہی لی تھی۔ شفاف سی روشنی نے برف سے ڈھکے سبزہ زاروں کو عجیب سا نور بخش دیا تھا۔ صبح ہوتے ہی سب لوگ گروپس کی شکل میں ادھر ادھر نکل گئے تھے نمرہ اور لالہ بھی چہل قدمی کے لیے پہاڑی پروپر کی طرف جانے والی پکی پگڈنڈی پر آ گئیں۔ لالہ کے ہاتھ میں پاپ کارن کا بڑا سا پیکٹ تھا۔ جیسے کبھی وہ خود کھاتی کبھی درختوں کی طرف اچھال دیتی۔

”پھینک کیوں رہی ہو؟“ نمرہ نے اسے ٹوکا۔

”پھینک نہیں رہی یہ گفٹ کر رہی ہوں۔“ وہ مسکرائی۔

”گفٹ کسے؟“ نمرہ نے حیرت سے ادھر ادھر دیکھ کے پوچھا۔

گلہریوں کو اس نے سرگوشی کی۔

"میں نے سنا ہے۔ اس موسم میں گلہریاں اپنے بل سے باہر نہیں آتیں۔ خوراک کی ضرورت بھی ہو تو بل کے دروازے سے ہی جھانک کے پیچھے بھاگ لیتی ہیں۔ کیا پتہ چند دانے ان کے کام آجائیں۔" اس نے وجہ بتائی۔

"ماں صدقے۔" نمرہ اس کے واری صدقے جانے لگی اور دونوں کی کھلکھلاہٹیں ان سرد وادیوں میں گونج اٹھیں۔ یونہی چلتے قہقہے لگاتے وہ کافی آگے نکل آئی تھیں۔ یہ جگہ نسبتاً کھلی تھی اور صاف کر کے چھپر نما ہوٹل بنادیا گیا تھا۔ جہاں گرما گرم دیسی کھانوں کی خوشبو سے ان دونوں کی بھوک یکنخت جاگ اٹھی تھی۔

یہاں لوگوں کا رش بھی کافی کم تھا اور کافی آگے جا کر دو تین مزید پگڈنڈیاں نکل رہی تھیں جو نیچے وادی میں اترتی دکھائی دیرہی تھیں۔

"کھانا کھاتے ہیں؟" نمرہ نے کہا۔

"پیک کروالو۔ نیچے کہیں کھالیں گے۔" لالہ نے تجویز دی۔ نمرہ تائید میں سر ہلاتی ایک طرف بڑھ گئی۔ لالہ سنبھل سنبھل کر پیچر رکھتی نیچے اترنے لگی۔ اس نے ایک نگاہ نیچے وادی میں ڈالی۔ جگہ، جگہ سے پھٹی کٹی چٹانوں کے درمیان کہیں پانی کے کٹاؤنے راستے سے بنا دیے تھے تو کہیں، کہیں موجود گھر لوگوں کے باہمت ہونے کا پتا دے رہے تھے۔ وہ تو ایک دن نہ رہے ان سنگلاخ پہاڑوں کی سفاک گود میں۔ اسے ہمیشہ سے لگتا تھا پہاڑ جس قدر خوبصورت ہوتے ہیں اسی قدر بدصورت اور ظالم بھی ہوتے ہیں۔ تبھی اسے ہمیشہ پہاڑوں سے خون آتا تھا لیکن آج۔۔۔ آج وہ ان کے سحر میں جکڑی گئی۔۔۔ وہ بے خود تھی۔

قدرت کی ایسی صنایع، وہ بار بار دل میں سورہ رحمن کا ورد کیے جا رہی تھی (اور تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے) "اوائے ہوئے۔۔۔" جیتی آواز پر وہ بری طرح چوکنی تھی۔

"سنا تو تھا پہاڑوں پر پریاں اترتی ہیں۔ آج دیکھ بھی لیا۔" اپنی ہی دھن میں منظروں، نظاروں کو کھوجتی لالہ کو ایک دم ہی احساس ہوا تھا وہ کافی دور نکل آئی تھی۔ یہاں سوائے اس کے اور ان دو اواباش لڑکوں کے اور کوئی نہیں تھا جو وہاں جیپ میں آئے تھے اور موج مستی میں مصروف تھے اور جن پر لالہ کی نگاہ نہیں پڑھی تھی۔

"سچ میں یار! اس دفعہ تو مری لگتا ہے مہربان ہو گیا ہے۔" دوسرے لڑکے نے پیلے دانت دکھائے۔ لالہ کو گھسن سی آئی۔ وہ بے اختیار دو قدم پیچھے ہٹی تھی۔ مدد کے لیے بے اختیار اوپر دیکھا تھا لیکن وہ زیادہ نیچے آچکی تھی۔ اوپر ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈی کے علاوہ غور سے تنا پہاڑ تھا، اس کی روح تک کپکپا گئی اور جب عورت کو ایک دم سے احساس ہو کہ وہ غلط مردوں کے نرنخے میں آگئی ہے تو بالکل ویسا ہی خون اسے لپیٹ لیتا ہے جیسا کبھی بڑے بوڑھے آسیب کے متعلق بتایا کرتے تھے۔ ہاتھ کام کرتے ہیں نہ پاؤں۔ ایک انچ بھی قدم نہیں ہلایا جاتا۔ یہی اس وقت لالہ کی حالت تھی۔ وہ دانت نکالتے آدم خور بھیر یوں کی طرح منہ کھولے اس کی طرف بڑھ رہے تھے اور لالہ، اس کے قدم جیسے پکی زمین میں دھنس سے گئے تھے۔ اس قدر بھاری ہو گئے تھے کہ وہ اٹھا ہی نہیں پارہی تھی۔

"لالہ۔۔۔" تبھی دور سے نمرہ نے اسے پکارا تھا۔ وہ لڑکے ایک دم رکے تھے۔ لالہ کی جان میں جان آئی تھی۔ اس نے تیزی سے نمرہ کو اپنی طرف آتے دیکھا تھا لیکن وہ اکیلی نہ تھی۔ ضیاعلی خان بھی اس کے ساتھ تھا۔ وہ دونوں لالہ کے قریب آکر کے تھے۔ دونوں لڑکے جیپ پر سوار ہو کر کودو گیا رہ ہو گئے تھے۔

"تم ٹھیک ہو؟" نمرہ نے پوچھا تو لالہ اختیار ہی اس کے گلے سے لگ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی ضیاعلی خان کی آنکھوں نے دور تک جیپ کا تعاقب کیا تھا۔ دائیں ہاتھ کی مٹھی مضبوطی سے بند کرتے اس نے اپنے ضبط کی طائیں کھینچی تھیں۔

☆.....☆.....☆

اس واقعے نے اسے بری طرح خوف زدہ کر دیا تھا۔ شام تک وہ کمرے میں بیٹھی روتی رہی تھی۔ نمرہ اسے سمجھا سمجھا کر خود پاگل ہو گئی تھی۔

"تمہاری غلطی تھی لالہ۔۔۔ اکیلے اتنے نیچے جانے کی کیا ضرورت تھی؟" آخر اسے غصہ آنے لگا۔
"وہاں رش کافی تھا۔ تبھی مجھے کھانا پیک کروانے میں دیر ہو گئی۔ وہ تو بھلا ہونصیا کا جو ہمیں ڈھونڈتا وہاں آ گیا اور تمہیں نہ دیکھ کر اس کے ساتھ میں بھی واقعی میں پریشان ہو گئی۔ اس کی بات پر لالہ نے چونک کر سر اٹھایا تھا۔

"ویسے سچ کہوں ضیاعلی خان بھی نہیں ہے جتنا تم سمجھتی ہو۔" ہمیشہ کی طرح وہ ایک مرتبہ پھر اپنے پسندیدہ موضوع پر آ چکی تھی۔ لالی چڑ گئی۔
"اس کا ہمارے پیچھے آنا ہی برا ہے، لڑکیوں کا پیچھا کرنا اچھی بات ہے؟" وہ بھی اپنے نام کی ایک ہی تھی منفی پہلو تلاش کر لیتی تھی۔
"اچھی بات ہی ہے۔ ورنہ آج نہ جانے کیا ہو جاتا۔" نمرہ کو پھر سے واقعہ یاد آ گیا۔

"میں آنٹی کو کیا منہ دکھاتی۔" فکر مندی سے کہتے اس نے کھانا بھی شروع کر دیا تھا۔ لالہ اسے گھورنے لگی۔
"ہاں تو اتنی ٹینشن میں بھوک تو لگتی ہے پھر اس وقت تو کھا ہی نہیں سکتی تھی۔" نمرہ نے اس کے گھورنے کا جواب دیتے ہوئے کہا۔
لالہ اس کے معصوم انداز پر بے اختیار ہنس دی تھی۔

☆.....☆.....☆

گیلی سڑک پر گاڑیوں کے ٹائر پھسل پھسل کے کئی بار گاڑی پیچھے کی طرف چلی جاتی تھی۔ ایسے موسم میں اس جیپ کی اسپید کافی زیادہ تھی۔ ڈرائیور نہ صرف اپنی زندگی سے بیزار لگ رہا تھا بلکہ باقی لوگوں کی بھی جان کے درپے تھا۔ ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا دوسرا نوجوان بھی شاید نشے میں تھا۔ بار بار کھڑا ہو جاتا، چلاتا، مفلر ہوا میں لہراتا اور ادھر ادھر جھولتا پھر سے سیٹ پر گر جاتا۔ ارد گرد گزرتی گاڑیاں اور ان کے سوار بھی ان کی وجہ سے بے طرح ڈسٹرب ہو رہی تھیں۔ تبھی ایک بلیک پراڈوان کے مد مقابل آئی تھی۔ اس گاڑی کے شیشے مکمل طور پر کالے تھے۔ اندر بیٹھے سوار کے بارے میں اندازہ لگانا مشکل تھا۔ سامنے موڑ تھا۔ لیکن پراڈو والا پیچھے ہونے کو تیار تھا نہ جیپ والے تبھی

پراڈو نے ہلکا سا کٹ دیا تھا۔ جیپ بری طرح لڑکھرائی تھی اور پراڈو تیزی سے راستہ نکالتی آگے نکل گئی تھی۔ مری کی خوب صورت فضا اس وقت ان کے ٹائروں کے بے ہنگم شور سے گونج اٹھی تھی۔ اور پہاڑی پر برف سے کھیلنے لڑکے لڑکیاں رک کر یہ تماشا دیکھنے لگے تھے۔ سڑک کے اوپری طرف قطاریں لگنے لگی تھیں۔

”اے پاگل ہو گیا ہے کیا؟“ دوسری بار پراڈو نے کٹ لگاتے ہوئے اسے دوبارہ پیچھے چھوڑا تھا تو وہ چلا اٹھا تھا۔ کافی بلندی پر بنی ڈھلوانی سڑک کے کنارے نمرے نمرے کے ساتھ لالہ کی نگاہ اس وقت ان دو گاڑیوں پر پڑی تھی اور وہ چونک گئی تھی۔ جیپ میں وہی دونو جوان تھے جو اسے چھیڑ رہے تھے۔

”پاگل ہیں یار دونوں۔۔۔“ نمرہ نے کھڑے ہوتے ہوئے دونوں ڈرائیورز کے لیے کمنٹ پاس کیا تھا۔
 ”یہ دونوں وہی ہیں۔“ لالہ نے بتایا۔ اس کی آواز میں خود بخود خوف سمٹ آیا تھا۔ تبھی پراڈو سلو ہوئی تھی۔ جیپ آگے نکل گئی۔
 پراڈو کی فرنٹ سیٹ کا دروازہ دھیرے سے کھلا تھا اور کسی کی مسکراتی آنکھیں دیکھ کر لالہ کی سانس وہیں رک گئی تھی۔ وہ بے ساختہ روڈ پر آگے کی طرف بھاگی تھی۔ نیچے روڈ پر پراڈو ایک مرتبہ پھر جیپ کے قریب پہنچ چکی تھی۔ آگے اندھا موڑ تھا۔ وہ وہیں جم گئی تھی۔ پراڈو ایک دم سے جیپ کے برابر آئی تھی۔ لالہ کی سانسیں تھمنے لگی تھیں اور پھر لالہ سمیت سب نے دیکھا تھا، پراڈو آگے نکل گئی تھی اور جیپ۔۔۔ گہری کھائی میں گرتی چلی گئی۔

جیپ میں سوار دونوں لڑکے چھلانگ لگا چکے تھے۔ لیکن پیچھے آنے والی گاڑیوں سے ٹکر کھا کے شدید زخمی ہو چکے تھے۔ انہیں اسپتال پہنچانے کی کوششیں جاری تھیں۔ البتہ بلیک پراڈو کسی جن کی طرح غائب ہو گئی تھی۔ سب لڑکے لڑکیاں اب روڈ پر جمع ہو کر نیچے گری جیپ کر دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہجوم سامع ہونے لگا تھا روڈ پر۔۔۔ نمرہ، لالہ کا ہاتھ کھینچتی اسے بھی نیچے آنے کا کہنے لگی۔ لالہ نے جھٹکے سے ہاتھ چھڑا لیا۔ وہ اسے وہیں چھوڑ کر نیچے بھاگ گئی۔ لالہ وہیں ایک سائنڈ سیٹ پر ڈھسے سی گئی۔ خوف سے اس موسم میں بھی اسے پسینے چھوٹ رہے تھے اس نے صاف دیکھا تھا وہ مسکراتی، اس کی طرف دیکھتی آنکھیں ضیا کی ہی تھیں۔ تبھی اس نے کالے بوٹوں کی بھاری آواز سنی تھی اور پھر کالے بوٹوں میں مقید پیراس کی نظروں کے سامنے تھے۔ اس نے نظر اٹھا کر سامنے دیکھا۔ بلیک شلوار قمیض میں ملبوس چہرے پر ہمیشہ کی طرح دوستانہ مسکراہٹ سجائے وہ ضیا علی خان ہی تھا۔ وہ دھیرے دھیرے چلے اس کے قریب آیا۔ لالہ جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔
 ”کون ہو تم ضیا علی خان۔۔۔؟“ اس نے جرأت کر ہی لی تھی مخاطب کرنے کی۔ ضیا اس یا قوتی دہانے کو دیکھے گیا جو اسے ہمیشہ دم بخود کر دیا کرتا تھا۔

”ان کا گناہ اتنا بڑا تو نہیں تھا۔“ اس کے خاموشی سے خود کو تکتا دیکھ کر وہ مزید چڑ گئی۔
 ”اگر میں نہ آتا تو وہ بڑا گناہ کر بھی سکتے تھے“ ضیا کے لہجے میں غصہ بھرنے لگا۔

"تو۔۔؟ تم سے مطلب؟" وہ بھی غم سے بولی۔

اس بار ضیا کچھ نہیں بولا تھا لیکن اس کی گہری آنکھوں میں تاسف نمایاں تھا۔

"میں نہ تمہیں جانتی ہوں، نہ جاننا چاہتی ہوں۔ سو آئندہ مجھ سے سو گز دور رہ کر چلنا اور میرے کسی معاملے میں انٹرفیر مت کرنا سمجھے۔" وہ اس کی آنکھوں میں بلا خوف جھانکتے ہوئے بولی ادھر شان بے نیازی سے سے بایاں بازو جس پر ڈارک براؤن کلر کا گندھا دھاگاندا تھا، اٹھا کر جیسے کبھی اڑائی گئی تھی، لالہ کا تو منہ کھل گیا۔

"میں تمہیں جانتا ہوں۔ میرے لیے اتنا کافی ہے۔ باقی رہا تمہارا کوئی معاملہ۔۔۔ تو ضیا علی خان جو چاہتا ہے کر لیتا ہے۔ سو اے اللہ پاک کے اسے کوئی روک نہیں سکتا" غصے پر ایک دم دوستانہ مسکراہٹ غالب آنے لگی تھی۔ لالہ نے ایک تیکھی نگاہ اس کے وجود پر ڈالی۔ پھر پیر پختی نیچے منہ کی طرف چلی گئی۔

"کسی روز بتاؤں گا تمہیں لالہ۔۔۔ تم میری محبت سے خوف زدہ ہو کر بھاگ رہی ہو اور میں تم سے کس قدر شدید نفرت کرتا ہوں۔" ضیا کی آنکھیں جلنے لگی تھیں۔

☆.....☆.....☆

کیبن میں لگے بلب کی روشنی میں اس کا ہاتھ تھامے اس بار وہ اس کے چہرے پر قم گھبراہٹ بخوبی پڑھ سکتا تھا۔ انہیں ایک ساتھ وقت بتائے کافی عرصہ ہو چلا تھا لیکن وہ ہمیشہ پر اعتماد رہی تھی۔ اس بار مگر وہ اعتماد اس کی شخصیت سے مفقود تھا۔

"اقرا! مجھے کیوں لگ رہا ہے میں تمہیں زبردستی لایا ہوں یہاں۔۔۔" وہ بدمزہ سا ہوا۔ اقرا نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ کچھ لمحے خاموشی سے اسے دیتی رہی۔

"آغا، مجھے ڈر لگنے لگا ہے۔"

"میرے ساتھ رہنے سے۔۔۔؟" وہ ناراض لہجے میں بولا اقرا کی نظریں جھک گئیں۔۔۔

"تمہارے ساتھ رہنے سے مجھے کبھی خوف نہیں آیا آغا۔ تم جانتے ہو میں تم پر خود سے زیادہ اعتبار کرتی ہوں" وہ سادہ لہجے میں بولی سچائی اس کے لہجے میں عیاں تھی۔

تو؟" وہ سیٹ کی پشت پر گرنے کے سے انداز میں ٹیک لگا گیا۔

"جب سے لالہ نے یوں اچانک ہمیں ایک ساتھ دیکھا ہے۔ مجھے ڈر لگنے لگا ہے۔ کہیں بھائی یا کوئی اور۔۔۔" وہ اپنے اندر کے خوف بتانے لگی۔

"کم آن اقرا۔۔۔" آغا نے آگے بڑھ کر بیٹھے ہوئے اس کے ہاتھ تھام لیے۔

"تم تو مجھے ڈرپوک کہا کرتی تھیں۔ اب خود ڈرنے لگی ہو۔" محبت سے وہ اس کا کوئل سا روپ نظروں میں جذب کرتے ہوئے بولا تھا۔

"ڈرپوک نہیں ہوں میں، بس تمہیں کھونے سے ڈرتی ہوں۔ اسی لیے کہتی ہوں خالہ کو بھیج دو اماں کے پاس۔" وہ اس کی نظروں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

"اچھا، آج ہی اماں سے بات کرتا ہوں بس۔ اب تم پلیز موڈ تو صحیح کرو" اس نے منت کی۔ اقرار اس کے انداز پر مسکرا دی۔

"ارے حمزہ۔۔۔ تم۔۔۔" اگلے ہی پل اس کے لب تیزی سے سکڑے تھے۔ دل بے قابو سا ہوا تھا۔ اس نے دعا کی وہ کوئی اور حمزہ ہو۔

"بہت دن ہو گئے۔ سوچا آج تمہاری طرف چکر لگا ہی لوں۔" اور وہ علی حمزہ کی ہی آواز تھی۔ اقرار کو لگا اس کے کان کے پردے پھٹنے لگے تھے خوف سے۔ خود آغا بھی حمزہ کی آواز پہچان کر سکتا رہ گیا تھا کیبن کے سامنے بنے کھلے پارٹ میں ہی وہ شاید کرسیاں سنبھال چکے تھے۔

"کیسا چل رہا ہے تمہارا کاروبار" حمزہ نے اسے چائے کا کہتے ہوئے پوچھا۔

"اللہ سلامت رکھے مینا، طوطوں کی جوڑیوں کو۔ کالج گرلز اور بوائز نے کافی رونق لگا رکھی ہے۔" جواب میں کیفے کا مالک جو شاید علی حمزہ کا پرانا دوست تھا، خباثت سے کہتے ہوئے ہنسنے لگا تھا۔ اقرار نے لب کاٹ لیے تھے۔

"ہم۔۔۔" حمزہ کی متنفر آواز سنائی دی تھی۔

"بے پرواہ ماں باپ کی بے غیرت اولاد۔۔۔" اس کے لہجے میں کس قدر تنفر تھا۔ اقرار کا سر شرمندگی سے جھکا تھا۔ آنکھیں خود بخود نم ہو گئیں۔

"پلیز۔" آغا اسے روتا دیکھ کر بے تاب سا ہوا۔ اقرار نے اٹھتے ہوئے ہاتھ کی پشت سے سختی سے آنکھیں رگڑی تھیں اور نقاب کرنے لگی تھی۔

"کہاں جا رہی ہو؟" وہ پریشان ہو کے اٹھ کھڑا ہوا۔

"سوری آغا، میں اب تم سے اس وقت تک نہیں ملوں گی جب تک تم ہمارے تعلق کو کوئی معنی نہیں دے دیتے" اس نے بہت دھیمی آواز میں قطعی نظروں سے دیکھتے ہوئے اس کو کہا اور خود کو مکمل ڈھانپتی تیزی سے باہر نکل گئی۔ آغا وہیں رک سا گیا تھا کیبن کے پردے سے باہر آتے ہی اقرار نے سامنے ہی کرسی پر حمزہ کو دیکھ لیا تھا۔ اس طرف اس کی پشت تھی۔ پھر بھی وہ بھائی کو ہزاروں میں پہچان سکتی تھی۔ اس کی آنکھیں ایک مرتبہ پھر دھندلا رہی تھیں۔ وہ تیزی سے ایک طرف سے نکلتی چلی گئی۔

☆.....☆.....☆

سب لڑکے لڑکیاں مال روڈ پر لگے اسٹالز سے شاپنگ کرنے میں مصروف تھے۔ یہ مختلف علاقوں کے روایتی ملبوسات اور دیگر ہینڈی کرافٹ کے اسٹال تھے جو دور دراز علاقوں کے غریب مگر قابل ورکرز کے کام کو ہائی سوسائٹی تک پہنچانے کے لیے مختلف این جی اوز نے حکومت کے تعاون سے لگائے تھے۔ اس سے نہ صرف ان کے کام کے لیے قدردان اور سپلائز سامنے آتے تھے بلکہ سیاح ہاتھوں ہاتھ دوسرے علاقوں کی چیزیں لے لیتے اور اچھی خاصی آمدنی ان تک پہنچائی جاسکتی تھی۔

سب سے زیادہ رش ملبوسات کے اسٹال پر تھا۔ ان کے گروپ کی سبھی لڑکیاں بشمول نمرہ رنگ برنگے خوب صورت ملبوسات پر ٹوٹ پڑی تھیں۔ لالہ ہمیشہ کی طرح ان پر مسکراتی نظر ڈالتی روڈ پر چہل قدمی کرنے لگی اور ایک طرف جاتی نسبتاً چھوٹی سڑک پر آگئی۔ یہاں پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔ یہ رہائشی علاقوں کی طرف جانے والی سڑک تھی شاید یہ سڑک کے دونوں طرف لگے درختوں نے سڑک کو دونوں طرف سے چھت کی طرح سایہ دے رکھا تھا۔ صبح ہونے والی بارش سے ہر چیز ابھی نم تھی۔ آج بھی دن صاف نہیں تھا۔ مری کی گیلی شفاف سڑک پر چلتے ہوئے اسے اچانک ہی کچھ احساس ہوا تھا۔ اس نے ایک طرف پائے کے درختوں کے قریب دیکھا۔ کیمرے کا رخ اس کی طرف کیے وہ بلاشبہ ضیاعی خان ہی تھا۔ وہ غصے سے پیر پختی اس کے پاس آئی۔

"تم پھر میرے پیچھے آگئے؟ چاہتے کیا ہو آخر مجھ سے؟" وہ غصے سے پاگل ہو رہی تھی۔
 "ایک کپ کافی پیو گی میرے ساتھ" مسکراتے ہوئے ہمیشہ کی طرح فرمائش کی گئی تھی۔
 لالہ کا دل کیا اسے نیچے کھائی میں گرا دے۔۔۔ اور گرا بھی دیتی اگر اسے جیل کا خوف نہ ہوتا۔
 "یہ قانون بھی ناں۔۔۔ بس ہم نیک لوگ ہی اس سے خوف کھاتے ہیں۔ ضیا جیسے لوگ تو سیدہ تان کے پھرتے ہیں۔ اس نے کڑھ کے سوچا تھا۔

"میں کبھی واقعی میں تمہاری جان لے لوں گی ضیا۔"
 وہ لب کچتی اسے بے حد خوبصورت لگی۔ پکی لال پٹھانی (کاش لالہ سن لیتی)
 پہ ماخذ دے نہ۔" (اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو)
 مسکراتے ہوئے وہ پشتو کا مشہور لوک ساگ گنگنا یا تھا۔ لالہ نے ایک غصیلی نگاہ اس پر ڈالی اور واپسی کے لیے مڑی تھی۔

☆.....☆.....☆

"خان" مودب پکار پر سہراب علی خان نے جھٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ وہ ابھی، ابھی اوزگل اور گل مینہ کو الوداع کہہ کر آئے تھے۔ ابراہیم وقت پر پہنچ گیا تھا۔ بچپن سے وہ ان کا نمک کھار ہا تھا۔ ان کے لیے قابل اعتبار تھا۔ تبھی ان کے جانے کے بعد وہ اطمینان سے

لان میں بچے تخت پر آرام کر رہے تھے کہ شاہ سواری کی آواز نے انہیں اٹھنے پر مجبور کر دیا۔

"خان! چھوٹی بیبیوں کے جاتے ہی آپ کے حکم کی تعمیل کر دی گئی ہے۔ تہہ خانے کا ایک اور کمر اصف کروادیا ہے۔ ان کی آنکھیں کھلتے دیکھتے ہی وہ سر جھکائے بولا۔

"مکین بھی پہنچا دیا یا نہیں۔" انہوں نے اٹھتے ہوئے سگ جلاتے ہوئے پوچھا۔

"پہنچا دیا خان۔"

"کوئی مسئلہ نہیں ہوا۔" خان کی گہری نظریں اس پر جمی تھیں۔

"بہت شور مچایا خان۔ اب بھی کافی شور مچا رکھا ہے۔" اس کے لہجے میں بیزارگی جاگی۔ سہراب علی خان اٹھ کھڑے ہوئے اور تیز قدم اٹھاتے حویلی کے دائیں طرف بنے چھوٹے سے دالان سے ہوتے کچی دیوار کے اس طرف بنے کھنڈر نما حصے میں آگئے جہاں چند پرند بھی پر مارنے سے خوف کھاتے تھے۔ یہ جگہ کافی بڑی تھی۔ تین اطراف چھوٹی چھوٹی کوٹھڑیاں بنی تھیں جو سب چھوٹے سے دروازے سے ایک دوسرے سے جڑی تھیں۔ وہ ایک کوٹھڑی میں داخل ہوئے۔ یہاں دروازے کے بالکل قریب سیڑھیاں نیچے جارہی تھیں۔ سہراب علی خان نیچے اترنے لگے۔ شاہ سواری بھی ان کے پیچھے تھا۔ اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا اور سیلن کی بو بھی۔ سہراب خان نے رومال جیپ سے نکال کر چہرے پر باندھ لیا تھا۔ شاہ سواری نے نیچے اترتے ہی لائٹ آن کر دی تھی۔ لائٹ آن کرتے ہی کسی کی زخمی چیخ سنائے گا کلاچر گئی تھی۔ ارد گرد کئی سلاخوں کے دروازے لگے تنگ کمرے تھے جن میں ہر عمر کے افراد ٹنڈھال سے پڑے تھے۔ ان میں مرد بھی تھے عورتیں بھی۔ لیکن کسی نے بھی اٹھ کر نہ تو اس کا استقبال کیا تھا نہ اس کی آمد کا نوٹس لیا تھا۔ سب کے سب جیسے ہے جان پڑے تھے۔ بس ایک وجود تھا جو اچھل کر چیخ مارتا سلاخوں سے آگیا تھا۔ سیلن کی بوتیز ہونے لگی تھی ٹھنڈی۔۔۔ غلیظ۔۔۔

"تیری پکڑ ہوگئی۔۔۔ اور اسے تو سلاخوں کے پیچھے نہیں ڈال سکتا۔" وہ کمزور سا وجود یوں سلاخوں

سے ٹکراتا تھا جیسے ابھی انہیں ڈھادے گا۔ رومال کے پیچھے چھپے لبوں پر مسکراہٹ ابھری۔

"کون پکڑے گا مجھے کون۔۔۔؟ وہ اس کے قریب آ کر کروفر سے بولے۔

وہ قہقہے لگانے لگی اور پھر اس نے اچانک جھپٹا ساما راتھا اور سہراب کے چہرے سے نقاب کھینچ لیا تھا۔ وہ گھبرا کے فوراً پیچھے ہوئے تھے۔

"ہاہاہاہا۔" وہ قہقہے لگانے لگی۔ تالیاں بجانے لگی۔ سہراب کے چہرے کے زاویے بگڑنے لگے تھے۔

"دیکھ کیسے ڈر گیا تو۔" وہ ہنستے ہنستے کہنے لگی۔

"ایسے ہی روئے گا۔ گھبرائے گا۔" وہ تالیاں بجانے لگی۔

"تیری پکڑ ہوگئی تیری پکڑ ہوگئی۔" وہ زیادہ شور کرنے لگی تھی۔ سہرا ب تیزی سے واپس مڑے تھے۔ شاہ سوار نے ان کی تقلید کی تھی۔

☆.....☆.....☆

پتھر پل سڑک سے کشادہ صاف ستھرے مین روڈ پہ چڑھتے ہی گاڑی دوڑنے لگی تھی سفر آرام دہ ہوتے ہی اوزگل اور گل مینہ نے سکھ کی سانس لی تھی۔ اوزگل اب مطمئن ہو کر اشتیاق سے باہر بھاگتے مناظر میں کوگ۔ وہ زندگی میں پہلی بار حوصلے سے باہر نکلی تھی، وہ بھی اتنے لمبے سفر پر ہر اک منظر اس کے لیے واقعی نیا اور حیران کن تھا۔

تقریباً سنان روڈ پر بلیک ہائی کس فرائے بھرتی جا رہی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ ابراہیم حیات نے سنبھال رکھی تھی۔ چاروں بدرگے (باڈی گارڈز) گاڑی کے پچھلے کھلے حصے میں بیٹھ گئے۔

اوزگل کا سارا دھیان باہر کے مناظر پر تھا اور گل مینہ۔۔۔ وہ تو اس قدر خوش تھی کہ کچھ بھی اس کی توجہ حاصل نہیں کر پا رہا تھا۔

"سنو۔" اس نے اچانک پکارا تو اوزگل چونک کر اسے دیکھنے لگی ابراہیم۔۔۔ اپنی دھن میں مگن گاڑی چلائے جا رہا تھا۔

"اے ڈرائیور۔" اب کی بار وہ تیز لہجے بولی اور اس بار ابراہیم بھی چونک پڑا تھا۔

"میوزک آن کرو۔" شہزادیوں کی طرح حکم جاری کیا گیا۔ ڈرائیور اتنا حیران ہوا تھا کہ گاڑی کی اسپید ایک دم کم ہوئی۔ لیکن

بہر حال اس نے بیک ویو مرر میں نظر اٹھا کر شہزادی کو دیکھنے سے اجتناب برتا تھا۔ اوزگل نے البتہ اس شہزادی کے پہلو میں کہنی ضرور دے ماری تھی جس پر وہ بری طرح اچھلی تھی۔

"کی مصیبت ہے؟" وہ پہلو ملسی اوزگل کو کھا جانے والی نظروں سے گھورتے ہوئے بولی۔ چادر بھی چہرے سے ہٹ چکی تھی۔

"مصیبت مجھے ہے یا تمہیں ہے۔۔۔" وہ اس کا بازو دبوتی اس کے کان میں سرگوشی کر گئی۔

"باء جی کو خبر بھی ہوئی نا تو جان لے لیں گے تمہاری۔۔۔" اس کے لہجے میں خوف تھا، ڈرائیور نے اسپید بڑھادی تھی۔ میوزک

البتہ ابھی آن نہیں کیا تھا۔

"اور چہرہ چھپاؤ اپنا پاگل ہو گیا؟" اوزگل نے زبردستی اسے نقاب کرنا چاہا۔ اس نے تیزی سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا تھا۔

"باء جی کو کون خبر دے گا تم بائو ڈرائیور۔۔۔" وہ تیز لہجے میں بولی۔ ڈرائیور کے لب بھینچ گئے تھے۔

"مین" اوزگل بے بسی سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔

"تم نے سنا نہیں میوزک آن کرو" وہ اب پھر ڈرائیور سے مخاطب تھی۔ اس بار اس نے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے پلیئر آن کر دیا تھا

گل مینہ بے فکری سے سر دھننے لگی تھی اوزگل اس پر بے بسی سے نظر ڈالتے باہر دیکھنے لگی تھی۔ گاڑی ہوا کے دوش پر گویا محسوس تھی۔

یونہی بے فکری سے ادھر ادھر دیکھتی گل مینہ کی نگاہ اچانک ہی سامنے شٹ میں نظر آتے اس چہرے پر پڑی تھی۔

وہ مکمل طور پر ڈرائیونگ کی طرف متوجہ تھا۔ اٹھی نظریں سامنے راستے پر جمی تھیں۔ لیکن اس کی آنکھوں

سے چھلکتی حیا۔۔۔ وہ کتنے ہی سے اسے ٹکلی باندھے دیکھتی رہی۔ لیکن۔۔۔ ڈرائیور (ابراہیم حیات) اس نے ایک دفعہ بھی اس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

"مرد ہو۔۔۔ اکیلا ہو۔۔۔ اور خان زاد یوں کا ساتھ۔۔۔ پھر بھی مارے تجسس کے نگاہ نہ اٹھائے۔" اسے دیکھتے ڈرا سا آگے ہو کر بیٹھتے ہوئے گل مینہ نے سوچا۔

"سنو۔۔۔" بلا ارادہ ہی اس کے منہ سے پھسلا تھا۔ اور بے اختیار ہی نظریں اٹھی تھیں۔ اور گل مینہ کی نظروں سے نظریں ٹکراتے ہی اس نے کسی الٹے ویشیزہ کی طرح نظریں پھیر لی تھیں لیکن گل مینہ۔۔۔ گل مینہ نظریں نہ پھیر سکتی تھی۔۔۔

چار سو کچھ سنہرا سا چمکتا محسوس ہونے لگا تھا۔

محبت کی پری نے جادوئی چھری گھمادی تھی۔

لیکن اس دفعہ شہزادے نے نہیں، سنڈریلا نے اپنے محبوب کو تلاش لیا تھا۔ گل مینہ کے لبوں پر محبت، سنہری مسکان کی صورت چمک رہی تھی۔۔۔ روشنی دے رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

وہ کون تھا۔۔۔؟ کہاں کا تھا۔۔۔؟ یہ سب باتیں اس کے لیے بے معنی سہی لیکن وہ اتنا ضرور جان چکی تھی۔ ضیاء علی خان کا اس کی زندگی میں آنا بے مقصد نہیں تھا۔

اس نے دلدل کا راستہ خود چنا تھا۔۔۔ وہ بھی صرف غصے اور ضد میں آکر۔۔۔ ورنہ وہ دل و جان سے صرف اپنے عہد کو چاہتی تھی۔۔۔ تبھی شاید خدا نے اسے ایک گناہ کبیرہ سے بچا کر سزا کے طور پر گناہوں کی دلدل میں لاپھینکا تھا۔ اور یہاں آکر اس پر آشکار ہوا تھا۔ عورت کے لیے چادر اور چادر یواری کتنی بڑی نعمت ہے۔

اس سیلین زدہ ماحول میں وہ لمحہ لمحہ انگاروں پر لوٹی تھی۔۔۔ ایک، ایک پل اس نے خوف کے پل صراط کو عبور کرتے گزارا تھا۔ اور اسی اللہ سے پناہ مانگتی رہی تھی۔ جس کے احکامات کو پس پشت ڈال کر اس نے خود اس ذلالت کو چنا تھا۔ وہ کم عقل تھی۔۔۔ راہ بھٹک گئی تھی۔ لیکن وہ وقت سے پہلے سنبھل بھی گئی تھی۔ تاب ہوئی تھی۔ اور تبھی مایوسی کے گناہ کے دلدلی اندھیرے میں ضیاء علی خان روشنی بن کر آیا تھا۔

اللہ کے بعد اگر میں کسی کو مدد کے لیے پکاروں گی تو بلاشبہ وہ تم ہو ضیاء علی خان۔۔۔ "ہاتھ میں پکڑے اس موبائل پر گرفت مضبوط کرتے ہوئے اس نے خود کلامی کی تھی۔ جو ضیاء نے جاتے وقت اس کے سپرد کیا تھا تاکہ وہ اس سے رابطے میں رہے۔

☆.....☆.....☆

سہ پہر ہونے کو تھی لیکن مری کی خوب صورت وادیوں میں صبح سے شروع ہونے والی اس مدھر کن من نے جیسے نہ رکھنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ ایسے موسم میں بھی لوگ باہر انجوائے کر رہے تھے۔ نمرہ بھی کچھ دیر تو اسے ساتھ چلنے کا ہمتی رہی۔ پھر اس کے مسلسل انکار پر اسے وہیں چھوڑ کر گروپ کے ساتھ گھومنے چلی گئی۔

لالہ نے سڑک کی طرف کھلنے والی کھڑکی سے پرے ہٹائے اور کھڑکی کے دونوں پٹ واکے۔ تازہ نم ہوا کے جھونکے نے روح تک میں سرشاری سی بھر دی تھی۔ وہ دھلی دھلائی سڑک کے پار دور تک پھیلے سبزہ زاروں کو دیکھنے لگی۔ ہر طرف لڑکے لڑکیاں گروپس کی صورت بکھرے نظر آ رہے تھے۔ کچھ لوگ فیملی کے ساتھ تھے۔ وہ بھی خوب انجوائے کر رہے تھے موسم کو۔۔۔ لالہ اداسی سے مسکرا دی۔

پچھلے دودن سے وہ اپنے کمرے میں بند تھی۔ میتم تبسم خود اسے پوچھنے بھی آئی تھیں لیکن اس نے سردرد اور فلو کا بہانہ گھڑ کر مزید کہیں بھی گھومنے سے انکار کر دیا تھا۔ خود نمرہ اس کی منتیں کر کر کے تھک چکی تھی لیکن اسے روم سے باہر آتا تھا نہ آئی۔

دودن پہلے ہونے والا حادثہ کسی آسیب کی طرح۔ اس کے دل و دماغ سے چٹ کر رہ گیا تھا۔

ضیاعلی خان کون تھا؟ اس سے کیا چاہتا تھا؟ وہ یہ سب نہیں جانتی تھی نہ ہی ضیاعلی خان کو جانتی تھی۔ لیکن۔۔۔ یہ ایک حقیقت تھی کہ ضیاعلی خان کی آنکھوں میں نظر آنے والی گہری شناسائی اسے اندر تک دہلا کر رکھ دیتی تھی۔ کبھی کبھی اسے یوں لگتا جیسے وہ صرف اسی کے لیے ہی آیا ہے۔

اس کا ہر وقت لالہ پر نظر رکھنا۔۔۔ اس کے پل، پل کی خبر رکھنا، اس کی ذات سے تمام تر آگاہی رکھنا۔۔۔ یہ محض اتفاق تو ہر گز نہیں تھا اور نہ ہی یہ کوئی جنونی محبت کا عکاس تھا۔ بھلے ہی اس نے ضیاعلی خان کی آنکھوں میں اپنے لیے کچھ خاص رنگ دیکھے تھے لیکن اس نے ایک دم ہی ان رنگوں پر کئی دوسرے رنگوں کو غالب آتے بھی دیکھا تھا۔ چونچنی اور دشمنی کے تھے کسی تلخ یاد کے یا شاید کسی درد کے۔۔۔

لیکن اس کا ضیاعلی خان کی زندگی، اس کی کسی یاد یا درد سے کیا واسطہ؟ وہ سوچ سوچ کر پاگل ہونے لگی تھی۔ لیکن اس پہیلی کا سر نہ ڈھونڈ پاتی تھی۔

"مجھے جلد از جلد اس بارے میں کسی سے بات کرنا ہوگی۔" اس نے جیسے ایک دم سے فیصلہ کیا تھا۔

"شاہ ویز سے۔۔۔" اس نے سوچا۔

"لیکن وہ بہت جذباتی ہے، الثابات بگاڑ کے رکھ دے گا۔ بہت جلد مارا ماری پر اتر آتا ہے وہ تو۔۔۔" اس نے خود ہی نفی بھی کر دی تھی۔

"تو پھر حمزہ" کسک سی اٹھی تھی دل میں۔۔۔ کتنے تلخ حوالے جڑے تھے اس شخص سے تنہائی میں اسے تحفظ کے، عزت کے خواب دکھانے والا سب کے سامنے کس طرح بیگھی بلی بن جانا تھا، وہ بھلا بھول سکتی تھی۔

"نہیں، میں ایسا بھی نہیں کر سکتی۔۔۔ میں اپنے ہاتھوں سے انہیں اپنے کردار پر آواز اٹھانے کی ہمت نہیں دے سکتی۔" اس بار بھی اس نے خود کو جیسے منع کیا تھا۔

"جو بھی ہو ضیاء علی خان۔۔۔ تم لالہ کے کردار سے نہیں جیت پاؤ گے۔ کیونکہ میرے پاس سوائے عزت کے کچھ بھی نہیں۔۔۔ ہاں کچھ بھی نہیں۔۔۔" اس نے خود کو مضبوط کرتے ہوئے، اندر کے خلفشار کو دھوئیں کے مرغولے کی صورت ہوا کے سپرد کیا تھا۔ تبھی اس کے موبائل پر میسج ٹون کی تھی۔ اس نے کوٹ کی جیب سے موبائل نکال کر چیک کیا۔۔۔ نامعلوم نمبر سے پیغام تھا۔۔۔ اس نے پیغام اوپن کر دیا۔ "ہائے گارجینس۔۔۔! ایک کپ کافی ہو جائے جگمگاتے حروف کے سامنے مسکراتا آئی کون بنا تھا۔ لالہ کو اپنے ہاتھ شل ہوتے محسوس ہوئے تھے۔ اس نے یونہی نگاہ نیچے سڑک کے کنارے بنے کیفے پر ڈالی۔۔۔ برآمدے کے ستون سے ٹیک لگائے، دوستانہ انداز میں ہاتھ ہلاتا وہ ضیاء علی خان ہی تھا۔ وہ نظریں نہ ہٹاپائی تھی۔

☆.....☆.....☆

"شاہ ویز" وہ چائے لے کر اس کے کمرے میں آئیں تو وہ پریشان سابلوں میں انگلیاں دیے سر جھکائے بیٹھا تھا۔ وہ اس قدر پریشان تھا کہ ان کی آواز بھی نہ سن سکا تھا۔ سین نے چائے کا کپ میز پر رکھا اور اس کے قریب چلی آئیں۔

"شاہ ویز" ان کے کندھا ہلانے پر وہ بری طرح چونکا۔

"امی آپ۔۔۔ کوئی کام تھا آپ کو۔۔۔؟" وہ پریشان سے لہجے میں بولا تھا۔ سین اگرچہ اس کی ممانی تھیں مگر وہ انہیں امی ہی کہتا تھا بچپن سے انہوں نے جو پالا تھا اسے۔

"کیوں؟" سین مسکرا دی۔

"تمہارے کمرے میں، میں بنا کام کے نہیں آ سکتی کیا؟" انہوں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

"نہیں امی۔ میرا مطلب تھا۔" وہ بات نہیں بنایا تھا۔

"ایک بات کہوں شاہ ویز۔۔۔" انہوں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے ممتا کی ڈھارس سی دی تھی اسے۔۔۔ وہ گم صم نظروں سے انہیں دیکھنے لگا۔

"میرے خیال میں تمہیں نوکری کے لیے اس قدر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔۔۔" دھیمے لہجے میں وہ اسے سمجھانے لگیں۔

"اچھا بھلا گزارہ چل رہا ہے، تم سکون سے ہر جگہ اپلائی کرتے رہو۔۔۔ جلد یا بدیر اللہ پاک کرم کر ہی دیں گے۔

"سکون کیسے آئے امی۔۔۔؟؟ وہ تڑپ کے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"آپ جانتی ہیں میں شروع سے ہمیشہ ٹاپر رہا ہوں۔ باریال اور میرے دوسرے دوست تو بہت پیچھے تھے مجھ سے لیکن آج وہ اتنی

اچھی جگہ جاب پر ہیں اور میں۔۔۔ گولڈ میڈلسٹ شاویز زیدی درد کی ٹھوکریں کھا رہا ہوں۔ اس کے لہجے میں غصہ تھا لیکن کچھ اور بھی۔۔۔ جس نے سین زیدی کو چونکا دیا تھا۔ وہ اٹھ کر اس کے قریب آئیں۔ ان کی آنکھوں میں دکھ سا تھا۔

"حق تو یہ تھا کہ میں آج کسی اونچی پوسٹ پر کام کر رہا ہوتا اور باریال جیسے لوگ تو میرے انڈر کام کرنے کے بھی قابل نہیں تھے۔ ہمیشہ نوٹس تک میں میرے محتاج رہتے تھے اور آج ان کی شاندار گاڑیوں میں اڑتے پھر رہے ہیں۔" اس کا لہجہ تلخ تھا۔

"تم حسد کر رہے ہو شاہ ویز؟ وہ بھی اپنے دوست باریال سے۔" انہیں تاسف نے گھیرا۔

"ہا۔۔۔ آج کل کے دور میں کوئی کسی کا دوست نہیں ہوتا امی۔۔۔ اور یہ جو باریال ہر دوسرے روز یہاں آ جاتا ہے تو آپ کا کیا خیال ہے میری دوستی میں۔۔۔" وہ ایک ایک لفظ چبا کر بول رہا تھا اور سین کے اندر دکھ سا بھرتا جا رہا تھا۔

"نہیں امی نہیں۔۔۔ وہ تو یہ سب مراعات دکھانے آتا ہے، میرا دل جلانے صرف اور صرف میرا دل جلانے۔۔۔"

تم غلط سوچ رہے ہو شاہ ویز۔۔۔ "سین نے اسے جھٹلانا چاہا۔ تبھی باہر گیٹ پر زوردار دستک ہوئی تھی۔ شاہ ویز سر جھٹکتا باہر نکل گیا ہے سین اس کے رویے کو ہی سوچتی رہ گئیں۔

☆.....☆.....☆

اسے بالکل امید نہیں تھی کہ گیٹ کھلنے پر اسے اس ہستی کا سامنا کرنا پڑے گا جس سے وہ آج تک شدید نفرت کرتا آ رہا تھا۔

• وہ صرف چند برس کا تھا جب اپنی محبوب بیوی کی وجہ سے وہ اسے ہمیشہ کے لیے اس در پر پھینک کر چلے گئے تھے۔ اور کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔ لیکن نہ جانے کیا بات تھی کہ وہ چہرہ آج تک شاہ ویز کے دل و دماغ سے محو نہیں ہو پایا تھا۔ شاید یہ اس نفرت کی شدت کی جو وہ اپنے دل میں ان کے لیے محسوس کرتا تھا۔ اب بھی انہیں اپنے سامنے دیکھ کر وہ جھٹ سے دروازہ بند کرنے لگا تھا۔ جب انہوں نے ہاتھ بڑھا کر اسے ایسا کرنے سے روک دیا۔

"صرف چند باتیں کرتی ہیں تم سے۔۔۔" ان کی آنکھوں سے جھلکتی پیاس ان کے لبوں پر آ پہنچی تھی لیکن شاہ ویز کو اب جیسے کسی جذبے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

"آپ کو لگتا ہے کہ آپ نے کچھ بھی کہنے کا حق چھوڑا ہے اپنے پاس۔۔۔؟" وہ طنزیہ لہجے میں کہتے ہوئے زخمی سا مسکرایا۔

"بالکل۔۔۔ تم ٹھیک کہہ رہے ہو شاہ ویز۔۔۔ میں ہر حق کھو چکا ہوں۔" انہوں نے بھگتے لہجے میں فوراً اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا۔ شاہ ویز نے نظریں پھیر لیں۔

"لیکن تمہارے پاس وقت ہے شاہ ویز۔۔۔ تم میری والی غلطی نہ دہراؤ۔۔۔ اپنے حقوق نہ گنواؤ میرے بچے۔۔۔" وہ منت پر آئے تھے۔

"بس صرف ایک بار آرام سے بیٹھ کر میری بات سن لو۔۔۔" شاویز نے ایک بے بس سی نظر ان کے تھکے، تھکے وجود پر ڈالی اور پھر اندر آ کے بیٹھک کا دروازہ کھول دیا۔

"جلدی بات ختم کریں، میرے پاس زیادہ وقت نہیں۔" ان کے بیٹھے ہی شاہ ویز نے بنا کسی لحاظ کے کہا تھا۔ وہ چپ چاپ اسے دیکھ گئے تھے۔

وہ ہو بہوان کی شکل و شبہات چرا کر لایا تھا۔ دراز قد، چوڑے شانے بے حد پتلی ٹانگیں جو عجیب سی لگنے کے بجائے اس کی شخصیت کو مزید نکھار سادہ بناتی تھیں۔

اور ان کی طرح ہی ڈارک براؤن چمکدار آنکھیں بلاشبہ وہ ان کی کاپی تھا۔ اللہ نے کس قدر بڑی نعمت سے انہیں نوازا تھا اور انہوں نے خود ڈھو کر مار کر اسے خود سے کس قدر دور کر دیا تھا۔

"کبھی کبھی میں سوچتا ہوں شاہ ویز۔۔۔ مجھ سے زیادہ بد بخت اس دنیا میں شاید ہی کوئی اور ہوگا۔" نظریں جھکاتے ہوئے انہوں نے بولنا شروع کیا تھا۔ شاہ ویز لب کاٹنے لگا۔

"صرف اپنی محبت، اپنا گھر بچانے کے لیے اپنی متاع حیات تک لٹانے پر اتر آیا میں۔۔۔" ان کی آنکھوں سے ندامت آنسو بن کر نکلنے لگی تھی۔

"میں چاہتا تو کوئی درمیانی راستہ نکال سکتا تھا لیکن اس وقت مجھے صرف ریشم عزیز تھی۔ اس کی بات اس کا حکم میرے لیے اٹل تھا۔۔۔" ان کا لہجہ کمزور پڑ رہا تھا اعتراف جرم کہاں آسان ہوتا ہے، چاہے سگی اولاد ہی سامنے کیوں نہ ہو۔

"میں سمجھتا تھا ماں اور تمہارے بعد میری زندگی ریشم کے ساتھ ہی مکمل تھی۔" وہ ذرا دیر رکے۔

"لیکن دیکھو۔۔۔ اس خدا نے ہم دونوں سے کتنا زبردست انتقام لیا۔ لاکھ دوا دارو کے باوجود ہم اولاد کے لیے ترستے رہے۔ کافی عرصے بعد ہر طرف سے مایوس ہونے کے بعد ریشم نے مجھے کہا کہ میں تمہیں ہی واپس لے آؤں۔ لیکن میں اس وقت خود کو شاید اتنا کمزور نہیں سمجھتا تھا کہ مجھے کسی سہارے کی ضرورت تھی۔ پھر میں یہ بھی جانتا تھا کہ تم کبھی میرے ساتھ واپس نہیں آؤ گے۔ کیونکہ ابھی تم کم عمر تھے اور میرے لگائے ہوئے زخم تازہ۔۔۔ لیکن۔۔۔ آج ریشم کے جانے کے بعد پہلی بار مجھے لگا، میں نے زندگی میں تمہیں نہیں، اپنی

زندگی ہاری ہے۔" ان کا سر چکا تھا اور شاہ ویز کے لبوں پر مسکراہٹ آٹھ رہی تھی۔

"صاف لفظوں میں کہیں ناں۔۔۔ ایک بوڑھے تنہا آدمی کو سہارے کی ضرورت آن پڑی ہے۔" اس کا لہجہ تلخ تھا۔

"بالکل۔ لیکن مجھ سے بھی زیادہ میرے بزنس کو تمہاری ضرورت ہے۔" انہوں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"میرا سب کچھ تمہارا ہے۔ اور اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ تم میرے ساتھ چلو تا کہ میں تمہارا حق تمہیں لوٹا سکوں۔" اب کی بار

بات کرتے ہوئے ان کا لہجہ صاف تھا۔ اعتراف اور اقرار نے دل پر دھڑے بوجھ کافی ہلکے کر دیے تھے۔

"آپ کو کیا لگتا ہے۔ میں آپ کے یوں لوٹ آنے پر آپ کے ساتھ چل دوں گا۔" وہ ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے تیز لہجے

میں بولا۔

"تمہیں چلنا چاہیے۔" وہ مسکرائے۔

"کیونکہ تم میرے بیٹے ہو۔۔۔ اور میری ہر چیز پر تمہارا حق ہے، مجھے سزا دینے کے لیے تمہارا اپنے حق سے دستبردار ہو جانا مناسب نہیں۔" انہوں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ وہ تیزی سے ایک طرف ہو گیا۔ وہ مسکرا دیئے۔

"اور پھر تمہیں یوں درد رچھوٹی موٹی نوکریاں ڈھونڈنے کی بھی ضرورت نہیں ایک روشن مستقبل تمہارا منتظر ہے بیٹا۔"

"آپ جاسکتے ہیں۔" شاہ ویز کافی بد لحاظ تھا۔ وہ اسے دیکھتے رہ گئے۔

"میں تمہارا انتظار کروں گا۔" کافی دیر بعد انہوں نے اسے تکتے ہوئے کیا اور بیٹھک سے باہر نکل گئے۔ شاہ ویز نے زوردار

لات سامنے پڑے صوفے کو رسید کی اور پھر وہیں ڈھے سا گیا۔

☆.....☆.....☆

"خدا کے لیے لالہ نکل آؤ اپنی خوشی منی سے۔" صبح سے ضیاء علی خان کے خلاف اس کے لیکچر سنتی نمرہ نے تنگ آ کے اس کے آگے

ہاتھ جوڑ دیے تھے۔ اس کی تو گویا زبان تالو سے چپک گئی۔

"اب ایسا بھی خونخوار بندہ نہیں ہے کہ سامنے آتے ہی تمہیں نگل جائے گا۔" وہ سخت غصے میں تھی۔ لالہ بے بسی سے اسے دیکھ گئی۔

"خدا کی پناہ! تم نے تو سر پر سوار کر لیا ہے اس ضیا کو۔۔۔" اس کا بس نہیں چل رہا تھا کچھ اٹھا کر اس کے سر پر نہیں تو دیوار پر دے

مارے۔

"اتنے اچھے موسم میں سیر و تفریح کے اتنے اچھے چانس کوس کر رہی ہو تم۔" وہ بری طرح خفا تھی۔

"تمہیں کیا فرق پڑتا ہے۔" لالہ بھی آخر تپ ہی گئی۔

"جاؤ ناں۔۔۔ تم کرو سیر۔۔۔ تمہیں کب منع کیا ہے میں نے۔" وہ اس سے بھی تیز آواز میں چلائی۔

"تم سے تو بات کرنا ہی فضول ہے۔ نمرہ نے تاسف بھرے لہجے میں کہا

"اچھا" لالہ ٹپ کے اٹھی۔

"تو اب خبردار جو مجھ سے بات کرنے کی کوشش کی۔" وہ اٹھ کر تیزی سے اپنا بیگ پیک کرنے لگی تھی۔ اسے اب جا کر کسی اور

دوست کے ساتھ روم شیئر کرنا تھا۔ نمرہ کے ساتھ ہرگز نہیں۔۔۔ اس نے سوچ لیا تھا۔

”جاؤ جاؤ یہاں کون مر جا رہا ہے تم سے بات کرنے کے لیے۔“ نمر نے بھی اس بار کبھی اڑاتے ہوئے بے فکری سے کہا تھا۔ اور اس کی یہ ادالہ کو مزید تپا گئی تھی۔ وہ جھٹکے سے بیگ اٹھاتی اور پیر پختی کمرے سے باہر نکل گئی تھی نمرہ نے تکیہ اٹھا کر دیوار پر دے مارا تھا۔

☆.....☆.....☆

”گل۔۔۔“ گل مینہ نے نیند کی وادیوں میں اترتی اوزگل کو دھیرے سے پکارا تھا۔ لیکن وہ اس قدر گہری نیندیں میں تھی کہ کوئی رسپانس نہ دیا۔ گل مینہ نے ایک بے بس سی نگاہ بے خبر سوتی اوزگل پر ڈالی تھی۔ پھر اٹھ کر کھڑکی کے پاس آٹھہری تھی۔ یہ پشاور میں ان کی پہلی رات تھی۔

اس نے کھڑکی کھول کر پردے ہٹا دیے۔ پورے چاند کی رات بے حد حسین تھی یا پھر یہ اس کے اندر کی روشنی تھی جو ہر شے کو شہری پن عطا کیے جا رہی تھی۔

آسمان صاف تھا۔ پورا چاند ستاروں کے جھرمٹ میں پورے فخر سے چمک رہا تھا۔ وہ کچھ دیر یونہی چاند کو مکتی رہی۔

”مینے“ اوزگل کی پکار پر وہ بری طرح چونکی۔

”اتنی رات کو یہاں کھڑکی کیا کر رہی ہو؟“ دوپٹہ اچھی طرح اپنے گرد جھاتے اس نے حیرانی سے اس سے پوچھا۔

”پتا نہیں گل“ اس نے چند لمحے اوزگل کو خاموشی سے تکتے کے بعد دوبارہ کھڑکی کے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

”آج جیسے ساری دنیا بدل گئی ہے۔“

”ظاہر ہے، ہم پہلی مرتبہ گاؤں سے اتنی دور آئے ہیں پھر ضیا بھی نہیں ہے، ورنہ ہمیں اتنی اجنبیت محسوس نہ ہوتی۔“ اوزگل جمائی لیتے ہوئے دوبارہ بستر پر لیٹتے ہوئے بولی۔

”بہی تو مسئلہ ہے گل۔۔۔“ وہ دھیرے دھیرے چلتی اس کے قریب آگئی۔ اور گل نے سائڈ ٹیبل پر دھرائیبل لیمپ آن کر دیا تھا۔ روشنی سی پھیلی تھی کمرے میں۔۔۔

”مجھے اجنبیت نہیں سب کچھ اپنا، اپنا سا لگ رہا ہے۔ ایسا احساس کبھی نہیں ہوا مجھے۔“ وہ اوزگل کی طرف دیکھتے ہوئے کھوئے کھوئے لہجے میں بولی تھی۔

”کیسا احساس۔۔۔؟“ اوزگل نے نا سنجھی سے پوچھا۔

”خود کو کھودینے کا احساس گل۔۔۔“ وہ مزید اس کے قریب ہوئی تھی۔

”مجھے لگتا ہے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں۔“ اس کی آنکھوں میں چمکتے رنگوں کو سمیٹتے ہوئے بھی نہ جانکیوں اوزگل نے نظریں چراتے ہوئے کہا تھا۔ اور دل ہی دل میں اپنے خدشے کے جھوٹے ہونے کی دعا بھی کی۔

"اب آرام سے سو جاؤ اور مجھے بھی سونے دو۔۔۔ شاباش۔۔۔" اسے ساتھ ہی لٹاتے ہوئے اس نیشیل لیپ آف کرتے ہوئے کہا تھا۔ اور خود بھی پلکیں موند گئی تھی۔

"وہ کتنا خوب صورت ہے ناں اوزگل۔۔۔" اور اوزگل کو لگا اس سے بھیا نک سپنا وہ ساری زندگی نہیں دیکھ پائے گی اس نے گہرا کر آنکھیں کھول دی تھیں۔

"اس کی آنکھ میں حیا کتنا چلتی ہے اس پر۔۔۔" وہ جیسے کسی سحر میں گرفتار بولے جا رہی تھی۔
 "وہ کتنا جدا ہے ناں سب سے۔" اس کے لہجے اس کے انداز میں صرف محبت بول رہی تھی۔۔۔ سچی محبت
 "اس نے تو خان زاد یوں پر نگاہ تک نہ ڈالی۔۔۔ کتنا حیا دار ہے ناں وہ۔۔۔"
 "کون۔۔۔؟" اوزگل کو اپنی آواز کسی گہری کھائی سے آتی سنائی دی تھی۔
 "وہی ناں۔۔۔" وہ اس کی طرف رخ کر کے لیٹ گئی۔
 "جس کے ساتھ آج ہم یہاں سفر کر کے آئے ہیں۔ اس کے لہجے میں جوش تھا۔
 "ابراہیم حیات۔۔۔"

اوزگل بول نہ سکی تھی۔ دل ہی دل میں اپنی پیاری بہن کے لیے دعائیں کی تھی جو اس کے خیال میں موت کے راستے پر قدم دھر چکی تھی۔ کیونکہ وہ جانتی تھی۔ خاندادی اگر کبھی محبت کے راستے پر قدم دھرتی ہے تو اس کی منزل صرف موت ہوتی ہے۔ وہ بھی ذلت کی موت۔۔۔ رسوائی کی موت۔۔۔

☆.....☆.....☆

"یہ اب کیوں آیا تھا۔۔۔؟" نانو کے سوال پر شاہ ویز کو حیرت کا شدید جھٹکا سا لگا تھا۔
 یہ بڑے بزرگ بھی ناں آہٹ سے پہچان لیتے ہیں نئے پرانے سب رشتوں کو نہ جانے کیوں شاویز کو ان کی آنکھیں بھیگی بھیگی سی محسوس ہونیں۔

"میری سوئی محبت جاگی ہے نانی۔۔۔" یا پھر یوں کہیں کہ میری ضرورت آن پڑی ہے انہیں۔۔۔" وہ تلخی سے بتانے لگا۔
 "ہم۔۔۔" نانو اداسی سے زمین کو تکتے لگیں۔
 "آپ کو اب بھی امی کا دکھ ستاتا ہے ناں نانو۔۔۔" شکر کریں کہ ان جیسے مطلبی شخص سے جان چھوٹی ان کی۔ "ان کو اداس دیکھ کر اسے بے حد برا لگا تھا۔

"پاگل" نانو نے پیار سے اس کی پیشانی چوم لی۔

"مرنے والوں کا کیا دکھ۔۔۔" ان کی ضعیف آنکھوں میں پانی تیرنے لگا۔

"دکھ تو زندوں کا ہوتا ہے۔ مجھے تو ساری عمر بس تیرا غم کھاتا رہا۔ ماں باپ کے ہوتے ہوئے یتیموں۔۔۔"

"نانو۔۔۔" اس نے ان کے تھر تھراتے لبوں پر ہاتھ رکھ کر بات مکمل کرنے سے روک دیا۔

"مجھے جن رشتوں کا احساس ساری عمر نہیں ہونے دیا۔ اب کیوں کروانا چاہتی ہیں، یقین کریں میں ان کے بغیر ہی زیادہ خوش ہوں۔" مضبوط ہے میں کہتا وہ بازوان کے گرد جمائل کر گیا تھا۔ نانو نے بھی مسکراتے ہوئے اسے ساتھ لگا لیا تھا۔

☆.....☆.....☆

وہ مزید دودن مری رکے تھے اور ان دودنوں میں ان میں سے ایک نے بھی لچک دکھانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ لالہ کو نمبرہ پر جس قدر غصہ تھا نمبرہ بھی اس مرتبہ اسی قدر ناراض تھی اور کسی حد تک تو اس کی بات تھی بھی صحیح۔۔۔ وہ یہاں گھومنے پھرنے موج منانے آئی تھیں۔۔۔ اور لالہ نے نہ صرف سارا مزہ کر کر کر دیا تھا بلکہ الٹا ناراض بھی وہی ہوتی رہی تھی۔ اور دونوں نے ہی ناراضی میں یہ سوچا تک نہیں تھا کہ کوئی تیسرا تھا جو نہ صرف ان کی ناراضی سے واقف تھا بلکہ ایسے کسی موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش میں بھی۔۔۔ آج ان کو واپسی کے لیے نکلتا تھا۔ صبح نو بجے سب کو یونیورسٹی بس میں سوار ہو جانے کی ہدایت ملی تھی۔ لالہ اپنا سامان رکھوا کے باقی کچھ لڑکیوں کے ساتھ فریش ہونے کے لیے دوبارہ کمرے میں گئی تھی۔

باقی لڑکیاں وقت پر ہی بس پر واپس پہنچ گئی تھیں لیکن ان میں سے کسی کو بھی لالہ کا خیال نہیں آیا تھا۔ بالکل سامنے والی سیٹ پر بیٹھی نمبرہ کو بھی نہیں، وہ لالہ سے سخت ناراض تھی۔ اور ویسے بھی بقول لالہ کے وہ اپنا خیال زیادہ اچھے سے کر سکتی تھی۔ سواب اسے کیوں پروا کرنی چاہیے تھی۔ بس نے روانہ ہوتے ہی اسپید پکڑ لی تھی۔ نمبرہ نے ہینڈ زفری کانوں میں اڑ سے اور باہر کے مناظر دیکھنے کی۔ اس بات سے بے خبر کہ ہوٹل کے کمرے کے واش روم میں بند لالہ کس قدر خوفزدہ انداز میں دروازہ دھڑ دھڑائے جا رہی تھی۔۔۔ کسی نے اسے واش روم میں لاک کر دیا تھا۔

☆.....☆.....☆

کافی سفر طے کر لینے کے بعد اچانک کسی لڑکی کو لالہ کی غیر موجودگی کا احساس ہوا۔ وہ بری طرح چلائی تھی۔ سب اس کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔

"میم۔۔۔ لالہ نہیں ہے ہمارے ساتھ۔۔۔" سب کے چہروں پر عجیب سے تاثرات دیکھ کر نمبرہ بھی متوجہ ہوئی اور اصل بات سن کر صحیح معنوں میں اس کے ہوش اڑ گئے تھے۔

"میم ضیا بھی نہیں ہے۔" شاہد نے توجہ دلائی۔

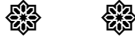
"ہاں، وہ تو اپنی گاڑی میں واپس آئے گا لیکن لالہ۔" وہ بے حد پریشان ہوئی تھیں۔ نمرہ کا تودل ڈوبنے لگا تھا۔ اسے خود پر غصہ آنے لگا۔۔۔

"میم، ضیا کو فون کریں۔ کیا پتا لالہ اس کے ساتھ ہو۔" ایک لڑکی نے تجویز دی۔
 "بالکل نہیں میم لالہ، ضیا کے ساتھ نہیں ہو سکتی۔ وہ تو اس سے بے حد چڑتی ہے۔" نمرہ ٹپ کر بولی
 "پلیز میم واپس چلتے ہیں۔" اس نے تبسم سے ریکورسٹ کی۔

"مجھے ضیا سے پوچھنے دو۔ کیا پتا وہ ابھی نہ نکلا ہو۔ اگر ایسا ہے تو وہ لالہ کو ساتھ لے لے گا۔" انہوں نے موبائل پر ضیا کا نمبر ڈائل کرتے ہوئے اسے تسلی دی تھی۔ دوسری بیل پر ہی ضیا نے کال ریسیو کر لی۔
 "ضیا تم کہاں ہو؟" میم نے فوراً پوچھا۔ اسپیکر آن کرتے ہوئے۔
 "میم نکل رہا ہوں بس میں بھی۔" اس نے جواب دیا۔
 "کیوں خیریت میم؟"
 "اصل میں لالہ بس میں نہیں ہے تم اگر۔۔۔"

"لالہ میرے ساتھ ہے۔" ضیا نے ان کی بات کاٹتے ہوئے جواب دیا تھا۔ اور نمرہ کو لگا کسی نے پگھلا ہوا سیسہ اس کے کانوں میں ڈال دیا تھا۔

"لیکن۔۔۔" میم تبسم مطمئن تو ہوئیں لیکن پھر بھی پوچھے بنانہ رہ سکیں۔
 "میم میں وہاں آ کر آپ کو تفصیل بتا دوں گا۔ ابھی راستے میں ہوں اور یہاں کافی رش ہے۔" ضیا نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔
 "اوکے، اوکے۔۔۔ اللہ حافظ۔" انہوں نے فوراً کال بند کر دی تھی سب کی جان میں جان آئی تھی۔ لیکن نمرہ۔۔۔ اسے ایک مرتبہ پھر اپنی سادگی پر بے انتہا غصہ آ رہا تھا۔



ناول ”محبت لفظ ہے لیکن“ ابھی جاری ہے۔ اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی 10 تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

قسط نمبر 6

”ماں باپ کے سامنے بہت سوچ سمجھ کر بولا کرو کیوں کہ کبھی کبھی ان کے سامنے بولا گیا کوئی بھی بر لیا اچھا کلام ہماری پوری قسمت پہ حاوی ہو جاتا ہے۔“

میم تبسم کو مطمئن کرتا وہ مسکراتا ہوا اب اس کمرے میں کھڑا تھا جس کے واش روم میں بند لالہ مدد کے لئے پکار رہی تھی۔۔۔ ضیا نے کچھ دیر سوچا۔۔۔ پھر آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔۔۔ دروازہ کھلتا دیکھ کر لالہ تیزی سے باہر آئی تھی۔ اور باہر ضیا کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں تیرنے والا اطمینان ضیا کو ایک لمحے میں حیران کر گیا۔ اس کی توقع کے مطابق لالہ کاری ایکشن نہایت سخت آنے والا تھا اگلے ہی پل اسے مزید جھٹکا لگا تھا جب اس نے لالہ کو دونوں ہاتھوں میں منہ چھپاتے پھوٹ پھوٹ کر روتے دیکھا۔

"لالہ" وہ بس اس کا نام لے کر رہ گیا۔

"میں ٹھیک ہوں۔" لالہ نے چند لمحوں میں ہی خود کو کمپوز کرتے ہوئے چہرہ صاف کیا۔

"مجھے لگا میں یہاں اکیلی رہ گئی ہوں۔ تم سب چلے گئے ہو۔" اس کی بات پر سینے پر ہاتھ باندھے وہ اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔

"سب چلیبی گئے ہیں۔" نہ جانے کیوں ضیا علی خان کو لالہ کا سکون غارت کر کے ہی سکون ملتا تھا۔

"مطلب۔" وہ پہلی بار چونکی۔۔۔

"مطلب صرف تم اور میں بچے ہیں۔ باقی سب لوگ نکل چکے ہیں۔" اس کی بات پر لالہ کا منہ ذرا سا کھلتا تھا۔

"اور شکر کرو کہ میں بھی کسی کام سے تھوڑی دیر لیٹ ہو گیا کیونکہ میرے گارڈز میری گاڑی بھی لا چکے ہیں تو مجھے کوئی المیہ نہیں تھا

رکنے کا۔۔۔ تبھی میم تبسم نے مجھے کال کر کے تمہارا بتایا تو میں تمہیں چیک کرنے آ گیا۔" اس نے صفائی سے جھوٹ گھڑا۔

"اوہ میرے خدا۔۔۔" وہ سر پکڑ کے بیٹھ گئی۔

"اب میرے ساتھ چلنا ہے یا کوئی اور بندوبست کر لو گی؟" اس نے معصومیت سی چہرے پر طاری کرتے ہوئے پوچھا۔ لالہ نے

لب چلتے ہوئے ایک بے بس سی نگاہ ضیا پر ڈالی۔ وہ یوں کندھے اچکا جتنا رہا ہو۔

"تمہارے پاس اور کوئی آپشن نہیں رہا لالہ ارتضیٰ زیدی۔۔۔"

"اوکے۔" کافی دیر تک اسے یونہی خاموش دیکھ کر ضیا نے ہاتھ جھاڑے۔

"میں نکلتا ہوں، ویسے بھی مجھے شہر سے آگے پھر گاؤں بھی جانا ہے ضروری کام سے۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر جیسے اسے الوداع کہا

تھا اور مڑ گیا تھا۔

"رکو" لالہ کی تیز آواز نے اس کے قدم روک دیے تھے، وہ مڑا نہیں تھا لیکن لبوں پر حسین مسکراہٹ رقص کرنے لگی تھی۔

"مجبوری ہے۔ میں تمہارے ساتھ جاؤں گی۔" وہ کمزور آواز میں بولی تھی ضیا سر ہلاتا کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔ لالہ نے کچھ دیر سوچا پھر مرے مرے قدموں سے اس نے بھی ضیا کی تقلید کی تھی۔ اسے خود پر۔۔۔ نمرہ پر اور باقی سب پر سخت غصہ آ رہا تھا۔ لیکن فی الحال وہ یہ موقع بھی نہیں گنوا چاہتی تھی۔

جو اس اجنبی شہر میں قدرت نے اسے دیا تھا۔۔۔ کم از کم اسے تو یہی لگا تھا۔

☆.....☆.....☆

آدھی سے زیادہ رات بیت چکی تھی لیکن نیند ان کی آنکھوں سے غائب تھی۔ شوق سا جاگ رہا تھا ان کی گہری سبز آنکھوں میں۔۔۔ آرام دہ کرسی پر جھولتے وہ مسلسل دروازے کی سمت دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں کا شوق پتا دے رہا تھا۔۔۔ وہ کسی کا بے صبری سے انتظار کر رہے تھے بھی زنجیری جھلکی تھی جھولتی کرسی ایک دم روک دی تھی انہوں نے چھن چھن کی دھیمی آواز آہستہ آہستہ قریب آ رہی تھی۔ گھنی مونچھوں تلے ہونٹ مسکرا اٹھے تھے۔ پھر آواز ان کے کمرے کے دروازے پر آ کر رک گئی۔ پھر کسی نے آہستگی سے ان کے بیڈروم کا دروازہ کھٹکھٹایا تھا۔

"چھوڑ دو۔۔۔" انہوں نے بارعب آواز میں حکم دیا تھا۔

ان کی آواز پر دروازہ فوراً زاساوا ہوا تھا اور تھکے تھکے وچو کو گھسٹتے وہ دومر داند آئے تھے۔ انہوں نے فوراً ہاتھ کے اشارے سے انہیں جانے کا کہا تھا۔ وہ سر جھکاتے واپس ہو لیے۔۔۔ انہوں نے آگے بڑھ کر اور دروازہ لاک کر دیا تھا۔ پھر دھیرے، دھیرے چلتے اس کمزور وجود کے قریب آٹھہرے تھے جس کے لمبے بالوں نے اس کے چہرے تک کوڑھانپ رکھا تھا۔ وہ کمزور سا وجود یوں ہانپ رہا تھا جیسے پیدل کوئی لمبی مسافت کر کے آیا ہو یا پھر کافی مدت بعد چلا ہو۔

"کیسی ہو؟" انہوں نے اسے کندھے سے تھام کر نرم لہجے میں پوچھا۔

"ہونہہ۔۔۔" کمزور وجود نے سختی سے آواز نکالتے ہوئے ان کے ہاتھ جھٹک دیے تھے۔ وہ بمشکل خود کو سنبھال پائے تھے۔

بلند آواز میں فحش سی گالی دیتے ہوئے انہوں نے اسے بالوں سے دبوچا۔۔۔ اس کے منہ سے اف تک نہیں نکلی تھی۔۔۔

زرد لیکن خوب صورت چہرہ بالوں کے پردے سے آزاد ہو گیا تھا۔ وہ چند لمحے اسے دیکھتے رہے تھے۔ جب اس نے دوبارہ خود کو ان کی گرفت سے آزاد کرانے کی کوشش کی تھی۔

اف۔۔۔ ف۔۔۔" انہوں نے گرفت مزید سخت کرتے ہوئے کہا۔

خوب صورت نیلی آنکھیں غصے سے انہیں دیکھنے لگیں۔

"رسی جل گئی۔۔۔ پر بل نہیں گیا" انہوں نے اسے بالوں سے کھینچتے ہوئے اپنے قریب کر لیا تھا۔۔۔

"یہی تو بات ہے سہراب خان رسی ابھی جلی نہیں۔۔۔" ان کے سینے سے لگی بالکل بے بس سی وہ عورت بے حد مضبوط لہجے میں

بولی تھی۔ اس کی آواز کے ساتھ ساتھ اس کی آنکھوں میں بھی بے خوفی تھی۔

"تم نے تو بس کھیل شروع کیا ہے۔ مگر بھول گئے ہو کچھ کھیل بہت لمبے چلتے ہیں۔ خاص کر زندگی کے کھیل۔۔۔ سازشوں کے

کھیل۔۔۔" وہ منہ ان کے مزید قریب کر کے پھنکاری تھی۔

"بس۔۔۔" کمزور کمر کے گرد مضبوط بازو جمائل کرتے ہوئے انہوں نے اس کمزور سے وجود کو خود میں سمو لیا تھا۔

"بس یہی ادا ہے تمہاری" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مجبور لہجے میں بولے۔

"جس سہراب علی خان کے سامنے شیطان بھی خوف سے تھر تھرا کر نکلتا ہے تو اسے بولتی ہے شیرنی ہے قسم سے۔۔۔" وہ مسلسل ان

کے شکجے کو توڑنے کی کوشش کرنے لگی تھی۔

"اسی وجہ سے صرف اسی وجہ سے تجھے چھوڑ کر بھی تجھے بھول نہیں پایا میں۔۔۔" وہ اس کی ہر کوشش ناکام کرتے ہوئے بولے تھے۔

"چل اب مجھے پریشان نہ کرو ایسے بھی اتنے سال اس کال کوٹھڑی کے بعد اپنے پرانے بیڈروم میں آ کر کچھ تو تمہیں بھی یاد آیا

ہوگا۔" اس کے پیروں سے بندھی زنجیر شور کرنے لگی تھی۔

"بیوی نہ سہی۔۔۔ باندھی ہی سہی۔۔۔ پر میرے کمرے پر تمہارا حق ہمیشہ رہنے والا ہے۔" انہوں نے بھوکی نظروں سے اسے

دیکھتے ہوئے بیڈ پر اچھال دیا تھا۔

"میں تھوکتی ہوں سہراب خان تجھ پر تجھ سے جڑی ہر شے پر۔۔۔ تھو۔۔۔" اس نے نڈر لہجے میں کہتے ہوئے ان کے چہرے پر

تھوکا تھا۔ سہراب علی خان نے آستین سے چہرہ صاف کرتے ہوئے غضب ناک نظروں سے اسے گھورا تھا۔ اور پھر ایسے اس کمزور وجود پر بل

پڑے تھے جیسے شیر اپنے شکار پر۔۔۔ نہ جانے کتنے سالوں بعد حویلی ایک مرتبہ پھر اس کی دردناک چیخوں اور زنجیر کے شور سے گونج اٹھی تھی۔

☆.....☆.....☆

ریسٹورنٹ کی کھلی چھت پر کونے کی ٹیبل پر بیٹھا وہ کپل بے حد حسین تھا تبھی آتے جاتے لوگوں کی توجہ کھینچ رہا تھا اوپر سے خاموشی

سے اسے تکتی امن۔۔۔

"مجھے گھورنا بند کرو پلیز۔۔۔" دونوں ہاتھوں کی پوائنٹر فنگر ملا کے ہونٹوں پر رکھتے ہوئے اس نے جیسے درخواست کی تھی۔

"کم آن باری۔۔۔" تم شرمارہے ہو امن کھلکھلا دی۔ اسے خود اتنا اچھا لگ رہا تھا باریال کو ایسے تکتے رہنا اور اس کی حیا سے

بوجھل ہوتی آنکھیں اور جھینپتا انداز۔۔۔

"غیرت دار پٹھان ہوں یار۔۔۔" اس کی بات پر وہ بھی دھیرے سے مسکرا دیا تھا۔ ہلکی سی مسکراہٹ پر بھی اس کی آنکھوں میں ہمیشہ چھل دیتی نمی بھی چمک اٹھتی تھی۔ سحر ساطاری ہوا تھا۔۔۔ امن اسے دیکھتی چلی گئی۔۔۔

"کچھ تو شرم کرو یار۔۔۔" اب کی باریاں نے ٹیبل بجاتے ہوئے رخ پھیرتے ہوئے کہا تھا۔ اور اس کی اس ادھر امن ہنستی چلی گئی تھی۔

"میرے خیال میں مجھے چلنا چاہیے۔" وہ خفا خفا سا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"باریاں۔۔۔ باریاں۔۔۔" امن بھی فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔

اچھا سوری۔۔۔ سوری۔۔۔"

"پکا۔۔۔" وہ سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"ہنڈرڈ پرسنٹ۔۔۔" وہ واقعی شرمندہ تھی۔ باریاں دوبارہ بیٹھ گیا۔

"توبہ ہے باری تم تو ناراض بھی لڑکیوں کی طرح ہوتے ہو۔۔۔" وہ پھر ہنس رہی تھی۔

"میں واقعی چلا جاؤں گا امن۔۔۔" اسے یونہی غیر سنجیدہ دیکھ کر اس نے دھمکی دی جو فوراً اثر کر گئی امن خاموشی سے ٹیبل بجانے لگی۔

"اب ہم کیا وہ بات کر لیں جس کے لیے محترمہ نے مجھے یہاں بلایا ہے۔" کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد باریاں نے کہا تو امن

کے یاقوتی لبوں پر مسکراہٹ سی پھیل گئی۔

"آج کا دن کتنا خوبصورت ہے ناں" وہ دونوں ہاتھوں پر ٹھوڑی جماتے ہوئے بولی۔۔۔ موسم واقعی بے حد خوب صورت تھا۔

ایک دم سے گھر کر آنے والے کالے بادلوں نے دن کو شام سی خوب صورتی عطا کی تھی۔ اوپر سے کن من بستی رم جھم۔۔۔ سب کچھ جیسے نکھر

سا گیا تھا۔

"دن تو سبھی خوب صورت ہوتے ہیں۔" باریاں نے اس کی بات کا جواب دیا تو اس کا منہ بن گیا۔

"توبہ باریاں تم کتنے بور ہو۔۔۔" وہ چڑ گئی تھی۔

"سچی۔۔۔؟" باریاں خوش ہوا۔

"تو میں چلوں۔۔۔" فوراً اجازت چاہی۔

"باری۔۔۔" اب کی بار وہ واقعی ناراض ہونے لگی تھی۔

"امن پلیز جلدی بتاؤں جو کہنا ہے دیدے میرا انتظار کر رہی ہوں گی۔" اس نے گھڑی دیکھتے ہوئے اس کی ناراضی کی پروا نہ

کرتے ہوئے کہا۔۔۔ امن کچھ دیر اسے یونہی ناراض نظروں سے گھورتی رہی۔

"واٹ۔" باریال نے سوالیہ انداز میں کندھے اچکائے۔

امن نے کچھ دیر خاموشی سے اسے دیکھا پھر ایک گہری سانس لے کر خود کو جیسے کمپوز کیا۔ اور پرس سے ایک منجلیس سرخ کیس نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ باریال نے پہلے کیس اور پھر اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"کھولو تو" امن مسکرائی۔ باریال نے سر ہلاتے ہوئے باباں ہاتھ آگے بڑھا کر کیس اوین کر دیا۔ ہیرے کی خوبصورت انگوٹھی جھلملا رہی تھی۔

"یہ۔۔۔" وہ حیران سا امن کو دیکھنے لگا تھا۔

"مجھ سے شادی کرو گے باریال" ہیرے کی انگوٹھی کی ساری جھلملاہٹ اس وقت جیسے امن کی آنکھوں میں جاسائی تھی باریال بت بنا اسے دیکھتا رہ گیا۔

☆.....☆.....☆

گیٹ اس قدر زوردار آواز سے کھلا تھا کہ اقرا اور حمزہ دونوں دوڑتے ہوئے باہر آئے۔ زرینہ بیگم تھیں۔ چہرے پر شدید غصہ رقم تھا۔ اقرا اور حمزہ دونوں نے ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا جیسے ایک دوسرے سے آنکھوں کی آنکھوں میں ان کے غصے کی وجہ پوچھ رہے ہوں۔

"ہائے اقرا پانی پلاٹھنڈا۔۔۔" ماتھے پر ہاتھ مارتی وہ صحن میں رکھے تخت پر بیٹھتے ہوئے بولیں۔ اقرا فوراً کچن کی طرف بھاگی حمزہ ماں کے قریب چلا آیا۔

"کیا ہوا امی؟ آپ تو مارکیٹ گئی تھیں ناں۔۔۔؟" حمزہ نے پریشانی سے پوچھا۔

"مارکیٹ کے لیے ہی نکلی تھی لیکن پھر ماں کی طرف چلی گئی نظریں چراتے ہوئے جیسے انہوں نے اپنا جھوٹ بھی چھپایا تھا۔ لیکن حمزہ فوراً بات کی تہہ تک پہنچ گیا تھا انہیں مارکیٹ کا کہہ کر وہ نانوں کی طرف ہی گئی تھیں تاکہ حمزہ وہاں نہ جاسکے۔۔۔ وہاں جا کر انہیں لالہ کے ٹور پر جانے کا پتا چلا ہوگا اور یہ سارا نزلہ اب اس پر گرنے والا تھا۔ وہ بددل ہو کر اٹھنیل گا تھا۔

"اور سنو۔۔۔" اسے اٹھتا دیکھ کر انہوں نے فوراً تزیں دکھائی۔

"وہ اپنی لالہ۔۔۔ جس کی بڑی تعریفیں کرتے ہوں ناں تم۔۔۔ اسلام آباد پہنچی ہوئی ہے۔ وہ، بھی اکیلی اتنے مردوں کے ساتھ۔۔۔" دونوں ہاتھوں سے بین کرتی وہ اسے بریکنگ نیوز دے رہی تھی حمزہ لب کاٹنے لگا جبکہ پانی کا گلاس لاتی اقرا کا بھی دل سخت برا ہوا۔

"ہائے ہائے میرے بھائی کی روح کو مر کر بھی چین نہ لینے دیں گے یہ لوگ۔۔۔" وہ اونچی آواز میں بین کرنے لگیں حمزہ گیٹ کی

طرف بڑھا۔

" لکھو الو یہ بی بی میرے بھائی کی عزت کو داغدار کر کے ہی رہے گی۔۔۔ " آواز حمزہ کو باہر جاتا دیکھ کر مزید بلند ہوئی حمزہ تیزی سے گیٹ کر اس کرتا باہر نکل گیا تھا۔

" مجال ہے جوان کے خلاف کچھ سن لے۔ " فوراً آواز معمول پر آئی تھی۔
 " اور تو۔۔۔ تو ادھر مر۔۔۔ " اقر کو گھوری دکھائی۔ وہ فوراً قریب آئی۔
 " اب صرف پانی پر ہی ٹرخائے گی، جاچائے بنا میرے لیے۔۔۔ " گلاس لیتے ہوئے ایک دھپ بھی کمر پر رسید کی گئی وہ بیچاری کمر سہلاتی اندر چلی گئی۔

" کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا اس لالہ بی بی کا جادو حمزہ کے سر سے اتارنے کیلئے۔ " ان کی سوئی اب بھی لالہ پر ہی اٹکی ہوئی تھی۔

☆.....☆.....☆

ضیا گاڑی تیز چلا رہا تھا۔ لیکن لالہ بھی خاموشی سے بیٹھی رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا ضیا جان بوجھ کر صرف اسے تنگ کرنے کے لیے گاڑی تیز چلا رہا تھا۔ ایک تو بیٹھی قرنٹ سیٹ پر تھی۔ سامنے سے آتی ہر چیز اسے خود سے نکراتی محسوس ہوتی۔ دل دھڑک دھڑک جاتا۔ لیکن پھر بھی خاموش بیٹھی رہی۔ وہ کسی طور خود کو کمزور ثابت نہیں کرنا چاہتی تھی۔

ضیا کے تینوں گن مین پچھلی سیٹ پر براجمان تھے۔ وہ گاہے بگاہے ان پر بھی ڈری ڈری نظر ڈال لیتی۔ لیکن وہ سب مکمل طور پر باہر متوجہ تھے۔ لالہ نے ایک مرتبہ بھی ان کو اپنی طرف متوجہ نہیں پایا تھا۔ ضیا بھی۔۔۔ فی الحال تک تو خاموش ہی رہا تھا۔ یہ چیز بھی اسے مطمئن کر رہی تھی۔ صرف چند منٹس کی ڈرائیو کے بعد ہی وہ اسلام آباد سے نکل آئے تھے اور موسم بھی نہایت سہانہ ہونے لگا تھا۔ ایک دم سے گھر کر آنے والے بادل اور ننھی منی کن من ضیا نے ہاتھ آگے بڑھ کر پلیر آن کر دیا۔

آج کی بات پھر نہیں ہوگی

یہ ملاقات پھر نہیں ہوگی

ایسے بادل تو پھر بھی آئیں گے

ایسی برسات پھر نہیں ہوگی

نصرت فتح علی خان کی آواز نے ماحول میں ایک دم سحر ساطاری کیا تھا۔ لالہ نجانے کیوں مزید سمٹ گئی تھی۔ اور ضیا وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔۔۔ وہ کس لیے زیادہ خوشی محسوس کر رہا تھا۔

لالہ کے ساتھ ہونے کے لیے۔۔۔ یا باء جی کی منزل کے بے حد قریب ہونے کے لیے۔۔۔

وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا ایک موسم اور دوسرا دم ہم موسیقی اور بادشاہ سر کی آواز۔۔۔ وہ جیسے کسی سحر کے حصار میں محصور ہوا جا رہا تھا۔

رات ان کو بھی یوں ہوا محسوس

اب یہ رات پھر نہیں ہوگی

لالہ نے چادر اپنے گرد مزید لپیٹی تھی۔

ہے کہاں کا ارادہ تمہارا صنم

کس کے دل کو دادوں سے بہلاؤ گے

میوزک تیز ہوا تھا۔ لالہ نے اچانک ہی ضیا کی طرف دیکھا وہ اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ بری طرح جھینپ گئی۔

"تم اسے بند کر کے نہیں چلا سکتے کیا گاڑی۔۔۔" وہ غصے سے بولی۔

"چلا سکتا ہوں لیکن اس طرح تھکوں گا نہیں ناں۔" وہ مسکرایا۔

"تم نے سنا نہیں میوزک روح کو تازہ دم کر دیتا ہے۔ ساتھ ہی لالہ کی معلومات میں بھی اضافہ کیا گیا۔

"ابھی تو یہ مجھے تھکا رہا ہے، سر میں درد ہونے لگا ہے۔" اس نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

”اوہ۔۔۔ تو یوں بتاؤ ناں۔۔۔“ وہ پریشان ہو گیا فوراً میوزک آف کر دیا۔۔۔

"یہاں کچھ دور ایک کیفے ہے۔ کہو تو کافی پینے رک جاتے ہیں۔" اس کی آفر پہ لالہ سوچ میں پڑ گیا۔

"بالکل قریش ہو جاؤ گی۔" وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے گاڑی کی اسپید کم کرتے ہوئے بولا تھا۔

"لیکن" وہ بیک ویو مرر میں اس کے گن مین کو دیکھتے ہوئے کچھ کہتے ہوئے ٹھٹکی۔ ضیا نے اس کی حرکت نوٹ کر لی تھی۔

"تم لوگ گاڑی کے پاس ہی رہنا۔۔۔ ہم بس کافی پی کر آتے ہیں۔" وہ ایک خوب صورت ہوٹل کے اوپن یارڈ کیفے تھا جس

طرف اس نے گاڑی موڑتے ہوئے اپنے آدمیوں کو ہدایت دی تھی۔

"یا پھر چھپلی طرف ہوٹل سائڈ پر جا کر تم لوگ بھی کچھ کھانی لینا۔ میں پے کر دوں گا۔۔۔" دوسرے ہی لمحے اس کی دوستانہ نیچراؤ

کرا آئی تھی۔

"جی خان۔" ایک آدمی نے مودب لہجے میں جواب دیا تھا۔ اور گاڑی سے نکلتے وقت لالہ بالکل بھی نہیں دیکھ پائی تھی کہ ضیا نے

اپنا فون اس آدمی کو پکڑا دیا تھا۔

☆.....☆.....☆

ان دونوں کے درمیان کتنے ہی پل خاموشی سے سرک گئے۔۔۔ امن باریال کو دیکھ رہی تھی اور باریال۔۔۔ ٹیبل پر پڑی اس

قیمتی اگٹھی کو۔۔۔ بارش کی ننھی رم جھم ان دونوں کو بھگونے لگی تھی۔ لوگ تیزی سے نیچے جانے لگے تھے لیکن وہ دونوں جیسے سے کی چھڑی سے بت بنے رہ گئے تھے۔

باریال حیرت اور بے یقینی کے سمندر میں غوطہ زن تھا۔۔۔ تو امن جیسے حیات گل کی تمام تر خوشیوں سے دامن سمیٹنے کے لیے بے قرار۔۔۔ وقت نے رفتار کی لگائیں ایک دم سے کھینچی تھیں۔

کائنات کی ہر چیز ہے جیسے ان دونوں کے مقدر کے فیصلے کی منظر تھی۔ ان دونوں میں سے ہر ایک کو کیا ملنے والا تھا؟
وصال قبولیت، محبت یا ہجر کی کالی سیاہی۔۔۔ دکھ اور فاصلے۔۔۔ اور وقت کی آنکھ نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ امن کی آنکھوں میں صرف خوشی تھی۔ انتظار تھا۔۔۔ وصل کا۔۔۔ قبولیت کا۔۔۔ محبت کا۔۔۔ لیکن ہجر دکھ اور فاصلوں کا خوف نہیں تھا اور اسے لگا یہی غلط تھا۔ اس قدر اعتماد ہی تو اچھا نہیں ہوتا۔۔۔ قسمت یہی پہ تو دھوکا دے جاتی ہے۔ اور سوچ کے بالکل الٹ ہو جاتا ہے۔

"باریال۔۔۔" امن کی آواز پر وہ فوراً اس کی طرف متوجہ ہوا۔
"میں نے اتنا مشکل سوال تو نہیں پوچھا۔" وہ مسکراتے ہوئے چمکتی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔
"یہ کافی اچانک نہیں امن۔" وہ سر کے پیچھے ہاتھ باندھتا کرسی کی پشت سے ٹیک لگا گیا۔ جیسے خود کو ریلیکس کر رہا ہو۔
"سو واٹ۔۔۔" وہ آگے کوچکی۔

"کیا تمہارے لیے یہ کافی نہیں کہ امن سکندر تمہیں تو خود پر پوز کر رہی ہے۔" اس کی آواز میں غرور سا سما گیا۔ باریال نے گہری نظر اس کے چہرے پر ڈالی پھر بایاں ہاتھ آگے بڑھا کر وہ ننھا سا کیس بند کیا اور آہستگی سے واپس اس کی طرف کھسکا دیا۔
"میں ابھی اس سب کے لیے تیار نہیں ہوں۔ مجھے سوچنے کا وقت دو۔۔۔" اس نے سادہ لہجے میں کہا تھا لیکن امن کے چہرے پر پھیلتی ناگواری بے حد واضح تھی۔

"واٹ ڈو یو مین باریال ولی خان۔۔۔" غصے سے اس کی سفید ہے داغ اسکن پر سبز رگوں کا جال ساتن گیا تھا۔
"امن سکندر اس ملک کے بزنس ٹائیکون سکندر خان کی بیٹی کا پروپوزل قبول کرنے کے لیے تمہیں سوچنا پڑے گا۔" وہ غصے میں آپے سے باہر ہو گئی تھی۔

ٹیل پر دھرے خوبصورت قیمتی برتنوں کو زوردار ہاتھ مار کے نیچے گرا دیا تھا۔ باریال بھی اٹھ کھڑا ہوا اس کی خوب صورت چمکیلی آنکھوں میں اب تاسف کا رنگ نمایاں تھا۔ دو تین بیرے دوڑتے ہوئے وہاں آئے تھے۔
"تم واقعی ٹھیک کہہ رہی ہو امن" وہ دھیرے، دھیرے چلتے اس کے قریب آٹھرا۔
امن کی کوآنکھوں میں ایک مرتبہ پھر امید سی لہرائی۔

"مجھے سوچنے کی بھی غلطی نہیں کرنی چاہیے۔" وہ ایک مرتبہ پھر اسے پاتال کی گہرائیوں میں دھکا دے رہا تھا۔

"سوری میں تم سے شادی نہیں کر سکتا۔" اس نے صاف انکار کر دیا تھا۔ اور امن۔۔۔ دکھ سے اسے بھی دیکھتی اچانک ہی جھول کر زمین پر آ رہی۔۔۔ اسے سنبھالنے کے لیے سب سے پہلے آگے بڑھنے والا مرد بھی ہاریال ولی خان ہی تھا۔

☆.....☆.....☆

کافی ختم ہونے تک ضیا بالکل خاموش رہا تھا۔ لالہ نے دیکھا تھا وہ اس کی طرف بالکل بھی متوجہ نہیں رہا تھا۔ ارد گرد کے نظاروں میں ہی کھویا رہا۔ اس کے دل میں ضیا کے لیے شدید چڑ، آہستہ آہستہ پسندیدگی میں بدلنے لگی۔ وہ آج تو یہ ماننے پر مجبور ہو گئی تھی کہ نمرہ بالکل ٹھیک تھی۔ ضیا اس قدر برا آدمی نہیں جتنا وہ سمجھتی تھی۔ باقی رہی اس کے پیچھے آنے والے بات تو ایسے امیر لڑکے اکثر غریب لڑکیوں کی محبت میں ایسی بے وقوفانہ حرکاتیں کرتے ہی ہیں۔ یہ لالہ الرضی کا ماننا تھا۔

"تو کیا ضیا مجھ سے محبت کرتا ہے؟" اپنی ہی سوچوں پر وہ بری طرح چونکی تھی۔ دل اچانک ہی بے قابو سا ہوا تھا۔ ایک گہری نظر ضیا پر ڈالی۔۔۔ وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ بلیک شلوار قمیض میں ملبوس اس کی شخصیت بے حد اجلی تھی۔ ہلکے بھورے روئیں پہ بندھا وہ دھاگہ۔۔۔ لالہ نے اعتراف کیا تم وہ اسے بے حد سوٹ کرتا تھا۔۔۔ اچانک ہی ضیا نے اس کی طرف دیکھا تھا اور لالہ کو لگا اس سے پہلے اس قدر خوب صورت آنکھیں اس نے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ کچھ سرمئی سی۔۔۔ یا بادامی سی۔۔۔ یا جھلملاتی سنہری۔۔۔ وہ اس کی آنکھوں کا رنگ نہ جانچ سکی تھی۔

"تم مجھے گاڑی میں بھی یونہی دیکھ سکتی ہو۔ میں مائنڈ نہیں کروں گا۔" وہ اٹھتے ہوئے وہی دوستانہ مسکراہٹ چہرے پر سجاتے ہوئے بولا تو وہ بے اختیار جھینپ گئی۔۔۔

"نہیں، میں تو۔۔۔" وہ بول نہ سکی۔

"مذاق کر رہا تھا۔" اس نے فوراً وضاحت دی۔

"چلیں۔۔۔؟" اور پوچھا۔

"ہاں۔۔۔" وہ نظریں جھکائے اپنا پرس اٹھاتی گاڑی کی طرف بڑھا گئی۔ ضیا اندر کا وٹنر کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے اندر آتے ہی اس کے خاص آدمی نے اس کا موبائل اسے تھما دیا تھا۔

"خان۔۔۔ بل ادا کر دیا ہے میں نے" اس نے مودب لہجے میں کہا۔

"تم لوگ چلو میں آیا۔" اس نے حکم دیا اور ان کے جاتے ہی تیزی سے موبائل پہ ہاتھ چلانے لگا تھا۔

☆.....☆.....☆

وہ گھر پہنچی تو کھانے کا وقت ہو رہا تھا۔ امی اسے فریش ہو کر آنے کا کہہ کر گئیں تو وہ جلدی سے واٹس ایپ آن کر کے بیٹھ گئی گھر پہنچنے کا اسٹیٹس لگانا تو ہی گئی تھی۔ اسٹیٹس لگا کر اس نے یونہی سرسری نگاہ نیچے فریش لگے دوستوں کے status پر ڈالی تھی۔ سب سے نئی اپ ڈیٹ ضیاعلی خان کی طرف سے تھی۔ اس نے کچھ سوچتے ہوئے اس پر کلک کر دیا تھا۔ اور اگلے ہی پل وہ اچھل ہی پڑی۔ یہ ایک اوپن کیفے کا منظر تھا۔ ضیاعلی خان اور لالہ ایک ساتھ۔۔۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا تصویر کے بعد تصویر بدل رہی تھی۔

"میرے ساتھ ایک کپ کافی پینا پسند کرو گی۔" ضیا کا مسکراتا ایک دم صاف لہجہ۔۔۔
 "اگر تم نے پھر کبھی ضیاعلی خان کے ساتھ میرا نام لینے کی کوشش بھی کی تو ہماری دوستی ختم۔۔۔"
 "اتنے سادہ نظر آنے والے لوگ اتنے مکار کیسے ہو سکتے ہیں؟" وہ خود سے سوال کرتی لب کچلنے لگی تھی۔
 ادھر ضیاعلی خان نے seen میں نمرہ کا نام نظر آتے ہی مسکراتے ہوئے سیل آف کیا تھا اور بلیک گلاسز لگائے گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

☆.....☆.....☆

"اسے ہوش آ گیا تھا۔ ڈاکٹرز نے اس کی بے ہوشی کی وجہ ایک دم سے اسٹریس اسٹروک بتائی تھی۔
 کسی بات پر ووشا کڈ ہوئی تھی۔ اور وہ بھی اس قدر زیادہ کہ اس کا دل اور دماغ برداشت نہیں کر پائے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ اسٹروک جان لیوا بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ دیوار سے پشت لگائے، ٹانگوں کی قینچی بنائے، سینے پر بازو باندھے وہ بے بسی سے بستر پر پڑے اس وجود کو دیکھ رہا تھا۔ جس کی کھلی رنگت میں صرف چند گھنٹوں میں زردی ان ہی کھلنے لگی تھیں۔
 وہ مسلسل اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور وہ۔۔۔ وہ اس کی طرف نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ اس کے چہرے کیے تاثرات سے وہ بخوبی سمجھ سکتا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اس سے کہنے کے لیے مناسب الفاظ تراشنا سکند ر صاحب گھبرائے ہوئے اندر آئے تھے۔ وہ احتراماً سیدھا کھڑا ہوا تھا لیکن انہوں نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ سیدھا بیڈ پر نڈھال سی لیٹی امن کی طرف بڑھے تھے ان کو دیکھتے ہی امن نے اٹتے ہوئے ان کی کمر کے گرد بازو جمائے کیے اور سسک پڑی۔

"امن۔۔۔ میرے بچے۔۔۔" وہ جو پہلے ہی پریشان تھے اسے اس طرح ہی ہو کر تے دیکھ کر مزید پریشان ہو گئے۔
 "امن۔۔۔ واٹ ہپنڈ مائی چائلڈ۔۔۔" انہوں نے محبت سے اس کے بالوں پر اپنے لب رکھتے ہوئے پوچھا تھا۔
 "سر۔" باریال نے انہیں متوجہ کرنے کے لیے پکارا۔ ان کے ساتھ ساتھ امن نے بھی سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔
 "پاپا اسے کہیں جائے یہاں سے۔" وہ دوبارہ ان کے پہلو میں سر چھپائے سسک اٹھی۔

"لیکن بات کیا ہے میری جان" وہ ناتجہی سے کبھی باریال تو کبھی روتی بلکتی امن کو دیکھتے۔

"سر۔" باریال کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ امن نے چلا کر اسے روک دیا تھا۔

"چلے جاؤ یہاں سے باریال۔"

"امن پلیز۔۔۔" وہ امن کے قریب آیا۔

"گیٹ لاسٹ باریال۔۔۔ لیو۔۔۔ لیوناؤ" وہ چلائی تھی۔ سکندر نے آنکھوں ہی آنکھوں میں باریال کو اشارہ کیا۔ اس نے ایک بے بس سی نظر امن پر ڈالی۔ اور پھر تیز قدموں سے باہر نکل گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

لالہ کے لاکھ منع کرنے کے باوجود بھی ضیا خود اسے چھوڑنے اس کے گھر تک آیا تھا۔۔۔ گھر سے ایک دو گلیاں دور ہی وہ ایک دم رک گئی۔

"آگے میں خود چلی جاؤں گی تم جاؤ۔۔۔" اس کے ہاتھ سے اپنا سفری بیگ تقریباً چھینتے ہوئے اس نے کہا۔

"کیوں۔۔۔ کیا پرالیم ہے؟ ضیا کو برا لگا۔"

"گھر تک چھوڑ دیتا ہوں ورنہ یہ آوارہ لڑکے تو یہ کام کر کے ہی دیں گے۔" اس نے نکل پر لگے بجلی کے کھمبے کے سائے میں کھڑے چند اوباش نوجوانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جو انہی کی طرف متوجہ تھے۔ نظریں لالہ پر ہی جمی تھیں۔

"تم نہیں سمجھو گے ضیا۔۔۔ بس پلیز تم جاؤ۔۔۔ میں چلی جاؤں گی۔" وہ کوئی رسک نہیں لینا چاہتی تھی۔ ماں کے حوالے سے وہ ویسے بھی حساس تھی اوپر سے اس کی گلی کی کسی بھی خاتون نے اس طرح اسے ضیا علی خان کے ساتھ دیکھ لیا تو وہ جانتی تھی کیا کچھ ہو سکتا تھا۔ تماشا بننے ذرا دیر نہیں لگتی تھی۔ اور وہ بس اسی تماشے سے ڈر رہی تھی۔

"اچھا تم جاؤ، میں یہیں کھڑا ہوں۔" اس نے ہارمانٹے ہوئے کہا۔

"نہیں بالکل نہیں۔۔۔ تم جاؤ ضیا۔۔۔" وہ بضد تھی۔ ضیا نے ایک خفا خفا سی نگاہ اس پر ڈالی اور مڑنے ہی لگا تھا کہ ایک بایک زوردار آواز سے ان کے قریب آرکی تھی۔ لالہ کی سانسیں رک سی گئی تھیں۔ وہ شاہ ویز تھا جو یقیناً اسے اور ضیا کو دیکھتے ہی رک گیا تھا۔

"آجاؤ لالہ۔۔۔" کوئی اور بات کیے بغیر شاہ ویز نے لالہ کو کہتے ہوئے اس کا سفری بیگ اٹھا کر اپنے سامنے رکھا تھا۔ ضیا الجھی ہوئی نگاہوں سے شاہ ویز کو دیکھ رہا تھا۔ لالہ کی آنکھوں میں کھلتی شناسائی سے وہ اتنا سمجھ ہی گیا تھا کہ لالہ سے اس کا کوئی اہم رشتہ تھا۔ لیکن کیا۔۔۔ یہ بات اسے الجھا گئی کیونکہ اس کی معلومات کے مطابق لالہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھی۔

"گھر پر سب ٹھیک ہیں؟" لالہ نے بیٹھتے ہوئے شاہ ویز سے پوچھا تھا۔ ضیا علی خان کو وہ مکمل نظر انداز کر چکی تھی۔ وہ لب کاٹنے لگا۔

"ہاں سب ٹھیک ہیں۔" شاہ ویز نے نارمل لہجے میں جواب دیتے ہوئے بانیک آگے بڑھا دی تھی۔ لالہ نے ایک ترچھی نگاہ دور ہوتے ضیا پر ڈالی تھی۔ وہ مڑچکا تھا۔

☆.....☆.....☆

سارادن وہ خوشی خوشی دادو اور امی کو مری اور اپنے وزٹ کے متعلق بتاتی رہی تھی۔ شاہ ویز بھی موجود رہا تھا لیکن لالہ جانتی تھی امی اور دادو کے کے سوتے ہی وہ ضرور اس سے باز پرس کرنے کی سوچ رہا تھا۔ اس کا کھویا کھویا سوچوں کے جالی سے بھر اچہرہ دیکھتے ہوئے بھلے وہ امی اور دادی کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف رہی تھی۔ لیکن اندر ہی اندر اسے مطمئن کرنے کے بہانے ڈھونڈنے میں لگی رہی۔

رات کو اس کی توقع کے عین مطابق دادو اور امی کے کمرے میں جاتے ہی وہ اس کے کمرے میں چلا آیا تھا۔ وہ جواتنے دن ضائع ہونے کے خیال سے پڑھنے میں لگی تھی۔ اسے اپنے کمرے میں داخل ہوتا دیکھ کر بالکل نہیں چونکی تھی۔ شاہ ویز کچھ قدم کے فاصلے پر ہاتھ سینے پر باندھے سے اسے چپ چاپ دیکھنے لگا۔ لالہ منتظر تھی وہ سوال پوچھے لیکن وہ چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔

"تم جو بھی پوچھنا چاہتے ہو پوچھ سکتے ہو شاہ ویز۔۔۔" بالآخر اس نے پہل کی تھی اور بیڈ پر جا بیٹھی۔

"تم حق رکھتے ہو۔۔۔" وہ اسے دیکھتے ہوئے مسکرائی۔ وہ کرسی اٹھاتا اس کے قریب بیٹھ گیا۔

"میں یہ نہیں پوچھوں گا لالہ۔۔۔ کہ وہ کون ہے اور تم اس کے ساتھ کیوں آئیں۔" وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے نرم لہجے میں بولا۔

"لیکن میں اتنا ضرور کہوں گا تم جاتی ہو ہم اتنی چھوٹی سی بات کے بھی متحمل نہیں ہو سکتے۔" لالہ جانتی تھی وہ آگے کیا کہنے والا ہے۔ اس کا منہ بن گیا تھا۔

"تم اچھی طرح جانتی ہو ہمارے محلے کی عورتوں کو۔۔۔ زری نہ پھپھو (اصل میں جو اس کی خالہ تھیں مگر وہ لالہ کی طرح پھپھو ہی کہتا تھا) تک اس بات کی بھنک بھی پہنچی تو حمزہ اور۔۔۔"

"شاہ ویز پلیز۔۔۔" لالہ نے اس کی بات کاٹ دی تھی۔

"ایسا کچھ بھی نہیں ہے جو تم سمجھ رہے ہو۔ یہ صرف اتفاق ہی تھا کہ مجھے ایک کلاس فیلو کے ساتھ آنا پڑا پھر بھی تم جانتے ہو میں اس معاملے میں خود کتنی محتاط ہوں۔" وہ اٹھ کر سیٹ کی ہوئی کتابوں کو خواہ خواہ ہی ادھر ادھر رکھنے لگی تھی۔ یہ اس کے اندر کا انتشار تھا۔ شاہ ویز کو اس سے ہمدردی محسوس ہوئی۔

"اور پھر مجھ سے زیادہ بہتر کون جانتا ہو گا کہ ایک لڑکی کی عزت کس قدر ہلکی ہوتی ہے، پر سے بھی ہلکی۔۔۔ ہاتھوں پہ گلیوں، بازاروں میں پھونکوں سے اڑائی جاتی ہے۔" وہ تلخ ہوئی تھی۔

"تم ناراض ہو گئی۔۔۔" میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ "شاہ ویز اداسی سے بولا لالہ نے ایک نظر اسے دیکھا پھر اس کے قریب آتے ہوئے بولی۔

"نہیں شاہ ویز مجھے اچھا لگا کہ تم میرا خیال رکھتے ہوں۔ میری کیئر کرتے ہو۔" اس کا لہجہ اس کی سسٹائی کا عکاس تھا شاہ ویز مطمئن سا ہوا۔

"لیکن۔۔۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ شاہ ویز چونکا۔

"حمزہ اور مجھے ساتھ ملانے کی کوئی ضرورت نہیں۔۔۔ اس کے اور میرے درمیان زرینہ پھینکنا حوالہ بہت صاف ہے۔۔۔ اور بے حد اہم بھی۔۔۔" قطعی لہجے میں کہتی وہ اسے بے حد خفا خفا سی لگی۔ رشتوں سے اپنوں سے۔۔۔

"چلر تھک گئی ہوگی تم سو جاؤ۔" شاہ ویز نے جاتے ہوئے اس کا سر تھپتھپایا تھا۔

وہ بھی تھکے تھکے انداز میں مسکرا دی تھی۔

☆.....☆.....☆

وہ کافی دن بعد اس بنگلے پر آیا تھا۔ پھر بھی دروازے پر کھڑے گاؤ نے فوراً اس کے لیے دروازہ کھول دیا تھا۔ وہ گاڑی سیدھا گیٹ کے اندر لے گیا تھا۔ اندر پہلے سے دو گاڑیاں کھڑی تھیں۔ نہ جانے کیوں اس کے ماتھے کی شکنوں میں اضافہ ہوا تھا۔ انداز سے آتے تیز میوزک اور گھنگھر وؤں کے شور نے نہ جانے کیوں اس کی بیزار ی میں اضافہ کر دیا تھا۔ وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا اور پرہال کی طرف آیا تھا۔ نشست بھی تھی اور اس کی توقع کے عین مطابق ناچنے والی دو تین لڑکیوں میں ایک زمزمہ بھی تھی۔ لیکن اس کی چال ڈبیلی تھی باقی لڑکیوں کی طرح اس میں وہ چمک نظر نہیں آ رہی تھی جو پہلی دفعہ ضیا کی توجہ کا مرکز بنی تھی۔ اور اس کی وجہ بھی صرف ضیا ہی جانتا تھا۔ جب سے وہ زمزمہ کی زندگی میں آیا تھا۔ زمزمہ نے اس دلدل سے نکلنے کی امید باندھ لی تھی اور اسی امید کی وجہ سے اسے سیلن زدہ بدبودار کام کرتے ہوئے مزید مشکل ہونے لگی تھی۔ ہال کے دروازے پر کھڑی ہوشیاری سی ادھیڑ عمر عورت نے اسے خوش آمدید کہا تھا۔

"خانم کو بلاؤ۔" اس نے اندر جانے کے بجائے اسے حکم دیا۔ اور سگریٹ سلگاتا کھلے چبوترے پر آ گیا۔ اس کی توقع کے عین مطابق خانم چند لمحوں میں ہی اس کے آگے کھڑی تھی۔

جس علاقے میں وہ رہتی تھی یہاں اس قسم کا دھندلا زیادہ تر ہلکا ہی رہتا تھا۔ نشے کے عادی، چوراچکے اور کبھی کبھار ان کے شرفا اس طرف آ ہی نکلتے تو کچھ کمائی ہو جاتی۔۔۔ ایسے میں ضیا علی خان جیسے کسی لینڈ لارڈ کی اولاد کا آنا ان کی قسمت چمکا دیتا تھا۔ اسی لیے جب بھی وہ وہاں آتا تھا خانم کچھی کچھی جاتی تھی۔

"زہے نصیب زہے نصیب۔۔۔" ضیا ایک غصیلی نگاہ اس کے تہہ در تہہ میک اپ میں چھپے چہرے کو نکلتا اس کے نزدیک آیا۔

"میں نے منع کیا تھا جب تک میں یہاں آتا ہوں زمزمہ کسی اور کے سامنے نہیں جائے گی۔" سخت لہجے میں کہتا وہ آخری بات پرت چلا یا تھا۔

"حکم خان حکم۔۔۔" وہ کانپتی ہاتھ باندھ گئی۔

"آپ اتنے دن آئے ہی نہیں۔" نظریں جھکائے وہ آہستہ لہجے میں بول رہی تھی۔ لیکن ضیا اس کے باوجود اس کے دل میں چھپے لالچ کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔

"اور آپ کو تو پتا ہے خان یہاں دو دو دن تک ان دوشیزاؤں کے پانی جیسے شفاف حسن کو رقص اور موسیقی کی غذا نہ ملے تو گہنا جاتی ہیں۔۔۔ کائی زدہ تالاب کی طرح بے ڈھب لگنے لگتی ہیں۔" دانت نکالتے ہوئے وہ خباثت سے بولی تھی۔ ضیا نے بمشکل اس پر ہاتھ اٹھانے سے خود کو روکا تھا۔ وہ دو قدم آگے آیا تھا۔۔۔ اور خانم خوفزدہ ہو کر پیچھے۔۔۔

"زمزم چاہے گہنا جائے چاہے سب بھول جائے آئندہ یہ غلطی مت کرنا خانم۔۔۔" اس کی آنکھوں میں عجیب سے شعلے لپک رہے تھے۔ خانم پر لرزہ سا طاری ہونے لگا تھا۔

"جاؤ زمزم کو بھیجو یہاں۔۔۔" وہ مڑ کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا تھا۔ خانم سر ہلاتی تیزی سے باہر کی طرف بڑھ گئی تھی۔ چند لمحوں بعد وہی زمزم اندر آئی۔۔۔ اور تھکی تھکی سی صوفے پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گئی۔ اس نے ہمیشہ کی طرح ضیا خوش آمدید نہ کہا تھا۔ بس خاموشی سے پیروں سے بندھے گھنگر واتارنے لگی تھی۔ وہ دھیرے دھیرے چلتا اس کے قدموں میں آ کر بیٹھ گیا۔

"تھک گئی ہو زمزم۔۔۔" اس نے زمزم کے پسینے سے تر چہرے کو دیکھتے ہوئے نرمی سے پوچھا تھا۔

"نہیں خان بس لگتا ہے ٹوٹنے لگی ہوں۔" اس کی سیاہ کٹھور آنکھوں میں پانی بھلنے لگا تھا۔ ضیا اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں تمہیں خرید لوں گا زمزم۔۔۔ تمہیں ہمیشہ کے لیے اس دلدل سے دور لے جاؤں گا۔" وہ بولا تو زمزم بت بنی رہ گئی۔ تو کیا واقعی اسے زمزم کی مدد کے لیے خدا نے بھیجا تھا۔ اس کی دعائیں قبول ہوئیں تھیں۔

"میں باء جی سے بات کرتا ہوں وہ میری بات کبھی نہیں ٹالیں گے۔" وہ فیصلہ کرتے ہوئے باہر کی طرف بڑھا۔ زمزم اٹھ کھڑی ہوئی۔

"لیکن۔" خانم وہ پریشان لہجے میں پولی۔

"اس کا مسئلہ صرف پیسہ ہے اور ویسے بھی ضیا علی خان جو سوچ لے کر کر رہتا ہے۔

"So no worries" وہ باہر نکل گیا تھا۔ زمزم کا دل نہ جانے کیوں سجدہ شکر کے لیے چل رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

دو دن بعد ہی ابراہیم نے اوزگل اور گل مینہ کو سب بڑے بڑے کالجز کا وزٹ کروا دیا تھا۔ اور گل مینہ نے ایک اچھے کالج کو سلیکٹ کر کے ایڈمیشن بھی کروا لیا تھا۔ اوزگل اور گل مینہ تو بے حد خوش تھیں۔ لیکن ابراہیم۔۔۔ وہ اس ذمہ داری سے اکتانے لگا تھا۔ اوزگل

کی تو پھر بھی خیر تھی۔ سارا وقت گاڑی سے باہر جھانکتے دوڑتے بھاگتے مناظر کو تکتی رہتی لیکن اصل مسئلہ تھا گل مینہ۔۔۔

وہ سارا وقت بس اسے تکتی رہتی اور بیچارے ابراہیم حیات کے ہاتھ کانپتے رہتے۔ اسے اس خانزادی کی مڈر اور بے باک آنکھوں سے خوف سا آتا تھا۔ کبھی کبھی اسے لگتا تھا وہ ہر طرح کے اعتبار کے باوجود اس سنہری جھیل میں ڈوب مرے گا۔ نہ جانے کیوں وہ آس پاس ہوتی تو ایک سنہرا پن سا اسے اپنے گرد محسوس ہوتا۔ وہ کسی حصار میں خود کو جھکڑتا محسوس کرتا۔ وہ فوراً خود کو سنبھال لیتا۔ اسے گل مینہ کی نظروں میں بھی اپنا عکس نظر آیا تھا لیکن وہ اس کی طرح خود سے بھی ہر جذبہ چھپانے والی لڑکی نہیں تھی۔ اس کے اندر بغاوت سی تھی۔۔۔ عشق سی بے باکی۔۔۔ اور یہی چیز اس سے خوفزدہ کیے جاتی۔

اب بھی جب وہ داخلہ کرا کر واپس گھر جا رہے تھے تو گل مینہ نے اچانک ہی آئس کریم کی فرمائش کر دی تھی۔ وہ منع کرنا چاہتا تھا لیکن اس نے جب چلتی گاڑی کا ہی دروازہ کھول دیا تو چارونا چاراسے رکنا پڑا۔

"کیا کرتی ہو گل مینہ۔۔۔ ایسے کچھ ہو جاتا تمہیں تو؟" اوزگل نے دھک دھک کرتے دل کے ساتھ اسے ڈانٹا۔

"ہاں تو اس ڈائینور کی غلطی بنیں۔۔۔ یہ کیوں میری ایک بات نہیں سنتا۔۔۔" وہ منہ بتاتے ہوئے گاڑی سے اتری یہ دیکھے بغیر کہ ڈرائیور کے لفظ پہ ایک مرتبہ پھر ابراہیم کی آنکھیں سلگ سی اٹھی تھیں۔

"ایک مرتبہ بھائی آجائیں۔ اس ڈرائیور کی اور تو نوکری ہی ختم کروانی ہے میں نے۔۔۔" اس نے ابراہیم کو زبان ہوئے کہا اور آئس کریم کارنر کی طرف بڑھ گئی اوزگل کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس کے سر پر بالکل جی چادر کو سامنے سے کھینچ کر گل مینہ کو گھونگھٹ کر وا دے۔۔۔ شہر آتے ہی اس نے چادر سے چہرہ ڈھانپنا بالکل چھوڑ دیا تھا اور بالکل بے پرواہ سی ہو گئی تھی۔

اوزگل کو ابراہیم پر بھی ترس آتا تھا۔ جب سے گاؤں سے آئے تھے۔ وہ ہر جگہ ان کے ساتھ نہ صرف خوار ہو رہا تھا بلکہ گل مینہ کی ہر الٹی سیدھی حرکت بھی نظر انداز کرتا رہا تھا۔ اس سارے وقت میں وہ تقریباً خاموش ہی رہا تھا۔ سوائے کام کی بات کے جواب دینا بھی پسند نہیں کرتا تھا۔

"مجھے لگتا ہے آج مجھے باء جی کو فون کر کے تمہاری کچھ تو خبر دے دینی چاہیے ورنہ ساری حدود ہی بھول جاؤ گی تم۔۔۔ گاڑی میں واپس بیٹھتے ہی اوزگل نے اسے ڈرانے کی کوشش کی۔

"آپ کو یہ زحمت کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں آج خود ہی باء جی کو بتا دوں گی سب۔۔۔ اگر آج بھی ضیا لالہ نہ آئے تو دیکھنا میں کرتی کیا ہوں۔" الٹا وہ منہ بسور نے لگی تھی۔

ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ابراہیم کے لبوں پر بہت پیاری مسکراہٹ رینگ گئی تھی اور بالکل اسی وقت اس نے اپنے سامنے ضیا کی گاڑی کو رکھ دیکھا تھا۔

"لالہ۔۔۔" ضیا کو گاڑی سے اترتا دیکھ کر گل مینہ چیختے ہوئے گاڑی سے اتری اور بھاگ کر بھائی سے لپٹ گئی تھی۔ ضیا نے دایاں بازو بہن کے کندھے کے گرد پھیلا دیا تھا۔ ابراہیم بھی فوراً باہر آیا تھا اور گل نے بھی ان کی پیروی کی تھی۔

"بھائی شکر ہے آپ آگئے۔۔۔" ہمیشہ کی طرح گل مینہ فوراً اشارت ہوئی تھی۔ ابراہیم ضیا سے ہاتھ ملاتا وہیں ٹھہر گیا اور گل بس دونوں کو دیکھ کر رہ گئی اسے اب گل مینہ کے خاموش ہونے تک چپ ہی رہنا تھا۔

"ورنہ آپ کے اس ڈرائیور اور اس بڑی بہن۔۔۔" اوگل کو دیکھ کر بڑی بڑی آنکھیں مزید بڑی ہوئیں۔

"ان دانوں نے مجھے تنگ کر دیا تھا۔" بڑے مان سے شکایت کی گئی تھی ابراہیم کا منہ بنا اور ضیا کا قہقہہ بے ساختہ تھا

"آپ ہنس رہے ہیں۔" مینے کو غصہ آنے لگا۔

"ہاں کیوں کہ یہ میرا ڈرائیور نہیں، میرا دوست ہے ابراہیم حیات" اس نے ہنستے ہوئے وضاحت کی تھی۔ مینے نے چونک کر ابراہیم کی طرف دیکھا تھا۔ وہ بتاتی نظروں سے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

جب سے اسپتال سے آئے تھے، امن کی حالت نے انہیں پریشان کر کے رکھ دیا تھا۔ نہ وہ انہیں کچھ بنا رہی تھی نہ ہی وہ خود سمجھ پا رہے تھے۔ باریال بھی شاید امن کے رویے سے کافی ہرٹ ہوا تھا تبھی واپس نہیں آیا تھا۔

"امن کیا ہوا ہے بچے۔" وہ اس کی کمر سہلاتے ہوئے دوبارہ پوچھنے لگے۔ ٹڈھال سی ان کے سینے میں سر چھپائے وہ مسلسل سسک رہی تھی۔

"کچھ بتاؤ گی۔۔۔ تو میں کچھ حل نکال پاؤں گا ناں۔۔۔" وہ اس کے سر پر ٹھوڑی رکھے اسے سمجھا رہے تھے۔

"پاپا۔۔۔" اس نے بھیگا بھیگا چہرہ اٹھا کر انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔۔۔ وہ انگلیوں کی پوروں پر اس کے آنسو چننے لگے۔

"آپ تو نے کہتے تھے آپ کی امن اس دنیا کی سب سے خوب صورت لڑکی ہے۔" وہ ہنسیوں میں بولی۔

"میں اب بھی یہی کہتا ہوں میری جان۔۔۔ میری امن اس دنیا کی سب سے خوب صورت لڑکی ہے۔" انہوں نے ہاتھوں کے پیلے میں اس کو خوب صورت چہرہ لیتے ہوئے کہا۔ اپنی امن کو یوں بکھرا دیکھ کر ان کا اپنا دل پھنسا جا رہا تھا۔

"اور آپ نے یہ بھی کہا تھا کہ آپ کی پری کو کوئی نہیں ٹھکرا سکتا" وہ سسکی۔

"بالکل۔۔۔ مجھے اپنا ایک، ایک لفظ یاد ہے بچے۔" وہ اس کی صبح پیشانی چومتے ہوئے بولے

"لیکن ہوا کیا ہے امن؟" وہ سخت بے چین ہو رہے تھے۔

"اس نے مجھے ٹھکرا دیا پاپا۔۔۔ امن سکندر کو اس نے ٹھکرا دیا پاپا۔۔۔" وہ چلاتے ہوئے بولی اور ایک مرتبہ پھر پھوٹ پھوٹ

کے رودی۔۔۔ سکندر صاحب کچھ دیر خاموشی سے اس کی کمر سہلاتے رہے۔

"کون ہے وہ امن۔۔۔" حالانکہ انہیں پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی پھر بھی انہوں نے دھیمے لہجے میں پوچھا تھا۔

"باریال پاپا۔۔۔ باریال ولی خان۔۔۔" وہ اس کا نام بتاتے ان کے سینے میں سما گئی تھی۔ سکندر نے اسے خود میں سمیٹ لیا تھا۔

☆.....☆.....☆

تہہ خانے میں دن کے وقت بھی تقریباً اندھیرے کا راج تھا۔ یہ موٹی موٹی دیواروں سے بنے کمرے پر مشتمل تھا۔ جن کو سامنے سے جیل کے کمروں کی طرح باریک سلاخوں کے دروازوں سے بند کیا گیا تھا۔ پر کمر مربع کی شکل کا تھا اور بے حد تنگ۔۔۔ اس قدر کہ ایک آدمی اگر سیدھا لیٹتا اور پاؤں دوسری دیوار سے لگ جاتے۔ ہر کمرے کی ساخت اور اس میں گنجائش تقریباً ایک ہی تھی۔

ہر کمرے کی پچھلی دیوار میں دو تین پتلی لکیروں کے مانند روشن دان تھے۔ جو اس اندھیر نگری میں سورج کی چمکتی شعاعوں کو ملنے والا واحد راستہ تھے۔ شاہ سوار نے تہہ خانے کا دروازہ کھولا اور پھر تین چار ملازموں کو لیے اندر آیا۔۔۔ دروازہ کھلتے ہی روشنی نے جیسے پر طرف ڈیرا جمایا تھا۔ آنکھیں موندے لیے کچھ ترچھے ٹیڑھے بدن تیزی سے سیدھے ہوئے۔۔۔ اور کچھ آنکھوں پہ ہاتھ رکھے رخ پھیر گئے۔ سب اندر آنے والے باقی آدمی کھانے کی چھوٹی سی ٹرے ایک، ایک دروازے کے سامنے رکھتے گئے۔ شاہ سوار سیڑھیوں کے اوپر ہی کھڑا چونکا سا نہیں دیکھتا رہا۔ کھانا تقسیم ہو چکا تھا اب وہ سب آدمی کل والے برتن اٹھا رہے جو تقریباً خالی تھے۔ یہاں ناشتے کے بعد صرف ایک مرتبہ ہی کھانا دیا جاتا تھا، شام سے کچھ دیر پہلے۔ برتن اٹھائے ایک ایک کر کے وہ سب باہر جانے لگے۔ لیکن آخری آدمی شاہ سوار کے قریب آ کر رک گیا۔

"شاہ سوار خان۔۔۔ اللہ لوک نے کچھ نہیں کھایا۔" اس نے ہاتھ میں پکڑی ٹرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"تم جاؤ میں دیکھتا ہوں۔۔۔" اس سے پرسوج انداز سے دیکھتے ہوئے اسے جانے کے لئے کہا۔ دروازہ اندر سے بند کرتا وہ نیچے اتر آیا سیڑھیوں کے بالکل سامنے والا کمر اللہ لوک کا تھا اس کے لمبے سفید بال کھلے تھے اور چہرہ ان میں ڈھک سا گیا تھا۔۔۔ شاہ سوار نے کندھے سے لٹکی مشین گن اتار کر سائیڈ پر رکھی اور ٹرے اٹھا کر دروازے کے قریب آ گیا۔ والے لوگ امی نے میرے سے پکارا۔ میری طرف خاموش میگی۔

"اللہ لوک۔۔۔" اس نے دھیرے سے پکارا دوسری طرف خاموشی رہی تھی

"اللہ لوک۔۔۔ کھانا کھا لو۔۔۔" اس نے دربارہ آواز دی۔۔۔ اس بار اس نے سر اٹھایا۔ لمبے بال پیچھے ہوئے تھے، سفید نورانی چہرہ اندھیری کال کوٹھڑی میں جگمگایا تھا۔

"کھانا کیسے کھا لوں۔۔۔" ان کی گہری سبز آنکھوں میں آنسو تھے پڑی زدہ ہونٹ کپکپا رہے تھے۔

"بتا۔۔۔ وہ چلائی۔۔۔" کیسے کھالوں کھانا؟"

"مجھے سب نظر آنے لگا ہے۔" وہ چلاتے ہوئے بیٹھے بیٹھے یوں گھٹنوں یوں چل کر اچانک اس کی طرف بڑھی تھی جیسے کوئی کوئی ننھا بچہ crawl کرتا ہے شاہ سوار خوفزدہ ہو کے بے اختیار چند قدم پیچھے ہوا جب سائڈ پیدوار لگی کے ساتھ لگی مشین گن نہ جانے کیسے زمین پر گر پڑی تھی۔ اللہ لوک زمین پر بیٹھے بیٹھے ہی سلاخوں کے قریب آگئی تھی۔

"پکڑ ہوگئی ہے تم سب کی۔۔۔" وہ سلاخوں پر ہاتھ رکھے تھقبے لگانے لگی تھی۔ پھر اچانک ہی اس نے ٹرے اٹھا کر شاہ سوار پر اچھال دی تھی۔ سارا سالن اس پر گرا اس کے کپڑے خراب کر گیا تھا اللہ لوک مزید بلند تھقبے لگانے لگی۔

"جا جلدی سے کھانا کھالے۔" اسے ہاتھ کے اشارے سے جانے کا کہہ رہی تھی۔ لیکن وہ بت بنا وہیں کھڑا رہا۔۔۔ غصے سے اس کا وجود لرز نے لگا تھا۔

"اپنے خان کو بھی کھلا دے۔۔۔ جا۔۔۔ شو۔۔۔ شو۔۔۔" وہ ہاتھ کے اشارے سے کہہ رہی تھی۔ شاہ سوار چند لمحے اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورتا رہا پھر ٹرے کو لات رسید کرتا۔۔۔ گن اٹھاتا اوپر کی طرف بڑھ گیا۔ اللہ لوک کی چیختی آواز نے دروازہ بند ہونے تک اس کا پیچھا کیا تھا۔

☆.....☆.....☆

موسم بدل رہا تھا۔ فروری کے اواخر میں ہونے والی بے حد کم بارشوں نے جہاں بہار کو زندگی بخشی تھی۔۔۔ ہر جگہ سبزہ لہلہانے لگا تھا، خزاں رسیدہ ننگ دھڑنگ درخت برالباس اوڑھنے لگے تھے۔ وہیں مارچ کے شروع میں ہی سورج کی دھوپ نے وہ تمازت پکڑی تھی کہ اللہ، اللہ۔۔۔ بہار کا آغاز ہی موسم کا پتا دینے لگا تھا۔

آج حمزہ اسے لینے کا کالج نہیں آسکا تھا۔ وہ رکشے پر گھر تک آگئی تھی لیکن رکشے والا اسے مین روڈ پر ہی اتار کر چلا گیا تھا۔ اس نے کافی منتیں کیں لیکن وہ نالیوں والی گلیوں میں جانے کے لیے راضی نہ ہوا۔

مرتی کیا نہ کرتی کی تصویر بنی وہ تیز فھوپ میں گھر کی طرف پیدل چل پڑی۔ مارچ کے اوائل کے دن تھے اور دن کے ایک بجے یوں کڑکتی دوپہر کا سماں تھا۔۔۔ ہر طرف سہا دینے والی ویرانی تھی۔ اس کا گھر دو گلیاں آگے تھا۔ اور یہ دونوں گلیاں کافی لمبی تھیں۔ اوپر سے جگہ جگہ ابھری ہوئی سیمنٹ سے بنی نالیاں۔۔۔ اس کے پسینے چھوٹ گئے تھے۔

"اقرا تیز آواز پر جہاں قدم خود بخود رکھتے تھے۔ دل اتنا ہی تیز تیز دھڑکنے لگا تھا۔ وہ آغا تھا۔ اس کے تیز قدموں کو قریب آتاسن کر بھی وہ اس کی طرف نہ مڑ سکتی تھی۔

"یہ کیا بات ہوئی اقرار۔ اتنے دنوں سے تمہارے کالج کے چکر لگا رہا ہوں، بیرونی گلی کے کٹڑ میں کھڑا تمہاری راہ دیکھتا رہتا ہوں،

ایسی بھی کیا بات ہو گئی کہ تم مجھ سے پردہ کرنے لگی ہو۔" وہ اس کے قریب آتے ہی آہستہ آواز میں اس سے مخاطب ہوا تھا۔ اقرار نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا پھر ادھر، ادھر خالی گلی میں۔

"تم ابھی جاؤ آغا۔۔ کوئی دیکھ لے گا۔" اس کی آواز میں خوف تھا۔

"پھر کل نہر پر ملو گی؟" وہ اب بھی سرگوشی میں بات کر رہا تھا، اقرار جانتی تھی کہ وہ اس کی عزت کی پرواہ کرتا تھا تبھی اس وقت اس طرح آہستہ آواز میں بات کر رہا تھا۔۔ وہ کبھی اس کو یوں گلی میں نہ روکتا لیکن پچھلے ایک ماہ سے جس طرح اقرار اس سے چھپ رہی تھی اسے مجبوراً ایسا کرنا پڑا۔

"بولو اقرار۔ آؤ گی ناں نہر پر ملنے۔۔؟" وہ بہت بے قراری سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے دوبارہ پوچھنے لگا۔

"ہاں۔۔۔ ہاں آؤں گی۔ اب تم جاؤ۔۔۔" اقرار خود بھی گھبرا رہی تھی۔ اس وقت ہی حمزہ کے گھر آنے کا وقت ہوتا تھا۔ اور اگر وہ اسے آغا کے ساتھ دیکھ لیتا تو وہ جانتی تھی کہ یہ ان دونوں کے حق میں بالکل بہتر نہ ہوتا۔

"جاؤ آغا۔۔۔" وہ تیز تیز قدموں سے آگئے بڑھ گئی۔ آغا بھی بھاگ کر اس کا ہم قدم ہوا۔

"کل بریک کے وقت میں پچھلے گیٹ پر تمہارا انتظار کروں گا۔"

"کہاناں آ جاؤں گی، جا اب یہاں سے۔۔۔" وہ فوراً رکتے ہوئے بدتمیزی سے بولی تھی آغا مسکرا دیا۔

"ہاں اب آیا ناں یقین کہ تم ضرور آؤ گی۔" محبت سے اسے تکتا وہ دائیں طرف والی گلی میں مڑ گیا۔ اقرار نے ایک نظر دوبارہ آگے پیچھے گلی میں ڈالی گلی ویران تھی مطمئن سی سانس لیتی وہ سامنے والی گلی میں داخل ہو گئی۔

☆.....☆.....☆

امن اسپتال سے گھر آ گئی تھی لیکن پچھلے ایک ہفتے سے وہ آفس نہیں آرہی تھی سکندر صاحب بھی اس تمام عرصے میں اس کے ساتھ رہے تھے۔ آفس کی تمام تر ذمہ داریاں باریال سنبھال رہا تھا۔ دوہ چاہ کر بھی امن کی عیادت کو نہ جاسکا تھا۔ اسپتال میں اس کا رویہ دیکھ کر اس کا خیال تھا کہ امن دوبارہ کبھی اس کا چہرہ نہیں دیکھنا چاہے گی۔

وہ کہیں کمیڈ نہیں تھا لیکن پھر بھی نہ جانے کیوں دل تھا کہ اس فیصلے پر آمادہ نہیں تھا۔۔۔ اور وہ اس معاملے میں سراسر دل کی مرضی چاہتا تھا۔ امن ایک اچھی لڑکی تھی۔ ایک سمجھدار شخصیت۔۔۔ لیکن اس کے لیے وہ ہمیشہ ایک اچھی اور مخلص دوست رہی تھی۔ اس رشتے سے بڑھ کر باریال نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا اور اب جب سوچنا چاہتا تھا تو دل راضی نہیں تھا۔ اس وجہ سے وہ دوبارہ امن کے سامنے ہی نہیں گیا تھا۔ اس نے پوری ایمانداری کے ساتھ ان دونوں کی غیر موجودگی میں تمام تر ذمہ داریاں بخوبی سرانجام دیں۔۔۔ اب بھی وہ سائٹ کا راؤنڈ لگا کر آفس پہنچا تھا۔ جب سر سکندر کی سیکرٹری نے ان کی آمد اور باریال کو اپنے آفس میں بلانے کی اطلاع دی تھی۔ اس نے کچھ

ضروری فائلز اٹھائیں اور سیدھا ان کے کمرے میں چلا آیا۔

"امن کیسی ہے سر۔۔۔؟" رسمی سلام دعا کے بعد اس نے فوراً پوچھا۔۔۔ سر سکندر نے سر اٹھا کر ایک گہری نگاہ اس کے وجود

پر ڈالی۔

"بیٹھو یا ریال۔۔۔" انہوں نے اسے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ سر ہلاتا بیٹھ گیا۔

"تمہیں کیا لگتا ہے من کو کیسا ہونا چاہیے؟"

دونوں ہاتھوں کی مٹھی بنا کر ان پر ٹھوڑی رکھ کے بغور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے انہوں نے سوال کیا تھا۔ بار ریال کو ان کے

انداز اور سوال پر حیرت ہوئی۔

"میری اس سے بات نہیں ہوئی سر۔۔۔" اس نے خود کو کمپوز کرتے ہوئے جواب دیا تو اس کی شخصیت کا ازلی ٹھہراؤ بے حد واضح تھا۔

"آپ کا فون، گھر کے نمبر بھی کئی دفعہ ٹرائی کیے لیکن نہیں مل پائے میں یہی سمجھا کہ آپ اسے وقت دے رہے ہیں تبھی۔۔۔"

اس نے بات مکمل کر کے جملہ چھوڑ دیا تھا۔

"تبھی تم اس کی خیریت دریافت کرنے گھر تک نہیں آئے؟" بار ریال کو لگا وہ ناراض تھے۔

"اس دن اسپتال میں آپ نے امن کاری ایکشن دیکھا تھا سر۔۔۔ بس میں اسے پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کے لہجے میں

سچائی تھی۔ وہ سیدھا سر سکندر کی آنکھوں میں دیکھ کے بات کر رہا تھا۔ اور سر سکندر نے دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں صرف اطمینان تھا۔۔۔

کوئی ملال کوئی افسوس نہیں۔۔۔

"تمہیں ذرا بھی احساس نہیں بار ریال یہ جو بھی ہوا تمہاری وجہ سے ہوا۔۔۔" وہ ذرا سا سا آگے کو جھکے۔۔۔ بار ریال نے ایک

گہری سانس لی۔ جیسے کہہ رہا ہو بالآخر آپ کو بھی پتا چل گیا۔

"سر۔۔۔ میرے خیال میں تو آپ بھی مجھے اس معاملے میں بالکل بھی بلیم نہیں کر سکتے۔۔۔" وہ صاف گوئی سے بولا۔

"بے شک آپ امن سے کلیئر کر لیں۔" اس کی بات پر کچھ پل اسے یونہی خاموشی سے دیکھتے رہے۔

"وہ تم سے بہت محبت کرنے لگی ہے بار ریال۔۔۔" کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے انہوں نے کمزور لہجے میں جیسے اپنی

بٹی کی غلطی کا اعتراف کیا تھا۔

"اور تم جانتے ہو میں امن سے کس قدر محبت کرتا ہوں۔" وہ ان کی بات کے جواب میں کچھ نہ کہہ پایا۔ چپ چاپ ان کو دیکھتا

رہا۔ جیسے ان کی اگلی بات کا منتظر ہو۔

"میں نے اس دنیا کی ہر خوشی پائی ہے، امن وہ واحد ہستی ہے جس نے میری کائنات مکمل کر دی۔ جس کے بعد مجھے زندگی میں کسی

بھی رشتے کے بچھڑنے کا دکھ نہ توڑ پایا۔ اب تم بتاؤ یا ر۔۔۔ میں اسے یوں ٹوٹا، بکھرتا کیسے دیکھ سکتا ہوں۔ وہ ہمیشہ والے دوستانہ لہجے میں

اس سے مخاطب تھے اب باریال کو ان کی حالت پر افسوس سا ہونے لگا۔

"کیا کچھ فیصلے دوسروں کی خوشی کیلئے نہیں کیے جاسکتے۔۔۔؟" انہوں نے اس کی طرف جھکتے ہوئے منت کرتے ہوئے پوچھا۔

"میں نے امن سے بھی یہی کہا تھا سر کہ مجھے سوچنے کے لیے وقت چاہیے۔ اور اب آپ سے بھی یہی گزارش کروں گا۔" وہ دونوں ہاتھوں کی پونٹز فنگرز ملا کر لبوں پر رکھتے ہوئے بولا سکندر نے اس کی اس ادا کو بہت جذب سے دیکھا تھا۔ اس وقت وہ انہیں بے حد معصوم اور کھرا سا شخص لگا۔ انہوں نے خود کو باور کرایا تھا اس لمحے۔۔۔ امن کو باریال کی اسی ادا سے محبت ہوئی ہوگی۔

"کئی ایسے وقتی فیصلے جو صرف دوسروں کی خوشی دیکھ کے کیے جاتے ہیں۔ بعض اوقات اس وقت کافی مہنگے پڑ جاتے ہیں جب قدرت آپ کی اپنی خوشی آپ کے سامنے لا کر رکھ دیتی ہے۔" اس کی بات میں وزن تھا وہ لا جواب ہوئے تھے۔

"تمہیں حق ہے جتنا چاہو وقت لو۔۔۔ لیکن۔۔۔" وہ اٹھنے لگا جب انہوں نے بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"تم جانتے ہو جواب کیا ہونا چاہیے ورنہ؟" وہ اس بار قدرے روکھے خشک لہجے میں بولے۔ باریال نے حیرت سے ان کے بدلے انداز اور دیکھا۔

"ورنہ۔۔۔؟" اس کی آنکھوں میں کوئی تاثر چمکا تھا لیکن سر سکندر نہ سمجھ سکے تھے۔ وہ خفگی کا تھا یا غصے کا۔۔۔

"ورنہ آفس آنے کی ضرورت کی" انہوں نے تلخ لہجے میں کہتے ہوئے اسے جانے کا اشارہ کیا تھا۔ باریال کے چہرے پر گہری مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ پہلے امن نے اور اب سر سکندر نے اس کے لیے فیصلے کو آسان کر دیا تھا۔ وہ سر ہلاتا آفس سے باہر نکل گیا۔

☆.....☆

جب سے ضیا واپس آیا تھا۔۔۔ اس نے ابراہیم کو دوبار نہیں دیکھا تھا۔ ضیا بالکل باء جی کی طرح ہی ان دونوں کا خیال رکھتا۔ اسے کالج خود ڈراپ کرنے جانا اور واپسی پر اکثر کسی گارڈ کو بھیج دیتا۔ کالج جاتے وقت تو وہ ہمیشہ مایوس ہی ہوتی لیکن کالج سے آنے کے وقت وہ دعا کرتی کہ کسی طرح ضیا لا لہ ابراہیم کو بھیج دیں۔ اور ہمیشہ ابراہیم کی جگہ گارڈ کے ساتھ اوزگل یا بی جان کو دیکھ کر اس کا دل سلگ اٹھتا ابراہیم تو جیسے اس کی طرف آنے والا ہر راستہ ہی بھول گیا تھا۔

وہ تو اسے صرف اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے اسے چھیڑتی رہتی تھی۔ اور اسے لگا تھا وہ چھیڑنے کے بجائے اس سے بری طرح چڑ گیا تھا۔ تبھی اس نے دوبارہ اس کے گھر کا رخ نہیں کیا گیا تھا۔

وہ ایک صاف، اجلا دن تھا، عجیب سی بوریٹ چھائی تھی طبیعت پتھی اس نے کالج سے بھی چھٹی کر لی تھی، اوزگل کو ناولز میں مصروف دیکھ کہ وہ نیچے پچھل طرف بنے سر سبز لان میں آگئی۔۔۔ لان بے ترتیب تھا۔ بہار کی بارشوں سے نالٹے قد کی ہری پیلی جھاڑیاں سارے لان میں پھیل چکی تھیں۔ جن پر کاسنی لہو رنگ زرد پھول لگ چکے تھے، درختوں نے بھی اس قدر شاخیں نکالی تھیں کہ اندازہ لگانا مشکل ہو رہا تھا کہ کون سا پیڑ کہاں شروع ہو رہا ہے کہاں ختم۔۔۔

سب کے پتے شاخیں آپس میں گڈ مڈ تھیں جیسے ہری بھری نرم گھاس کافی اوپر آگئی تھی۔ اس نے ل چپل اتاری اور ننگے پیر گھاس پر چلنے لگی۔ ٹھنڈی نرم گھاس نے اسے ایک دم شانت کر دیا تھا۔

"حیرت ہے۔۔۔ گھر کے سب سے پیارے حصے کا ہی کسی کو ہوش نہیں۔۔۔" لان کے بیٹوں بیچ ہاتھوں کو پھیلاتے ہوئے اس نے خود سے سرگوشی کی۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے نے سب پودوں کو بد مست سا کیا تھا۔ وہ بھی ان کے ساتھ جھوم اٹھی تھی۔

"لوگ بارش میں ایسے جھومتے ہیں۔۔۔" اوزگل اچانک ہی وہاں اسے ڈھونڈتی تو اسے یوں جھومتا دیکھ کر مسکرا دی۔

"کوئی تمہیں ایسے میں خشک موسم میں جھومتا دیکھے گا تو پاگل سمجھے گا۔" اس نے مینے کو چڑایا۔

"تمہیں میں پاگل نہیں لگتی گل۔۔۔؟" اس نے دوپٹہ ہوا میں اچھالا تھا یوں جیسے بادبانی کشتیوں کے ملاح ہوا کے زور پر کشتی حوالے کرتے بادبان کھولا کرتے ہیں۔

"بالکل لگتی ہو۔۔۔" اوزگل کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔

"لیکن یہ تو پتا چلتے تمہیں ہوا کیا ہے؟" وہ شرارت سے دائیں آنکھ دباتے ہوئے بولی۔

"سچ بتا دوں۔۔۔؟" مینے دھیرے دھیرے اس کے قریب آئی تھی ہوانے اس کا آنچل سنبھال رکھا تھا اس کے کھلے بال بھی ہوا پر

رقص کر رہے تھے اور اس کے چہرے کی معصومیت پر کوئی نور سا حاوی ہوا جاتا تھا۔ وہ چند لمحے بہن کے معصوم حسن کو تکتی رہ گئی۔

"مجھے محبت ہوگئی ہے اوزگل۔" اس کے یا قوتی لبوں نے مسکراہٹ سجاتے اعتراف کیا تھا۔ اوزگل نے گہرا کر بے اختیار رد و قدم

پیچھے ہو کر ارد گرد دیکھا تھا گل مینہ دوبارہ ہوا کے ساتھ ساتھ جھومنے لگی تھی۔

"گل مینہ کو محبت ہوگئی ہے۔" اس نے پشتوں میں لگناتے ہوئے کہا تھا۔ اوزگل نے موت اور اس کی پچھلی پیری کی آہٹ سنی تھی۔

☆.....☆.....☆

وہ جب سے یونیورسٹی واپس آئی تھی، نمرہ اسے خود سے کچھ کھنچی کھنچی محسوس ہوئی تھی کلاس میں بھی وہ اس کے ساتھ بیٹھنے کے

بجائے دوسری سیٹ پر بیٹھ گئی، اور کلاس ختم ہونے کے بعد بھی وہ یوں منظر سے غائب ہوئی تھی کہ لالہ اسے ڈھونڈتی رہ گئی تھی۔

وہ جب سے مری سے واپس آئے تھے لالہ نے اسے کئی بار کال کرنے کی بھی کوشش کی تھی لیکن ہر بار یا تو وہ کال کاٹ دیتی یا فون

ہی بند ملتا۔۔۔ لالہ نے سوچا تھا وہ کہیں بڑی ہوگی مگر یونیورسٹی آنے کے بعد اسے لگا تھا نمرہ اس سے بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اسے مری

میں ہونے والی اپنی اور نمرہ کی لڑائی یاد تھی لیکن وہ اتنی بڑی بات بھی نہیں تھی کہ وہ اور نمرہ مراد سے یاد رکھ کے روٹھے رہتے۔ ان کی دوستی اتنی

کمزور تو نہیں تھی۔۔۔ لیکن نمرہ کا رویہ اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ ایک، دو، دو تو وہ اسے اپنا وہم سمجھی تھی لیکن پھر وہ سمجھ گئی تھی نمرہ اس سے واقعی

ناراض تھی۔ اور بے حد ناراض تھی اور اسے ہر حال میں نمرہ کو منانا تھا۔

وہ ابھی میٹیم بسم کا پیر یڈ لے کر فارغ ہوئے تھے۔ نمرہ نے کلاس مس کر دی تھی اور لالہ اٹھنے کرنے کے باوجود اہم پوائنٹس مس کر گئی

تھی جب کہ ماڈرن فزکس اس کا فیورٹ ٹاپک تھا۔ پھر بھی آج کلاس میں اس کا دل بالکل نہیں لگ رہا تھا۔ پیریڈ ختم ہوتے ہی وہ نمبر کو ڈھونڈتی ڈیپارٹمنٹ کے پچھلے لان کی طرف آئی تھی۔ یہاں سے ایک خوب صورت کشادہ سڑک پیچھے فاسٹ کالج تک جاتی تھی۔ جس کا کچھ ایریا ان کی یونیورسٹی سے بھی متصل تھا یہ حصہ کافی سربز تھا اور اونچے گھنے درختوں پر مشتمل تھا۔ اگر سکے، اکثر لڑکے لڑکیاں پیریڈ ختم ہوتے ہی خود کو فریش کرنے اس طرف آنکلتے تھے۔ اس نے پیریڈ ختم ہونے کے بعد نمبر کو اس طرف جاتے دیکھا تھا لیکن اب وہ اسے کہیں بھی دکھائی نہیں دی رہی تھی۔ لالہ کی متلاشی نظریں چار سو اسے تلاش کر رہی تھیں اور پھر کچھ دیر بعد ہی وہ اسے ضیا کے گروپ کے ساتھ کھڑی دکھائی دی تھی۔ لالہ کو دیکھتے ہی وہ تیزی سے ان سے ایکسکیوز کرتی دوسری طرف نکل گئی۔ ضیا نے بھی لالہ کو دیکھ لیا تھا اور دور سے ہاتھ ہلا کے اسے متوجہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ جسے وہ مکمل طور پر نظر انداز کر کے نمبر کی طرف بھاگی تھی

"نمبرہ۔۔۔ رو پلیز بات تو سنو۔۔۔" اس کے قریب پہنچتے ہی اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔ نمبرہ رک گئی۔ لالہ کو اس کی نگاہوں میں سرد مہر اثر حیران کر گیا۔

"تم اتنی ناراض ہو جاؤ گی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی یار۔۔۔" اس نے بنا کوئی شکایت کیے فوراً ایک مان سے کہا تھا۔

"میں بھی کہاں سوچ سکتی تھی لالہ۔۔۔" نمبرہ کا سرد سا لہجہ اسے حیران کر گیا تھا۔

"کیا۔۔۔ کیا مطلب نمبرہ۔۔۔؟" اب کی بار وہ چڑ گئی۔

"مطلب۔۔۔" وہ دو قدم چل کر اس کے قریب آئی۔

"مطلب تو تمہیں پتا ہونا چاہیے۔۔۔ تم ہی بھول گئیں لالہ اپنی کی ہوئی بات۔۔۔" وہ طنزیہ مسکرائی۔

"کون سی بات۔۔۔" لالہ نے بھنویں اچکائیں۔

"یہی کہ اگر کبھی میں نے تمہیں اور ضیا کو ایک ساتھ جوڑنے کا ذکر کیا تو ہماری دوستی ختم۔۔۔"

"ہاں، تو۔۔۔؟" وہ اب بھی نا سمجھی سے اسے دیکھ گئی۔

"تو تم نے تو کافی پی لی ضیا کے ساتھ۔" اس کے اگلے جملے نے لالہ کے ہوش اڑا دیے تھے۔

"دوستی بھی اچھی خاصی ہو گئی۔ مطلب تم اور ضیا ایک دوسرے سے جڑ گئے۔" لالہ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ وہ کیا کہہ رہی ہے۔

"اور اسی لئے لالہ اب میں کہتی ہوں ہماری دوستی ختم۔۔۔" تلخی سے کہتی وہ اسے بت بنا چھوڑ کر کینیٹین کی طرف بڑھ گئی۔ لالہ کتنی ہی دیر اپنی جگہ پر ساکت کھڑی رہی۔

اس کا وجود جیسے برف کے مجسمے میں بدل گیا تھا۔۔۔ بے حس۔۔۔ ٹھنڈا ٹھار۔۔۔ موت کا سا سرد وجود۔۔۔

☆.....☆.....☆

اقرا چائے لے کر کمرے میں آئی تو حمزہ ٹیبل پر رکھے لیپ ٹاپ پر کچھ دیکھ رہا تھا۔ وہ اس قدر بڑی تھا کہ اقرائے آنے کا بھی پتا

نہیں چل سکا تھا اسے۔ اقرار کپ اس کی ٹیبل پر رکھنے لگی تو اس کی نگاہ لیپ ٹاپ کی اسکرین پر پڑی وہاں لالہ کی تصویریں مختلف فیملی ممبرز کے ساتھ تھیں۔ جو ایک، ایک بدل جاتیں۔ حمزہ کے چہرے پر بہت پیاری مسکان چل رہی تھی۔

اقرار نے کچھ دیر اسے یونہی مسکراتا دیکھا۔ پھر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ بری طرح چونکا۔

"بھائی۔۔۔"

"اقرار۔۔۔ تم کب آئیں۔۔۔" وہ فوراً لیپ ٹاپ بند کر گیا۔

"یار ناک ہی کر دیا کرو، وہ منہ بناتے ہوئے بولا اقرار کو ہنسی آئی۔

"شکر کریں میں ہوں امی نہیں آگئیں۔" اس نے حمزہ کو مزید ڈرایا وہ مسکرا کر چائے پینے لگا۔

"ویسے بھائی ایک بات کہوں؟"

"ہاں بولو۔۔۔"

"آپ کو نہیں لگتا آپ کو لالہ کا خیال چھوڑ دینا چاہیے۔؟" حمزہ کے ہاتھ سے جانے کا کپ چھلک گیا تھا۔ اقرار دوپٹے سے ہی اس کی شرٹ صاف کرنے لگ گئی۔

"میں جانتی ہوں بھائی آپ کو لالہ بہت اچھی لگتی ہے لیکن کیا آپ کو نہیں لگتا کہ امی تو اب لالہ کو برداشت نہیں کر پاتیں۔۔۔ سوچیں

اگر آپ کی شادی لالہ سے ہو جاتی ہے تو امی نے لالہ کا جینا حرام کر دینا ہے۔" اس کی بات میں اس قدر سچائی تھی کہ حمزہ کچھ بول ہی نہیں پایا۔

"پتا ہے میرا دل کیا کرتا ہے۔" اقرار اس سامنے دوزانو ہو کے زمین پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"بھائی آپ کو لالہ ہی ملے لیکن امی کے لیے میرا دل کرتا ہے۔ رضیہ خالہ کی بیٹی شزا جیسی بہو آئے۔ تب امی کو اچھے برے کا فرق

پتا چلے گا۔" اس کی بات پر حمزہ کو ہنسی آگئی۔

"توبہ ہے اقرار کتنا برا سوچتی پوتم" وہ ہنستے ہوئے بولا۔

"سچ کہہ رہی ہوں بھائی۔ یقین کریں اب بھی اس کے نام کا لیکچر سن کر آرہی ہوں۔ لالہ سے اوڑھنا پہننا سیکھو ادائیں دکھانا

سیکھو توبہ۔۔۔ امی کی باتیں۔۔۔ وہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بتانے لگی حمزہ کی ہنسی کو ایک دم بریک لگی۔

"لالہ بیچاری تو امی کو فائدہ تک نہیں کہتی لیکن امی ان کا اور سبین مامہ کا پیچھا ہی نہیں چھوڑتیں۔" وہ سگی ماں سے کس قدر بدظن تھی۔

حمزہ نے دل میں سوچا اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

"تم یہ سب مت سوچا کرو۔ جاؤ اب تیاری کرو۔۔۔ رات کو جانا ہے ناں نانو کے گھر۔۔۔ دیر ہوگئی تو پھر مامی ناراض ہوں گی"

اس کی بات پر وہ سر ہلاتی نکل گئی حمزہ کتنی دیر اس کی باتوں کو سوچتا رہا۔

☆.....☆.....☆

باریال نے دیدے سے کچھ نہیں چھپایا تھا۔ سب بتا دیا تھا۔ دیدے نے ہمیشہ کی طرح اس کا ساتھ دیا تھا۔ یہ ان کی تربیت کا ہی
تو اثر تھا کہ باریال نے اپنا سودا نہیں کیا تھا۔ رشتے سودا کب ہوتے ہیں۔
لیکن دولت، شہرت یہ کب کسی رشتے کی مضبوط بنیاد بن پاتے ہیں۔

اس نے واقعی سچے دل سے سوچنے کے لیے وقت مانگا تھا۔ وہ امن کے متعلق کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے خود کو مکمل وقت دینا
چاہتا تھا۔ لیکن امن اور اس کے بعد سرسندر نے اسے امارت کے پلڑے میں تول کر اور اپنا محتاج جان کر جیسے مٹی کا کر دیا تھا تبھی اس نے اس
بار خود کوئی بھی جاب نہ کرنے کا فیصلہ لیا تھا۔ وہ کوئی چھوٹا موٹا کاروبار شروع کرنا چاہ رہا تھا اور اس بات میں اسے دیدے کی مکمل حمایت
حاصل رہی تھی۔

ہوم ورک تو پہلے ہی شروع کر رکھا تھا۔ زمین، بلڈنگ کا نقشہ سب وہ decide کر چکا تھا۔ اب صرف فریم ورک باقی تھا اور
اسے کچھ اور مخلص لوگوں کی تلاش تھی۔۔۔ جو اس کی طرح ہی محنت اور لگن سے کام کریں۔۔۔ اور اسے یقین تھا۔۔۔ وہ بہت جلد اپنے
مقصد میں کامیاب ہونے والا تھا۔

☆.....☆.....☆

لالہ کی تیز آواز نے سارے گھر کو سر پر اٹھا رکھا تھا سین تو ہمیشہ کی طرح چپ کی چادر اوڑھے کچن میں مصروف تھی۔ نانوا البتہ اس
کے ساتھ خوب دماغ کھپا رہی تھیں۔۔۔

"لالہ بچے اتنا غصہ نہیں کرتے۔۔۔" انہوں نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔
"غصہ۔۔۔ دادو میرا دل کر رہا ہے میں سارے گھر کو تھس تھس کر دوں۔۔۔" وہ مزید بل کھا گئی۔
"تم تو بالکل اپنے دادا پر چلی گئی ہو۔۔۔" دادو کے لہجے میں شرارت سی جاگی۔

"سچ غصے میں تمہاری طرح ہی پیارے لگتے تھے۔" ان کی اگلی بات پر موبائل پر مصروف شاہ ویز کا قبہ بے ساختہ تھا۔ لالہ نے
اسے گھورا۔ وہ کان کھجاتا دوبارہ موبائل میں مصروف ہو گیا۔۔۔

"مجھے بہلائیں مت دادو۔۔۔ ضرورت کیا تھی ان لوگوں کی دعوت کی۔" وہ نزوٹھے انداز میں بولی۔
"ہر دوسرے دن آتو جاتیں ہیں دل جلا نے پھچھو"

"بری بات لالہ۔۔۔" ہمیشہ کی طرح سین نے اسے فوراً ٹوکا تھا۔

"یہی ہمت ذرا ان کے سامنے بھی دکھا دیا کریں ناں امی۔۔۔ انہیں تو کبھی نہیں ٹوکتیں آپ۔" وہ فوراً تلخ ہوئی۔
"زیرینہ پھچھو کا غصہ تم ہی پہ کیوں نکال لگتی ہو؟" شاہ ویز چڑتے ہوئے بولا

"تو غلطی بھی تو امی ہی کرتی ہیں ناں انہیں مزہ آتا ہے جب پھپھو میری انسٹ کرتی ہیں۔۔۔ بار بار مجھے یاد دلاتی ہیں کہ میں ایک۔۔۔" سین کے ہاتھ سے چیخ چھوٹ کر گرا۔

"لالہ۔۔۔" وہ شاید بہت کچھ کہہ جاتی روانی میں اگر شاہ ویز ٹوک نہ دیتا۔

"تم کمرے میں بند رہنا یا چھت پر چلی جانا۔۔۔ لیکن یوں سب سے بد تمیزی کرنا تمہیں زیب نہیں دیتا بچے۔۔۔" دادو نے محبت سے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"آپ سب مجھے ہی غلط کہتے رہیں گے، میرا تو کسی سے بات کرنا ہی فضول ہے۔" وہ پیر پختی اندر چلی گئی۔۔۔ اور وہ سبھی جانتے تھے صرف اس معاملے میں وہ ضدی بچی بن جاتی تھی ورنہ ان کی لالہ بے حد سمجھدار تھی۔

☆.....☆.....☆

محفل کا آغاز تو بے حد خوبصورت تھا۔ سب گھر والے اتنے دنوں بعد ایک ساتھ۔۔۔ پرانی پادیں تو کبھی نئے خواب ایک دوسرے سے شیر کر رہے تھے۔ لیکن زرینہ موجود ہوں اور لالہ ان کے طنز سے بچ جائے یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اب بھی وہ سب شام سے ذرا پہلے ہی وہاں پہنچ گئے تھے۔ لالہ کچھ دیر بعد ہی ان کے لیے چائے اور لوازمات لیے آئی شیفون کی گلابی شلوار قمیض پر گولڈن کلر کا دوپٹہ شانوں پر اچھی طرح سے پھیلائے وہ کسی افسر کا سا روپ اوڑھے لگ رہی تھا۔ زرینہ نے ترچھی نظروں سے بیٹے کی طرف دیکھا۔ وہ ان کی توقع کے عین مطابق لالہ کی طرف ہی متوجہ تھا۔ وہ لالہ سے اس کی یونیورسٹی کے بارے میں پوچھنے لگا۔ لالہ بھی اسے تفصیل بتانے لگی۔

"لالہ۔۔۔" زرینہ نیگم نے اچانک ہی اسے پکارا تھا

"جی پھپھو۔۔۔" وہ فوراً ان کی طرف مڑی تھی۔

"کیا یونیورسٹی بھی ایسے ہی بن ٹھن کر جاتی ہوڑ کی؟" سب کے منہ کا ذائقہ کڑوا ہوا تھا۔ زرینہ کو نہ جانے کیوں چین نہ پڑتا تھا جب تک سب کا چین غارت نہ کر دیتیں حمزہ نے بد دلی سے کپ ٹیبل پر رکھا تھا۔

"بالکل" لالہ نے تیز آواز میں کہا۔ سین بچاری اشارہ کرتی رہ گئیں۔

"بلکہ اس سے بھی زیادہ بن ٹھن کے جاتی ہوں۔" وہ تو جیسے سارے بدلے چکانے پر اتر آئی تھی۔

"دادو کو تو خوشی محسوس ہونے لگی۔ سین کے البتہ پسینے چھوٹ گئے۔

"دیکھ لیں اماں۔۔۔ شرم حیات اس لڑکی کو چھو کر نہیں گزری۔" زرینہ اسے دودھو ہوتا دیکھ کر نا نو کی طرف مڑیں۔

"ہاں تو تجھے کس نے روکا ہے۔ تو ہی کر لے ذرا شرم۔۔۔" اماں تو پہلے ہی بھری بیٹھی تھیں فوراً بولیں۔

"تیل لگائے بغیر تو تجھے چین نہیں آتا۔" اماں واقعی غص

"تم اماں بس میرا ہی منہ بند کرواتی رہنا کل کو آئے گی ناں کہیں منہ کالا۔۔۔ تب روتی رہنا۔" اماں کا تو دل دہل گیا۔

"تیرے منہ میں خاک زرینہ۔" ان کا بس چلتا تو واقعی مٹی اٹھا کر ان کے منہ میں ڈال دیتیں لالہ کی برداشت بھی بس یہی تک تھی، وہ اٹھنے لگی چھت پر ٹھک ٹھک کی زوردار آواز نے سب کی توجہ کھینچ لی۔

"لالہ بیٹا ذرا دیکھو تو شزا ہوگی۔" سین نے فوراً موقع کا فائدہ اٹھا کر اسے کام دیا تھا۔ وہ تلخ نظروں سے زرینہ کو تکتی اوپر آگئی۔ "میں ذرا بھا بھی کود دیکھ لوں کیا بنایا ہے اماں؟" اماں کا بگڑا منہ دیکھ کر زرینہ نے بھی پکچن کی راہ لی تو حمزہ کو جیسے موقع ہاتھ آیا تھا۔ وہ نانو کو بتا کر اوپر چھت پر آ گیا۔ شام کے سائے گہرے ہونے لگے تھے ہر طرف اندھیرا پر پھیلا نے لگا تھا۔ سامنے ہی منڈیز کے اس پار لالہ اور اس پر تیز مزاج شزا اٹھ رہی تھی۔

حمزہ نے کچھ دیر اپنے گرد چھائے اندھیرے کو محسوس کیا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ چلتا لالہ کے قریب آٹھرا تھا۔ "حمزہ۔۔۔" شرا سے یوں اچانک کے سامنے دیکھ کر ایک دم کھلی تھی، لالہ نے بھی چونک کر اسے دیکھا تھا۔ وہ لالہ کے مقابل آٹھرا۔ "کیسے ہو حمزہ۔۔۔" شزا کی آنکھوں میں اسے دیکھ کر کتنے ہی رنگ لودینے لگے تھے۔ "میں تم سے ہی بات کرنے آیا ہوں شزا۔۔۔" اس کی بات پر شزا سے زیادہ حیرت لالہ کو ہوئی تھی۔ "مجھ سے۔۔۔" شزا خوشی سے چبکی۔

"میں اپنی امی کو تمہارے گھر بھیجنا چاہتا ہوں۔" شزا کا منہ تو کھلا سوکھلا لالہ پوری کی پوری حمزہ کی طرف مڑی تھی۔ "تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں۔۔۔" اور شزا دوپٹے کا پلو دانتوں میں دبائے بس اتنا کہہ کر بھاگ گئی۔ "بالکل نہیں جی۔۔۔"

"حمزہ۔۔۔" لالہ ابھی تک حیرت سے بت بنی کھڑی تھی حمزہ کچھ دیر خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ پھر اداسی سے مسکرا دیا۔ "مجھے معاف کر دینا لالہ، مجھے بہت دیر سے سمجھ آیا کہ میں تمہارے قابل نہیں۔۔۔ کبھی ہو بھی نہیں سکتا۔۔۔" اس کا لہجہ زخمی تھا۔ "حمزہ۔۔۔" وہ تو کچھ بول بھی نہیں پائی۔ حمزہ کی دائیں آنکھ سے ایک موتی سا چمکا کا تھا۔ جسے انگلیوں سے اڑاتا وہ اسے وہاں۔۔۔ چھوڑ کر نیچے چلا گیا۔ لالہ کی آنکھیں نہ جانے کیوں جلنے لگیں۔



ناول "محبت لفظ ہے لیکن" ابھی جاری ہے۔ اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی 10 تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

قسط نمبر 7

”ماں باپ کے سامنے بہت سوچ سمجھ کر بولا کرو کیوں کہ کبھی کبھی ان کے سامنے بولا گیا کوئی بھی برایا اچھا کلام ہماری پوری قسمت پہ حاوی ہو جاتا ہے۔“

وہ کوئی فلرٹ نہیں تھا، اقرار کو دل سے چاہتا تھا۔ اقرار کی ضد پر اسے رشتہ بھیجنے سے انکار نہیں تھا لیکن موجودہ حالات میں یہ رشتہ کسی صورت اقرار کے گھر والوں کے لیے قابل قبول نہیں ہوتا۔ وہ پڑھا لکھا تھا لیکن فی الحال نہ اس کے پاس اچھی جاب تھی نہ ہی گھر کے حالات سازگار تھے، ایسے میں زرینہ بیگم کبھی اس رشتے کے لیے راضی ہونے والی نہیں تھیں۔ تو ختمی انکار سے بچنے کے لیے اس نے بار بار اقرار کو سمجھانا چاہا تھا کہ اگر وہ رشتہ فی الحال نہ بھیجے تو انہیں وقت مل سکتا تھا کیونکہ بالفرض اگر اقرار کے لیے کوئی دوسرا اچھا رشتہ آ بھی جاتا تو اقرار کی پڑھائی کا بہانہ بنا کر اسے ٹالا جاسکتا تھا۔ لیکن آغا کو یقین تھا کہ اگر وہ رشتہ بھیج دیتا تو زرینہ بیگم ضرور چوکنی ہو جاتیں اور ایسی صورت میں وہ کسی بھی اچھی جگہ اقرار کی بات ہی طے کر دیتیں۔۔۔ شاویز تو ان کے گھر کا بچہ تھا۔ اور وہ پہلے سے ہی اس بارے میں اقرار کو بھی قائل کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اس طرح اگر وہ آغا اور اقرار کے تعلق کی بابت جان لیتیں تو ان دونوں کے لیے کافی مشکل کھڑی کر سکتی تھیں۔

”تم امی کی فکر مت کرو، انہیں میں منالوں گی، تم بس کسی طرح اپنی امی کو بھیج دو۔“ اقرار ہمیشہ کی طرح اپنی ضد پر اڑی رہی۔۔۔ اور آغا کو مانتے ہی بنی تھی، اس نے ماں کو کسی نہ کسی طرح رشتہ لے جانے کے لیے راضی کر کے ہی چھوڑا تھا۔

☆.....☆.....☆

زرینہ پھپھو آئی ہوئی تھیں۔۔۔ سین کچن میں مصروف تھیں۔ حمزہ، شاویز کے ساتھ کہیں باہر گیا ہوا تھا اور زرینہ، اماں کے سامنے بیٹھیں ہمیشہ کی طرح لالہ کی ذات پر نکتہ چینی جاری رکھے ہوئے تھیں۔

”جب بھی آتی ہوں، بیچاری سین اکیلے ہی پکین میں خوار ہوتی نظر آتی ہے۔“

”ہاں، تو تم کرو الیا کرو نا مدد۔۔۔“ نانو نے عینک کے اوپر سے جھانکا۔

”کیوں، یہ لالہ کس مرض کی دوا ہے۔ کیا فائدہ اس پڑھائی کا کہ ماں کا بھی احساس نہ ہو۔“ زرینہ بیگم کا لہجہ کڑوا ہوا۔

”میری اقرار تو چائے کا کپ تک نہیں دھونے دیتی مجھے۔“ ان کے شفاف جھوٹ پر اقرار کا منہ بن گیا۔

”نانو صدقے جائے۔“ نانو نے البتہ پیار سے اس کی پیشانی چوم لی۔

”لالہ کہاں ہیں؟“ اس نے نانو سے پوچھا۔

”باہر ہی کہیں آوارہ گردیاں کرتی پھر رہی ہوگی۔“ زرینہ بیگم نے منہ بناتے ہوئے کہا۔
 ”اپنے کمرے میں ہے، جاؤ۔“ نانوں نے ان کی بات ان سنی کرتے ہوئے اسے کہا۔ وہ اٹھ گئی۔
 ”واہ! بی بی صاحبہ کمرے میں ہیں۔ اور اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ آکر پچھو کو سلام کر لے۔۔۔“ وہ دوبارہ شروع ہو گئیں۔
 نانوں نے تاسف سے بیٹی کو دیکھتے ہوئے تسبیح کے دانے گرانے شروع کر دیے۔۔۔ وہ واقعی لاعلاج تھیں۔

☆.....☆.....☆

”آپ باہر نہیں آئیں۔۔۔ میں نے سوچا آپ کے کمرے میں ہی آکر آپ سے مل لوں۔“ وہ دستک دے کر کمرے میں آئی تو
 لالہ کو ہمیشہ کی طرح کتابوں میں گم دیکھا۔۔۔ وہ بیڈ پر اس کے قریب ہی جگہ بنا کر بیٹھ گئی۔ لالہ نے ایک نظر اس کے اوپر ڈالی اور دوبارہ
 اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔
 ”ناراض ہیں؟“ وہ کچھ دیر خاموشی سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ اس بار لالہ نے ایک گہری سانس اندر کھینچی جیسے خود کو نارمل کر
 رہی ہو۔

”اسٹڈی کیسی جا رہی ہے تمہاری۔۔۔؟“ چند لمحوں میں وہ خود کو کمپوز کر چکی تھی۔ اقرانے ایک مسکراتی نگاہ اس کے خوبصورت
 چہرے پر ڈالی۔۔۔ اس کے چہرے پر بے پناہ معصومیت تھی۔ ستواں ناک اس کے کردار کے غرور جیسی کھڑی تھی۔ ننھا یا قوتی دہانہ۔۔۔ اور
 ایک لب پر نقش ننھا سا کالا تل۔۔۔ لالہ کس قدر خوب صورت تھی۔ تبھی تو بھائی اس پر جان چھڑکتے ہیں۔
 ”اقرار۔۔۔؟“ لالہ نے اپنے سوال کے جواب میں اسے گم صم پا کر حیرت سے اسے پکارا۔۔۔ وہ چونکی۔
 ”میں نے پوچھا ہے کچھ تم سے؟“ اسے اقرار کی حالت عجیب سی لگی۔
 ”اچھی جا رہی ہے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔
 ”اب بھی آغا سے ملتی ہو۔۔۔؟“ ذرا سا آگے کی طرف جھکتے ہوئے لالہ نے سرگوشی کی تھی۔ سوال اس قدر اچانک تھا کہ اقرار چند
 لمحوں کے لیے خاموش رہ گئی۔

”مجھ سے جھوٹ بولنے کی کوشش مت کرنا اقرار۔“ وہ بیڈ پر بکھری کتابیں سمیٹنے لگی۔
 ”نہیں لالہ۔۔۔ میں نے اسے ملنے سے منع کر دیا ہے۔“ اس نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔
 ”وہ اتنے آرام سے مان گیا؟“ لالہ کو حیرت ہوئی۔ وہ لڑکا اب اتنا بھی سلجھا ہوا نہیں لگا تھا اسے کہ اس قدر آرام سے اقرار کا پیچھا
 چھوڑ دیتا۔۔۔ اسے سچ میں حیرت ہوئی تھی۔

”میں نے اس سے صاف کہہ دیا ہے لالہ۔۔۔ اگر وہ سچا ہے تو اپنی امی کو ہمارے ہاں بھیج دے۔“ وہ تفصیل بتانے لگی۔

”اور پھر اس نے کیا کہا۔۔۔؟“ لالہ بغور اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”اس نے وعدہ کر لیا ہے، بہت جلد وہ اپنی امی کو بھیجے گا۔“ اس نے سادہ لہجے میں جواب دیا۔

”صرف وعدہ کیا ہے؟ یا وعدہ لیا بھی ہے کوئی؟“

”نہیں، وہ میری مجبوری سمجھ گیا ہے۔“ اس کے لہجے میں سچائی تھی۔ لالہ کو سکون سا ملا۔

”اس نے یہ بھی وعدہ کیا ہے کہ آئندہ میرے راستے میں نہیں آئے گا۔“

”مجھے خوشی ہے اقرا، تم ایک غلط راستے سے لوٹ آئی ہو۔“ لالہ نے مسکراتے ہوئے اس کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھا۔

”شاید کبھی نہ لوٹتی لالہ آپی۔۔۔“ وہ بھی اداسی سے مسکرائی۔

”اگر آپ مجھے یہ نہ بتاتیں کہ میری ماں کا کیا میرے سامنے آ سکتا ہے۔“ اس کی پلکیں بھینگنے لگیں۔ نہ جانے کیوں لالہ نے

نگاہیں پھیر لیں۔

”جو کچھ امی آپ کے بارے میں کہتی ہیں، وہ مجھ سے بھی برداشت نہیں ہوتا۔۔۔ نہ جانے آپ کیسے سہہ لیتی ہیں۔“ وہ خاموشی

سے سنتی رہی۔

”آپ بہت اچھی ہیں لالہ۔۔۔“ اس نے لالہ کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ وہ نرم آنکھوں سے مسکرا دی۔

”تم خود بھی تو کتنی اچھی ہو۔“ لالہ نے بھی مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

☆.....☆.....☆

ان لوگوں کے جانے کے بعد وہ کمرے سے باہر آئی تو گھر پر خاموشی کا راج تھا۔ نانو سونے کے لیے اپنے کمرے میں جا چکی

تھیں۔ اور شاویز اپنے کمرے میں، کچن کی لائٹ البتہ ابھی تک آن تھی اور برتنوں کی کھٹ پٹ سے سین کی موجودگی کا بھی اندازہ ہو رہا تھا۔

وہ سیدھا کچن میں چلی آئی۔ اس کے اندازے کے مطابق وہ کچن کا پھیلا وہ سمیٹنے میں لگی تھیں۔

”بھوک لگی ہے؟ کچھ لائٹ سا بنا دوں یا کھانا ہی کھاؤ گی؟“ اسے اندر آتے دیکھ کر وہ فوراً ہاتھ صاف کرتے ہوئے پوچھنے لگیں۔

”نہیں، مجھے بس چائے پینی تھی۔“ وہ کیتلی اٹھا کر اس میں پانی بھرنے لگی۔

”میں بنا دیتی ہوں۔“ سین آگے آئیں۔

”آپ پہلے ہی کافی تھک چکی ہیں۔۔۔ اندر جائیں، آرام کریں، میں چائے بنا کر باقی پھیلا وہ سمیٹ لوں گی۔“ اس نے برز

آن کرتے ہوئے کہا۔ اس بار سین خاموش رہیں۔۔۔ چائے کے لیے پانی آگ پر رکھ کر وہ تیزی سے باقی بچے برتن بھی دھونے لگی۔ سین

خاموشی سے اسے تیزی سے ہاتھ چلاتا دیکھتی رہیں۔

”زیرینہ پھپھو ہیں تمہاری، سلام دعا ہی کر لیا کرو۔۔“ وہ اسے برتن دھوتا دیکھ کر خود چائے بنانے لگیں۔ ان کی بات پہ لالہ کے ہاتھ ایک پل کے لیے رکے اور پھر سے کام میں لگ گئے۔

”جانتی بھی ہو اس کی عادت کو۔۔۔ کتنا بولتی ہے پھر۔۔۔ کیوں خود کو ہلکا کرتی ہو۔“ محبت بھرے لہجے میں وہ اسے نصیحت کر رہی تھیں۔ وہ برتن دھو چکی تھی۔ دوپٹے سے ہاتھ صاف کرتی ماں کے قریب آئی۔ جو چائے کپ میں نکال رہی تھیں۔

”کچھ چیزوں پہ انسان کا اختیار نہیں رہتا۔۔۔ جیسے قسمت۔۔۔ جیسے غصہ۔۔۔ اور جیسے محبت۔۔۔“ ان کے ہاتھ سے کپ تھامتھی وہ طنز پر لہجے میں بولی تھی۔ سین کا ہاتھ ذرا کانپا تھا۔ چھلکی چائے لالہ کی سفید قمیص کا دامن داغدار کر گئی تھی۔

ان کا چہرہ ایک پل میں لٹھے کی طرح سفید پڑ گیا تھا۔ لالہ کو کبھی، کبھی حیرانی ہوتی تھی۔ ساری دنیا کے طنز، زیرینہ پھپھو کے زہر میں بجھے لفظ سن کر اس کی ماں کو کوئی اثر نہیں ہوتا تھا، حالانکہ اس کی روح تک چھلنی ہو جاتی تھی لیکن اس کی کہی ایک بات ان کا چہرہ یونہی زرد کر دیتی تھی، یوں جیسے موت طاری ہو گئی ہو ان کے وجود پر۔۔۔ سفید موت۔۔۔

زخمی مسکراہٹ اس کے گلابی ہونٹوں پر پھیل اٹھی تھی۔

”ہلکی تو میں اسی دن ہو گئی تھی امی۔۔۔ جب آپ نے محبت میں بے اختیار ہو کر اپنے باپ کی دہلیز پار کی تھی۔“ سین کو چکر سا آیا تھا۔ سلیب سے لگ کر انہوں نے خود کو سنبھالا۔

”لوگ تو بس مجھے یہ یاد کرواتے ہیں کہ میں ایک بدکردار ماں کی بیٹی ہوں۔“ وہ جیسے ہر حد پار کر گئی تھی۔ سین کے دل میں درد سا اٹھا، انہوں نے بے اختیار ہو کر سینے پر ہاتھ رکھا تھا۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی جاری ہوئی تھی۔

لالہ کپ اٹھائے باہر نکل آئی۔ آنکھیں اس کی بھی جلنے لگی تھیں۔ سامنے کے منظر دھندلا سے گئے تھے۔۔۔ تبھی وہ سامنے کھڑے شاوین کو بھی نہ دیکھ سکی تھی اور اس سے ٹکراتے، ٹکراتے پکٹی تھی۔ اگلے ہی پل اس نے سختی سے آنکھوں کو رگڑ ڈالا تھا۔ منظر صاف ہوا تھا۔ شاوین اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں، اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ اس کی گفتگو سن چکا تھا لیکن اسے کوئی پروا نہیں تھی۔ ایک تیز نظر شاوین پر ڈال کر لالہ نے شاوین کے پہلو سے نکل جانا چاہا جب اچانک اس نے سامنے سے آکر اس کا راستہ روک دیا۔ اس کی آنکھوں میں رقم ناراضی بے حد صاف تھی۔

”شکر کرو لالہ! ماں کبھی بددعا نہیں دیتی۔“ تلخ لہجے میں کہہ کر وہ کچن کے اندر چلا گیا تھا۔ لالہ نے سر جھٹک کر جیسے اس کی بات کو ہوا میں اڑا دیا تھا۔ اور کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

☆.....☆.....☆

اس نے ہوم ورک مکمل کر لیا تھا۔ وہ ایک اچھا اور جامع اسٹارٹ لے سکتا تھا لیکن یہ بہر حال ایک حقیقت تھی کہ اسے نہ صرف بے

حد قابل اور پُر خلوص لوگوں کی ضرورت تھی بلکہ ایسے انویسٹرز کی بھی جو بخوشی اس کے آئیڈیاز میں پارٹنرشپ کر لیتے۔۔۔ اس طرح ایک تو اسے سپورٹ مل جاتی۔ دوسرا پہلے سے کسی اسٹیبلسڈ نام کی مدد سے اسے بھی بزنس میں کافی اچھا اور تیز رسپانس مل سکتا تھا۔ سرسندر اس ضمن میں ایک بہترین شخصیت تھے۔ وہ ایسے خود دار اور قابل لوگوں کو نہ صرف سپورٹ کرتے تھے بلکہ پروموٹ بھی کر دیتے تھے۔ باریال ولی خان کا ارادہ بھی یہی تھا کہ وہ سب سے پہلے انہی سے اپنے آئیڈیاز شیئر کرے گا اور ان سے پارٹنرشپ کی درخواست بھی کرے گا لیکن۔۔۔

امن والے معاملے کے بعد وہ اب اس پوائنٹ پہ سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اس نے چند اہم شخصیات سے ملاقاتیں بھی کی تھیں جو بزنس ڈیولپمنٹ میں خاص مقام رکھتے تھے۔ ان کے توسط سے اسے کچھ اسپانسر مل گئے تھے۔ اس قدر کہ وہ جلد از جلد چھوٹے پیمانے پر اپنا بزنس فوری شروع کر سکتا تھا۔ تبھی تمام تر ہوم ورک کمپلیٹ کرنے کے بعد وہ سب سے پہلے شاویز کے پاس آیا تھا۔ بزنس ایڈمنسٹریشن میں شاویز گولڈ میڈلسٹ تھا۔ بے حد قابل اور قابل بھروسہ لڑکا۔۔۔ وہ اپنے بزنس کو اس کی صلاحیت سے بہ آسانی کامیاب بنا سکتا تھا۔

”تمہارے لیے کام کروں، اس سے اچھی بات بھلا کیا ہو سکتی ہے؟“ اس کی آفر سن کر شاویز چند لمحے خاموش رہ کر کچھ سوچتا رہا۔ باریال کو لگا وہ شاید فیصلہ نہیں کر پارہا۔۔۔ لیکن اس کی بات نے باریال کے چہرے پر مسکراہٹ بکھیر دی تھی۔

”لیکن۔۔۔“ شاویز نے اس کی طرف دیکھا۔

”لیکن کیا۔۔۔؟“ وہ چونکا۔

”لیکن دودن پہلے ہی میری جاب ہوئی ہے۔“ اس کی بات پر باریال کو بخوشی سے زیادہ حیرت ہوئی تھی کیونکہ وہ اس سے قطعی لاعلم تھا۔

”کافی اچھی جگہ ہے، سیلری ٹیکج زبردست ہے۔۔۔“ وہ مزید بتانے لگا۔ نہ جانے کیوں باریال کو لگا وہ اس سے جھوٹ بول رہا ہے۔

”میں پھر بھی ریزائن کر کے تمہارے ساتھ آ جاتا۔ لیکن کمپنی کے رولز میں ہے کہ کوئی بھی ورکر جاب چھوڑنے سے کم از کم تین ماہ پہلے ضرور انفارم کرے گا تو اس طرح اچانک۔۔۔ تم سمجھ رہے ہونا میں کیا کہہ رہا ہوں۔“ اس نے بات ختم کرتے ہوئے باریال سے پوچھا تھا۔

”تم نے بتایا ہی نہیں کہ تمہاری جاب ہو گئی ہے یا۔۔۔“ وہ اس کی ساری بات جیسے ہوا میں اڑاتا تاسف سے بولا تھا۔

”نئی جاب تھی تو دودن کافی بزی رہا۔ آج آنے ہی والا تھا تمہاری طرف مٹھائی لے کر کہ تم خود آ گئے۔“ اس نے صفائی سے بہانہ گھڑا۔

”چلو کوئی بات نہیں۔۔۔“ وہ مسکرا دیا۔

”تمہاری جاب ہو گئی یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔“ وہ دل سے مسکراتے ہوئے اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے بولا۔

”تھینکس۔۔۔“ نہ جانے کیوں شاویز کی مسکراہٹ اسے پھینکی سی لگی۔

”اب کچھ کھلاؤ پلاؤ گے بھی اس خوشی میں یا یونہی روکھے منہ ٹرخانے کا ارادہ ہے۔“ دونوں ہاتھوں کی پوائنٹنگ فنگرز ہونٹوں پر جماتے ہوئے وہ مسکرایا تھا۔

”کیوں نہیں یار۔۔۔ میں پوچھنے ہی والا تھا۔ چائے یا ٹھنڈا۔۔۔“

”چائے۔۔۔ ہمیشہ کی طرح۔۔۔“ اس نے کہا تو شاویز سر ہلاتا باہر نکل گیا۔ تار پر گیلیے کپڑے پھیلاتی لالہ کام چھوڑ کر اس کے پیچھے آئی تھی۔

”تم نے اس سے جھوٹ کیوں بولا شاویز۔۔۔؟“ اس کے لہجے میں حیرانی تھی۔ شاویز نے کچن کے قریب آتے ہی اس کے لیے راستہ چھوڑا تھا۔ وہ اندر آ گئی تھی۔ اسے ہاتھ چلاتا دیکھ کر وہ سمجھ گیا تھا کہ اس نے ساری باتیں سن لی ہیں۔ تبھی اس کے بلانے سے پہلے خود ہی اُدھر آ گئی تھی۔

”تو۔۔۔“ وہ بھی اندر آ گیا۔ ”تم کیا چاہتی ہو، میں، شاویز زیدی، اب اس باریال کے انڈر کام کروں؟“

”اس میں حرج ہی کیا ہے؟“ وہ کیبنٹ سے کپ نکالتے ہوئے بولی۔

”میرے ابھی اتنے بھی برے دن شروع نہیں ہوئے کہ میں باریال سے تنخواہ لیتا پھروں۔“ ٹرے اسے تھماتے ہوئے لالہ نے تاسف بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

”تم اتنا نیکیو کیوں سوچنے لگے ہو شاویز۔۔۔“

”پلیز لالہ۔۔۔“ نرمی سے اسے سامنے سے ہٹاتا وہ باہر نکل گیا تھا۔ لالہ اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

وہ گھر آیا تو رات کافی ہو چکی تھی۔ اس نے دیدے کے کمرے میں جھانکا، وہ سوچکی تھیں۔ وہ آہستگی سے دروازہ بند کرتا اپنے کمرے میں آ گیا۔

بیڈ پر بیٹھ کر شوز اتارتے سے اچانک ہی اس کی نگاہ اسٹڈی ٹیبل پر پڑے اس گفٹ پیک پر پڑی تھی۔ وہ اٹھ کر اس کی طرف آیا تھا۔ اور ڈبے کو دیکھے بغیر اس کے اوپر رکھا خوبصورت کارڈ اٹھا لیا تھا۔

”آئی ایم سوری۔“ سنہری حروف جگمگا رہے تھے۔ اس نے کارڈ اور پیکٹ اٹھا کر الماری کے نچلے حصے میں پھینک دیے اور پھر لائٹ بجھاتا بیڈ پر آ گیا۔

موبائل کی تیز ویپ پہ بند ہوتی آنکھیں ایک جھٹکے سے کھلیں۔ اس نے چیک کیا۔۔۔ امن کی کال تھی۔۔۔ اس نے لیس کا بٹن دبا دیا۔

”مجھے امید نہیں تھی تم فون اٹھاؤ گے۔“ امن کے لہجے میں اداسی تھی۔

”تم میری دوست ہو۔۔۔ میں فون کیوں نہیں اٹھاؤں گا۔“ دایاں ہاتھ سر کے پیچھے رکھتے ہوئے اس نے عام سے لہجے میں کہا۔

”کیا ہم اب بھی دوست ہیں؟“

”میں اپنے دوستوں کو کبھی نہیں چھوڑتا امن، تم ہمیشہ میری اچھی دوست رہو گی۔“

"I am really very sorry Baaryal"

اس کی آواز بھینکنے لگی تھی۔ باریال لب بھینچ گیا۔

”میری بے وقوفی کی وجہ سے تمہارے اور پاپا کے تعلقات بھی خراب ہوئے۔“

”وہ اتھارٹی ہیں امن۔۔۔ مجھے جاب پر رکھنا ہے یا نہیں یہ وہ بہتر سمجھتے ہیں، تم اسے خود سے ریلیٹ نہ کرو۔۔۔“ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دوسری طرف کچھ دیر خاموشی رہی تھی۔

”کچھ تو کہو باریال۔۔۔ سخت، کڑوا۔۔۔ کچھ تو ملال کم ہو۔“ وہ سسکی۔

”اچھا یہ تناؤ طبیعت کیسی ہے؟“ وہ بات بدل گیا۔

”کافی بہتر ہوں۔ آفس بھی جوائن کر لیا ہے۔“

”فٹنساٹک۔۔۔“ وہ خوش ہوا۔

”باریال۔۔۔“ وہ شاید چند لمحے اس کی خوشی محسوس کرتی رہی۔ پھر آہستگی سے پکارا۔

”ہم۔۔۔“

”کیا ہم کہیں مل سکتے ہیں؟“

”شیور۔۔۔ وائے ناٹ۔۔۔“ وہ دوستانہ لہجے میں بولا۔

”تو کل آرہے ہو آفس۔۔۔؟“ وہ چبکی۔

”تم میرے گھر آ جانا، دیدے سے بھی مل لوگی، کافی یاد کرتی ہیں۔“ وہ نفاست سے انکار کر گیا۔

”یہ بھی ٹھیک ہے۔۔۔ تو ملتے ہیں کل شام کو۔۔۔“

وہ خوش ہو گئی۔

”او کے پھر۔۔۔“ وہ تھک گیا تھا۔ اسے نیند آرہی تھی۔

”پھر۔۔۔؟“ امن سمجھ نہ سکی۔

”کل ملتے ہیں پھر۔۔۔ ابھی نیند آرہی ہے بہت سخت۔۔۔“ بوجھل آواز پر اسے ایک دم ہنسی آئی تھی۔
 ”ٹھیک ہے، خدا حافظ۔۔۔“ مسکراتی ہوئی آواز ابھری۔

”شب بخیر۔۔۔“ وہ بھی مسکرا دیا تھا۔ سیل آف کر کے ایک طرف بیڈ پر اچھالا اور پھر تکیے سینے کے نیچے رکھ کر پاؤں پھیلا کر الٹا ہی سو گیا تھا۔ نیند کی وادیوں نے اسے خود میں سمولیا تھا۔

☆.....☆.....☆

فرسٹ سیمسٹر کا رزلٹ آ گیا تھا۔ ضیا اس سے پورے دس نمبر آگے تھا۔

”یہ کیسے؟“ وہ ڈسپلے بورڈ پر بار بار بے یقینی سے نظر دوڑاتی اور وہی نتیجہ دیکھ کر پہلے سے بھی زیادہ الجھ جاتی۔

”یہ مجھ سے زیادہ نمبر کیسے لے سکتا ہے؟“ اس نے ساتھ کھڑی نمرہ کو مخاطب کرتے ہوئے تاسف سے کہا جو اپنا رزلٹ دیکھ کر اب موبائل پر مصروف تھی۔ نمرہ نے اس کی بات کے جواب میں بس ایک سرسری سی نظر اس پر ڈالی اور دوبارہ بات کرنے میں مصروف ہو گئی۔

”یہ تو کتاب کو ہاتھ تک نہیں لگا تا تھا۔“ لالہ رو دینے لگی تھی۔ نمرہ نے فون بند کر کے پرس میں ڈالا اور اس کے قریب آ گئی۔

”پتا ہے کیا لالہ۔۔۔؟“ اجنبی سے لہجے میں اس نے لالہ کو مخاطب کیا، لالہ نے نم آنکھوں سے اسے دیکھا۔

”مجھے لگتا ہے ضیا کو تم پر نہیں، دراصل تمہیں ضیا پر کرش ہو گیا ہے، کتنا بختی ہونا تم۔“

”نمرہ۔۔۔!“ تاسف اور دکھ سے اس کی آنکھیں پھٹنے کے قریب ہو گئیں۔

”مجھے سچ میں کبھی کبھی بہت افسوس ہوتا ہے لالہ! میں نے تمہیں سمجھنے میں کتنی غلطی کی۔“

”یہ تم کیا کہہ رہی ہو نمرہ۔۔۔؟“ وہ واقعی اسے نہیں سمجھ پارہی تھی۔

نمرہ اس کی بات کے جواب میں کچھ نہیں بولی۔ خاموشی سے خفا خفا نظروں سے اسے کچھ دیر گھورتی رہی پھر ایک طرف بڑھ گئی۔

لالہ مارے صدمے کے قدم نہیں اٹھا سکی تھی۔ اسے رہ رہ کر ضیا پر غصہ آ رہا تھا۔ جب سے ضیا علی خان اس کی زندگی میں آیا تھا ایک ایک چیز

الٹ سی گئی تھی۔ عجیب سا خوف اسے اپنے حصار میں لیے رکھتا تھا۔ اور اب نمرہ کا یوں اجنبی رویہ اسے مزید الجھا رہا تھا۔ مری میں ہونے

والی ان دونوں کی لڑائی ہرگز اتنی بڑی بات نہیں تھی کہ نمرہ یوں اتنے دن بعد بھی اس طرح بی ہو کر کرتی۔۔۔ کچھ تو تھا جو اسے نمرہ کی آنکھوں

میں نظر آتا تھا۔ لیکن وہ لاکھ کوشش کے باوجود بھی سمجھ نہیں پارہی تھی۔

”کیا ہوا لالہ۔۔۔؟“ بھاری آواز پر وہ بری طرح چونکی تھی۔ آنے والا ضیا تھا جو اسے یوں اکیلے بت کی طرح ساکت کھڑا دیکھ

کر فوراً اس کی طرف آیا تھا۔

”نہیں، کچھ نہیں۔۔۔“ وہ گم صم سے انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ اور پھر سامنے کی طرف بڑھ گئی۔

”تم میرے دس اضافی نمبرز سے پریشان ہو؟“ وہ اس کے ہم قدم ہوا۔
 ”لالہ کبھی پریشان نہیں ہوتی، ہاں لیکن مجھے دکھ ہے کہ ایک بے پروا لڑکا مجھ سے دس نمبرز زیادہ کیسے لے سکتا ہے؟“ اس کے سوال پر اس کا ازلی اعتماد دعو کر آیا۔

”ویسے سچ بتاؤں۔۔۔ ان دس نمبروں پر میں خود بھی پریشان ہوں۔“ وہ مسکرایا تھا۔
 ”مجھے تو کتابوں سے الرجی ہے۔ ہاں کبھی کبھی کھول کر دیکھ لیتا ہوں۔ وہ بھی جب امتحانات سر پر ہوں۔“ لالہ کو لگا وہ اسے چڑا رہا ہو۔
 ”جاؤ ضیا، مجھے تنگ نہ کرو۔“ وہ ابھرتے غصے کو کنٹرول کرتے ہوئے بولی۔
 ”جو حکم۔۔۔“ وہ فوراً دوسری طرف مڑ گیا تھا۔
 ایک پل کے لیے تو لالہ بھی اس قدر فرمانبرداری پر شکا کڈ رہ گئی تھی۔ پھر سر جھٹک کے لائبریری کی طرف بڑھ گئی۔

☆.....☆.....☆

”باریال۔۔۔؟“ دیدے کی پکار پر وہ فوراً اٹھ کر ان کے کمرے میں آیا تھا۔ جس وقت وہ گھر آیا تھا، دیدے نماز پڑھ رہی تھیں۔ اس لیے وہ خاموشی سے پلٹ گیا تھا۔ لیکن انہوں نے شاید اس کی آہٹ محسوس کر لی تھی۔ تبھی نماز ختم کرتے ہی اسے پکارا تھا۔
 ”السلام علیکم دیدے۔۔۔“ وہ مسکراتا ہوا ان کے قریب نیچے زمین پر ہی بیٹھ گیا۔ انہوں نے زیر لب کچھ پڑھتے ہوئے اس پر پھونک دیا تھا۔

”یہاں کیوں بیٹھ گئے ہو۔۔۔ میں اٹھنے ہی والی تھی۔“ شفقت سے اس کے گھنے بالوں کو چھوتے ہوئے انہوں نے کہا۔ باریال کو دیکھتے ہی روشنی سی ان کی آنکھوں میں جھلملانے لگتی۔ باریال بچپن سے اس روشنی کا عادی تھا۔ جب بھی کبھی وہ ماں سے کچھ دیر کے لیے دور جاتا۔ واپس آنے پر یہی روشنی اس کا استقبال کرتی۔۔۔ دیدے اٹھ گئیں تو وہ بھی جانماز تہہ کرتا بستر پر بیٹھ گیا۔۔۔ دیدے کچھ دیر اسے یونہی پیار سے دیکھتی رہیں۔

”میں دیکھ رہی ہوں، جب سے تم آفس کے کام میں بزی ہوئے ہو۔ تھکنے کی بجائے تازہ دم رہنے لگے ہو۔۔۔“ باریال نے بیڈ کراؤن سے ان کے ٹیک لگاتے ہی نرمی سے ان کے پاؤں اٹھا کر اپنے قریب کر لیے اور ان کے پیردبانے لگا۔۔۔ دیدے مسکرا دی تھیں۔
 ”نہ صرف فریش رہنے لگا ہوں دیدے۔۔۔ بلکہ اب وہ ڈراؤن خواب بھی مجھے نہیں ستاتے۔ بلکہ اکثر دوا لیے بغیر ہی مجھے نیند آ جاتی ہے۔“ اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

”ضبط ہی بہترین ہتھیار ہے باریال۔۔۔“ دیدے کے چہرے پر کئی رنگ ایک ساتھ آ کے ٹھہرے تھے۔
 ”تم بے بس تھے۔۔۔ لیکن ضبط نہیں کر پار ہے تھے۔ انتقام کی آگ سینے میں جلانے تم خود ہی تھے جو ان ڈراؤنی حقیقتوں کو بار،

بارخود کو یاد کرانا چاہتے تھے۔“ نتیجے کے دانے رو کے وہ اس کے چہرے کو دیکھے جا رہی تھیں۔ باریال کو ایک دم ان کے چہرے پر خوشی اور غم ایک ساتھ رقم ہوتے محسوس ہوئے۔

”لیکن ایسا ہوتا ہے بیٹے زندگی میں کئی بار ہماری طاقت بس چوٹ کھا کے مر جانے یا کہیں چھپ جانے میں ہوتی ہے پھر یہ کہ۔۔۔ ہم اس پر کڑھ کڑھ کے اپنا وقت، اپنا گیان ضائع کرتے ہیں یا پھر ضبط کی راہ لیتے ہیں، وقت پر چھوڑ دیتے ہیں اور یقین کرو باریال یہ آخری راستہ بے حد سہل اور پُر امید ہے کیونکہ پھر فیصلہ، انصاف ہم ڈائریکٹ اللہ پر چھوڑ دیتے ہیں۔“ وہ ان کی بات سمجھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر سکون تھا۔

”مجھے خوشی ہے، دیر سے سہی لیکن تم نے ضبط کی راہ اختیار کی، انتقام کی آگ کو ٹھنڈا کر دیا۔۔۔ ان شاء اللہ یہ ادویات وغیرہ بالکل چھوٹ جائیں گی۔“ انہوں نے اٹھ کر اس کی پیشانی چومتے ہوئے کہا۔

”ان شاء اللہ۔۔۔!“ باریال نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔

”دودھ لاؤں آپ کے لیے؟“

”نہیں میں نے پی لیا۔“ وہ مسکرائیں۔

”سوری دیدے۔۔۔ آج پھر لیٹ ہو گیا۔“ اس کا لہجہ معذرت خواہانہ ہو گیا۔

”سوری کرنے کی بات تو ہے لیکن وجہ میں نہیں۔“ دیدے اب اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھیں۔

”مطلب۔۔۔؟“ ذہین چمکتی آنکھوں میں الجھن سی بیدار ہوئی تھی۔

”امن آئی تھی۔۔۔“ دیدے نے بتاتے ہوئے بغور اس کے چہرے کے تاثرات کو نوٹ کرنا چاہا تھا۔ وہاں فوراً شرمندگی اتری تھی۔

”اوہ گاڈ۔۔۔!“ بالوں میں ہاتھ پھنساتے ہوئے وہ واقعی شرمندہ ہوا تھا۔

”تم نے خود اسے ملنے کے لیے کہا تھا؟“ دیدے نے پوچھا۔

”نہیں، وہ خود ملنا چاہ رہی تھی۔ میں نے بس گھر کا کہہ دیا، آپ بھی تو یاد کرتی ہیں ناں اسے۔“ وہ صاف گوئی سے بولا۔ دیدے کو لگا تھا، اس کے دل میں واقعی امن کو لے کر کوئی خاص جذبات نہیں تھے۔ ان کے بیٹے کی آنکھیں انہیں اس کے دل کا حال خوب بتاتی تھیں۔

”امن اچھی لڑکی ہے۔“ انہیں جیسے افسوس سا ہوا، فوراً مدعے پر آئیں۔

”میں نے کب کہا بری لڑکی ہے اور پھر میری تو سب سے اچھی دوست ہے وہ۔“ وہ کندھے اچکاتے ہوئے سارا معاملہ ہی ختم کر گیا۔

”کسی کو انتظار نہیں کروانا چاہیے۔“ دیدے نے جیسے التجا کی۔

”بالکل بھی نہیں کرواؤں گا۔“ وہ ان کی بات سمجھ کر مسکراتے ہوئے بولا اور جانے کے لیے مڑا۔

”پھر بھی باری۔۔۔ امن جیسی نہیں تو پھر تمہیں کیسی لڑکی چاہیے۔“ ان کی پکار پر وہ رکا۔۔۔ پھر مڑ کر آہستگی سے چلتا ان کے قریب آ کے رک گیا۔

”کچھ زیادہ ڈیمانڈ نہیں ہے میری دیدے۔“ ذرا سا جھک کے وہ ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ دیدے بھی اسے دیکھنے لگیں۔

”بس اسے دیکھتے ہی یہ دل گواہی دے دے۔“

”مطلب۔۔۔؟“ دیدے حیران ہوئیں۔

”مطلب۔۔۔“ وہ سوچنے لگا۔

”مطلب یہ گواہی دے دے کہ اسے دیکھتے ہی میرے دل کو کچھ خاص محسوس ہو۔ میری آنکھیں کسی دیے کی مانند جل اٹھیں اور میں۔۔۔“ وہ شرارت سے کہتا چلا گیا۔

”باری۔۔۔“ دیدے نے ہنستے ہوئے اسے ہلکا سا تھپڑ رسید کیا تھا۔

”لکھوالو۔۔۔ وہ لڑکی پیدا ہی نہیں ہوئی جو باریال کا دل پھیر سکے۔“

”بس پھر میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔“ وہ خفا، خفا سا منہ بنا کر بولا تھا۔ دیدے مزید ہنسنے لگیں۔۔۔ وہ مسکراتے ہوئے انہیں دیکھے گیا۔

☆.....☆.....☆

بنگلے کے اس حصے میں آتے ہی نہ جانے کیوں وہ ہمیشہ اس احساس میں گھر جاتی تھی کہ وہ شہر میں نہیں اپنے گاؤں میں موجود ہے۔ تقریباً دس مرلوں پر محیط اس لان میں برآمدے سے لے کر بیرونی دیوار تک انار، کھجور، کیلے، آم، امرود، جامن اور فالسے کے درخت لگے تھے۔ جن کی شاخیں ایک دوسرے میں گڈ مڈ ہو رہی تھیں۔ کئی بار تو وہ سب ایک دوسرے کا حصّہ لگنے لگتے۔۔۔ برآمدے کے بالکل قریب لگے جالی دار درتچے سے چڑھتی انگور کی نیل نے برآمدے کی ساری چھت پر ہی قبضہ جما نا شروع کر دیا تھا۔ بیرونی چار دیواری بوگن ویلیا سے ڈھکی تھی۔

سرسبز سایہ دار حصہ اسے ہمیشہ ہی مسحور سا کر دیتا تھا۔ عجیب سی سرشاری اسے اپنے حصار میں لے لیتی۔ تبھی وہ اکثر عصر کے وقت کتابیں لے کر ادھر ہی آ جایا کرتی۔

آج فضا میں جس غائب تھا۔ صبح سے روئی جیسے بادلوں اور ٹھنڈی ہوائ نے موسم میں خوشگواریت بھردی تھی۔ اوزگل سورہی تھی۔ وہ کتابیں لے کر لان میں آ گئی۔ فالسے کے زرد نارنجی ننھے پھول جھڑنا شروع ہو گئے تھے۔ مطلب پھل لگنے کو تھا۔ وہ کتابیں انار کے پیڑ کے نیچے رکھتی اس طرف واپس آ گئی۔ اور فالسے کے باقی ماندہ ننھے منے پھول شاخوں سے چننے لگی۔ تبھی اس نے گیٹ کھلنے کی آواز سنی۔۔۔ بے اختیار اس طرف دیکھا۔ وہ ابراہیم تھا۔۔۔ ابراہیم حیات۔۔۔ بانیک پر سوار وہ ادھر ادھر دیکھے بنابانیک سیدھا اپنے پورشن کی طرف لے

گیا تھا۔ اس پورشن کا واحد دروازہ اسی بنگلے میں کھلتا تھا۔ لیکن یہ پورشن تھا بنگلے سے باہر۔۔۔ اسے اس بنگلے سے جوڑنے والا وہی واحد دروازہ ہی تھا۔

گل مینے نے ایک نظر بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر بکھرے پھولوں کو دیکھا۔ انہیں یونہی دیکھتے ہوئے وہ کچھ دیر سوچتی رہی۔ پھر دھیرے دھیرے چلتی اس پورشن کی طرف بڑھ گئی۔ جس کا ادھ کھلا دروازہ ہوا کے زور سے دھیرے دھیرے بل رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر بہت پیاری مسکان آٹھ رہی تھی۔ وہ محبت کی رتھ کی سوار تھی۔ خوابوں کے رنگوں کا حسین لباس اوڑھے جذبات کی پریاں جس کی باگ بان تھیں۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ یوں جیسے وہ اس سے پہلے منزل کا متمنی ہو۔ نہ جانے کب پیروں میں قید چل اتر گئی۔ اور نرم پیروں نے ملائم گھاس کو چھوا۔۔۔ وہ یونہی پھول سنبھالے دھیرے دھیرے قدم دھرتی رہی۔ اور پھر اس نے دروازے کے سامنے قدم روکے تھے۔ بالکل اسی وقت ابراہیم واپس آیا تھا۔ اسے دیکھتے ہی گل مینے نے اپنی ہتھیلی آگے بڑھادی۔ خوب صورت آنکھوں میں رچی حیرت دو چند ہوئی۔ وہ اب مسلسل اس کے ہاتھ کو دیکھ رہا تھا۔

”خانزادی۔۔۔“ وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا تھا۔

”میرا نام گل مینہ ہے، تم مجھے مینہ کہہ سکتے ہو۔۔۔“

اس نے کہتے ہوئے پھولوں سے بھری ہتھیلی اس کے آگے کی تھی۔ وہ بے اختیار ایک قدم پیچھے ہوا۔ مینہ کھلکھلا دی۔

”توبہ ہے، میں تو سمجھتی تھی تم شرمیلے ہو۔۔۔ لیکن۔۔۔“ اس کی بات پر وہ نظریں یکبارگی اٹھی تھیں۔

”لیکن۔۔۔؟“ ابرو تکیے انداز میں ذرا سا اٹھے۔

”لیکن تم تو ڈرپوک ہو۔“ دایاں ہاتھ پہلو میں جماتے ہوئے وہ ایک انداز سے مسکرائی۔

”جن کی حدیں مقرر ہوں، وہ محتاط ہوتے ہیں، ڈرپوک نہیں خانزادی۔“

”میں نے بتایا ناں میرا نام مینہ ہے۔“

”میرے لیے آپ ایک خانزادی ہیں بس۔۔۔ میں آپ کو آپ کے نام سے پکارنے کی جرأت کبھی نہیں کر سکتا۔“

”خانزادی میں صرف نوکروں کے لیے ہوں۔ اور بھائی نے بتایا ہے تم نوکر نہیں، ان کے دوست ہو۔“ وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔

”گل مینہ۔۔۔“ دور سے اوزگل کی پکار سنائی دی تھی۔ پہلو پہ جمایا ہاتھ ایک جھٹکے سے نیچے گرا تھا۔

”مینہ، باء جی آئے ہیں جلدی آؤ۔۔۔“ اور اس کی اگلی بات پہ اس کے ساتھ، ساتھ ابراہیم کی بھی سانس اٹکی تھی۔ وہ مزید پیچھے

ہوا تھا۔

”یہ پکڑو۔۔۔“ تیزی سے کچی دہلیز پار کرتی وہ اس کا ہاتھ پکڑتی سارے پھول اس کی ہتھیلی پر دھر گئی تھی اور مڑ کر بھاگ گئی۔

ابراہیم نے حیرت بھری نظر ان سنہری پھولوں پر ڈالی تھی۔ پھر سرشاری کی سی کیفیت میں مٹھی بند کر دی۔ سماں مہکنے لگا تھا۔

☆.....☆.....☆

لاؤنج میں موت کا سماں طاری تھا۔ سردی خاموشی چھائی تھی۔ فیملی کے سارے ممبرز اتنے عرصے بعد ایک ساتھ بیٹھے تھے۔ لیکن سب کے چہرے بجھے، بجھے تھے۔ یوں جیسے سب نے موت کا قرض دیکھا ہو۔۔۔ یا اچانک سے سب کچھ کھودینے کا احساس جاگ اٹھا ہو۔۔۔ کونے میں رکھے صوفے پر بیٹھی اوزگل کی آنکھیں مسلسل آنسو بہا رہی تھیں۔ گل مینے بڑے صوفے پر ایک کروفر سے بیٹھے باء جی کی گود میں سر رکھے اداس سی نیچے کارپٹ پر بیٹھی تھی۔ باء جی کے چہرے پر سختی سی چھائی تھی۔ جیسے انہیں یہ افسوس یہ ماتم گراں گزر رہا ہو۔ ”آپ کم از کم اطلاع تو کرتے ہمیں باء جی۔۔۔“ ساتھ بیٹھے ضیا نے کافی خاموشی کے بعد غم لہجے میں کہا۔ ”ہمیں اچھی طرح معلوم ہے ضیا۔۔۔ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔“ سخت آواز میں ناراضی چھلک رہی تھی۔ ضیا معذرت خواہانہ لہجے میں سر جھکا گیا۔

”اللہ لوک کی موت رات کو نیند میں ہوئی۔ اس قدر اچانک۔۔۔ ہم خود بھی حیران پریشان تھے۔ لیکن ہم یہ بھی اچھی طرح جانتے تھے کہ تمہارے اور گل مینے کے امتحانات چل رہے تھے۔ اور ہم نہیں چاہتے تھے کہ اس چھوٹے سے واقعے سے تم دونوں کی ساری محنت بیکار چلی جاتی۔“

”لیکن یہ ایک چھوٹا سا واقعہ نہیں تھا باء جی۔۔۔“ مینے نے سراٹھایا۔

”موت اور زندگی سب غیر یقینی ہے میرے بچے۔۔۔“ انہوں نے محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”پھر یہ ہمارے پُرکھوں کی ریت ہے۔۔۔ پٹھان موت پر اتنا رویا نہیں کرتے۔۔۔ کافی مضبوط ہیں ہم۔۔۔ تم سب بھی اس بات کو دل پر نہ لو۔۔۔ اور ان کے لیے دعا کرو۔۔۔ اللہ پاک ان کی مشکلیں آسان فرمائے۔“ گھنی مونچھوں تلے دبے ہونٹ نہ جانے کیوں عجیب سا مسکرائے تھے۔

”آمین۔۔۔“ وہ تینوں بہن بھائی بیک وقت بولے تھے۔ اور پھر واقعی ضیا اور مینے دونوں باء جی کے ساتھ اپنے معمولات دشمنیہ کرنے لگے تھے لیکن اوزگل۔۔۔ بہر حال نہ کر پائی تھی۔ وہ چائے بنانے کا کہہ کر وہاں سے نکل آئی۔ اور اپنے کمرے کے ٹیس پر آٹھری، بارش شروع ہو چکی تھی۔۔۔ وہ بھی رونے لگی۔

”کاش۔۔۔ کاش میں آپ کو چھوڑ کر ادھر نہ آئی ہوتی اللہ لوک۔۔۔ پتا نہیں کیا ہوا ہوگا آپ کے ساتھ۔“ چہرہ ہاتھوں میں چھپائے وہ پھوٹ پھوٹ کے رو دی تھی۔

☆.....☆.....☆

جب سے آغا نے ایک پرائیویٹ کمپنی میں جاب حاصل کی تھی، اپنے اور اقرا کے معاملے کو سیٹ ہوتے محسوس کیا تھا۔ اس نے شاہدہ سے بھی بات کر لی تھی۔ وہ تو راضی تھیں لیکن زریہ بیگم کا ڈر تھا، انہیں نہیں لگتا تھا کہ وہ اس رشتے کے لیے مانیں گی۔

”آپ میرے اور اقرا کے تعلق کے بارے میں بتا دینا۔ پھر دیکھتا ہوں کیسے نہیں مانتیں۔“ یہ بات ان کے دل کو بھی لگی۔۔۔ زریہ بیگم نہ بھی مانتیں تو اقرا اپنی بات منوا کے ہی رہے گی، یہ وہ اور آغا اچھی طرح جانتے تھے۔ تبھی وہ آج مٹھائی اور کچھ سامان لے کر سر شام ہی ان کے گھر پہنچ گئیں۔ حمزہ ابھی تک گھر نہیں آیا تھا۔ اقرا نے ہی دروازہ کھولا اور آغا اور شاہدہ آٹنی کو دیکھ کر اس کا انگ، انگ کھل سا گیا تھا۔ انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھا کر، امی کو اطلاع دے کر وہ سیدھا کچن میں چلی آئی تھی۔ شاہدہ نے کچھ دیر انتظار کر کے آغا کو واپس بھیج دیا۔ زریہ آئیں تو وہ ان کی منتظر تھیں۔ زریہ نے بھی ہمیشہ کی طرح ان کا استقبال دوستانہ لہجے میں کیا تھا۔ ان کے دوستانہ انداز کو دیکھتے ہی انہوں نے اقرا کو آغا کے لیے مانگ لیا تھا۔ زریہ بیگم ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

”تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟“ منہ سے جیسے جھاگ نکلنا شروع ہو گیا۔ وہ شدید غصے میں تھیں۔

”ایک منٹ میں اٹھاؤ یہ کاٹھ کباڑ اور راستہ پکڑو۔۔۔“ ان کی چیخنی آواز پر اقرا دوڑتی ہوئی دروازے تک آئی تھی۔

”زریہ بہن۔۔۔! نرمی سے سوچو، گھر آئے لوگوں کی بھی کوئی عزت ہوتی ہے۔ پھر میرے بیٹے میں کیا برائی ہے۔ خیر سے کمانے لگا ہے، آج نوکر لگا ہے، کل افسر لگ جائے گا۔ دن پھرنے میں وقت ہی کب لگتا ہے۔“ شاہدہ سمجھدار خاتون تھیں، تبھی ان کے غصے کو درگزر کرتے ہوئے نرمی سے انہیں سمجھایا۔

”ہاں تو کیوں کرے میری اقرا، آغا جیسے آوارہ لڑکے کے وقت پھرنے کا انتظار۔۔۔ اس کے لیے رشتوں کا کال پڑ گیا ہے کیا؟“ وہ اور زیادہ بھڑک گئیں۔ اپنے بیٹے کے بارے میں ان کی رائے سن کر شاہدہ بھی غصے سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”ذرا سی عزت کیادی محلے دار سمجھ کے، بی بی تم تو گلے کا ہار بننے لگیں۔“ زریہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ان کا منہ نوچ لیں۔ اقرا تیزی سے اندر آئی تھی۔

”امی پلیز۔۔۔ یہ کیا کر رہی ہیں آپ؟“ وہ ماں کا بازو پکڑتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولی۔

”ان جیسے بے غیرت لوگوں کے ساتھ بات کرنے کا یہی صحیح طریقہ ہے، ہونہر آ جاتے ہیں منہ اٹھا کر۔۔۔“ اور شاہدہ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

”خود نہیں آئی، نہ ہی کوئی شوق ہے۔ یہ جو تیرے بازو سے لگ کر کھڑی ہے ناں۔“ وہ بولنے پر آئیں تو بولتی چلی گئیں۔ اقرا کا دل دھڑکنے لگا بھول گیا۔

”پوچھ اس سے، ہم۔۔۔ م۔۔۔ م بڑا شوق تھا اسے آغا کی دلہن بننے کا۔۔۔ ورنہ میرے آغا کو بھی کمی نہیں ہے لڑکیوں کی۔۔۔“

ایک سے ایک اعلیٰ خاندان سے لڑکی بیاہ کرنے لے آئی تو کہنا۔۔۔ یہ تیرے سامنے سے بارات لے کر جاؤں گی وہ بھی بڑی دھوم دھام سے۔“ زرینہ نے تیکھی نگاہ ساتھ لگی اقرار ڈالی۔ لیکن خاموش رہیں۔

”ہاں ہاں جاؤ۔۔۔ روکا کس نے ہے، میری بلا سے۔“ زرینہ نے ہاتھ جھاڑے۔

”اور سمجھا لینا اس آفت کو۔۔۔ اگر آغا چاہیے تو اب اس کی ماں میرے گھر آ کر خود منت کرے گی۔ میں اب اس گھر کی دلیلیز پار نہیں کروں گی، کبھی نہیں۔۔۔“ چادر اوڑھتے ہوئے شعلہ بارنگا ہوں سے وہ اقرار کو تکی گھر سے باہر نکل گئی تھیں۔

”جا جا اپنے بیٹے کو سمجھا۔۔۔ وہی پیچھے پڑا ہوگا میری اقرار کے، اللہ پوچھے تم لوگوں کو۔“ سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے انہوں نے چلا کر کہا تھا۔ اقرار خاموشی سے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی۔ حمزہ کے آنے کا وقت ہو رہا تھا۔ اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ بھائی کے سامنے کوئی بات کھلے۔۔۔ اپنی اماں کو بھی جانتی تھی۔ حمزہ کے سامنے وہ کوئی ذکر نہیں کرنے والی تھیں۔ کل اس کے جانے کے بعد ہی وہ اس سے تفصیل پوچھیں گی اور وہ اس کے لیے مکمل طور پر تیار تھی۔

”اماں کیا سمجھتی ہیں؟ لالہ کی طرح ہر کسی کو بے عزت کر دیں گی، دبا لیں گی، نہیں ہرگز نہیں، میں لالہ نہیں، اقرار ہوں۔۔۔ میں وہی کروں گی جو میرا دل چاہے گا۔“ اس نے دل ہی دل میں کہتے ہوئے خود کو مضبوط کیا تھا۔

☆.....☆.....☆

سہراب علی خان نے اسے اپنے کمرے میں بلایا تھا۔ انہیں کچھ ضروری معاملات اس سے ڈسکس کرنا تھے۔ وہ جانتا تھا یہ معاملات کیا تھے۔ اور سہراب علی خان کے نزدیک ان کی اہمیت کیا تھی؟ اسی لیے وہ فوراً ان کے کمرے میں پہنچا تھا۔ دونوں ہاتھ پشت پر باندھے ادھر سے ادھر ٹہلتے وہ بے چینی سے اس کے منتظر تھے۔

”آپ نے بلایا بآء جی؟“ کمرے میں آتے ہی وہ مؤدب انداز میں بولا۔ بآء جی کے قدم رکے۔ ضیا علی خان کا سراپا ان کے سامنے تھا۔ ایک گہرا جائزہ لیا پھر اسے سامنے والے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کر کے خود بھی رو برو بیٹھ گئے، یوں کہ نظریں اس کے چہرے کا طواف کرتی رہیں۔

”تمہیں پتا ہے اللہ لوک کی موت کیسے ہوئی۔۔۔؟“ سوال کرتے وقت ان کی چپتے جیسی چمکدار آنکھیں ضیا کی آنکھوں پر جمی تھیں۔ وہ اس سوال پر چونکا تھا۔

”آپ نے بتایا تھا بآء جی اللہ لوک کی موت نیند میں ہوئی۔“ وہ حیرانی سے بولا۔

”نہیں ضیا۔۔۔“ وہ ضبط سے دونوں ہتھیلیوں سے چہرہ چھپاتے سسک دیے تھے۔

”بلکہ مرتضیٰ زیدی کے ہاتھوں بخشی رسوائی اور بدنامی کی چوٹ نے ہمارے خاندان کے ایک اور فرد کو نگل لیا۔“ وہ بچوں کی طرح

سک اٹھے تھے اور ضیا اپنی جگہ پر بت بنا رہ گیا تھا۔

”پتا ہے کیا؟“ ہاتھ چہرے سے ہٹاتے ہوئے انہوں نے کہا۔ ضیا نے دیکھا ان کا چہرہ۔۔۔ آنسوؤں کی شدت سے لال پڑ چکا تھا۔

”انہوں نے مرتے وقت مجھے کہا۔۔۔ سہراب بس ایک بار، ایک بار اس خاندان کو بھی ذلیل و رسوا کر دو۔ میری میت کو سکون مل جائے گا اور میں۔۔۔ میں، سہراب علی خان اس بار بھی کچھ نہیں کر سکا ضیا کچھ نہیں۔“ وہ بچوں کی طرح ہلکے، ہلکے کر رہے تھے۔ ضیا مارے ضبط کے لب کاٹنے لگا۔ اس میں اتنی ہمت بھی نہیں رہی تھی کہ اٹھ کر باپ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے دولفظ تسلی کے بول دیتا۔ وہ کچھ دیر انہیں خاموشی سے روتے دیکھتا رہا۔ بچپن سے لے کر اب تک کا ہر دن جب اس نے یونہی باپ کو روتے دیکھا تھا، نظروں کے سامنے آ رہا تھا۔

”میں بھی ان کے دامن میں ایسا داغ سجاؤں گا بابتی کہ وہ بھی ایک، ایک کر کے یونہی اپنے ہاتھوں موت کو گلے لگائیں گے۔“

اس نے اٹھتے ہوئے ایک عزم سے کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ دروازے کے بند ہونے کی آواز سنتے ہی انہوں نے چہرہ اٹھایا، ضیا جاچکا تھا۔

”دوران خان کہتا ہے، ضیا مقصد بھول چکا ہے لیکن ہم تمہیں کیسے بھولنے دے سکتے ہیں ضیا کیونکہ مقصد تو ہمارا ہی ہے بچے۔“

کینی سی مسکراہٹ نے ان کے ہونٹوں کا احاطہ کیا تھا۔ آنسو کہیں غائب تھے۔ وہ فون اٹھا کر کسی کا نمبر ملانے لگے۔

☆.....☆.....☆

شام ڈھل رہی تھی۔ رات کا اندھیرا آہستہ، آہستہ روشنی کی آخری کرنوں کو بھی نگل رہا تھا۔ وہ سائٹ سے واپس آ رہا تھا۔

اس نے جان بوجھ کر آج گاڑی کے بجائے بائیک کا انتخاب کیا تھا۔ اس وقت سڑکوں پر گاڑیوں کا رش بہت بڑھ جاتا تھا۔ اکثر ٹریفک جام میں پھنس کے گھنٹے دو گھنٹے ضائع ہو جاتے، آج بھی یہی حال تھا۔ روڈ بلاک ہو چکا تھا اور ایک گھنٹے تک رش کم ہونے کا امکان بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے کچھ دیر گاڑیوں کے درمیان رک کر انتظار کیا پھر کچھ سوچتے ہوئے کسی نہ کسی طرح بائیک وہاں سے نکالتا دائیں طرف جاتی ایک غیر معروف شاہراہ پر لے آیا۔ یہ راستہ اب ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا، تبھی اس طرف ٹریفک نہ ہونے کے برابر ہوتی۔

میں روڈ پر ٹریفک زیادہ ہونے کی صورت میں اکاؤنٹ لوگ ہی اس سڑک کا رخ کرتے۔ تبھی اس نے بھی اس راستے کا انتخاب کیا تھا۔ لیکن پہلا موڑ کاٹتے ہی اسے بائیک روکنا پڑی۔ سڑک کے دائیں طرف سفیدے کے درخت سے لگی وہ کار شاید کسی حادثے کا شکار ہوئی تھی۔

یوں لگ رہا تھا جیسے ڈرائیور کو موڑ نظر نہیں آیا تھا اور وہ سیدھا لے گیا تھا کار کو۔۔۔ کار کا اگلا دروازہ ٹکڑے ٹکڑے کھل گیا تھا۔ اور لائینس ابھی تک جل رہی تھیں۔ وہ تیزی سے اس طرف آیا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا لڑکا بے ہوش تھا۔ ماتھے کے اوپر بالوں کے نیچے سے خون کی پتلی لکیر اس کی شرٹ تک بھگو چکی تھی۔ اس نے تیزی سے اس لڑکے کو پیچھے کیا۔ انکیشن میں چابی موجود تھی۔ اس نے ایک دو بار ٹرائی کیا، تیسری کوشش میں گاڑی اسٹارٹ ہو گئی تھی۔ اس کے چہرے پر بڑی خوبصورت مسکراہٹ رہ گئی تھی۔ لڑکے کو اٹھا کر چھلی سیٹ پر لٹایا تو اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی اس کی آنکھوں میں شناسائی رنگ دینے لگی۔ بائیک کو درختوں کے پیچھے چھپا کر اس نے تیزی سے ڈرائیونگ سیٹ

سنجالی اور تھوڑی دیر بعد ہی ٹوٹے پھوٹے بونٹ والی گاڑی اسپتال کی طرف دوڑتی جا رہی تھی۔ صرف دس منٹ میں وہ اسے اسپتال پہنچا چکا تھا۔ اسے سر پر ہلکی سی چوٹ آئی تھی۔ ڈاکٹر نے پٹی کر دی تھی۔ وہ اس کے کمرے میں آیا تو اسے ہوش آچکا تھا۔ اسے دیکھتے ہی زخمی کی آنکھوں میں بھی شناسائی جاگتی تھی۔

”تم چاہو تو اپنی گاڑی میں گھر جا سکتے ہو۔ ڈاکٹر ز کے مطابق تمہاری چوٹ معمولی ہے۔ لیکن تم کسی سخت اسٹریس میں تھے تبھی جلدی ہوش و حواس کھو بیٹھے۔“ اس کا موبائل اور کار کی چابی اس کے سامنے رکھتے ہوئے اس نے بتایا۔ وہ اٹھ بیٹھا۔

”آپ وہی ہیں ناں جنہوں نے چند ماہ قبل بھی میری مدد کی تھی۔ جب میں کہیں جھاڑیوں میں گرا پڑا تھا۔“ اس کے سوال پر وہ بے ساختہ مسکرا دیا۔

”باریال۔۔۔ باریال ولی خان ہے میرا نام۔۔۔“ اس نے تعارف دیا۔

”واؤ، نام بھی آپ کی طرح بہت خوبصورت ہے۔ میں ضیا۔۔۔ ضیاعلی خان۔“ اس نے بھی اپنا تعارف کرایا۔

”ویسے حیرت ہے، میں جب بھی کہیں گرتا ہوں، آپ مجھے سنبھالنے آ جاتے ہیں۔“ وہ اٹھ کر اپنے جوتے پہننے لگا۔ اس کی بات پر اس کے سامنے کھڑا باریال ذرا سا چونکا تھا۔

”گرنے کی اس عادت کو سدھارو، ہو سکتا ہے کبھی میں نہ بچا سکوں۔“ اس نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ ضیا اٹھ کھڑا ہوا۔

”یہ شاید پھر میری بھی آخری ٹھوکر ہو۔“ ضیا مسکرا دیا۔ اس کے گال کا ڈمپل گہرا ہوا۔ باریال اسے کھوجتی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

یوں جیسے اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔

”چلیں۔۔۔“ ضیاعلی خان نے کہا تو باریال چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

”آپ مجھے یہاں میری گاڑی میں لائے۔ مطلب آپ کی گاڑی وہیں روڈ پر ہوگی، میں آپ کو وہاں تک لفٹ دے سکتا ہوں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے شرارت سے دائیں آنکھ دباتے ہوئے کہا تھا۔

”ہاں شیور۔۔۔“ وہ چپ چاپ اس کے ساتھ چل دیا جبکہ دل ہی دل میں نہ جانے کیوں گھبراہٹ سی ہو رہی تھی۔ ضیاعلی خان سے اسے اپنائیت سی محسوس ہوتی لیکن ساتھ ہی کچھ خوف بھی۔۔۔ کوئی انجانا سا خوف۔۔۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ سو سر جھٹک کر اس کے ساتھ چل دیا تھا۔ بانیک تو اسے لینی ہی تھی وہاں سے۔

☆.....☆.....☆

حمرہ ابھی، ابھی آفس کے لیے نکلا تھا۔ زرینہ بیگم نے اس کے گلی کا موڑ کاٹتے ہی دروازہ سختی سے بند کیا اور تیز تیز قدم اٹھاتی اتر کر کمرے کی طرف چل دیں۔ کمرے کا دروازہ بھی اچھی طرح بند کر کے انہوں نے اتر کر اسے چادر کھینچی تھی۔ وہ تو پہلے سے جاگ

رہی تھی اور انگلیوں میں چادر پکڑے لیٹی تھی۔ زرینہ کے یوں چادر کھینچنے پر اس کے لمبے، لمبے ناخن پھنس کے ذرا سا ٹوٹے تھے۔ وہ درد سے بلبلاتا اٹھی تھی۔

”امی۔۔۔“

”خبردار۔۔۔ خبردار جو مجھے ماں کہا۔“ انہوں نے اس کے چلا نے کی پروا کیے بغیر چادر ایک طرف اچھال دی۔ چارونا چاراسے اٹھ کر بیٹھنا پڑا تھا۔

”اب سچ، سچ بتا، یہ آغا کی ماں کیا بک رہی تھی؟“ نفرت اور غصے سے ان کی سانس پھولنے لگی تھی۔

”سب بتا دیا انہوں نے اور کیا سننا چاہتی ہیں۔“ وہ بھی اس دفعہ انہی کے لہجے میں چلائی تھی۔ وہ تو مارے صدمے کے وہیں بستر پر ہی ڈھسے گئیں۔ وہ نظریں چرا گئی۔

”پسند کرتی ہوں میں آغا کو اور وہ بھی مجھے۔۔۔ تو اس میں کیا برائی ہے امی۔۔۔“ وہ انہیں یوں گم صدمہ دیکھ کر نرمی سے ان کے قریب ہوئی۔

”پھر آپ کو نوکری سے ایسا شوق تھا۔ اب تو شاد ویز بھائی سے پہلے آغا کی نوکری ہو گئی ہے، گھر بیٹھے اتنا اچھا رشتہ مل گیا میرے لیے۔ آپ کو تو خوش ہونا چاہیے۔“

”یہ سب لالہ کا کیا دھرا ہے ناں۔۔۔؟“ وہ اس کی بات ان سنی کرتے ہوئے تیز لہجے میں بولیں، اقرا کا منہ کھل گیا۔

”اسی نے تجھے مائل کیا ہے ناں اس آغا کی طرف۔۔۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئیں، انداز میں عجیب سی جارحیت تھی۔

”اس دن شام کو تیرے ساتھ آئی تھی، یاد ہے تجھے، سارا دن یہی سکھاتی رہی تھی ناں تجھے۔۔۔“

”امی پلیز۔۔۔!“ وہ بھی بیڈ سے نیچے اتر آئی۔

”خدا کا واسطہ ہے لالہ کا بیچھا چھوڑ دیں۔۔۔ ایسا نہ ہو اس کی آپ کی بیٹی کی زندگی اجیرن بنا دیں۔“ وہ ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی۔ زرینہ نے زہر خند نظر اس پر ڈالی۔

”چھوڑ دوں۔۔۔؟“ ان کے لہجے میں بھی زہر تھا۔

”اس کی تو میں وہ درگت بناؤں گی کہ لوگ دیکھیں گے لیکن پہلے۔۔۔“ وہ ذرا سارکیں۔

”پہلے میں تیری اور شاد ویز کی بات پکی کر دوں۔ اب میں تجھے اور ڈھیل نہیں دے سکتی۔“ ان کا لہجہ قطعی تھا۔ اقرا تاسف سے انہیں دیکھ گئی۔

”میری شادی آغا سے طے کر دیں اماں۔۔۔ ورنہ۔۔۔“

”ورنہ کیا۔۔۔؟ ہاں۔۔۔“ انہوں نے غصے سے اسے جھاڑا تھا۔
 ”یہ بھی آپ دیکھ لیں گی۔“ لب کچلتے، غصے سے کہہ کر وہ پیر پٹختی باہر نکل گئی۔
 زرینہ بیگم نے قریب پڑا گلدان اٹھا کر دیوار پر دے مارا تھا۔

☆.....☆.....☆

احمد انٹرپرائزز سے اس کی مینٹنگ شاندار رہی تھی۔ عہدیداران کو نہ صرف اس کے آئیڈیاز بہت پسند آئے تھے بلکہ وہ اس کے پہلے پروجیکٹ میں انویسٹ بھی کرنا چاہ رہے تھے۔ وہ آج بے حد خوش تھا۔ ان کے آفس سے نکلتے ہی اس نے اپنی خوشی دیدے سے شیر کی تھی۔ ان سے دعائیں وصول کر کے جونہی اس نے کال بند کی، اس کا فون بجنے لگا۔ امن کی کال تھی۔ اس نے فوراً پک کی اور گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

”کیا بات ہے؟ بہت خوش نظر آرہے ہو۔“ دوسری طرف امن نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔
 ”don't tell me، تم یہیں کہیں ہو۔“ وہ خوشگوار حیرت میں مبتلا ہوا تھا۔
 ”تو۔۔۔؟“ روکھا سا جواب آیا۔

”تو سے مطلب۔۔۔ کہاں ہو یا۔۔۔؟ بتاؤ مجھے۔“ وہ ادھر ادھر اسے تلاش کرتے ہوئے بولا۔
 ”کیوں بتاؤں؟“

”ملنا ہے تم سے اور کیا۔۔۔؟“ باریال مسکرایا۔

”دو دن تمہارے گھر جاتی رہی۔۔۔ تم نے وعدہ جو کیا تھا۔۔۔ وہاں ملے نہیں، اب بھی یہ احسان کرنے کی ضرورت نہیں۔“ وہ ناراض لہجے میں بولی۔

”ہاں تو سوری کروں گا ناں۔۔۔“ وہ فوراً غلطی مان گیا۔

”بس یہی عادت تمہاری بہت اچھی ہے تم اکڑو نہیں ہو۔“ وہ کھلکھلا دی تھی۔

”ویسے میں تمہارے پیچھے پارکنگ میں ہی کھڑی ہوں۔ آفس کے کام سے آئی تھی۔“ اس نے ہنستے ہوئے بتایا۔ باریال نے مڑ کر پارکنگ ایریا کی طرف دیکھا۔۔۔

سامنے ہی امن نے اسے دیکھتے ہی ہاتھ ہلا دیا۔۔۔ وہ مسکرا کر فون بند کرنا اس کی طرف آ گیا۔

”تم بہت برے ہو باریال۔۔۔“ اس کے پاس آتے ہی وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔

”آئی ایم سوری۔۔۔“ اس نے دایاں ہاتھ سینے پر جماتے ہوئے مؤدب انداز میں کہا۔

امن کو وہ بے حد کھلا کھلا لگا، فریش سا۔۔۔ خوش سا۔۔۔

”چلو، آج میری طرف سے ٹریٹ۔۔۔“ وہ اسے اشارہ کرتے ہوئے اپنی گاڑی کی طرف آگیا۔

”وہ کس خوشی میں۔۔۔؟“ وہ بھی اسی طرف آگئی۔

”آج ایک بہت بڑے انویسٹر سے بات ہوئی ہے میری، ڈیل تقریباً تیار ہے۔“ وہ گاڑی اسٹارٹ کرتا خوشی، خوشی بتانے لگا۔
امن کی آنکھیں نہ جانے کیوں بجھ سی گئیں۔

اس نے فرنٹ ڈور پہلے ہی اس کے لیے کھول دیا تھا۔

"Congrats" کہتے وہ گاڑی میں اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔

”شکریہ۔۔۔“ وہ مسکرایا۔

امن خاموش رہی۔

”بتاؤ کہاں چلیں۔۔۔؟“ باریال نے پوچھا۔

”جس کا رز۔۔۔“ مختصر جواب دے کر وہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

باریال نے اس کی خاموشی نوٹ نہیں کی تھی۔ وہ خود میں مگن تھا۔ بے حد خوش۔۔۔

☆.....☆.....☆

جب سے اللہ لوک کی موت کی خبر آئی تھی، اوزگل بالکل مرجھا کے رہ گئی تھی۔

باء جی صرف دو دن یہاں رہے تھے۔ الیکشن سرپر تھے اور انہوں نے ایک ساتھ کئی ترقیاتی کام شروع کر دیے تھے اپنے علاقے میں۔۔۔ اس ضمن میں سب سے پہلے کھیتوں میں پختہ نالوں کی تعمیر تھی۔

نہر علاقے میں موجود تھی۔ لیکن صرف خان کی زمین ہی سیراب ہوتی تھیں اور باقی پانی بند کر دیا جاتا۔ عام لوگوں کو بارش کے پانی پر ہی گزارہ کرنا پڑتا۔ کاشتکاری کے لیے۔۔۔ اس کا سب سے بڑا مقصد انہیں مالی طور پر کمزور کرنا اور قرضہ جات کے بوجھ تلے دبانا تھا۔

سارے سال کی محنت کے باوجود وہ صرف اس قدر کم پاتے کہ ایک تو سال آرام سے گزر جاتا اور دوسرے قرضے کا کچھ حصہ واپس کر دیا جاتا۔ لیکن سال کے آخر میں فصل کے لیے بیج، کھاد اور دواؤں جیسے مزید اخراجات کے لیے دو گنا قرضہ لے لیا جاتا۔ اور اس طرح نسل در نسل غلامی منتقل ہوتی رہتی۔

لیکن اب دور بدل گیا تھا۔ علم و آگہی کی روشنی میں نئی نسل غلامی کی زنجیروں کو نہ صرف محسوس کرتی بلکہ ان کے بوجھ سے نکلنے کے راستے بھی تلاش کر سکتی تھی۔ جمہوری نظام نے اور کچھ دیا ہو یا نہ دیا ہو، عام انسان کو سب سے بڑا حق ضرور دیا ہے کہ وہ اپنے حق کے لیے

سوچے اور صحیح فیصلہ کرے۔

نئی نسل میں شعور و آگہی کا جذبہ تھا اور وہ تجربہ کر بھی سکتے تھے۔ اسی لیے سہراب علی خان کو بھی کچھ اصول توڑنے پڑے تھے۔ پھر وہ اچھی طرح جانتے تھے صرف ایکشن جیتنے تک ان کو جھکنا تھا ذرا سا۔ اس کے بعد وہ بادشاہ تھے۔ سو یہ سودا مہنگا نہیں تھا۔ اسی لیے صرف دو دن ہی وہاں گزار کر وہ واپس چلے گئے تھے۔

اور اب ایک ہفتہ ہو چکا تھا لیکن اوڑگل خود کو نہیں سنبھال پا رہی تھی۔ اب بھی مینے اسے تلاش کرتی لان کی طرف آئی تو وہ برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھی رو رہی تھی۔ گل مینے ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی۔

”گل۔۔ تم پھر رو رہی ہو؟“ گل کے قریب بیٹھتے ہوئے وہ خفا لہجے میں بولی۔

”پتا نہیں کیوں مینے۔۔۔“ اس نے دائیں ہاتھ کی پشت سے اپنے گال صاف کرتے ہوئے کہا۔

”مجھے لگتا ہے اللہ لوک مری نہیں، ابھی زندہ ہیں۔“

”جب بھی کوئی پیارا مرتا ہے تو ہمیں ایسا ہی لگتا ہے نا۔۔۔“ مینے نے بہن کو ساتھ لگا لیا۔

”تم نے ہی تو مجھے بتایا تھا گل۔۔۔ امی کے مرنے پر بھی تمہیں کئی دن وہ قبر میں زندہ نظر آتی تھیں۔“ وہ اسے یاد دلانے لگی۔

”لیکن وہ صرف خواب تھے مینے۔۔۔ یہ احساس ہے۔۔۔ جیتا جاگتا احساس۔۔۔“ وہ بے بس لہجے میں بولی۔

”مجھے سچ میں لگتا ہے اللہ لوک کے ساتھ کچھ غلط ہوا ہے۔“

”لیکن کیا گل۔۔۔!“ مینے کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔

”ہماری اپنی حویلی میں، اتنے بدرگوں (محافظوں) کی موجودگی میں کچھ غلط کیسے ہو سکتا ہے ان کے ساتھ۔“

”یہی تو مجھے سمجھ نہیں آرہی۔۔۔“ اس کا لہجہ پھر بھینگنے لگا۔

”لیکن مجھے لگتا ہے وہ مجھے یاد کر رہی ہیں، مجھے پکار رہی ہیں، اللہ لوک۔۔۔ کاش میں آپ کو چھوڑ کر یہاں نہ آئی ہوتی۔۔۔“

کاش۔۔۔ وہ گھٹنوں میں سر دیے پھوٹ پھوٹ کے رودی تھی۔ گل مینے نے اس کے لرزتے وجود کو ساتھ لگا لیا تھا۔

☆.....☆.....☆

آہنی دروازہ اتنی زور سے بجا تھا کہ نانو کا کمزور سادل بے اختیار دھڑدھڑا گیا تھا۔

”یا اللہ خیر۔۔۔!“ فوراً ہی دل کو سنبھالتی اٹھ بیٹھیں۔ گھر پر اس وقت وہ اکیلی تھیں۔ برآمدے میں لیٹیں تو نہ جانے کیسے آنکھ لگ

گئی۔ دروازے کی زوردار آواز نے ایک دم نیند سے جگایا تو مریض دل کانپ، کانپ گیا۔ جتنی دیر میں وہ خود کو نارمل کرتی چپل پہنئیں۔۔۔

دروازہ مزید زور سے بجا گیا۔

”صبر کر لو۔۔۔ آ رہی ہوں۔“ انہوں نے چیپل پہنی اور دھیرے دھیرے آ کر دروازہ کھول دیا۔ آنے والا بھی مسلسل دستک جاری رکھے ہوئے تھا۔

”زرینہ، تم۔۔۔؟“

”کیا ہے اماں۔۔۔؟“ زرینہ کو سامنے دیکھ کر ان کی تیوری چڑھ گئی۔ وہ جھنجھلائی ہوئی اندر داخل ہوئیں۔
 ”اتنی گرمی میں کتنی دیر سے دروازہ بجائے جا رہی ہوں۔۔۔ سارے مرگئے ہیں کیا جو آپ کو آنا پڑا۔“ وہی تلخ کڑوا لہجہ۔۔۔
 ”استغفار کر بی بی۔“ انہیں تو فوراً غصہ آیا۔

”کبھی تو کچھ اچھا بول لیا کر۔۔۔“ دروازہ بند کرتیں ان کا انتظار کیے بغیر واپس تخت پر آ بیٹھیں۔
 ”آپ تو بس مجھے ہی سنانا۔۔۔ ان کم بختوں کو کچھ نہ کہنا۔“ وہ منہ بناتے ہوئے ماں کے ساتھ ہی بیٹھ گئیں۔
 ”ہیں کدھر سارے؟“ انہوں نے متحس نظروں سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”لالہ گئی ہے یونیورسٹی، سین، شاویز کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس گئی ہے۔ دل بے وفا ہو رہا ہے اس کا۔“ اماں کے لہجے میں دکھ تھا۔
 ”ہاں تو اس میں کیا انوکھا ہے اماں۔۔۔“ وہ کبھی اڑاتے ہوئے بولیں۔

”ہمارے بھائی کو مرے تو سالوں ہو گئے، یہ سخت جان نہ جانے کس کے لیے جیے جا رہی ہے۔“ انہوں نے سفاکیت کی حد کر دی تھی۔

”شوہر تو تیرا بھی برسوں پہلے چھوڑ گیا۔ تو کیا دوسری سیٹ بھی پکی ہے۔“ انہوں نے بھی تاک کے نشانہ لگایا تھا، لب خود بخود دسل گئے تھے۔

”اور اب خاموش ہو کر بیٹھ، اگر کچھ اچھا بولنے کے لیے نہیں ہے۔“ انہوں نے سخت لہجے میں کہتے ہوئے تکیے سے ٹیک لگالی۔
 ”خیر اماں۔۔۔ آئی تو میں ایک اچھے کام سے ہی تھی۔“ وہ ان کا ٹانگیں دبائے لگیں۔
 ”بول۔۔۔“ وہ آنکھیں موندے لیٹی رہیں۔

”اماں، اقر اور شاویز کے لیے آئی ہوں۔“

”لو۔۔۔ پھر وہی پرانا قصہ۔۔۔“ اماں اس بات پر اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

”تم اچھی طرح جانتی ہو، شاویز اس کے لیے کبھی راضی نہ ہوگا۔“

”تو راضی کرو ناں اماں۔۔۔ آپ کے زیر سایہ ہی پرورش پائی ہے، آپ کو انکار کرے گا بھلا؟“ وہ منت پر اتر آئیں۔
 ”بات کیا ہے زرینہ؟“ اماں بغور ان کا چہرہ دیکھنے لگیں۔

”گھر کی بات ہے ناں اماں، بڑے اچھے اچھے رشتے آرہے ہیں اقرا کے۔۔۔ لیکن آپ تو جانتی ہو اماں شادو یز مجھے کس قدر عزیز ہے۔“ وہ فوراً بات بدل گئیں۔

”ہاں، ہاں یہ مجھ سے زیادہ کون جان سکا ہے؟“ نانو کے لہجے میں فوراً طنز ابھرا۔

”آپ جو اماں ہمیشہ سے مجھے ہی غلط سمجھنا۔“ وہ خفا ہونے لگیں۔

”اچھا میں بات کروں گی شادو یز سے۔۔۔ لیکن وہ مانے گا نہیں، میں جانتی ہوں۔“

”اس کا مطلب مجھے کچھ اور کرنا پڑے گا۔“ وہ سوچتے ہوئے بولیں۔

”سین سے بات کرو گی؟“ اماں نے فوراً اس کی سوچ پڑھ لی تھی۔

”کوئی بات تو ہے زریں۔۔۔ پر ہی لگے ہیں آج تو تمہیں۔۔۔“ اماں نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔

”اچھا یہ بتاؤ اماں، بھابھی تو ٹھیک ہیں۔“ اور اماں ان کے اس قدر میٹھے لہجے پر وہ بھی سین کے لیے۔۔۔ ہوش میں رہتیں تو

جواب دیتیں ناں۔۔۔

☆.....☆.....☆

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا۔ جب موبائل پر چیختی رنگ ٹون نے اسے بوکھلا کے رکھ دیا تھا۔ اس نے اٹھ کر فوراً فون چیک کیا۔ کال زمزم کی طرف سے کی گئی تھی۔ ایک پل کے ہزارویں حصے میں اس کا دماغ بیدار ہوا تھا۔ پچھلے کئی دنوں سے وہ یونیورسٹی اور بہنوں کے ساتھ اس قدر مصروف رہا تھا کہ زمزم کی طرف خیال تک نہیں گیا تھا۔ فون تھوڑی دیر بجنے کے بعد بند ہو گیا تھا۔ اس نے فوراً اسے کال بیک کی۔ نمبر بند تھا، اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس نے تیزی سے اٹھتے ہوئے ابراہیم کا نمبر ملایا۔ اس کی توقع کے مطابق وہ ابھی تک جاگ رہا تھا۔ اس نے فوراً کال ریسیو کی تھی۔

”تم یہاں بنگلے پر ہو۔۔۔؟“ ضیاء نے تیز لہجے میں پوچھا۔

”نہیں، میں تو آج شاہد کی طرف ہوں۔“

”فوراً خانم کے بنگلے پر پہنچو، شاہد کو بھی ساتھ لے لینا۔“ اس نے کہتے ہی فون بند کر دیا تھا۔ اور دوسرا نمبر ملانے لگا۔ ساتھ، ساتھ وہ شوز بھی پہن رہا تھا۔ بوٹ پہننے کے بعد اس نے سائیڈ ٹیبل پر لگا مٹن دبا دیا تھا۔ سائرن کی تیز آواز کوارٹرز میں گونجی تھی۔ اس نے کھڑکی کا پردہ اٹھا کر دیکھا۔ اس کے بدرگے تھیریا رسنجا لے باہر آچکے تھے۔

”ہیلو۔۔۔“ کال پک ہوئی تھی، خانم کی کھٹکتی آواز ابھری۔

”زمزم کہاں ہے؟“ وہ بھاری لہجے میں بولا۔

”آپ نے بھلا دیاسر کا تو نئے گا ہک تو ڈھونڈنے پڑتے ہیں، ورنہ آپ جانتے ہیں لاش انسان کی ہو یا حیوان کی گل سرڑ کر بدبو دینے لگتی ہے۔ اور یہاں بھی سب زندہ لاشیں ہی ہیں سرکار۔۔۔“ وہ کمینگی سے ہنسی تھی۔

”زمرمہ کو اگر کسی نے ہاتھ لگانے کی بھی کوشش کی ناں خانم۔۔۔ تو نتیجے کی ذمہ دار تم خود ہوگی۔“ اس کے لہجے میں نہ جانے کیا تھا۔ خانم کے ہاتھ کانپ گئے تھے۔

”میں کچھ لحوں میں وہاں خود آ رہا ہوں، تب تک زمرمہ تمہاری ذمہ داری ہے اور ہاں مال کی فکر مت کرنا۔“ اسے وارن کرتا وہ نیچے آیا تھا اور کال بند کر کے سیل ڈیش بورڈ پر اچھال دیا تھا۔ اس کے گاڑی میں بیٹھتے ہی چاروں بدرگے اندر بیٹھ گئے۔ رش ڈرائیونگ کرتا وہ صرف بیس منٹ میں وہاں پہنچا تھا۔ ابراہیم اور شاہد اس کے منتظر تھے۔ خانم اور زمرمہ بھی ان کے ساتھ تھے۔ زمرمہ مسلسل روئے جا رہی تھی۔ ضیا فوراً اس کی طرف آیا تھا۔

”تم ٹھیک ہو زمرمہ۔۔۔“ وہ صرف سر ہلا گئی تھی۔

”اسے تم اور دوران فارم ہاؤس پر اماں بی کے حوالے کر کے آؤ گے۔ ان سے کہنا اسے وہاں کوئی تکلیف نہ ہو۔“ اس نے ابراہیم کو ہدایت کی۔

”اور خانم یہ میرے آدمی ہیں، انہیں اپنا اکاؤنٹ نمبر بتا دینا۔“ وہ مڑنے لگا۔

تبھی زمرمہ نے پکار لیا۔

”ضیا۔۔۔ کیا تم مجھے وہاں چھوڑ سکتے ہو؟“ وہ متذبذب تھی۔

”ابراہیم میرے بھائی کی طرح ہے۔ میری طرح ہی سمجھو۔۔۔ بے فکر رہو۔“ وہ اسے فکر مند دیکھ کر مسکرایا۔

”مجھے کل ایک بہت پرانا بدلہ چکانا ہے، میرے لیے دعا کرنا۔ خدا مجھے کامیاب کرے۔“

”آمین۔۔۔“ زمرمہ نے صدقِ دل سے دعا کی تھی۔

☆.....☆.....☆

”تم کہاں جا رہی ہو؟“ حمزہ کے ساتھ تیار کھڑی اقرا پر نظر پڑتے ہی زمرینہ تلملائی تھیں۔

”کیا ہو گیا ہے امی آپ کو۔۔۔؟ کالج لے کے جا رہا ہوں، نیا سیشن اسٹارٹ ہو گیا ہے۔“ حمزہ نے حیرت سے بتایا۔

”بس بہت ہو گئی پڑھائی۔ اب گھر کے کام وام سیکھ لے کافی ہے۔“ انہوں نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

”چلیں بھائی چلیں۔۔۔ دیر ہو رہی ہے۔“ اقرا فوراً نقاب درست کرتی باہر نکل گئی۔ وہ بھی بانیک نکالنے لگا۔ زمرینہ گیٹ تک آ گئیں۔

”وقت پہ لینے پہنچ جانا اسے پھر۔۔۔“ حکم دیا اور دروازہ ٹھاہ سے بند۔۔۔

”امی کو کیا ہوا ہے؟“ بایک اشارت کرتے ہوئے اس نے حیرت سے پوچھا۔
 ”کل لالہ کے گھر گئی تھیں۔ وہاں سے آ کر ایسی ہی ہو جاتی ہیں۔“ اقرانے بیزار لہجے میں جواب دیا۔
 ”ہم۔۔۔ م۔“ حمزہ نے بایک آگے بڑھادی تھی۔

☆.....☆.....☆

”لالہ۔۔۔“ وہ اپنے خیالوں میں مگن ڈیپارٹمنٹ کے پچھلے لان کی طرف جا رہی تھی۔ جب دنیا کی پکار پر ٹھٹک کے رکی تھی۔
 ”کیا میں تمہارے چند سیکنڈ لے سکتا ہوں؟“ وہ اس کے قریب آ کے رکا۔
 وہ اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

”مجھ سے شادی کرو گی لالہ۔۔۔؟“ اور لالہ کی نظر ان دو یا قوتی لبوں پر ٹھہری گئی تھی۔ سحر سا تھا جس نے اسے اپنے حصار میں جکڑا تھا۔ وہ بت بنی رہ گئی تھی۔

”بات صرف چند سیکنڈز کی ہے لالہ۔۔۔ میں نے مہلت بھی چند سیکنڈز کی مانگی ہے۔ مجھے جیون دان کر دو۔ یا میرا سب چھین لو۔۔۔“ کوئی اس طرح اچانک اس قدر خوب صورت انداز میں بھی اسے اپنانے کا کہہ سکتا ہے۔ وہ سن ہو کر رہ گئی تھی۔
 وہ سادہ مسکراہٹ والا، جس کی آنکھیں جادو کرنا جانتی تھیں، پل، پل رنگ بدل دیتی تھیں۔ کوئی ان کو جان نہ سکتا تھا، پڑھ نہ سکتا تھا۔ وہ جو دوستی لٹائے رکھنا ایمان مانتی تھیں، دیو مالائی شخصیت جسے چاہتی اپنے سحر کے نور میں جکڑ لیتی، وہ اس کے سامنے ہاتھ پھیلائے کھڑا تھا اور وہ۔۔۔ چاہے جتنی بھی مضبوط ہو، تھی تو لڑکی، نرم جذبات سے گندھی، موم کی گڑیا۔۔۔ ہلکی سی آنچ پھبھی جو پکھل پکھل جاتی ہے۔
 ”ماں کی طرح اپنا معاملہ خود ہی نہ سیٹ کر لے تو کہنا۔“ اور اترتے سنہرے رنگ نے ایک دم ہی دھوئیں کا لبادہ اوڑھا تھا۔
 دھنک کے سارے رنگ سیاہ رنگ میں غائب ہو گئے تھے۔

”بدکردار ماں کی بیٹی نیک کیسے ہوگی؟“

”خاندان کے منہ پر ایک کالک مل کے نہ چلی گئی تو سبین کی بیٹی نہ ماننا۔۔۔“ اس کے کان کے پردے پھٹنے لگے تھے۔ سامنے کھڑے ضیا کے خوب صورت روپ نے ایک دم ہی کسی چھلاوے کی صورت اپنالی تھی۔ لحوں میں اس سے دور جا کھڑا ہوا تھا۔ یا۔۔۔ یا پھر یہ اس کا وہم تھا۔

”لالہ۔۔۔“ اسے یوں خاموش دیکھ کر ضیا نے پکارا۔ وہ چونکی۔۔۔ پھر خود کو مضبوط کرتی وہ دو قدم اس کے قریب آئی۔
 ”ہم دونوں کے بیچ ذات کا یہ واضح فرق تم کیسے بھول گئے ضیا۔“
 ”ہم کوشش تو کر سکتے ہیں۔“

”نہیں، ہرگز نہیں۔۔۔ میرا کردار ہی میری پونجی ہے، وقت نے جو طے کر رکھا ہے وہ وقت پہ چھوڑ دو ضیا۔۔۔ میں تمہارا راستہ ہوں نہ منزل۔۔۔ آئندہ میرے راستے میں آنے کی کوشش مت کرنا۔“ قطعی لہجے میں کہتی وہ آگے بڑھنے لگی۔

”لالہ۔۔۔“ ضیا اس کے ہم قدم ہوا۔

”پلیز ضیا۔۔۔ عورت کی زندگی میں محبت نہیں، عزت اہم ہوتی ہے۔ اور مجھے میری اور میرے خاندان کی عزت بہت عزیز ہے۔“

”دوسروں کی عزت سے کھیلنے والے ایسا کیسے سوچ سکتے ہیں؟“ ضیا کے لبوں سے پھسلا تھا۔ آگے بڑھتی لالہ کے قدم جھٹکے سے رکے تھے۔ وہ فوراً مڑی تھی۔

ضیا کی آنکھوں کے جلتے رنگ اسے اندر تک خوفزدہ کر گئے تھے۔ کچھ تو تھا۔۔۔ وہ اس سے مزید بات کیے بنا تیزی سے ڈیپارٹمنٹ کی طرف بڑھ گئی تھی۔

”اماں صبح کہتی تھیں۔ مجھے یونیورسٹی میں ایڈمیشن نہیں لینا چاہیے تھا۔“ لمبے کاریڈور میں قدم رکھتے ہی اس نے تہیہ کیا تھا کہ وہ گھر جا کر شاویز سے ضیا کا ذکر ضرور کرے گی۔۔۔ یا پھر یونیورسٹی ہی نہیں آئے گی۔

اسے خبر بھی نہ تھی۔۔۔ قدرت اسے یہ موقع دینے والی تھی یا نہیں۔۔۔

☆.....☆.....☆

سادگی سے سجایا ایک ستے ہوٹل کا کمرہ تھا۔ یونیفارم پر گلہابی دوپٹا اوڑھے وہ سر جھکائے بیڈ پر پیر لٹکائے بیٹھی تھی۔ نظریں نیچے زمین پر جمی تھیں۔

سفید ماربل کے میبلے، میبلے سے فرش پر کئی چہرے، کئی منظر بن اور بگڑ رہے تھے۔

”ہاں گڑیا۔۔۔ میں لالہ سے بہت محبت کرتا ہوں۔“ وہ حمزہ تھا۔ برآمدے کے ستون سے ٹیک لگائے وہ اس سے بات کر رہا تھا۔

”مجھے پتا ہے تم وہاں اس پچھلے کٹنی لالہ کے لیے ہی جاتے ہو۔۔۔ اور تم کیا شاویز کو ہر وقت بھائی، بھائی کہہ کر چسکی رہتی ہو، لالہ سے ہی سیکھ لو کچھ ناز انداز۔۔۔“

اماں تو بولتی بھی دوغلا تھیں۔۔۔ جو بات دوسرے کے لیے طعنہ، اسی کا سبق اسے پڑھاتیں۔

”ہم لڑکیوں کی زندگی کسی کانچ کے برتن کی طرح ہوتی ہے اقرار۔۔۔ ساری عمر ڈر لگا رہتا ہے، کہیں کچھ غلط نہ کر بیٹھیں، کوئی کھر وچ نہ پڑ جائے۔۔۔ ایک بار اسکرینچ پڑ جائے ناں تو ساری عمر بس لوگوں کو وہی داغ نظر آتا ہے۔ مرد ہمیشہ پتھر کی طرح ہوتا ہے۔ خود داغدار نہیں ہوتا، عورت جیسے شیشے میں پوری دراڑ ڈال دیتا ہے۔“ لالہ کی آنکھیں نم تھیں، اس کی بھی آنکھیں جلے لگیں۔

”کہیں تمہاری ماں کا کیا تمہارے سامنے نہ آجائے۔“ کبھی لالہ نے اسے کہا تھا۔

”اگر ایسا ہے تو یونہی سہی۔۔۔ میں اس کے لیے تیار ہوں لالہ۔۔۔“ کمرے کا واحد دروازہ کھلا اور آغا اندر آیا تھا۔

”اقرا، مولوی صاحب اور میرے دوست آچکے ہیں، کیا تم واقعی تیار ہو؟ سوچ لو اب بھی وقت ہے۔“ وہ اس کے سامنے دوزانو ہو کے بیٹھ گیا، اقرانے نرم چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔

”شادی میرے بھائی کی طرح ہیں آغا۔۔۔ خدا کی قسم اماں اگر ان سے میری شادی کے لیے ضد نہ پکڑتیں تو میں تمہیں کبھی یہ قدم اٹھانے کے لیے نہ کہتی۔“ وہ سسکی۔

وہ ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا۔

”ٹھیک ہے، تم چہرہ ڈھانپ لو، میں سب کو اندر بلاتا ہوں۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

اقرانے گلابی گھونٹ مزید آگے کو پیچ لیا تھا۔

☆.....☆.....☆

اور وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کے ساتھ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ اب جبکہ ساری بات طے تھی، سب کچھ مکمل تھا، وہ کاغذات تک بنوا چکا تھا۔ اور اب عین وقت پر انویسٹر کو کچھ تحفظات نظر آنے لگے تھے۔ انہوں نے عین وقت پر اس کے ساتھ کسی قسم کے معاہدے یا شیرنگ سے انکار کر دیا تھا۔

اس روز باریال ولی خان جس قدر خوش اس بلڈنگ سے نکلا تھا آج اسی قدر اداس اور ناامید۔۔۔ رات ہی تو اس کی بات ہوئی تھی منیجر سے۔۔۔ وہ جلد از جلد معاہدہ کرنا چاہتے تھے۔ اور پھر آج صبح، یوں اس طرح ایک دم سے سیدھا انکار۔۔۔ بے دلی سے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے اس نے فائل بچھلی سیٹ پر اچھالی اور خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ اسٹیئرنگ پر ہاتھ جماتے وہ خالی ذہن کے ساتھ بیٹھارہا کہ فون کی آواز سن کر چونک پڑا۔

”امن کالنگ۔۔۔ اس نے بد دلی سے اوکے کیا تھا۔

”باریال۔۔۔ وہ میں پوچھنا چاہ رہی تھی کہ کیا تمہارے پراجیکٹ میں تھرڈ پرسن کی جگہ ہے، ایچو نیلی تمہارا پہلا پراجیکٹ ہے ناں۔۔۔ تو میں بھی تمہارے ساتھ۔۔۔“ وہ ہنسی بولے۔

”فرسٹ انویسٹر نے عین موقع پر جواب دے دیا امن۔۔۔“ اس نے اداسی سے بتایا۔

”کیا۔۔۔؟“ امن حیرت سے چلائی تھی۔

”بعد میں بات کرتا ہوں، بائے۔“ اس نے کہہ کر فون آف کر دیا۔ اسے ایک مرتبہ پھر ڈپریشن ہونے لگا تھا۔

”دیدے کہتی ہیں بھول جاؤ۔۔۔ معاف کر دو۔۔۔ یہ دنیا والے بھولنے دیں تب ناں۔۔۔“ اس نے اداسی سے سوچتے ہوئے

گاڑی اسٹارٹ کی۔ اسے جلد از جلد گھر پہنچنا تھا۔

☆.....☆.....☆

لالہ جس خاموشی سے اس کی بات سن کر چلی گئی تھی یہ بالکل اس کی توقع کے خلاف تھا۔ ضیاء نے دیکھا تھا اس کی آنکھوں میں واضح تشویش تھی۔ وہ جانتا تھا کہ لالہ کافی شارپ لڑکی تھی اور اس کی آنکھوں سے چھلکتی تشویش بتا دیتی تھی کہ وہ ضیاء کا مقصد کچھ، کچھ تو سمجھ ہی گئی تھی۔ وہ کچھ بھی کر سکتی تھی۔ کوئی بھی ایشو کری ایٹ کر سکتی تھی اور وہ ایسا بالکل بھی نہیں چاہتا تھا۔ اس نے فوراً زید کا نمبر ملایا۔

”کہاں ہو زید۔۔۔؟“

”کینٹین میں، کیوں؟“ اس نے جواب دیا۔

”بہروز خان کے گروپ کے ساتھ تصادم۔۔۔ یونیورسٹی بند۔۔۔“ ضیاء نے کہا تو وہ حیرت سے بولا۔

”مطلب۔۔۔؟“

”یہ خبر کل تک ہر نیوز چینل پر لگ جانی چاہیے۔“

”اوکے۔۔۔ سمجھ گیا۔“

”اور سنو۔۔۔ حالات کچھ اس طرح کے کر دینا کہ بھگدڑ مچ جائے۔“ ضیاء نے اگلی ہدایت دی۔

”مطلب، ہتھیار؟“

”سمجھدار ہو۔۔۔ سنبھال لینا۔“ اس نے فون بند کرتے ہوئے مسکراتے ہوئے کہا اور دوسری کال ملانے لگا۔

”جی خان جی۔۔۔“ دوران خان نے دوسری بیل پہ ہی کال پک کی تھی۔

”دو گاڑیاں لے کر یونیورسٹی کے گیٹ پر پہنچ جانا۔ مزید ہدایات تک میرے فون کا انتظار کرنا۔“ اس نے ہدایات دے کر فون بند کر دیا تھا۔

☆.....☆.....☆

یونیورسٹی کے دو سیاسی یوتھ ونگ گروپ میں تصادم چھڑا تھا۔ واقعہ اس قدر اچانک ہوا تھا کہ ہر کوئی اپنی موجودہ جگہ پہ پھنس کے رہ گیا تھا۔ خاص کر لڑکیوں کی پریشانی کافی زیادہ تھی۔ ایک تو اتر سے ہوتی فائرنگ اور اوپر سے خوف و ہراس سے لوگوں کا پاگلوں کی طرح دوڑنا، سیکورٹی کو کنٹرول کرنے میں مشکلات پیش آنے لگی تھیں۔

”ڈیپارٹمنٹ کے پچھلے حصے سے نکلو۔۔۔“ شاہد نے کاریڈور میں جمع سب لڑکیوں کو ہدایت کی۔ وہ پاگلوں کی طرح بھاگیں۔

ان میں ایک لالہ بھی تھی۔ کاریڈور کی سیڑھیاں اترتے کسی نے آخری اسٹیپ پہ اسے ہلکا سا دھکا دیا تھا اور وہ گھٹنوں کے بل گری تھی۔ ساری

لڑکیاں تیزی سے بھاگ کے اس سے دور ہوتی گئی تھیں۔ وہ گھٹنے سہلاتی اٹھی۔ درد کی تیز لہر نے اسے سسکاری بھرنے پر مجبور کر دیا۔ لیکن کسی طرح وہ باہر آنے میں کامیاب ہو گئی۔ تبھی ایک سلیٹی رنگ کی کار اس کے سامنے رکی تھی۔

”لالہ۔۔۔ اندر بیٹھو جلدی۔۔۔“ وہ ضیا تھا۔ لالہ دو قدم پیچھے ہوتی تھی۔ تبھی فائرنگ کی آواز سنائی دی۔ آواز کہیں قریب ہی تھی۔

”ایزیووش۔۔۔“ اس نے کندھے اچکاتے ہوئے گنیر بدلا۔

”ضیا، رکو۔۔۔“ تیزی سے اسے آواز دیتی وہ اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ اس نے ایک فراٹے سے گاڑی آگے بڑھا دی تھی۔



ناول ”محبت لفظ ہے لیکن“ ابھی جاری ہے۔ اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی 10 تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

تزیلہ ریاض کا بہت خوبصورت نیا ناول

غم ہے یا خوشی ہے تو

ہر ماہ باقاعدگی سے کتاب گھر پر پیش کیا جا رہا ہے
نئی اقساط پڑھنے کیلئے وزٹ کریں

kitaabghar.com

بطور خاص کتاب گھر قارئین کے لیے لکھا گیا
عشاء کوثر سردار کا بہت خوبصورت اور طویل ناول

عطارد جزیرے کے خواب

ہر ماہ باقاعدگی سے کتاب گھر پر پیش کیا جا رہا ہے
نئی اقساط پڑھنے کیلئے وزٹ کریں

kitaabghar.com

قسط نمبر 8

”ماں باپ کے سامنے بہت سوچ سمجھ کر بولا کرو کیوں کہ کبھی کبھی ان کے سامنے بولا گیا کوئی بھی بر لیا اچھا کلام ہماری پوری قسمت پہ حاوی ہو جاتا ہے۔“

کیونکہ وہ یونیورسٹی کی پچھلی سائیڈ سے نکلے تھے۔۔۔ تو یہ راستہ انہیں کافی لمبا پڑا تھا۔ یہ راستہ جنگل کے بالکل درمیان سے ہو کر نکلتا تھا۔ بارشوں کے بعد جگہ، جگہ خورد و پودوں کی وجہ سے رک جانے والے پانی کی وجہ سے کافی خراب بھی ہو رہا تھا کیونکہ اس طرف زیادہ ٹریفک نہیں ہوتی تھی۔ صرف کالج، یونیورسٹی کے بچے اور فارمسٹ ڈیپارٹمنٹ کے لوگ ہی اس طرف آتے تھے۔ انہیں ڈرائیو کرتے آدھا گھنٹا ہو چلا تھا لیکن اب بھی دونوں اطراف کے درختوں کے جھنڈ ویسے ہی گھنے تھے۔ آبادی کے آثار ہی نہیں تھے۔ ضیا بھی اس وقت سے مسلسل خاموش تھا۔ لالہ نے نوٹ کیا تھا۔ وہ مضطرب سا تھا، اس کی آنکھیں اسکرین پر جمی تھیں۔ لیکن لالہ صاف محسوس کر رہی تھی وہ کسی گہری سوچ میں تھا۔ نچلا ہونٹ مسلسل دانتوں سے کاٹا وہ اسے بھی پریشان کر رہا تھا۔ اور پھر اس سے پہلے کہ وہ اس سے کچھ پوچھتی، اس نے کسی کو درختوں کے جھنڈ سے باہر آتے اور پھر لفٹ کے لیے ہاتھ کھڑا کرتے دیکھا تھا۔ ضیا نے اس شخص کے قریب جاتے ہی گاڑی روک دی۔

”سر۔۔۔ میری بایک خراب ہو گئی ہے۔“ اس نے درختوں کے قریب کھڑی بایک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
 ”پلیز شہر تک اگر مجھے لفٹ دے دیں۔“ وہ اس سے درخواست کر رہا تھا۔
 ”شیور۔۔۔! ضیا کے چہرے پر وہی خوب صورت دوستانہ مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔
 ”میں بیگ لے لوں۔۔۔“ وہ شکریہ ادا کرتا بایک کی طرف بڑھ گیا۔

”لالہ تم پیچھے چلی جاؤ، آج کل حالات خراب ہیں، کسی کا کچھ پتا نہیں چلتا۔ اس کے پاس اگر گن ہوئی تو پیچھے سے یہ ہمیں آسانی سے کور کر سکتا ہے۔ لیکن میرے ساتھ بیٹھ کر اگر ایسی کوئی حرکت کرے گا بھی تو خود بھگتے گا۔“ ضیا نے سامنے لڑکے کے نظر رکھتے ہوئے لالہ کو ہدایت کی۔ وہ سر ہلاتی فوراً نیچے اتر کر پچھلی سیٹ پر جا بیٹھی۔ چند لمحوں بعد ہی وہ لڑکا بیگ اٹھائے فرنٹ سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا، ضیا نے اس کے بیٹھے ہی گاڑی اسٹارٹ کی تھی۔ لالہ کی جانچت نگاہیں ابھی تک اس لڑکے کے چہرے پر جمی تھیں۔ وہ دروازے سے ہٹ کر بیٹھی تھی۔ تقریباً بیچ میں اور اس سے پہلے کہ ضیا گاڑی آگے بڑھاتا، بالکل اچانک پچھلے دونوں دروازے ایک جھٹکے سے کھلے تھے۔ اور دو گن مین لالہ کے پہلوؤں میں سیٹ سنبھال گئے۔ لالہ کا دل دھک سے ہوا تھا۔

”ضیا۔۔“ خوف کی شدت سے اس کے لب جڑ گئے تھے۔ وہ چاہ کر بھی ضیا کو نہ پکار سکی تھی۔ ایک نے پٹل کی نوک اس کی کنپٹی سے لگا دی تھی۔

”گاڑی آگے بڑھاؤ۔“ لب کاٹتے ضیا نے گاڑی آگے بڑھا دی تھی۔

”اسے بے ہوش کر دو۔“ سامنے بیٹھے لڑکے نے لالہ کے دائیں طرف بیٹھے آدمی کو حکم دیا تھا۔

”نہیں، چھوڑ دیجئے۔“ وہ اس کا اشارہ سمجھتے ہی چلائی تھی۔ ساتھ بیٹھے تنومند شخص نے کلوروفارم سے بھیگا رومال اس کے چہرے سے لگا دیا تھا، وہ چڑیا کی طرح پھر پھڑا کر رہ گئی تھی۔ اسے صرف چند سیکنڈ لگے تھے ساکت ہونے میں۔ اس کے بے ہوش ہوتے ہی سب نے پستول واپس رکھ لی تھی۔

”کہاں لے کے جائیں گے اسے خان؟“ ساتھ بیٹھے لڑکے نے ضیا سے پوچھا۔

”فارم ہاؤس۔“ اس نے لب کچلتے ہوئے سخت لہجے میں جواب دیا تھا۔ وہ سر ہلا گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

شام ڈھلنے لگی تھی اور اقرا ابھی تک کالج سے نہیں لوٹی تھی۔ زریہ بیگم کی توسانس پھولنے لگی تھی۔ حمزہ بھی دوبار پوچھ چکا تھا۔ انہوں نے کسی دوست کا نام لے کر اسے تو ٹال دیا تھا لیکن خود ان کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ حمزہ آج بھی وقت پر اسے لینے کا کالج پہنچ گیا تھا لیکن وہاں جا کے اسے پتا چلا کہ آج فیئر ویل پارٹی تھی اور بچیاں جلد ہی واپس گھر چلی گئی تھیں۔ اس نے سوچا اقرا بھی کسی دوست کے ساتھ چلی گئی ہوگی۔ گھر آ کے اس نے یہی بات ماں کو بتاتے ہوئے جب پوچھا کہ اسے کالج سے اکیلے آنے میں پریشانی تو نہیں ہوئی تو زریہ کو سانس رکتی محسوس ہوئی۔ انہوں نے حمزہ کو فی الحال تو بہانہ کر کے ٹال دیا تھا لیکن اب واقعی پریشان تھیں۔ انہیں لگا تھا کہ اقرا کسی دوست کے ساتھ گئی ہو یا آغا سے ہی ملنے گئی ہوگی تو بھی شام تک گھر لوٹ آئے گی لیکن شام کے سائے بھی گہرے ہونے لگے تھے۔ وہ ابھی تک نہیں لوٹی تھی۔ حمزہ مغرب کی نماز کے لیے نکل گیا تھا۔

”اماں کی طرف نہ گئی ہو۔“ خیال آتے ہی جیسے ڈھارس سی ملی دل کو۔ انہوں نے فوراً نمبر ملایا۔

”ہیلو۔۔“ فون سین نے اٹھایا تھا۔

”بھابھی میں ہوں زریہ۔۔“ اقرا آئی ہے آپ کی طرف۔۔؟“ انہوں نے چھوٹے ہی پوچھا۔

”کیا۔۔؟“ اقرا ابھی ابھی تک گھر نہیں آئی؟“ پتا نہیں کیوں زریہ کو لگا ان کی طرح سین کا لہجہ بھی پریشان سا تھا۔

”اقرا ابھی مطلب۔۔؟“ انہوں نے رکتے دم سے پوچھا تھا۔

”زریہ آپا۔۔۔ لالہ بھی ابھی ابھی تک گھر نہیں لوٹی۔۔۔“ ان کی پریشان آواز نے ایک دم ہی انہیں شانت کر دیا تھا۔ تسلی سی ہوئی

تھی کہ اقرا ضرور لالہ کے ہی ساتھ تھی۔ اگلے ہی پل پچھلی ساری پریشانی لہجے سے زائل تھی۔

”اور دو آزادی۔۔ لڑکی ذات کو کھلی چھوٹ دے رکھی ہے۔ ارے اپنی لڑکی کی تو تربیت ہی ایسی ہے۔ اوپر سے اسے کھلا چھوٹ رکھا ہے۔ میری اقرا کو بھی ساتھ چمٹائے رکھتی ہے۔ سنا تھا، ایک گندی مچھلی سارے تالاب کو گندا کرتی ہے۔ زندگی میں دیکھ بھی لیا، ہائے میرا مرحوم بھائی۔۔“ وہ بولنے پر آئیں تو رکتا ہی بھول گئیں، سین چپ چاپ سنے گئیں۔

”بتائے دیتی ہوں، لالہ کے چکر میں میری اقرا کے ساتھ کچھ ایسا ویسا ہوا۔۔ تو چھوڑوں گی نہیں کسی کو،“ کچھ انسان بھی کتنا زہرا لگتے ہیں ناں۔۔ سین کے وجود پر موت طاری ہونے لگی تھی۔ تبھی زور، زور سے گلی کا دروازہ بجاتا۔

”لگتا ہے آگئیں دونوں ایک مرتبہ پھر آوارہ گردیاں کر کے،“ انہوں نے تلخ لہجے میں کہا اور فون رکھ لگیں۔

”زرینہ آپا۔۔ پلیز فون بند نہ کریں۔ لالہ ہو تو بات کروادیں میری،“ انہوں نے التجا کی۔ دروازہ دوبارہ کھٹکھٹایا گیا۔

”ہم۔۔“ انہوں نے منہ بناتے ہوئے فون ہولڈ پر رکھا۔ اور باہر آ کر دروازہ کھولا۔ باہر صرف اقرا تھی۔ اقرا کو صحیح سلامت دیکھ کر ان کی جان میں جان آئی تھی۔

”لالہ کے ساتھ تھیں تم؟“ اس سے اندر قدم رکھتے ہی انہوں نے سخت لہجے میں پوچھا۔

”نہیں۔“ اپنے کمرے کی طرف جاتی اقرا ان کی آواز پر رکتے ہوئے بولی تھی لیکن مڑی نہ تھی۔

”آغا کے ساتھ تھی میں۔“ بدل جانی سے کہتی ماں کو وہیں گنگ چھوڑ کر وہ سیدھا کمرے میں چلی گئی اور اندر سے کنڈی لگا دی۔

زرینہ بیگم کا سارا اطمینان پل میں ہوا ہوا تھا۔

”تو سارا دن کیا وہیں اس لوفر کے ساتھ رہی تھی۔ اور اگر وہ آغا کے ساتھ تھی تو لالہ۔۔؟ ہوگی اپنے کسی یار کے ساتھ۔۔ سین کی بیٹی ہے۔“ پریشان ہوتے ہوئے ازلی نفرت عود کر سوچوں میں لوٹی تھی۔ فون تک آتے آتے وہ خود کو اقرا کی پریشانی سے کچھ سنبھال چکی تھیں۔

”اقرا آگئی ہے گھر۔۔ دوستوں کی طرف تھی۔ لالہ نہیں ہے اس کے ساتھ۔“ انہوں نے منتظر سین کو اطلاع دی تھی۔

”ایک آدھ گھنٹے تک آتی ہے تو ٹھیک ورنہ مجھے بھی ضرور بتانا۔ حمزہ ہے ناں، کافی تعلقات ہیں، ڈھونڈ لے گا اسے۔“

”رکھتی ہوں آپا۔“ سین نے نرم لہجے میں کہتے ہوئے کال کاٹ دی تھی۔

شام سے رات اور پھر رات سے آدھی رات ہو چلی تھی۔ لالہ گھر نہیں آئی تھی۔ اس کا فون بھی بند تھا۔ یونیورسٹی میں اس کی کوئی دوست نہیں تھی سوائے نمرہ کے۔ نمرہ کے علاوہ کسی کا ایڈریس ان کے پاس نہیں تھا۔ نہ ہی فون نمبر۔۔ نمرہ نے کہا تھا کہ وہ یونیورسٹی میں اس سے ملی ضرور تھی لیکن ہنگامے کے بعد وہ بھی کافی مشکل سے وہاں سے نکلی۔ اسے لالہ کی خبر نہیں تھی۔ کچھ دوسری لڑکیوں سے نمرہ نے پتا

کیا تھا۔ وہ بھی بے خبر تھیں۔ نمرہ نے معذرت کرتے ہوئے انہیں پولیس اسٹیشن جانے کا مشورہ دیا تھا۔ شاویز تو چکرا کر رہ گیا۔ اس کا جسم

جیسے بے جان ہو رہا تھا۔ سین اور نانو کا رو، رو کر برا حال تھا۔ زرینہ بیگم کو بھی اطلاع کر دی گئی تھی۔ حمزہ اور اقرا کے ساتھ وہ دوڑی چلی آئی تھیں۔ مشکل کی اس گھڑی میں باریال بھی شاویز کے ساتھ تھا۔

”ہو سکتا ہے یار، کسی نے یونی کی ہنگامی صورتِ حال کا فائدہ اٹھایا ہو۔ آئی مین کسی وڈیرے نے۔“ باریال اب دوسری نہج پر سوچنے لگا تھا۔

”مطلب۔۔۔؟“ شاویز نے الجھی نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ اور باریال اس وقت نمرہ کے گھر سے کچھ دور سڑک کنارے اسٹریٹ لائٹ کے نیچے کھڑے تھے۔

”مطلب یہ انغوا وغیرہ کا کیس ہو؟“ اس نے خیال ظاہر کیا۔

”اللہ نہ کرے یار۔۔۔“ اس کا دل ڈوب سا گیا۔

”تو۔۔۔ کہیں لالہ خود تو کہیں انٹرسٹڈ نہیں تھی؟“ نہ جانے کیوں اسے خود اپنے لفظوں پر شرمندگی سی ہوئی۔

”نہیں یار۔۔۔ لالہ ایسی نہیں ہے۔“ شاویز سر جھٹکتے ہوئے بایک کی طرف بڑھ گیا۔

”میرے خیال میں ہمیں پولیس کے پاس چلے جانا چاہیے۔“ اس نے بے بس لہجے میں کہا تھا۔

”لڑکی کا معاملہ ہے شاویز۔۔۔ یہاں کی پولیس کا حال تو تم اچھی طرح جانتے ہو۔۔۔ مجرموں سے پہلے گھر والوں کی وہ پیشی لگائیں گے کہ۔۔۔“ باریال کچھ سوچتے ہوئے بولا تھا۔

”میرے خیال میں کل پرسوں تک خود کوشش کر کے دیکھ لیتے ہیں۔“ اس کی بات میں وزن تھا۔ وہ سر ہلا گیا۔ اور تاریخ کی یہ ایک تلخ حقیقت ہے۔ جہاں انصاف نہ ہو وہاں مجرم نہیں، متاثرین قانون سے ڈرتے ہیں۔

☆.....☆.....☆

وہ واقعی بے حد ذہین اور دماغی طور پر مضبوط تھی۔ تبھی فارم ہاؤس تک پہنچتے پہنچتے اس کا نشہ دم توڑنے لگا تھا۔ وہ نشے کی حالت میں بھی خود کو بار بار جگانے اور ذہن کو بیدار کرنے کی کوشش کرتی رہی تھی۔ گاڑی فارم ہاؤس میں داخل ہوتے ہی دوران خان اور دوسرے چند پرانے گارڈز دوڑتے چلے آئے تھے۔ وہ اتر چکا تھا۔

”ابراہیم اس لڑکی کو لے آیا تھا؟“

”جی خان۔۔۔ اسے آپ کی ہدایت پر رہائشی حصے میں رکھا ہے۔“ اس کی بات پر ضیا طمینان سے سر ہلا گیا۔

”اچھا اس لڑکی کو مہمان خانے کی طرف لے جاؤ۔۔۔ کمر تو سیٹ کروادیا تھا ناں۔۔۔؟“ اس نے ہدایت دیتے ہوئے پوچھا۔

”جی خان۔۔۔ سارا انتظام کر دیا ہے۔“

”اور ہاں۔۔۔ تم سب لوگ جو مری میں میرے ساتھ تھے، لالہ کے سامنے نہیں جاؤ گے۔ جب تک میں نہ کہوں، اسے پتا نہیں چلنا چاہیے کہ اسے یہاں لانے میں میرا ہاتھ ہے۔“ وہ رہائش گاہ کی طرف جانے والی پگڈنڈی پہ قدم رکھتے ہوئے بولا۔ دوران سر ہلا گیا۔۔۔ تبھی ضیا کے فون پہ پیسج ٹون بجی تھی۔ اس نے چلتے، چلتے ہاتھ ہلا کر دوران کو جانے کا اشارہ کیا اور آگے بڑھتا پیسج بھی اوپن کر دیا۔

”ضیا، لالہ ہے تمہارے ساتھ؟“ نمرہ کا پیسج تھا۔ اس کے لب خود بخود دھنچ سے گئے تھے۔

”نہیں تو۔۔۔ میں تو گاؤں نکل آیا ہوں آج ہنگامے کے بعد۔۔۔ کیوں خیریت تو ہے نا؟“ اس نے صاف مکر تے ہوئے ٹائپ کیا تھا۔

”ہاں بس لالہ ابھی تک گھر نہیں پہنچی تو۔۔۔ خیر پھر بات ہوگی۔ ٹیک کیر۔“ نمرہ نے جیسے جان چھڑائی تھی۔ اس نے بھی فون آف کر کے جیب میں ڈال لیا تھا۔

اندرونی دروازے میں قدم رکھتے ہی گلابی ساسر پالے زمزمہ اسے تیزی سے سیڑھیاں اترتی دکھائی دی تھی۔ اس کے چہرے پر پریشانی رقم تھی۔ ضیا رک گیا تھا۔

”ضیا۔۔۔“ وہ فوراً اسے پکارتی اس کی طرف آئی تھی۔

”میں نے ابھی کھڑکی سے دیکھا۔ تمہارے آدمی پچھلی طرف کسی لڑکی کو زبردستی لے جانے کی کوشش کر رہے تھے۔“

”لڑکی۔۔۔ اور میرے آدمی۔۔۔“ اس نے انجان بننے ہوئے کندھے اچکائے۔

”میں سچ کہہ رہی ہوں۔۔۔ میں نے ابھی خود دیکھا۔ پچھلی طرف۔۔۔ لان میں۔“ وہ سخت خوفزدہ تھی۔

”تم یہاں محفوظ تو ہونا۔۔۔؟“ ضیا نے لمبی سانس لے کر خود کو کمپوز کیا اور اس کے قریب آ کے پوچھا۔

”ہاں۔۔۔ لیکن۔۔۔؟“ زمزمہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے حیرت سے بولی۔ جیسے اس کا سوال نہیں سمجھ پارہی ہو۔

”بس تو بے فکر ہو جاؤ۔۔۔ ضیا کے حکم کے بغیر اس چار دیواری کے اندر کوئی کسی کو انگلی بھی نہیں لگا سکتا۔“ وہ مسکرایا۔

”لیکن ضیا۔۔۔ وہ لڑکی خود کو چھڑانے کی مسلسل کوشش کر رہی تھی۔“

”میں سخت تھکا ہوا ہوں۔۔۔ جاؤ آرام کرو زمزمہ۔۔۔ اور مجھے بھی آرام کرنے دو۔ ملازموں میں سے کسی کی بیٹی، بیوی ہوگی۔ یہ لوگ اپنی عورتوں سے ایسے ہی سلوک کرتے ہیں۔ میں کل دیکھ لوں گا۔“ اس نے زمزمہ کو تسلی دیتے ہوئے کہا تھا۔

زمزمہ نے اس بار کچھ نہیں کہا۔۔۔ خاموشی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی۔ ضیا کچھ دیر اسے سیڑھیاں چڑھتا دیکھتا رہا۔

پھر خود بھی لب کچلتا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

آدھی رات کے قریب وہ گھر لوٹا تھا۔ سبھی نفوس اس کے انتظار میں صحن میں ہی جمع تھیں۔ نانو جائے نماز بچھائے، آنسو بہاتی مسلسل نتیج کے دانے گرانے میں مصروف تھیں۔ سین پلر سے ٹیک لگائے بے جان وجود لیے زیر لب دعا میں۔۔۔ تو حمزہ اور اقرار کی حالت بھی ان سے کم نہ تھی۔ حمزہ کو تو خبر بھی کافی دیر سے پہنچی تھی پھر شاویر کا فون مسلسل بزی ہی ملا تھا۔ اس کی تو جان سولی پہ لٹکی تھی۔ شاویر کو دیکھتے ہی سب تیزی سے اس کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔

”کچھ پتا چلا؟“ حمزہ نے بے قراری سے پوچھا۔

”جتنے دوستوں کا پتا تھا سب سے پوچھ لیا۔۔۔ ہاسٹل بھی پتا کر آئے۔ لیکن لالہ کے بارے میں کسی کو بھی کوئی پتا نہیں۔۔۔“

مایوسی سے کہتا وہ چار پائی پر بیٹھ گیا۔

”میں اسپتالوں میں چیک کرتا ہوں۔ خدا نخواستہ کہیں کوئی حادثہ نہ ہو گیا ہو اس کے ساتھ۔“ حمزہ نے کہا۔

”ہاں یہ ٹھیک ہے۔ میں بھی چلتا ہوں تمہارے ساتھ۔“ شاویر فوراً اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”بار، بار کہتی رہی، لڑکی ذات کو اتنی چھوٹ نہ دو۔ لیکن نہ۔۔۔ میری یہاں سنتا ہی کون ہے۔۔۔ زرینہ تو ہے ہی بری۔۔۔“ ان کے گھر سے نکلتے ہی زرینہ نے زور سے ہتھڑ سینے پر مارتے ہوئے دہائی دی تھی۔

”امی پلیز۔۔۔ کچھ تو موقع دیکھ لیا کریں۔۔۔“ اقرار نے مسلسل روتی سین مامی اور نانو کی طرف دیکھتے ہوئے خفیف لہجے میں کہا۔

”اوبی بی کیسا موقع؟“ زرینہ تو اور ہی ہتھے سے اکھڑ گئیں۔

”اسی موقع سے بچنے کے لیے ہی کہتی تھی۔۔۔ میری بات پہ عمل کیا ہوتا تو آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔۔۔ ہائے میرے مرحوم بھائی

کی روح تک کو ننگا کر گئی بے غیرت۔۔۔“

”زرینہ۔۔۔“ اماں کے صبر کا پیمانہ چھلکا تو چلا اٹھیں۔

”کیا اماں۔۔۔؟ اب بھی تم لوگ بچے بنو تو شاباش ہے اماں۔۔۔ یوں دن دیباڑے اچانک غائب ہو گئی لالہ۔۔۔ کیا لگتا

ہے آپ کو، جن اٹھالے گیا اسے۔۔۔ سیدھی بات ہے اماں۔۔۔ چن لیا ہوگا سین کے نقش قدم پر چلتے ہوئے کوئی ساتھی۔۔۔ لات مار گئی

آپ کی چوکھٹ کو۔“ زرینہ کب کسی کا لحاظ رکھتی تھیں جو اس موقع پر خاموش رہتیں۔

”حد ہوتی ہے زرینہ۔۔۔“ اماں کا ضعیف لہجہ کپکپا سا گیا تھا۔

”کیسی بہن ہے تو۔۔۔؟ تیرے مرحوم بھائی کی بیٹی مشکل میں ہے۔ ہم سب اس قدر پریشان ہیں اور تو۔۔۔ اب بھی مرہم

رکھنے کی بجائے نمک چھڑک رہی ہے ہمارے زخموں پر۔“

”میں تو صرف سچ کہتی ہوں اماں۔۔۔“ انہوں نے تنفر سے نتھنے پھلائے۔

”اور پہلے کب اچھی لگی ہوں میں آپ کو۔۔۔ جو آج اچھی لگوں گی۔ آپ کے لیے تو ہمیشہ بھائی، بھابھی اور ان کی اولاد ہی مقدم رہی۔ آپ کا بس چلے تو لالہ کے کر توت بھی اقرار پھوپ دیں۔“

”استغفار۔۔۔“ اماں کا دل دہل گیا۔ اقرار الب کترنے لگی۔

”اللہ سے ڈر زربینہ۔۔۔ دکھی دل کو اور نہ دکھا۔“ اماں ہاتھ جوڑے پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔

”حد ہوتی ہے امی۔۔۔! اقرار غصے سے ماں کو گھورتی نانو کو سنبھالنے لگی۔ چپ چاپ آنسو بہاتی سین پلر سے سہارا لیے زمین پر بیٹھتی چلی گئیں۔

”یا اللہ میری لالہ کی حفاظت فرما۔۔۔“ اماں نے روتے، روتے دعا کی تھی۔

”ہم۔۔۔ میری لالہ۔۔۔ منہ پہ کالک مل کر چلی گئی۔ لیکن ذرا جو کسی کو پروا ہو۔۔۔ پتا نہیں کس کے ساتھ ہوگی اس وقت بے غیرت لڑکی۔“ زربینہ مسلسل بڑبڑاتی رہیں۔

☆.....☆.....☆

ہر اسماں نظروں سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اس نے اس جگہ کو پہچاننے کی کوشش کی تھی، لیکن وہ جگہ اجنبی تھی۔ چوکور کشادہ کمرے میں تین اطراف کھلی کھڑکیاں تھیں۔ جن کے سامنے لوہے کی مضبوط گرل لگی تھی۔ اور آگے دبیز پردے گرے تھے۔ مرے، مرے وجود کو گھسیٹتی کھڑکی تک آئی تھی۔ باہر رات پھیل چکی تھی۔ اس کے کمرے سے کافی دور تک لال پکی اینٹوں کا فرش اور اس کے آگے گھنے درختوں کا سلسلہ تھا۔ پردہ چھوڑ کے وہ گرنے کے سے انداز میں وہیں ننگے فرش پر بیٹھ گئی۔ آنکھوں سے بہتے آنسو کچھ دیر میں ہی اس کے گال جلانے لگے تھے۔

”یہ کیا ہو گیا۔۔۔؟ کون لوگ ہیں یہ؟“ کتنی ہی دیر تک بے جان سی آنسو بہانے کے بعد کہیں وہ کچھ سوچنے کے قابل ہوئی تھی۔

”ضیا۔۔۔ ضیا بھی تو میرے ساتھ تھا۔“ وہ یاد کرنے کی کوشش کرنے لگی تھی۔ اور اسے ذہن پر زور دینے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ ہوش اور بے ہوشی کی درمیانی کیفیت سے جنگ لڑتے ہوئے وہ مسلسل اپنے ارد گرد کو محسوس کرنے، سننے کی لاشعوری کوشش کرتی رہی تھی۔ اور لاشعور بتا رہا تھا کہ ضیا ان سے ان کی زبان میں ہی بات کرتا رہا تھا۔۔۔ ضیا کے لہجے کی شناسائی بھی اسے محسوس ہوئی تھی۔

”کون ہے یہ لڑکا۔۔۔ کیا چاہتا ہے مجھ سے۔“ وہ بے بسی سے کہتی پھوٹ، پھوٹ کر رو دی تھی۔

☆.....☆.....☆

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا جب اس کی آنکھ کھلی تھی۔ آنکھ کھلتے ہی سب سے پہلا احساس شدید ٹھنڈک کا تھا۔ موت کی سی سردی کا۔۔۔ اس قدر شدید گرمی کے موسم میں رگ، رگ جماتی ٹھنڈک۔۔۔ وہ حیران سا اٹھ بیٹھا تھا۔ اگلے ہی لمحے اسے حیرت کا شدید

جھٹکا لگا تھا۔۔۔ اس نے کیا دیکھا تھا۔ وہ برف پوش چوٹی پر برہنہ بیٹھا تھا۔ بے اختیار اس نے دونوں بازو پھیلا کر خود کو ڈھانپنے کی کوشش کی تھی۔ اسی وقت عجیب سی گڑگڑاہٹ ہوئی تھی۔ جس زمین پر وہ بیٹھا تھا ذرا سی لرزی تھی پھر سکوت طاری ہو گیا تھا۔ تبھی سامنے اسے کسی کا سر دکھائی دیا تھا۔ وہ اس سے چند سال بڑا تھا۔ وہ اس سردی میں اتنی اونچائی پر نہ جانے کیا کرنے آیا تھا۔ اوپر آتے ہی اسے دیکھ کر اس کی خوبصورت ذہین آنکھوں میں پہلے حیرت ابھری تھی اور پھر فکر۔۔۔

”سنو، اس طرف آ جاؤ۔۔۔ برف کا وہ ٹکڑا پہاڑ سے الگ ہونے والا ہے۔“ اس کی بات پر ضیاء نے بے اختیار سامنے نیچے دیکھا تھا، برف کے درمیان واقعی دراڑ پڑ چکی تھی۔ وہ اپنا برہنہ پن بھول کر فوراً آگے کو ہوا تھا۔ سامنے کھڑے لڑکے نے اپنی بڑی سی شال اس پر اچھال دی تھی۔ اس کا برہنہ بدن ڈھک گیا تھا۔ تبھی گڑگڑاہٹ زور سے شروع ہوئی تھی۔

”جلدی کرو۔۔۔ ورنہ نیچے گر جاؤ گے۔۔۔“ سامنے والا لڑکا چلا یا تھا۔ اس نے کودنے کی کوشش کی تھی لیکن بے سود۔۔۔ برف کا وہ حصہ چوٹی سے جدا ہو گیا تھا۔ وہ نیچے گرتا چکا گیا۔ ٹھنڈی ہوا سے اس کا جسم چمٹنے لگا تھا۔ درد بے حساب تھا، وہ بری طرح ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا تھا۔ کمرے میں زیر و بلب کی ہلکی روشنی تھی۔ اے سی آن تھا۔ ٹھنڈک تھی پھر بھی اس کا جسم پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔

”وہ لڑکا۔۔۔“ اسے یاد آیا خواب میں آنے والا لڑکا وہی تھا جس نے کئی موقعوں پر اس کی مدد کی تھی۔

”تم ہمیشہ گرتے ہو۔۔۔ اور میں سنبھال لیتا ہوں۔۔۔ دھیان رہے یا۔۔۔ کئی بار ہم اتنا گر جاتے ہیں کہ کوئی ہمیں سنبھال نہیں سکتا۔۔۔ تم بھی یہ بات یاد رکھنا۔ ضروری نہیں ہمیشہ تم گرو اور میں سنبھال سکوں۔۔۔“ باریال ولی خان کے الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے لگے۔ وہ بے آرام سادونوں ہاتھوں سے اپنے بال جکڑ گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

ایک رات، ایک دن گزر گیا تھا کچھ پتا نہ تھا لالہ کہاں چلی گئی تھی۔ اس کا فون بھی مسلسل بند تھا۔ یونیورسٹی کے ہنگامے میں بھی ایسی کوئی خبر نہیں تھی کہ کسی کے قتل یا غائب ہونے کی اطلاع ہوتی۔ سکیورٹی نے بروقت کارروائی کرتے ہوئے نہ صرف حالات سنبھال لیے تھے بلکہ یونیورسٹی بھی تقریباً ویران ہو چکی تھی۔ حالات کے پیش نظر تین دن تک تعطیلات کا بھی اعلان ہو چکا تھا، اس لیے بھی لالہ کے تمام کلاس فیلوز سے پوچھنے میں دقت تھی۔ سین تورو، روکے خاموش سی ہو گئی تھیں۔ نانو بھی نڈھال سی بیڈ پکڑے بیٹھی رہ گئی تھیں۔

شاویز، باریال اور حمزہ تینوں نے ہی سارے اسپتال، ایمرجنسی سینٹر سب چھان مارے تھے۔ اقرانا کو سنبھالتی تو کبھی سین کو۔۔۔ زربینہ بیگم کی بڑبڑاہٹیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ اگلے دن بھی شام ڈھلے وہ تینوں ناکام گھر لوٹے تھے۔ ان کے مایوس چہرے دیکھ کر امید سے دھڑکتے دل بند سے ہونے لگے تھے۔ نانو کی بوڑھی آنکھیں سیلاب ایلنے لگی تھیں۔ بالکل اسی وقت شاویز کے فون کی بیپ ہوئی تھی۔ نمبرہ کی کال تھی۔ اس نے فوراً پک کی۔

”شادویر! ابھی ایک لڑکی نے مجھے بتایا کہ کل اس نے یونیورسٹی کے بعد لالہ کو ایک لڑکے کے ساتھ گاڑی میں دیکھا تھا۔ وہ شہر کے باہر والے راستے پر تھے۔“ نمرہ نے اطلاع دی تھی۔ شادویر گرنے کے سے انداز میں چارپائی پر بیٹھ گیا۔

اسپیکر آن ہونے کی وجہ سے آواز تقریباً سبھی نے واضح سنی تھی۔

”پڑ گئی ٹھنڈ۔۔۔ کہتی تھی ناں میں منہ کالا کر کے چلی گئی ہے ہم سب کا۔۔۔“ زرینہ کی تلخ آواز بلند ہوئی تھی۔ سین نے کانوں پر بے اختیار ہاتھ رکھے تھے۔

”میری لالہ ایسی نہیں ہے۔“ نفی میں سر ہلاتے وہ چلا اٹھی تھیں۔

☆.....☆.....☆

کمرے میں ملگجی سی روشنی تھی۔۔۔ نڈھال وجود لیے وہ کمرے کے ایک کونے میں سکرٹی بیٹھی تھی۔ میز پر رکھا کھانا ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ اور اس کی آنکھوں کے چمکتے رنگ دھیمے پڑنا شروع ہو گئے تھے۔ وہ پورے ایک دن سے گھر سے غائب تھی۔ گھر والوں پہ کیا قیامت ٹوٹی ہوگی اسے اچھی طرح خبر تھی۔ زرینہ پھپھو کو تو موقع مل گیا ہوگا۔

”اُف میرے خدا۔۔۔!“ اس کی پلکیں دوبارہ بھینکنے لگیں۔ آنکھوں کے پپوٹے مسلسل بے آرمی اور رونے کی وجہ سے سوچ رہے تھے۔ یا قوتی ننھا دہانہ یک دم نیلا پڑنے لگا تھا۔

”میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی ضیا۔۔۔“

وہ سب جان چکی تھی۔ ضیا کی سب تدبیروں کے باوجود وہ سمجھ گئی تھی، یہ سب ضیا کا ہی کیا دھرا ہے۔

کمرے کے باہر بھاری بوٹوں کی آواز پر وہ بری طرح چونکی اور دروازے کی سمت دیکھنے لگی۔ مضبوط دروازے کے سامنے آواز دم توڑ گئی اور ہلکی سی چرچراہٹ سے دروازہ کھلتا چلا گیا۔ وہ جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی اور اگلے ہی لمحے اسے کچھ تسلی سی ملی تھی۔ وہ خوبصورت شخصیت کے مالک بزرگ آدمی تھے۔ وہ یقیناً ضیا کے بابا تھے۔ انہیں شاید اپنے بیٹے کی حرکت کی خبر ہو گئی تھی۔ تبھی وہ وہاں چلے آئے تھے۔ انہیں دیکھ کر اس کے چہرے پر ایک گونہ اطمینان چھایا تھا۔

”انکل۔۔۔ انکل پلیز مجھے یہاں سے باہر نکالیں، ضیا مجھے دھوکے سے یہاں لے کر آیا ہے۔“ وہ فوراً مدد کے لیے ان کی طرف بڑھی تھی۔

سہراب علی خان کے لبوں پر مسکراہٹ گہری ہوئی۔۔۔ اور لالہ کو حوصلہ ہوا تھا۔ وہ یقیناً اس کی مدد کرنے والے تھے۔

”انکل پلیز میری مدد کریں۔۔۔ میں بھی تو آپ کی بیٹی کی طرح ہوں۔۔۔“ وہ ان کے قریب آتے ہوئے منت بھرے لہجے میں بولی تھی۔ اور اگلے ہی پل سہراب خان کا بھاری ہاتھ اس کے گال پہ نشان چھوڑ گیا تھا۔ بھوک پیاس سے نڈھال لالہ اس کے لیے تیار نہ

تھی تھی سنبھل نہ سکی تھی اور لڑکھڑا کے زمین پر جا گری تھی۔ اس کے گلابی ہونٹ کنارے سے پھٹ گئے تھے اور خون کی ننھی لکیر اس کی ٹھوڑی بھگو نے لگی تھی۔ اس نے پھٹی نگاہوں سے اس شخص کو دیکھا تھا۔ جسے وہ باپ کی طرح سمجھتی تھی۔ اسے یہ امید تو ہر گز نہیں تھی، اس سے پہلے کہ وہ سنبھل کر اٹھتی، انہوں نے اس کے لمبے کالے بال اپنے ہاتھ میں دبوچے تھے اور جھٹکے سے اسے سیدھا کیا تھا۔

”ارتضیٰ زیدی کی بیٹی، میری بیٹی کی خاک سے بھی نہیں ملتی۔۔۔“ تکلیف سے کراہتی لالہ کی پروا کیے بغیر وہ تنفر سے بولے تھے۔ اور بابا کا نام سن کر لالہ سُن سی ہو گئی تھی۔ ساری تکلیف سردی پڑنے لگی تھی۔

”کیا سمجھا تھا تیری ماں نے۔۔۔“ انہوں نے غلیظ گالی دیتے ہوئے پھنکارتے ہوئے کہا۔ لالہ کے لب ضبط سے ایک دوسرے سے سختی سے پیوست ہوئے تھے۔

”ارتضیٰ کے ساتھ میرے گھر کی چوکھٹ پار کر کے، سارے گاؤں میں ہماری عزت کا جنازہ نکال کر اس کی پناہ گاہ میں محفوظ رہے گی؟“ وہ بالکل کسی زہریلے ناگ کی طرح پھنکار رہے تھے۔ لالہ کو اُن سے خوف آنے لگا تھا۔ وہ بے اختیار ان سے اپنا آپ چھڑوانے لگی تھی۔ لیکن اس عمر میں بھی ان کی طاقت اس سے کہیں زیادہ تھی۔

”سین جانتی تھی، سہراب علی خان کی بہنیں، لال حویلی کی عورتیں کبھی شادی نہیں کرتیں۔ ان کا کسی خواب، کسی خوشی، کسی رشتے پر کوئی حق نہیں ہوتا۔۔۔ لیکن سین۔“ انہوں نے اس کے گال اپنے پنجے میں دبوچتے ہوئے کہا۔ درد کی تیز لہر جاگی تھی۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

”سین نے بغاوت کی۔۔۔ اور وجہ تھا تمہارا باپ۔۔۔“ ان کے لہجے میں نفرت تھی۔ لالہ کو ان کے صاف ستھرے، خوب صورت وجود سے ایک دم گھن آنے لگی تھی۔

”اب جب تم عبرت کی تصویر بن کر گھر جاؤ گی تو کیا حال ہوگا ارتضیٰ کا، سین کا۔۔۔“ وہ قہقہہ لگا کے ہنس دیے تھے۔

”ایک ایک پل جنیں گے۔۔۔ ایک ایک پل مریں گے۔۔۔ نسلیں یاد رکھیں گی کہ ہماری حویلیوں سے بغاوت کرنے والی خانزادیوں کا انجام کیا ہوتا ہے۔“ ان کے نتھنوں سے نکلتی گرم ہوا لالہ کا چہرہ چھلکانے لگی تھی۔

”کتنے برس، بیس سال سے بھی زیادہ اس دن کا انتظار کیا ہے میں نے۔۔۔ ناک کے بدلے ناک۔۔۔ عزت کے بدلے عزت۔۔۔ کہاں چھپائیں گے اس بدنامی کے داغ کو ارتضیٰ اور سین۔۔۔“ وہ وجود دوسرے پانفرت تھا اور لالہ۔۔۔ وہ سب سمجھ رہی تھی۔ ساری کہانی کھلنے لگی تھی۔۔۔ وہ ساری عمر کیا سمجھتی رہی تھی۔۔۔ اور یہاں سانپ کے روپ میں انسان دیکھ کر اسے پل بھر میں الہام ہوا تھا۔۔۔ اس کی پھولوں جیسی فطرت کی ماں ان سانپ جیسے لوگوں کے ساتھ کیسے رہ سکتی تھی، اسے تو ارتضیٰ ہی پناہ دے سکتے تھے۔۔۔ صرف اور صرف اس کے بابا۔۔۔ اس کا دل درد سے پھٹنے کو تھا۔

”میں ایک بدکردار ماں کی بیٹی ہوں۔۔۔“ سہراب علی خان اب بھی بولے جارہے تھے لیکن لالہ کو صرف اپنے الفاظ سنائی دے رہے تھے۔

”میں نہیں چاہتی افراتفرات تمہاری ماں کا کیا تمہارے سامنے آئے۔“ اس نے کس قدر غرور سے کہا تھا۔۔۔ لیکن اس کا کیا۔۔۔ وہ تو بھول ہی گئی۔۔۔ مکافات عمل تو سب کے لیے ہوتا ہے۔

اور پھر ماں، باپ۔۔۔ وہ تو سگی اولاد تھی۔۔۔ زریہ پھپھو کی طرح اس نے بھی تو ماں کا کردار ہمیشہ چاک کیا تھا۔۔۔ طعنے مارے تھے۔

آج اسے اندازہ ہوا تھا۔۔۔ امی نے اتنا بڑا قدم کیوں اٹھایا تھا۔۔۔ تبھی دروازے پر دستک ہوئی تھی اور دوران نے دروازے سے ہی آواز دی تھی۔

”خان۔۔۔ چھوٹے خان نے حکم دیا ہے لڑکی کو گھر چھوڑ کے آنے کا۔“ اس کی آواز مودب تھی۔ شیطانی مسکراہٹ ان کے لبوں کو چھو گئی۔

”انہوں نے کہا ہے ناں۔۔۔ میں نے تو نہیں کہا۔۔۔ ابھی میرا بدلہ پورا کہاں ہوا ہے۔“ انہوں نے جھکے سے لالہ کو چھوڑا تھا۔ وہ جہازی سائز بیڈ پر جاگری تھی۔

”تم نے ضیا کو وہ مشروب پلا دیا۔“

”جی خان۔۔۔ گل بی بی نے دے دیا تھا۔“ اب وہ آدھے کھلے دروازے پر کھڑا تھا۔

”گڈ۔۔۔“ انہوں نے شیطانی نظریں لالہ پر جماتے ہوئے کہا۔ شیطان مجسم روپ بھی رکھتا ہے۔ لالہ نے آج اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ سہراب علی خان نے سائڈ ٹیبل پر رکھنا کھانچ سے بنا شوپس اٹھایا اور اگلے ہی لمحے اپنی پیشانی پر دے مارا تھا۔ بلکی سی سسکاری بھری تھی۔ اور ان کی پیشانی سے خون کی پتلی سی لکیر نکلنے لگی۔

”خان۔۔۔“ دوران پریشان سا ان کی طرف بڑھا۔ لالہ بھی چیخ مار کے لاشعوری طور پر ذرا پیچھے کو ہٹ گئی۔

”یہ آج رات بھی ہماری مہمان رہے گی۔۔۔ صبح منداں دھیرے، روشنی پھیلنے سے پہلے اسے اس کے دروازے پر ڈال آنا۔۔۔“ وہ زخم کی پروا کیے بغیر شیطانی مسکراہٹ سجائے بولے۔

”حکم خان۔۔۔“ وہ فوراً سر جھکا گیا۔

”اور تم۔۔۔“ دونوں ہاتھ بیڈ پر رکھتے ہوئے وہ اس پر جھکے تھے۔ وہ کانپ سی گئی تھی۔

”تم ضیا کا انتظار کرو۔۔۔“ پھنکار کر کہتے ہوئے وہ قہقہہ لگا کے ہنسے تھے۔ لالہ کا ننھا سادل بے جان ہونے لگا تھا۔

☆.....☆.....☆

اسے عجیب سی گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ ذہن مآؤف سا ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ چکر سے آرہے تھے۔۔۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا اسے کیا ہو رہا تھا۔ شاید یہ مسلسل اسٹریس کی وجہ سے تھا۔ وہ لالہ کو یہاں لے تو آیا تھا ابھی تک وہ اس کے سامنے نہیں جاسکا تھا۔ اس نے بس باء جی کو اطلاع دے دی تھی۔ لالہ ایک دن گھر سے غائب رہی تھی۔ اس کے خیال میں یہ سزا کافی تھی اس کے خاندان والوں کے لیے۔۔۔ اسی لیے اس نے ملازموں کو بھی حکم دے دیا تھا کہ اسے واپس گھر چھوڑ آئیں رات کے اندھیرے میں لیکن یہ ایک حقیقت تھی، یہ سب کر کے وہ بے حد پریشان رہا تھا، بے حد بے سکون۔۔۔ حالانکہ یہ سب اس نے اپنے باء جی کے لیے کیا تھا۔ لیکن پھر بھی دل مطمئن نہ تھا۔۔۔ وہ خوش نہ تھا۔ ضیا کے کمرے کا دروازہ کھلا اور سہراب علی خان اندر آئے۔ دوران خان انہیں سہارا دیے ہوئے تھا۔ پیشانی پہ پٹی لگی تھی جس پر لگا خون کا دھبہ ابھی تازہ تھا۔ وہ فوراً ان کی طرف آیا تھا۔ وجود میں ہلکی لڑکھڑاہٹ تھی۔

”کیا ہوا باء جی۔۔۔ آپ ٹھیک تو ہیں۔“ اس نے پوچھا تھا۔

”خان۔۔۔ اس لڑکی نے حملہ کیا ہے بڑے خان پر۔۔۔ گلہ ان سر پر دے مارا ان کے۔“ دوران خان نے فوراً کہا۔

”لالہ۔۔۔!“ ضیا ضبط سے مٹھی بھینچ گیا۔

”گری ہوئی نسلوں سے یہی امید کی جاسکتی ہے زوئے (بچے)۔۔۔“ سہراب خان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اس کی ہمت بھی کیسے ہوئی آپ پر ہاتھ اٹھانے کی۔ میں اسے چھوڑوں گا نہیں۔۔۔ خود کو سمجھتی کیا ہے؟“ غصے سے کہتا، لڑکھڑاتا وہ باہر نکل گیا تھا۔

”یادر ہے دوران خان۔۔۔ صبح ہونے سے پہلے ہی لڑکی گھر پہنچ جانی چاہیے۔۔۔ ضیا کو بھی یہاں لے آنا، جو مشروب اس نے پیا ہے صبح سے پہلے اسے ہوش نہیں آئے گا۔“

ضیا کے باہر جاتے ہی انہوں نے حکم دیا تھا۔ دوران خان سر جھکاتا باہر نکل گیا تھا۔ سہراب علی خان کے لبوں پر وہی شیطانی مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔

”تیری انتہائی شکست ہی تو اصل لطف دے گی ارتضیٰ زیدی۔۔۔“ انہوں نے خود کلامی کی تھی سانپ جیسی پھنکار کے ساتھ۔۔۔

☆.....☆.....☆

کسی نے دروازہ پوری قوت سے کھولا تھا۔ وہ جواں سے کی گئی زیادتیوں پہ ندامت کے آنسو بہا رہی تھی، بری طرح چوکی تھی۔ لیکن اگلے ہی پل ضیا کو اندر آتا دیکھ کر جھٹکے سے بستر سے نیچے اتر آئی تھی۔ ضیا دروازے کو ٹھوکر سے بند کرتا کسی پھرے شیر کی طرح اس کی طرف لپکا تھا۔

”تمہاری ہمت بھی کیسے ہوئی باء کو تکلیف پہنچانے کی۔“ اس کی آنکھیں لال انگارہ ہو رہی تھیں۔

”واہ۔۔۔ تکلیف بھی تمہارے باء جی کو ہوئی۔۔۔ اور میرا کیا۔۔۔؟ میری تکلیف کا احساس ہے تمہیں۔۔۔“ وہ اس سے خوف کھائے بنا تیز لہجے میں بولی تھی۔

”تمہاری تکلیف۔۔۔؟“ ضیا نے آگے بڑھ کر اس کی نازک کلائی اپنی مضبوط گرفت میں لیتے ہوئے کہا۔۔۔ وہ پھڑپھڑا کر رہ گئی۔

”ساری عمر میرے باء جی کو تکلیف کے کانٹوں پر گزارنے پر مجبور کرنے والوں کو آج اپنی تکلیف نظر آرہی ہے۔۔۔ واہ۔۔۔“ وہ خود کو بہ مشکل سنبھال رہا تھا۔

”اور تمہیں۔۔۔ تمہیں کون سی تکلیف ہے یہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔“

”ایک لڑکی کا گھر سے ایک رات باہر گزار لینے کا مطلب تم کیا جانو ضیا۔۔۔“ وہ ہاتھ چھڑاتے ہوئے متنفر لہجے میں بولی۔۔۔ ضیا نے مزید دو قدم اس کی طرف بڑھائے۔ وہ بے اختیار پیچھے ہوئی۔ دل میں خوف سا جاگا۔

”حیرت ہے، تمہیں کسی نے بتایا نہیں شاید کہ تمہاری ماں نے گھر سے بھاگ کر ساری عمر باہر گزاری۔۔۔“ اس نے جیسے گالی دی تھی۔ لالہ کا دل کٹ سا گیا تھا۔ اس نے ضیا کو دھکا دیا تھا اور اتنی ہی تیزی سے اس کے منہ پہ تھوک دیا تھا۔ ضیا دم بخود رہ گیا تھا۔ اسے لالہ سے ایسی حرکت کی توقع نہ تھی۔

”پتا ہے کیا۔۔۔ ساری غلطی میری ہے، میں نے یہ جانے بنا کہ تم ایک سانپ کی اولاد ہو تم پہ بھروسہ کر لیا ضیا۔“ وہ نفرت سے اسے دیکھتی چلا تے ہوئے بولی تھی۔ وہ پھرے انداز میں اس کی طرف بڑھا تھا۔

”سانپ کیا ہوتا ہے آج میں تمہیں بتاؤں گا۔“

”ضیا۔۔۔“ اسے اپنی طرف یوں جارحانہ انداز میں بڑھتے ہوئے دیکھ کر لالہ کو احساس ہوا تھا، اس نے غلطی کر دی تھی۔ اور آگے بڑھتے ضیا کے قدم اس کے ہلتے ہونٹوں پر جھے تل کو دیکھ کر بس ایک پل کے لیے رکے تھے۔ اور اگلے ہی لمحے اس نے لالہ کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا تھا۔ وہ کسمسا کر رہ گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

لال حویلی کے سنائے میں چوہا دروازے کے کھلنے پر کسی آسب کے پر کھلنے کی سی آہٹ پیدا ہوئی تھی۔ دل بری طرح دھڑک اٹھا تھا۔ ایک تورات کا وقت، اوپر سے اس جگہ قدم دھرنا جہاں باء جی نے کسی کا بھی داخلہ سختی سے منع کر رکھا تھا۔ دل تھا کہ خوف سے لرز جا رہا تھا لیکن اندر کے تجسس سے مجبور ہو کر بہر حال اس نے اندر آ کر ہی دم لیا تھا۔ ضیا نے انہیں ابراہیم کے ہمراہ کچھ دنوں کے لیے گاؤں بھیجا تھا۔ باء جی خود بھی کام سے شہر گئے ہوئے تھے۔ ایسے میں وہ اس خوابیدہ جگہ کی مکمل سیر کر سکتی تھی۔ اس نے سب سے پہلے کمرے کی واحد قد

آرالماری پہ لگے سارے سوئچ آن کر دیے تھے۔ ہر طرف سے بند کمراروشنی سے نہا گیا تھا۔ وہ کچھ دیر اس جنوں خیز جگہ کی ساری خوبصورتی سے نظروں کو خیرہ کرتی رہی۔ پھر دھیرے دھیرے چلتی ایک، ایک کتاب کو چھو کر دیکھنے لگی۔۔۔ وہاں ہر قسم کی کتب تھیں۔ علاقائی، غیر ملکی ادب سے، اردو ادب، عربی ادب، قرآن، حدیث سے متعلق تمام اہم کتب، شاعری کی کتابیں، جاسوسی مواد، تفریحی مواد، بچوں کی کتابیں، اسلامک اسکالرز کی اہم کتب۔۔۔ فخر سے اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ کتنی محبت کرتے تھے اس کے باء جی اپنی کتابوں سے۔۔۔ وہ بھی تو بالکل ان پر گئی تھی۔ اسے بھی تو اسی طرح کتابوں سے عشق تھا۔ اسے فخر سامحوس ہوا، وہ اپنے باء جی کی طرح تھی۔ اور بھی وہ ذرا آگے بڑھی تھی۔ اس کا شیفون کا دوپٹا دراز سے الجھا تھا اور اس کے تیزی سے آگے بڑھنے پہ دراز دوپٹے کے ساتھ کھسکتی کھلتی چلی گئی تھی۔ او زگل نے حیرت سے اس کھلی دراز کی طرف دیکھا تھا۔ اس نے کئی بار دیکھا تھا باء جی یہ دراز ہمیشہ لاک کرتے تھے تو آج یہ کھلی کیسے رہ گئی تھی۔ وہ تیزی سے اسے بند کرنے کو آگے بڑھی تو دیکھا کہ لاک آدھا لگا ہوا تھا۔ مطلب باء جی نے تیزی سے لاک کیا تھا اور اسی لیے لاک صحیح بند نہیں ہوا تھا۔ لیکن انہوں نے یہی سمجھا تھا کہ لاک بند ہو گیا تھا۔ یہ کراوہ مبینوں میں کبھی کھولتے تھے اور اسی لیے شاید انہیں ابھی تک اس دراز کو بند کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے دراز بند کرنے لگی کہ نظر اندر پڑی ایک فوٹو پہ ٹھہری گئی۔ یہ دو بچوں کی تصویر تھی۔ بارہ اور دس سال کے قریب کی عمروں کے وہ بچے بہت خوب صورت اور صحت مند تھے گہری سبز آنکھوں کو دیکھتے ہی وہ پہچان گئی تھی۔

”یہ تو باء جی ہیں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے فوٹو اٹھالی تھی اور بھی اس کی نظر نیچے پڑی ایک بوسیدہ ڈائری پر پڑی تھی۔ جسے دیکھ کر ہی اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ تقریباً تیس، چالیس سال پرانی تھی۔ تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کے اس نے وہ ڈائری اٹھالی تھی اور باء جی کی خوب صورت منقش کرسی پر بیٹھتے ہوئے ذرا سے خوفزدہ دل کے ساتھ اس نے ڈائری کا پہلا ورق پلٹا تھا۔

”میں سہراب علی خان۔۔۔ آج قسم کھاتا ہوں۔۔۔ آفتاب ولی خان کو کبھی معاف نہیں کروں گا۔۔۔ ان کی وجہ سے میرے بابا کی جان گئی۔۔۔ اور جان کے بدلے جان، عزت کے بدلے عزت۔۔۔ مال کے بدلے مال۔۔۔ میں اس خاندان کو، اس نسل کو ختم کر دوں گا۔“ کسی ننھے بچے کی ہینڈ رائٹنگ میں لکھے الفاظ اسے ساکت کر گئے تھے۔ چند لمحے یونہی ساکت بیٹھی وہ انہی لفظوں کو بار، بار دہراتی رہی تھی۔ اور پھر اس نے تیزی سے ورق پلٹنا شروع کر دیے تھے۔ اسے لگ رہا تھا وہ کوئی کہانی پڑھ رہی تھی۔۔۔ بے حد طویل کہانی۔۔۔ زندگی کی کہانی۔۔۔ اور کہانیاں مختصر کہاں ہوتی ہیں۔۔۔ اس نے بھی بیٹھے، بیٹھے ماضی کا سفر طے کیا بلکہ اب طے کرنا شروع کیا تھا۔

☆.....☆.....☆

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔۔۔ گلیوں کو چوں میں کتوں کے بھونکنے اور ٹڈوں کی گونجتی سیٹیاں سنائے کا وجود جیرتی اور پھر وہی خاموشی طاری ہو جاتی۔ سنسان گلی میں رات کے اس پہر اس تنگ گلی کے سامنے کھڑی بڑی سی گاڑی سے چار نفوس نکلے اور گاڑی کی پچھلی سیٹ سے کسی بے جان وجود کو اٹھائے اس گلی میں داخل ہو گئے۔ ایک آدمی ان سب کے آگے تھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھی اور وہ

بے حد ہوشیاری سے ارد گرد کا جائزہ لے رہا تھا۔ ایک متوازی گیٹ کے قریب آتے ہی اس شخص نے دونوں ساتھیوں کو اشارہ کیا تھا۔ انہوں نے وہ بے جان وجود وہیں چوکھٹ پر آرام سے ڈال دیا تھا۔

”تم سب جاؤ۔۔۔ اور ہاں گاڑی اسٹارٹ رکھنا۔“ پستول تھامے شخص نے انہیں ہدایت کی۔۔۔ وہ حکم کی تعمیل کرتے ہوئے تیز قدموں سے واپس مڑ گئے تھے، اس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے جیب سے ٹیپ نکالی اور سامنے لگی بیل پر چپکا دی۔۔۔ گھر میں تیز گھنٹی کی آواز گونج اٹھی تھی۔ وہ فوراً واپس مڑ گیا تھا۔ گھنٹی بجتی جا رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

حویلی کے طاقتوروں میں رکھے دیے سر شام ہی روشن کر دیے جاتے تھے۔ بڑے، بڑے دالانوں کے سروں پر اتنے ہی بڑے الاؤ روشن ہوتے تو دن کا سماں بندھ جاتا تھا حویلی میں۔۔۔ سرخ اینٹوں سے بنی یہ اونچے محرابوں والی حویلی ویسے تو لال حویلی کے نام سے مشہور تھی لیکن یہاں کے رہنے والوں کے حسن سلوک اور محبت کی وجہ سے امن کی علامت سمجھی جاتی تھی۔

آفتاب ولی خان نہ صرف ملک کے جانے پہچانے سیاستدان بلکہ اس علاقے کے والی سمجھے جاتے تھے۔ سادہ اور نیک طبیعت کے مالک آفتاب خان ہر دل عزیز شخصیت کے مالک تھے۔ انہیں دیکھ کر غریبوں کے لبوں پر مسکان رقص کرنے لگتی تھی۔ اسفندیار علی خان ان کے دستِ راست تھے۔ ہر جگہ ان کے ساتھ ہوتے، اسفندیار نہ صرف یہ کہ ان کے بہترین دوست تھے بلکہ سگے چچا زاد بھی تھے۔ چچا کی عیاشیوں کی وجہ سے اسفندیار گھر بار اور زمینوں کی وراثت سے ہاتھ دھو چکے تھے اور ان کی وفات کے بعد آفتاب ولی خان نے انہیں سگے بھائی کی طرح نہ صرف پناہ دی تھی بلکہ سنبھالا بھی تھا۔ وہ انہیں بالکل سگے بھائی کی طرح ہی عزیز تھے۔ اور خود اسفندیار علی خان بھی ان پر جان چھڑکتے تھے۔

یہ ایک ڈھلتی شام تھی۔ حویلی روشن ہونے لگی تھی۔ شام تک حویلی میں رہنے والی چہل پہل دم توڑ چکی تھی۔۔۔ سکون سا ہر سو حصار کیے ہوئے تھا۔ جب تیز گاڑیوں کے چیختے انجنوں کے شور نے حویلی کا پرسکون ماحول لرزاکے رکھ دیا تھا اور عصر کے وقت خوش باش مسکراتے چہرے کے ساتھ زمینوں پر جانے والے اسفندیار علی خان چار کندھوں پر واپس آئے۔ آفتاب ولی خان پر کسی نے قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ اسفندیار نے ان کے حصے کی گولیاں بھی اپنے سینے پر کھالی تھیں۔ آفتاب خان تو بال، بال بچ گئے تھے لیکن اسفندیار موقع پر ہی جان گنا بیٹھے تھے۔ حویلی میں قیامت برپا ہو گئی تھی اور اسی دن چار پائی پرسفید لباس میں بے جان پڑے وجود کے ساتھ لگے سہراب علی خان کے سر پر آفتاب ولی خان نے دستِ شفقت رکھتے ہوئے کہا تھا۔

”آج سے میرا ایک نہیں، دو بیٹے ہیں۔۔۔ سہراب علی خان آج سے میرا بیٹا ہے۔“ اور وہ آنسوؤں سے دھندلائی آنکھوں سے یہ نہیں دیکھ سکے تھے کہ گہری سبز آنکھوں میں کس قدر زہرا مڈ آیا تھا، ان کے پہلو سے لگتے ہی اور پھر جنازہ اٹھتے ہی ماں کے پہلو میں بیٹھے

ہوئے اس بچے نے زہریلے لہجے میں کہا تھا۔

”اماں۔۔۔ میرے ابا کا قاتل ہے یہ۔۔۔ اس نے اپنی جان بچانے کے لیے ابا کو مروادیا۔“
 ”نہ بیٹا، ایسے نہیں سوچتے۔“ اماں نے روتے ہوئے اس ننھی جان کو خود میں سمیٹ لیا تھا۔

☆.....☆.....☆

نیند تو جیسے گھر کے باسیوں سے روٹھ سی گئی تھی۔ زرینہ گھر جا چکی تھیں، اقرا البتہ وہیں رک گئی تھی۔ سین نے اسے زبردستی سلا دیا تھا لیکن خود مسلسل برآمدے میں ٹہلتی دعائیں مانگتی رہی تھیں۔ نانوبھی تسبیح کے دانے گراتی لالہ کے لوٹ آنے کی دعا میں مشغول تھیں۔ شادویز، لالہ کے کمرے میں اس کی کتابیں، نوٹس ایک، ایک کر کے دوبارہ چیک کرنے میں لگا تھا۔ اگر وہ کسی کے ساتھ انٹرسٹڈ تھی تو ضرور کہیں نہ کہیں اس آدمی کا نام نمبر لکھا ہونا چاہیے تھا۔ وہ خوش تھی تو اس کے لیے کافی تھا۔ لیکن وہ خوش تھی بھی؟ اس کی تسلی بہر حال اسے کرنی تھی، وہ اس کے کسی لڑکے کے ساتھ بھاگ جانے کا سوچ کر مطمئن نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ اس نے بہ مشکل کچھ کتابیں ہی چیک کی تھیں کہ ڈور بیل کی چیخنی آواز نے رات کا سناٹا چیر کے رکھ دیا، آواز اس قدر تیز اور مسلسل تھی کہ کتاب اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر جا گری تھی۔ ”شادویز۔۔۔“ سین بے اختیار اسے پکارتی گیٹ کی طرف لپکی تھیں۔ شادویز بھی تیزی سے ان کی طرف بھاگا تھا۔ گیٹ کے قریب جا کر ہی وہ ایک دم رکی تھیں۔ انہیں اپنے پیروں کی طرح اپنا دل بھی رکتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ گھنٹی بجتی چلی جا رہی تھی۔ جیسے گھنٹی بجانے والا ہاتھ رکھ کے اٹھانا بھول گیا تھا۔ شادویز نے بھاگ کے دروازہ کھولا تھا۔ چوکھٹ سے لگا بے جان سا وجود اندر کی طرف گرا تھا۔ چادر ڈھلک گئی تھی۔ لالہ کا ویران چہرہ ان دونوں کے سامنے تھا۔ سین زمین پر بیٹھتی چلی گئیں۔

☆.....☆.....☆

جس طرح اچانک اس کا پروپوزل ریمجیکٹ ہوا تھا۔ وہ واقعی اس کے لیے کافی پریشان کن تھا۔ لیکن عین وقت پر امن کی پیشکش اور پھر اس کا خود اس پروجیکٹ میں دلچسپی لینا اسے واقعی خوشگوار حیرت میں ڈال گیا تھا۔ چند دنوں کے اندر ہی ان کی کوششوں سے وہ ایک دو اور بھی اچھے اسپانسرز لینے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

لالہ کے معاملے میں جس وقت وہ شادویز کے ساتھ بڑی رہا تھا۔ امن نے کنسٹرکشن کا سارا کام دیکھا تھا۔ وہ ایک دوست کی طرح اس کے شانہ بشانہ رہی تھی۔ اس کے دل میں ایک مرتبہ پھر امن کی عزت مزید بڑھ گئی تھی۔

”مجھے لگتا ہے امن۔۔۔! تم صرف اپنا وقت ضائع کر رہی ہو۔“ امن رات گئے گھر لوٹی تو پاپا نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔

”ابھی تو وقت دے رہی ہوں پاپا اپنے اور باریال کے رشتے کو۔۔۔ ضائع ہوتا ہے یا کامیاب، ہاں یہ وقت ہی طے کرے گا۔“

وہ مسکراتے ہوئے بولی تھی۔

”میری دعا تمہارے ساتھ ہے ہمیشہ۔۔۔ بس اس بار اگر ناکامی ہو تو بچھلی والی غلطی مت دہرانا بیٹا۔“ انہوں نے اس کے گرد ہاتھ پھیلاتے ہوئے محبت سے کہا تھا۔

”تم جانتی ہو تمہارے لیے باریال بہت۔۔۔ لیکن میرے لیے صرف تم ہو۔۔۔ صرف تم۔“

”پاپا۔۔۔“ وہ ان کے سینے میں سما گئی تھی۔ بیٹیوں کی سب سے مضبوط پناہ گاہ ماں، باپ کا سینہ ہی تو ہوتی ہے۔

☆.....☆.....☆

اس کی آنکھ کھلی تو دن چڑھ چکا تھا۔ نشے کا خمار بھی اتر چکا تھا۔ پھر وہ کتنی دیر چھت کو خالی، خالی نگاہوں سے تکتا بے سدھ لیٹا رہا تھا۔ بھلے رات وہ نشے کی حالت میں تھا لیکن ایک، ایک منظر اس کی یادداشت سے بالکل واضح چمٹ کے رہ گیا تھا۔ اس کے مضبوط شکنجوں میں پھڑپھڑاتی وہ نازک سی چڑیا، اس کی گھٹی، گھٹی چیخیں، مزاحمت کرتے اس کے کمزور، نازک ملائم سے ہاتھ، بے اختیار وہ اٹھ بیٹھا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں کو دیکھا۔ سفید گلابی خوب صورت ہاتھ جنہوں نے کبھی کوئی سخت کام نہیں کیا تھا۔ کل رات کس قدر کھر دے ہو گئے تھے۔ نرم و ملائم ہاتھ اس کے ہاتھوں میں پھنس کر زخمی ہو رہے تھے۔ اس نے اپنے اوپر ڈالا گیا کمبل اٹھا کر دور اچھال دیا تھا اور سیلپرز پہنتا ہاتھ روم میں آ گیا۔ سامنے لگے قد آور آئینے میں اس کا وجہہ سراپا کس قدر شاندار تھا لیکن اسے بالکل بھی اچھا نہیں لگا تھا۔ اس نے سامنے پڑی خوب صورت کرٹل بال اٹھا کے شیشے پہ مار دینی چاہی کہ ایک دم سراپا بدلا تھا۔ نرم و نازک، کوئل سا سراپا کالی کٹورا آنکھیں، سمندر جیسی گہرائی لیے اور۔۔۔

اور وہ یا قوتی لب۔۔۔ ننھا سادہ بانہ، دھیرے سے مسکرانا پھر ایک دم جیسے درد سے نیلا پڑنے لگا تھا۔۔۔ وہ یہ سب نہیں دیکھ سکتا تھا بھلے ہی وہ لالہ اور اس کی فیملی سے نفرت کرتا تھا، انہوں نے اس کے باپ کو سالوں رُ لایا، اس کے چاچو، بو اسب کی موت کا باعث بنا تھا۔ پھر بھی وہ اسے لالہ کو یوں تڑپتا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس نے چیختے ہوئے وہ بال آئینے پر دے ماری تھی۔ شور سا ہوا تھا اور آئینہ چھنا کے سے کرچیوں میں بکھر گیا تھا۔ وہ پریشان سائونہی باہر آ کر بستر پر گر گیا۔ اسی وقت دروازہ کھلا تھا اور دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی زمزمہ اندر آئی تھی۔ اس نے نظریں اٹھا کر زمزمہ کو دیکھا۔۔۔ زمزمہ کی آنکھوں میں ناراضی تھی، دکھ تھا، کرب تھا۔

”میں نے کہا تھا ناں خان۔۔۔ اس لڑکی کو بچا لو۔۔۔ لیکن۔۔۔“ وہ جملہ مکمل نہ کر سکی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنا شروع ہو گئے تھے، صبح جس وقت لالہ کو وہاں سے لے کر گئے وہ سارا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی تھی۔۔۔ بے حس و حرکت لالہ اور نڈھال، گناہ کے بوجھ سے کپکپاتا وجود لیے ضیا۔۔۔ وہ بچی نہ تھی کہ کچھ سمجھ نہ پاتی۔

”میں نے کچھ نہیں کیا زمزمہ۔۔۔“ وہ دونوں ہاتھ بالوں میں الجھا گیا۔

”تم جانتی ہو میں ایسا کچھ نہیں کر سکتا۔۔۔ ضیا علی خان کو اپنا کردار کس قدر، اپنی انانگتی عزیز ہے۔“ جھکی، جھکی پلکوں سے ندامت

کا آنسو پکڑا تھا۔ زمزمہ اس کے سامنے زمین پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گئی۔

”میں نے کہا تھا ناں خان، کچھ نشے اور حسن بہت طاقتور ہوتے ہیں۔ مدہوش کر ہی دیتے ہیں۔“

زمزمہ کا لہجہ بکھرا تھا۔ سر جھکائے بیٹھا ضیا رو رہا تھا۔ وہ مرد جسے وہ دنیا کا مضبوط ترین مرد سمجھتی تھی۔ کس طرح کمزور پڑ گیا تھا۔ برائی کی طرف کھینچ، کھینچ کے لے جانے والے اس شخص نے ہمیشہ کس طرح اچھائی کی طرف خود کو مائل کیے رکھا تھا۔ لیکن اچھائی اور برائی کے دورا ہے پہ چلتے، چلتے کبھی تو پھسلنا ہی تھا شاید۔۔۔ ٹھوکر لگنی ہی تھی۔۔۔ وہ مرد تھا۔ صاف راستہ چُن سکتا تھا۔ صحیح راستہ چُن سکتا تھا۔ لیکن اپنے باء جی کے لیے خود پر برائی کی چھاپ لگاتے لگاتے وہ کس بری طرح برائی کی دلدل میں گرا تھا کہ سارا وجود ہی کیچڑ، کیچڑ ہو گیا تھا۔۔۔ زمزمہ کی آنکھیں بھی بھینکنے لگی تھیں۔

☆.....☆.....☆

وہ جیسے مٹی کا برتن تھی۔۔۔

یا پھر کانچ کی گڑیا۔۔۔

ایک ہی ضرب سے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی تھی۔

کرچیوں کی صورت بکھری تھی۔

لالہ جب سے آئی تھی۔۔۔ سدھ بدھ کھو بیٹھی تھی۔ اماں اسے خود سے لگائے بیٹھی تھیں۔ خود سے جدا کرنے پر راضی ہی نہیں ہو رہی تھیں۔ سین، شاوزین، اقرا، حمزہ بار، بار اس سے پوچھتے، کریدنے کی کوشش کرتے اور وہ گم صم بس چپ چاپ ان سب کو دیکھ جاتی۔ اس کی ویران آنکھیں دیکھ کر سین کا دل کٹ جاتا۔ لیکن ان کے بے حد اصرار پر بھی وہ کچھ بتانے پر راضی نہ ہوئی تھی نہ بولنے پر۔۔۔ اس کی چپ کسی طور ٹوٹنے پر نہیں آرہی تھی۔

”اب بھی سب اس منحوس کو سینے سے لگا کر رکھو۔۔۔ ارے میں کہتی ہوں ایسی بھی کیا پیٹی بندھی ہے اس کے عشق کی تم سب کی آنکھوں پر کہ اس کے وجود پر لگی غلاظت تم لوگوں کو نظر نہیں آرہی۔“ زرینہ بیگم تو اطلاع ملتے ہی گھر پہنچیں تو اس پر ایسے حملہ آور ہوئیں کہ ابھی کچا چبا جائیں گی۔ اس وقت بھی شاوزین نے لالہ کو ان سے چھڑ والیا اور اب ان سب کو یوں اس کے آگے بچھتے دیکھ کر ان کے سینے کی جلن مزید بڑھنے لگی تھی۔

”بس امی۔۔۔“ ان کی زہر فشانیوں پر حمزہ ضبط کھوتے ہوئے چلا یا تھا۔

”حد ہوتی ہے کسی بات کی بھی۔۔۔ آپ کے مرحوم بھائی کی بیٹی ہے کم از کم اتنا ہی خیال کر لیں۔“ وہ لب کچلتے ہوئے بولا تھا۔

”ہائے، یہی تو افسوس ہے۔“ وہ سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے دھاڑیں۔

”میرے اتنے شریف بھائی کے منہ پر کالک مل دی اس نے۔۔۔ ان کے کفن تک کو داغدار کر دیا اس منحوس نے۔۔۔“ وہ بین کرنے لگی تھیں۔ شاویز کمرے کی دبلیز پر کھڑا بے بسی سے بت بنی لالہ کو دیکھتا رہا۔۔۔ مضبوط سی وہ لڑکی کس طرح بکھری گئی تھی۔ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا، وہ سب کچھ سمجھ سکتا تھا لیکن کیوں ہوا، کیا وہ خود گئی تھی یا پھر کون ایسا تھا جو اسے نقصان دے سکتا تھا۔ اس کا جواب صرف لالہ ہی دے سکتی تھی۔ اور اس کے لب تو یوں سلے تھے جیسے کبھی وہ بولی ہی نہ ہو۔“

ڈورنیل کی تیز آواز پر وہ چونکا پھر تیزی سے سر جھٹکتا باہر نکل گیا۔ اس نے گیٹ کھولا، سامنے آغا کھڑا تھا۔

”اقرا کو بلا دو، مجھے اقرا سے بات کرنی ہے۔“ اس نے سوچا تھا وہ کسی کام سے حمزہ کے پیچھے آیا ہوگا لیکن اس کے منہ سے اقرا نام سن کر اسے شدید دھچکا لگا۔

”یہ کیا بد تمیزی ہے؟“ شاویز کی آواز میں خود بخود غصہ اٹھ آیا تھا، باہر آتے ہی حمزہ نے اس کی آواز سن کر اس کی طرف پیش قدمی کی۔ ”بد تمیزی۔۔۔ تم ایک منٹ کے لیے اقرا سے میری بات کروادو، بد تمیزی میں کر رہا ہوں یا تم۔۔۔ پتا چل جائے گا۔۔۔“ وہ شانے اچکا تا سینے پر ہاتھ باندھتے ہوئے بولا۔

”تم ہوش میں تو ہو۔۔۔“ اس بار ذرا آگے کو آنے والا حمزہ تھا۔

”تمہاری ہمت بھی کیسے ہوئی اقرا کا نام لینے کی۔“ حمزہ کی پیشانی پر سبز لکیریں تن ہی گئیں۔ اندر سے زربینہ کے تیز، تیز بولنے کی آواز آرہی تھی۔

”اس بد ذات کی وجہ سے اب گھر کے لڑکوں کی جان بھی خطرے میں رہے گی۔ ہائے کہاں چپ بیٹھیں گے میرے حمزہ اور شاویز۔۔۔ یہ دشمنی تو نسلوں تک چلتی ہے۔ اب دیکھو ذرا جا کر کس کے ساتھ بحث کرنے لگ گئے ہیں۔“ وہ شاید اسی طرف آرہی تھیں۔ حمزہ خون آلود نظروں سے آغا کو گھور رہا تھا۔

”یار پلیر۔۔۔ پہلے اقرا کو بلا دو۔۔۔ پھر چاہے سارا دن مجھے دروازے پر کھڑے دیکھتے رہنا۔۔۔ بہت ضروری کام ہے مجھے اقرا سے۔۔۔“ باہر کی طرف آتی زربینہ، آغا کی آواز پہچان کر جھٹکے سے رکیں، دل کسی انہونی کے خدشے سے دھڑک اٹھا تھا۔

”کیوں۔۔۔؟ کیوں بلائیں اقرا کو۔۔۔ کیا کام ہے تمہیں اقرا سے۔“ شاویز، حمزہ کو پیچھے ہٹاتا خود آغا کے سامنے آیا اور قدرے نرم لہجے میں پوچھا۔

”کیونکہ یہ میرے شوہر ہیں شاویز بھائی۔“ اماں کے پیچھے کھڑی اقرا نے پورے اعتماد سے کہا تھا۔

”ہمارا نکاح ہو چکا ہے۔“ اس وقت ان میں سے کوئی بھی بولنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ آغا کے لبوں پر البتہ مسکراہٹ رقص کرنے لگی تھی۔ ”جس دن لالہ آپنی غائب ہوئی تھیں۔ اس دن ہم نے بھی نکاح کیا تھا۔ میں آغا کے ساتھ ہی تھی۔ میں نے آپ لوگوں سے جھوٹ

بولتا تھا کہ میں دوستوں کے ساتھ تھی۔“

حمزہ کے ہاتھ پہلوؤں میں آگرے تھے۔ زرینہ یوں ساکت کھڑی تھیں جیسے کسی نے کھڑے، کھڑے ان کی روح نکال لی تھی۔

”بہت رہ لیا اقرار یہاں یا اپنے گھر جاؤ یا میرے ساتھ چلو۔۔۔ ویسے بھی رقیبوں کا کیا بھروسہ۔۔۔“ وہ شاوینز کو دیکھتے ہوئے

اقرا سے مخاطب ہوا۔

”پھر تمہاری اماں جان کے ارادے تو ویسے بھی خطرناک ہیں۔“

”تم جاؤ، ہم آج شام گھر چلے جائیں گے۔“ اقرا نے وفا شعار بیوی کی طرح اسے تسلی دی۔

”چلو ٹھیک ہے، میں شام تک انتظار کروں گا۔“ وہ مڑنے لگا۔

”سنو۔۔۔“ حمزہ کی آواز پر وہ رکا تھا۔

”اسے بھی اپنے ساتھ لے جاؤ۔۔۔ اقرا جاؤ چادر لے کر آؤ۔۔۔“ اس نے اچانک فیصلہ کرتے ہوئے کہا تھا۔ شاوینز جہاں

حیران ہوا تھا وہیں زرینہ کے بے جان ہوتے وجود میں حرکت ہوئی تھی۔۔۔ وہ بے اختیار آگے بڑھی تھیں۔

”ایسے کیسے حمزہ۔۔۔؟“ وہ بہ مشکل بول پائی تھیں۔

”بیوی ہے وہ اس کی امی۔۔۔ ایسے کیسے کا کیا مطلب۔۔۔؟“ وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔

”لیکن لوگ کیا کہیں گے؟“ انہیں اپنی آواز پر رائی، پرانی لگی تھی۔

”یہ تو آپ کو لالہ کے وقت بھی سوچنا چاہیے تھا ناں امی۔۔۔ اب تو لوگ وہی کہیں گے جو کبھی آپ کہتی تھیں۔۔۔ وقت کتنے

خوبصورت انداز میں سب کچھ لوٹا تا ہے ناں امی۔۔۔“ طنزیہ نظروں سے ماں کو دیکھتا وہ کاٹ دار لہجے میں بولا تھا۔

زرینہ اس بار کچھ نہ بول پائیں۔ آغاب منتظر کھڑا تھا۔ اور زرینہ اس بار سین کی طرح غرور سے نہیں کہہ پائی تھیں کہ۔۔۔

”میری اقرا نے کچھ نہیں کیا۔۔۔“

☆.....☆.....☆

”کیا کہہ رہے ہو شیر؟“ بات اتنی بڑی تھی کہ وہ اتنی آسانی سے نہیں یقین کر سکتے تھے لیکن خبر دینے والا شیر تھا۔ جو آج تک خبر

لانے میں ہمیشہ سچا رہا تھا۔

”کچن خبر ہے خان۔۔۔ اپنے بندے کو ان کے شہر والے فارم میں رکھوا دیا تھا۔ اسی نے ساری معلومات دی ہیں، میں نے لڑکی

اور اس کے گھر والوں کے بارے میں بھی کافی معلومات حاصل کر لی ہیں خان۔۔۔“ وہ مؤدب لہجے میں بولا۔ اس کے لہجے کا اعتماد بتا رہا تھا

واقعی خبر کچن تھی۔

”الیکشن کے دن ہیں خان۔۔۔ خبر اتنی بڑی ہے کہ چاروں شانے چت گرے گا سہراب علی خان۔۔۔ ایسی چوٹ تو ساری عمر اسے نہ پڑی ہوگی۔ بس کسی طرح اس لڑکی کے گھر والے مان جائیں۔ اتنا اچھا وکیل کریں گے کہ سہراب بچ نہ سکے گا، نہ اس کا بیٹا ضیا۔۔۔ سیاست میں تو یہ خاندان ختم ہی ہو جائے گا۔۔۔ اور اس کا نام و نشان بھی۔“

”یہ تو واقعی پتے کی بات ہاتھ لگی ہے۔ اب آیاننا اونٹ پہاڑ کے نیچے۔“ وہ مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے بولے۔

”سارے بدلے ایک ساتھ چکانے کا وقت۔۔۔ ایک، ایک حساب دینا پڑے گا سہراب علی خان کو۔۔۔“ وہ تنفر سے کہہ کر ہنسنے لگے تھے، شیرونے ان کا ساتھ دیا تھا۔



ناول ”محبت لفظ ہے لیکن“ ابھی جاری ہے۔ اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی 10 تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

تزیلہ ریاض کا بہت خوبصورت نیا ناول

غم ہے یا خوشی ہے تو

ہر ماہ باقاعدگی سے کتاب گھر پر پیش کیا جا رہا ہے
نئی اقساط پڑھنے کیلئے وزٹ کریں

kitaabghar.com

بطور خاص کتاب گھر قارئین کے لیے لکھا گیا
عشاء کوثر سردار کا بہت خوبصورت اور طویل ناول

عطارد جزیرے کے خواب

ہر ماہ باقاعدگی سے کتاب گھر پر پیش کیا جا رہا ہے
نئی اقساط پڑھنے کیلئے وزٹ کریں

kitaabghar.com

قسط نمبر 9

”ماں باپ کے سامنے بہت سوچ سمجھ کر بولا کرو کیوں کہ کبھی کبھی ان کے سامنے بولا گیا کوئی بھی برایا اچھا کلام ہماری پوری قسمت پہ حاوی ہو جاتا ہے۔“

آفتاب ولی خان نے زندگی کی ہر آسائش ان ماں، بیٹے کے آگے ڈھیر کر دی تھی، وہ اس خاندان کے محسن تھے۔ اور آفتاب ولی خان کا خاندان جانتا تھا کہ محسنوں کی قدر کس طرح کی جاتی ہے۔ ہر طرح کی سہولت کے باوجود بھی اسفندیار کی بیوہ غم نہیں سہہ پارہی تھیں۔ اور روز بروز ان کی صحت گرتی جا رہی تھی۔ سہراب علی خان البتہ اس مملکت مختصر میں آکر بے حد خوش تھا۔ یہاں آکے اسے جو مقام دیا گیا تھا اس کا اسے بخوبی اندازہ تھا۔ وہ آفتاب ولی خان کے اکلوتے جاں نشین زریاب ولی خان کی برابری کرنے لگا تھا۔ آفتاب ولی خان نے اسے بیٹا کہا تھا، اس صحت مند خوبصورت بچے کو اس بات کا بخوبی ادراک تھا کہ چونکہ یہی خاندان اس سے اس کے باپ کی دوری کا باعث بنا تھا سو اس کی ہر چیز پہ اس کا برابر کا حق تھا۔

آفتاب ولی خان جب بھی بیٹھک پہ جاتے ہمیشہ زریاب ولی خان کو ساتھ رکھتے تاکہ چھوٹی سی عمر سے ہی اسے سرداری کی اونچ نیچ سمجھ آ سکے۔۔۔ اسفندیار کی موت کے بعد ہر وقت کھیل کود میں وقت برباد کرنے والا سہراب علی خان بھی زریاب کی طرح ہی کلف لگے کپڑے پہن کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہوتا۔ کبھی، کبھی اس کی پھرتی آفتاب ولی خان کو بھی ورطہء حیرت میں ڈال دیتی تھی۔ اس کی گہری سبز آنکھوں میں عجیب سی ذہانت چمکتی تھی۔

”مجھے تو اس بچے کی آنکھوں سے بہت خوف آتا ہے، آپ کو اسے زریاب کے اتنا قریب نہیں رکھنا چاہیے۔“ زریاب کی ماں اکثر خوفزدہ ہو کر ان سے کہہ بھی دیتیں تو وہ مسکرا دیتے۔

”اوہ پاگل۔۔۔ زریاب کی طرح ہی تو ہے، معصوم سا بچہ ہے، اس سے بھی تمہیں خوف آرہا ہے۔“ وہ انہیں تسلی دیتے۔

”یاد رکھو، خدا محسنوں کو بھول جانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔“

اور۔۔۔ بھولی بھالی اماں فوراً کانوں کو ہاتھ لگائے استغفار کا ورد شروع کر دیتیں۔

اور پھر بیٹھک میں بھی وہ آفتاب ولی خان کو اکثر حیران کر دیتا تھا، زریاب کی نسبت وہ زیادہ دلچسپی لیتا تھا ان معاملات میں، زمینداری، بدی داری، (یعنی وہ دشمنی جو نسلوں در نسلوں قتل و قتل چلتی ہے۔) کے معاملات میں خاص طور پر، آفتاب ولی خان نے یہ بھی دیکھا تھا کہ عام بچوں کی طرح وہ صرف سب کچھ جذب ہی نہیں کرتا تھا بلکہ اس اعتماد سے رائے بھی دیتا تھا جیسے ان کا اصل جانشین وہی ہو، زریاب نہیں۔۔۔

صرف چند دنوں میں ہی انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ بچہ اپنی عمر سے کئی سال آگے سوچتا تھا۔ شدت پسند تھا، بدی داری کے معاملات میں نہ صرف غیر ضروری دلچسپی لیتا تھا بلکہ حیران کن طور پر بدلہ لینے کے حق میں ہی بات کرتا تھا۔ اسے لگتا تھا معافی یا صلح نامے سے متاثرین کے دکھ کا ازالہ ناممکن تھا۔

اس کی بڑھتی عمر کے ساتھ آفتاب ولی خان جیسے یہ ماننے لگے تھے۔۔۔ وہ اسفندیار علی خان، ان کے سگے چچا زاد کا بیٹا ضرور تھا، ان کا خون ضرور تھا لیکن واقعی اس میں کچھ غلط تھا، وہ اکثر اسے سمجھاتے بھی لیکن وہ انہیں یوں دلائل دیتا کہ بالآخر انہیں ہی خاموشی اختیار کرنا پڑتی۔ آفتاب ولی خان نے یہ بھی دیکھا تھا کہ سہراب، زریاب سے مرعوب ضرور رہتا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں اس کے لیے پسندیدگی کے رنگ بہت دھیمے تھے، حویلی کے ملازموں میں وہ صرف انہی بچوں کے ساتھ کھیلنا پسند کرتا تھا، جو حد سے زیادہ شرارتی تھے، ان کی شرارت سے نہ انسان محفوظ رہتے تھے نہ حیوان۔۔۔ زریاب جس قدر سلجھی ہوئی اور سمجھدار شخصیت کا مالک تھا، سہراب اسی قدر جلد باز اور منفی سوچ رکھتا تھا، وہ اب بیوی کی بات کو سوچنے لگے تھے، ایک شام ایسا واقعہ ہو گیا کہ ان کو واقعی اپنے فیصلے کے غلط ہونے کا احساس ہو گیا۔ اس دن وہ شام کے کھانے کے بعد چہل قدمی کرتے ہوئے پائیں باغ کی طرف آئے تھے۔ جب انار کے گھنے درخت کے نیچے انہوں نے ماں، بیٹے کو باتیں کرتے دیکھا۔ وہ بلا ارادہ ہی رک گئے۔

”امی، بیٹھک میں سب آدمی سادہ سفید پگڑی پہنتے ہیں اور آفتاب بابا، اتنی اونچی، چمکدار پگڑی۔۔۔ کیوں؟“ وہ ماں سے پوچھ رہا تھا۔ اس کے معصومیت بھرے سوال پر وہ مسکرا دیے تھے۔

”کیونکہ وہ سردار ہیں نا ہمارے۔۔۔ اور سردار کی پگڑی ہمیشہ اونچی ہوتی ہے تاکہ اس علاقے کے سردار کی پہچان ہو سکے۔“ ”اچھا۔۔۔“ وہ سمجھنے کے انداز میں سر ہلاتا بولا تھا۔

”مورے۔۔۔ بابا کے بعد یہ پگڑی کون پہنے گا؟“ وہ مڑنے لگے تھے جب اس کا سوال سن کر رک گئے تھے۔ ”ظاہر ہے زریاب بابا۔“ خیف سی ماں نے ہاتھوں کے پیالے میں اس کا خوبصورت چہرہ تھامتے ہوئے کہا۔ شام کے مدھر اجالے میں اس کی گہری سبز آنکھیں لہورنگ سی ہوئیں۔

”اور میں مورے۔“ سوال بالکل اچانک تھا۔

”تم زریاب کا دایاں ہاتھ بنو گے نا سہراب۔۔۔ اپنے بابا کی طرح۔۔۔ جس طرح وہ آفتاب لالہ کے ساتھ رہتے تھے۔“

”نہیں مورے۔۔۔ مجھے بابا کی طرح نہیں بننا۔۔۔ مجھے آفتاب بابا کی طرح بننا ہے۔ اونچی پگڑی والا۔۔۔ سردار خان۔۔۔“

”سہراب۔۔۔ ایسا نہیں بولتے بچے۔۔۔“ انہوں نے حیرت سے بچے کو خود میں سمولیا تھا۔

اور وہاں سے بنا آہٹ کیے واپس پلٹتے آفتاب ولی خان نے پہلی بار سوچا تھا۔ وہ واقعی اس بچے کو پہچاننے میں غلطی کر گئے تھے۔

انہیں وہ رات اچھی طرح یاد تھی جب اماں جی نے انہیں بتایا تھا۔

”اس بچے کی آنکھیں اس کا اندر کھول دیتی ہیں آفتاب خان۔۔۔ اس کی تیز، روشن آنکھوں سے اس کا من جھانکتا ہے، وہ بچہ نہیں ہے۔۔۔ بلا کا شیطان ہے۔ یاد رکھنا خان۔۔۔ تاریکی صرف رات کی نہیں ہوتی، تاریکی دل کی بھی ہوتی ہے۔ کالی شالا۔۔۔ گھپ اندھیرا، جس طرح رات کا اندھیرا ہر اجالے کو نگل لیتا ہے۔ ویسے ہی من کا اندھیرا ہر نیکی، ہر احسان کو نگل جاتا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے، زریاب کل کو اس کی وجہ سے مشکل میں پڑنے والا ہے۔“ وہ ان کو سمجھا رہی تھیں اور وہ خاموشی سے سنے جا رہے تھے۔

”میں نے دیکھا ہے، جب وہ دونوں کھانا کھانے بیٹھتے ہیں ناں۔۔۔ تو سہراب کسی نہ کسی طرح زریاب کی پلیٹ سے ہر اچھی چیز اٹھا لیتا ہے۔۔۔ اور سیانوں کا قول ہے کہ دوست، دشمن کا فرق کھانے کی میز پر ہی پتا چل جاتا ہے، نوالے اور بوٹی پہ نظر رکھنے والا کبھی تیرا دوست نہیں بن سکتا۔“

اس رات انہیں وہ ساری باتیں صفر لگی تھیں۔ لیکن اب انہیں اپنے فیصلے پر افسوس ہونے لگا تھا۔ اب سب کچھ سیننا بہت مشکل تھا۔ سہراب علی خان اس حویلی میں جگہ بنا چکا تھا۔ اور حویلی سے باہر کے لوگ بھی اب اسے ان کا بیٹا مانتے تھے، بہر حال وہ سردار تھے۔ اور سردار فیصلہ لینے کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں، انہیں بھی اب جلد از جلد کچھ سوچنا تھا۔

☆.....☆.....☆

وہ انہیں نہیں جانتا تھا لیکن جس شخص کے بارے میں وہ اطلاع لائے تھے، اسے ان سے کسی تعارف کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ وہ اس وقت بغور انہیں اس طرح سن رہا تھا جیسے وہ واقعی اس کے ہمدرد ہوں، غمگسار، بہت پرانے دوست۔۔۔

”سہراب علی خان وہ شیطان ہے جو کسی کو بھی نگل سکتا ہے۔ اور ایسا ہی اس کا بیٹا۔۔۔ تمہاری بہن اس کے فارم ہاؤس تک کیسے پہنچی۔۔۔ یہ سب تم یا تمہاری بہن بتاؤ گے۔ ہم تمہیں صرف ان ظالموں تک رسائی دیں گے۔ ہماری این جی او نہ صرف تمہاری بہن کو بلکہ تمہاری ساری فیملی کو سپورٹ کرے گی۔ درپردہ مقدمہ اور اس کا سارا خرچہ بھی ہم اٹھائیں گے۔۔۔ ہو سکتا ہے فیصلہ آنے کے بعد تمہاری ساری فیملی کو ہمارا خان کسی دوسرے ملک بھی سیٹل کروادے۔ فی الحال تمہیں اپنی بہن کو اس پریس کانفرنس میں پیش کرنا ہوگا جس کا سارا انتظام ہم کریں گے۔ تمہیں صرف اپنا دکھ، اپنا مٹیج بیان کرنا ہے۔ باقی کام ہم پہ چھوڑ دو، ہمارا مقصد اور تمہارا مقصد صرف ایک ہے۔ تمہاری بہن کے مجرم کی بنیابی۔۔۔ اور ہمارا ساتھ دے کر تم اعلیٰ اسٹیٹس بھی حاصل کر سکتے ہو اور اعلیٰ شخصیات کی ہمدردی بھی۔۔۔ فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔“ گن بردار آدمی نے ایک کارڈ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا تھا۔

”جب بھی فیصلہ کر لو اس نمبر پر رابطہ کر لینا۔ سہراب علی خان سے انتقام کی اس جنگ میں تم ہمارا ساتھ دو، ہمیں اچھا لگے گا۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اور دروازے کے سامنے سے گزرتی سین کے قدم لوہے کے ہوئے تھے۔

”سہراب علی خان۔“ خوف سے ان کا دل دھڑکنا ہی بھول گیا تھا جیسے، انہوں نے جھٹ سے گرتے وجود کو سنبھالنے کے لیے دیوار کا سہارا لیا تھا۔۔۔ اندر کون تھا، انہیں غرض نہ تھی لیکن وہ بات کس معاملے پر کر رہے تھے۔ انہیں یہ سمجھنے میں وقت نہیں لگا تھا، وہ مرے مرے قدموں سے لالہ کے کمرے کی طرف آئیں۔ لالہ بستر پر پڑی تھی۔ دروازے کی طرف اس کی پشت تھی۔ وہ چل نہیں پار ہی تھیں۔ تبھی بہ مشکل کا نپتی ٹانگوں سے اس کے قریب بیڈ پر اپنا وجود گرا سا لیا تھا، لالہ نے چونک کر پیچھے مڑ کر دیکھا تھا۔ اس کی پلکیں اب بھی نم تھیں۔ سین کا دل کسی نے مٹھی میں کر لیا۔

”لالہ۔۔۔“ وہ بہ مشکل اسے پکارتے ہوئے بولیں۔

”سہراب لالا۔۔۔؟“ لالہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ان کے سوکھے خشک ہونٹ ذرا سا کپکپائے تھے۔ اور کتنے دنوں کی ٹوٹی پھوٹی، خاموش سی لالہ ایک دم اُن کے گلے لگ کے پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ سین کے روتے، ہلکتے، لرزتے وجود کو اسے سنبھالنے میں خود وقت کا سامنا تھا۔

”تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا لالہ۔۔۔ میری بد نصیبی، میرے بخت کی سیاہی تجھے لوٹ ہی گئی میری بچی۔۔۔“ وہ منہ پہ دونوں ہاتھ مارتے بین کرتے ہوئے بولیں۔ اماں گھبرائی سی شور کی آواز سن کر اُن کی طرف آئی تھیں اور ماں بیٹی کو اتنے عرصے بعد یوں ایک دوسرے سے لپٹے دیکھ کر وہیں جم سی گئیں۔

”نہیں امی۔۔۔ میں تو ساری عمر آپ کو طعنے مارتی رہی۔۔۔ آپ کو اپنا مجرم ٹھہراتی رہی۔۔۔ آپ کی نافرمانی کی ہی تو سزا ملی ہے مجھے امی۔۔۔ کہ خدا نے خود میری ذات اس شیطان کے سامنے لاکھڑی کر دی امی۔۔۔“ وہ سسک سسک کے ماں کے ہاتھ چوم رہی تھی۔

”وہ مجسم شیطان، میں نے جب اپنی آنکھوں سے دیکھا امی۔۔۔ تو پہلی بار میرا دل کیا کہ کاش وہ مجھے مار دے۔۔۔ میرا آپ سے سامنا نہ ہو امی۔۔۔ میں آپ کو کیا، کیا کہتی رہی۔۔۔ بد کردار۔۔۔ گھر سے بھاگی عورت۔۔۔ مجھے ماریں امی۔۔۔ ابھی اور اسی وقت میرا وجود توڑ پھوڑ ڈالیں۔“ وہ ماں کے ہاتھ لے کر اپنے چہرے پر مارنے لگی۔

”لالہ۔۔۔“ سین نے اسے زبردستی خود میں بھینچ لیا تھا۔

”میں آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گی سہراب لالا۔۔۔ میرا خدا آپ کو کبھی معاف نہیں کرے گا۔“ وہ زور، زور سے رونے لگی تھیں۔

لالہ ان کی گود میں سر چھپائے الگ سسک رہی تھی۔ اماں نے آگے بڑھ کر سین کا سر خود سینے سے لگا لیا تھا۔ وہ اب بھی خوش قسمت تھے۔ دعا ان کے ساتھ تھی۔

آئینہ ٹوٹنے کا شور بے حد زیادہ تھا۔ وہ بھاگتی ہوئی لاؤنج میں آئی تھی۔ گلاس ونڈو کے سامنے ضیا کھڑا تھا۔ گلاس مکمل طور پر ٹوٹ چکا تھا۔

”کتنے آئینے توڑو گے خان۔۔۔؟“ وہ دھیرے دھیرے چلتی اس کے قریب آ کے بولی۔

ضیا نے زخمی نظروں سے اسے دیکھا تھا پھر نظریں پھیر لیں۔

”جس آئینے میں بھی اس کا عکس نظر آئے گا۔“ بھاری، تھکن سے چور لہجہ۔۔۔

”باہر کے آئینے توڑنے سے دل پہ جسے عکس کہاں پیچھا چھوڑتے ہیں۔“ وہ اداس لہجے میں بکھرے کانچ کے ٹکڑوں کو دیکھتے ہوئے بولی۔

”کیوں زمزمہ۔۔۔؟ کیوں۔۔۔؟“ وہ بالکل اچانک اس کی طرف مڑا تھا کہ وہ گہرا سی گئی تھی۔

”جس سے میں شدید نفرت کرتا تھا جو اتنے سالوں سے میرے باء جی کی تکلیف کا باعث بنے تھے۔ مجھے ان کے لیے اتنا برا

کیوں محسوس ہو رہا ہے۔ نفرت پر کچھ اور غالب کیوں آنے لگا ہے، کیوں اس کے نرم ہاتھ، معصوم لب مجھے سونے نہیں دیتے۔۔۔ ضیا علی

خان اس قدر راز راں تو نہیں تھا۔۔۔ وہ تو ارادوں کا پکا تھا۔ کھیل کھیلتا تھا، جیت جاتا تھا، یوں کبھی محصور نہ ہوتا تھا، کیا ہے یہ۔۔۔؟ کیوں

میری نفرت کمزور پڑنے لگی ہے۔“ وہ اس کا بازو پکڑے اسے جھنجھوڑتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

زمزمہ کچھ دیر خاموشی سے اس کی خوب صورت گہری آنکھوں میں دیکھتی رہی تھی۔ ہر وقت کھلا رہنے والا چہرہ کس قدر مرجھانے

لگا تھا۔ بڑھی شیواور کندھوں کو چھوتے الجھے بال، اس کا حلیہ کس قدر رُف ہو رہا تھا۔ مرد ہونے کے باوجود وہ سنبھل نہیں پارہا تھا، خود کو سنبھال

نہیں پارہا تھا۔۔۔ تو لالہ۔۔۔ اس کا کیا حال ہوگا؟ اسے تاسف گھیرنے لگا۔

”میں نے تو سمجھا یا تھا آپ کو خان۔۔۔ آپ اس سے نفرت نہیں، محبت کرتے ہیں، آپ کی ایک، ایک ادا پر تحریر ہوتا تھا، آپ

کے ایک، ایک نقش میں اس کا عکس جگمگاتا تھا۔۔۔ آپ تو خود ہی نظریں چراتے رہے خان۔۔۔“ وہ تاسف سے اس مضبوط مرد کو دیکھتے

ہوئے بولی تھی جو بالکل اجڑ چکا تھا۔

”کتنی دیر کردی ناں خان آپ نے۔۔۔ سب کچھ تباہ کر دیا۔۔۔ کتنا مان تھاناں آپ کو اپنے کردار پر۔۔۔ آپ کے ہوتے

ہوئے کوئی کسی کو انگی بھی نہیں لگا سکتا اس عمارت میں۔۔۔ اور آپ نے خود ہی۔۔۔“ اس کی آنکھیں نم ہونے لگی تھیں۔ دل میں درد سا جاگا

تھا، ضیا اسے بھی تو عزیز تھا۔ اور اس کے لیے تو وہ فرشتوں جیسا تھا۔

”کاش آپ سہرا ب علی خان کے بیٹے نہ ہوتے خان۔۔۔“ اس نے سرگوشی میں کہا تھا لیکن ضیا نے واضح سن لیا تھا، وہ مٹھیاں

بھینچ گیا۔

”کہا تھا میں نے خان۔۔۔“ وہ واپس سیڑھیوں کی طرف مڑتے ہوئے بولی تھی۔

”یہ لفظوں کی شرارت ہے۔۔۔ سمجھ کر کچھ بھی لکھنا تم،

محبت لفظ ہے لیکن۔۔۔ یہ اکثر ہو بھی جاتی ہے۔“

وہ گنگناتے ہوئے اوپر چلی جا رہی تھی اور ضیا وہیں بکھری کر چیوں کو تکتا صوفے پر ڈھسے سا گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

اس کی بات پر نہ صرف لالہ بلکہ اماں اور سین بھی شا کڈ رہ گئی تھیں۔

”یہ تم کیا کہہ ہو شاویز۔۔۔؟“ اماں نے گرجدار آواز میں کہا۔

”میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نانو۔۔۔“ وہ ان کے غصے کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے آرام سے بولا تھا۔

”ایک حادثہ ہو چکا ہے، ہم اسے ٹھیک نہیں کر سکتے۔ اس وڈیو سے کچھ بگاڑ بھی نہیں سکتے لیکن خود تو کچھ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔“

اس نے زیادتی کی انتہا کر دی تھی۔ لالہ کا دل درد سے پھٹنے کے قریب تھا۔

”سارے ملک کی ہمدردیاں ہمارے ساتھ ہوں گی، ہر طرح کے فنڈ زلیں گے۔۔۔ ملک کی ساری بڑی این جی اوز کی سپورٹ

ملے گی ہمیں۔۔۔ اور اس طرح ہم اس سردار کو بھی سبق سکھا دیں گے۔“

”بس۔۔۔ ایک لفظ اور مت بولنا شاویز۔۔۔“ سین ضبط نہ رکھتے ہوئے کمرے سے باہر نکلیں تو نانو نے چیختے ہوئے شاویز کو

مزید بولنے سے منع کیا تھا۔

”ابھی بات اتنی نہیں پھیلی۔ تم اسے ساری دنیا میں پھیلانا چاہتے ہو؟“

”بات پھیلنے کو ہی دیر لگتی ہے نانو۔۔۔ پھر جو ہونا تھا ہو چکا۔۔۔ لالہ کی پاک دامنی واپس نہیں آ سکتی۔۔۔ تو کیا برا ہے کہ گناہ

گار کو نقصان اور ہم اس موقع سے تھوڑا سا فائدہ اٹھالیں۔“

”شاویز۔۔۔“ نانو نے اٹھ کر اس کے گال پر تھپڑ رسید کیا تھا۔۔۔ وہ حیرت سے گنگ گال پر ہاتھ رکھے انہیں دیکھے گیا۔

”میں نے سوچا تھا، سین کی تربیت نے تم سے وہ ساری غلاظت نکال لی ہوگی جو تمہارے باپ کے خون کے ذریعے تم میں شامل

ہوئی تھی۔“ نانو غصے سے کانپنے لگی تھیں۔ ان کا کمزور ضعیف وجود ہلکورے لینے لگا تھا۔ لالہ کے آنسو متواتر اس کا دامن بھگوائے جا رہے تھے۔

”لیکن سچ کہا ہے کسی نے، اُرسی کرسی۔۔۔ کندا پرے تے ٹرسی۔۔۔ (جو بھی ہو دیوار بنیاد پر ہی کھڑی ہوتی ہے) ٹیڑھی بنیاد تو

ٹیڑھی دیوار، سیدھی بنیاد تو سیدھی دیوار۔۔۔ میں نے سوچ بھی کیسے لیا کہ تم باپ سے الگ نکلو گے۔“

”نانو۔۔۔“ وہ دکھ سے انہیں دیکھے گیا جیسے وہ اسے سمجھنے میں غلطی کر رہی ہوں۔

”میں تو ہم سب کا بھلا چاہتا ہوں، آپ خود سوچیں لالہ اور ہماری کیا عزت رہی ہے۔ اس طرح کم از کم۔۔۔“

”کیا اس طرح۔۔۔ اس طرح باقی بچی عزت کا بھی تم جنازہ نکالنا چاہتے ہو۔“ اس نے وجود کی طرح ان کی آواز بھی کپکپا رہی تھی۔

”لالہ۔۔۔ لالہ تم تو سمجھو۔۔۔“ وہ سر جھکائے نیر بہائی لالہ کے قریب آیا۔

”ہم چند دنوں میں کہاں سے کہاں پہنچ جائیں گے۔“ لالہ نے سراٹھایا، اس کی نگاہیں لہو رنگ تھیں، شکوہ، شکایت، بے حسی، لا چاری کتنے ہی رنگ اس وقت اس کی آنکھوں میں بیک وقت پڑھے جاسکتے تھے۔

”میں جانتی ہوں شاویز۔۔۔“ اس کی آواز ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھی۔ اس کا لہجہ بھی غم تھا۔

”میں ریپ وکٹم ہوں۔۔۔ ساری عمر اپنی ماں کے کردار کی دھجیاں بکھیرنے والی ساری عمر اپنے بلند کردار کی بات کرتی رہی۔۔۔ دعویٰ کرتی رہی کہ میں دکھاؤں گی، کیسے عورت خود کو بلند رکھ سکتی ہے۔ اور دیکھو میرے ساتھ کیا ہوا۔“ اس نے دونوں ہاتھ یوں پھیلائے تھے جیسے سب کچھ لٹا چکی ہو۔ وہ خالی ہاتھ ہو۔۔۔ تہی دامن۔۔۔

”میرے ساتھ جو کچھ بھی ہوا، میری ماں کو دی گئی میری ہر گالی، ہر سخت لفظ، ہر کڑوے بول کا حساب ہے اور خوش قسمت ہوتے ہیں وہ لوگ جو اسی دنیا میں حساب کا شکار ہو جاتے ہیں، مجھے قدرت کی یہ سزا منظور ہے، ساری عمر امی کو دینے والے طعنے اب میں چپ کر کے سہہ لوں گی لیکن۔۔۔“ اس نے ہاتھوں سے رگڑ کر گیلیا ہوتا چہرہ صاف کیا تھا۔

”یہ سب خدا کی طرف سے ہے، عزت، ذلت صرف میرے رب کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جانتا ہے میں اس گناہ میں شریک نہیں، میں گناہ گار نہیں، میرے ساتھ ہونے والے ظلم کا حساب بھی وہی کرے گا۔ میرا پردہ وہی رکھے گا۔۔۔ لیکن میں خود اپنے ہاتھوں سے اپنا تماشا ہرگز نہیں بنانے دوں گی۔“ اس کا لہجہ اٹل تھا، شاویز لب کا ثارہ گیا تھا۔ نانوں نے اٹھ کر سسکتی لالہ کو سینے سے لگا لیا تھا۔

☆.....☆.....☆

اور گہری سبز آنکھوں والے اس بچے نے، سہراب علی خان نے نہ جانے کیسے ماں کے شانے پر سر رکھتے ہوئے آفتاب ولی خان کو وہاں سے پلٹتے دیکھ لیا تھا، ان کے قدموں کی سستی سے وہ اچھی طرح جان گیا تھا کہ وہ اس کی باتیں سن چکے تھے۔ اور اسے امید تھی کہ وہ جلد از جلد کوئی فیصلہ سنائیں گے۔ بہر حال وہ مطمئن تھا آفتاب ولی خان احسان فراموشوں میں سے ہرگز نہیں تھے۔ وہ بھی اس کے لیے کچھ نہ کچھ اچھا ہی کرتے۔

اور واقعی انہوں نے ان کے بابا کی قربانی کا حق ادا کر دیا تھا۔ انہوں نے ایک قریبی قصبے کی ساری زمین نہ صرف سہراب علی خان کے نام کر دی تھی بلکہ وہاں موجود گھر بھی ان کو دے دیا۔ اور ان کی رہائش کا سارا بندوبست بھی وہیں کر دیا۔

”میرے خیال میں بی بی، اس طرح سہراب اپنی ذمّے داریوں کو بھی سمجھے گا اور آپ کو بھی پریشانی نہیں ہوگی۔“ انہوں نے

سارے انتظامات کرنے کے بعد سہراب کی امی سے کہا تھا۔

”ملازمائیں بھی آپ کے ساتھ جائیں گی اور دوسرے ملازم بھی ہر وقت سہراب کے ساتھ رہیں گے۔ جب تک سہراب میٹرک نہیں کر لیتا اس کے سارے تعلیمی اخراجات بھی میں خود اٹھاؤں گا۔ آگے پڑھے گا تو بھی اس کا ذمہ میں اٹھاتا ہوں۔“

اسفندیار کی بیگم تو تشکر کے آنسو لیے اس گھر سے رخصت ہوئی تھیں لیکن وہ زہریلی آنکھوں والا لڑکپن کی حدیں چھوڑتا لڑکا سخت ناراض تھا۔

”آفتاب بابا نے ہمارے ساتھ اچھا نہیں کیا۔“ اس بار اس نے صرف خود سے شکایت کی تھی۔

یہ پہلی بار تھا جب اس نے صرف خود سے شکایت کی تھی۔ ورنہ وہ نہ صرف ڈائری میں لکھتا بلکہ اماں سے بھی ضرور بات کرتا۔ اس دن کے بعد اس نے خود سے وعدہ کیا تھا، سہراب علی خان کی بات صرف اس تک ہی محدود رہے گی۔

قسمت نے ایک بار پھر اس کا ساتھ دیا تھا۔ صرف ایک مہینے بعد ہی امی کو ہارٹ اٹیک ہوا، وہ جانبر نہ ہو سکیں اور سہراب کی یارت (وصیت یا ہدایت کرنا) آفتاب ولی خان کو دے گئیں، صدمہ اس قدر شدید تھا کہ اس بار آفتاب ولی خان نے ذرا بھی نہ سوچا تھا اور سہراب علی خان کو گھر لے آئے تھے۔

”آج کے بعد میرے دو بیٹے ہیں، زریاب اور سہراب کوئی ان میں فرق نہ رکھے اور یہ دونوں میری ہر چیز کے مشترک وارث ہوں گے۔“ شام کو بچوں کے درمیان بیٹھے انہوں نے سب کو سمجھایا تھا اور وہ سب آفتاب ولی خان کے بچے تھے، فوراً سمجھ گئے تھے، سب سے بڑے زریاب نے فوراً اسے گلے لگا لیا تھا۔

اس دن کے بعد سہراب علی خان اس گھر کا بیٹا تھا، زریاب سب سے بڑے تھے۔ سب سے چھوٹی اور ان سے بڑی نکلیں۔۔۔ اور وہ سبھی بہن، بھائی سہراب کی صورت بھائی مل جانے پر بے حد خوش تھے۔

وقت نے اڑان بھری تھی۔ زریاب اور سہراب کی شادیاں ہو گئیں۔۔۔ زریاب ولی خان کا بیٹا پیدا ہوا۔۔۔ ساری حویلی میں خوشیاں دوڑ گئیں۔۔۔ ساری رات جشن کا سماں رہا، شادیانے بجتے رہے۔۔۔ دور، دور سے لوگ مبارکباد کے لیے آتے رہے۔۔۔ اور سہراب علی خان اس دن سارا وقت اندر ہی اندر بل کھاتے رہے۔ آفتاب ولی خان اس قدر خوش تھے کہ اپنی حدود کے آخری دو قصبے زریاب کی بیوی جنت بی بی کے نام کر دیے تھے۔

”کان کھول کر سن لو۔۔۔ مجھے بھی صرف بیٹا چاہیے۔“ اس رات سونے سے پہلے انہوں نے بیوی صنوبر کے پیٹ پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس قدر سخت لہجے میں کہا تھا کہ وہ دھک سے رہ گئی تھیں۔ یہ روپ سہراب علی خان کا انہوں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ اور وہ اس ساری رات سونہ سکی تھیں۔

اور صرف تین ماہ بعد خوب صورت سی اوزگل ان کی گود میں آئی تھی۔ آفتاب ولی خان اسی قدر خوش تھے، جس قدر اپنے پوتے کی پیدائش پر۔۔۔ انہوں نے روایت برقرار رکھتے ہوئے حویلی کی پہلی بچی کے نام بھی اتنی زمین کر دی تھی۔۔۔ جتنی پہلے سپوت کو دی تھی۔

”کتنے اچھے ہیں ناں داجی۔۔۔“ صنوبر نے شام کو ان کے کمرے میں آتے ہی مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

”لیکن وارث تو ان کا پوتا ہی ہوگا ناں۔۔۔ تم نے تو بچی پیدا کر لی۔“

”خان یہ تو اللہ کے فیصلے ہوتے ہیں۔“

”کمزور لوگ یہی کہہ کر ہار مان لیتے ہیں۔۔۔ لیکن میں کمزور نہیں ہوں، میں اپنے فیصلے خود کرتا ہوں۔“ انہوں نے تکبر سے کہا تھا۔ صنوبر دل تھام کر رہ گئیں۔

”اور اسے ہٹاؤ میرے سامنے سے۔۔۔ دور سلا یا کرو۔۔۔“ انہوں نے ساتھ لیٹی اوزگل کو نفرت سے تکتے ہوئے تشفیر سے کہا۔ صنوبر نے فوراً انھی سی جان کو اٹھا کر گود میں بھر لیا تھا۔

☆.....☆.....☆

”تمہارا دامغ خراب ہو گیا ہے شاولیز۔۔۔“ اس نے باریال سے اپنا فیصلہ شیر کیا تھا۔ وہ تو بھڑک ہی اٹھا تھا۔

”لڑکیوں سے متعلق ویسے بھی سارے معاملات کس قدر نازک ہوتے ہیں۔۔۔ اور تم۔۔۔ تم خود اس حادثے کی تشہیر کرنا چاہتے ہو۔“ باریال کے لہجے میں دکھ تھا۔

”ہا۔۔۔ تمہیں کیا لگتا ہے، یہ سارا معاملہ چھپا ہوا ہے؟“

”ہاں فی الحال تو واقعی ایسا ہے اور جس قدر پردہ رہتا ہے رہنے دو شاولیز۔۔۔ اپنے گھر کی عزت یوں کون اچھا لتا ہے یا۔۔۔“ اسے واقعی سمجھ نہیں آرہی تھی۔ شاولیز جیسا لڑکا اس قدر زریں سوچ رکھ سکتا ہے۔ تاسف کے ساتھ غصہ سا بھر رہا تھا اس کے دل میں۔

”آج کل ہر چیز کیش کرنے کا دور ہے اگر ہمیں موقع مل رہا ہے تو ہم پیچھے کیوں رہیں۔“

”فارگاڈ سیک شاولیز۔۔۔“

”پھر تم بتاؤ میں کیا کروں۔۔۔ لوگوں کو منہ دکھانے کے قابل تو میں ویسے ہی نہیں رہا۔“

”صرف خدا پہ بھروسہ کرو۔۔۔ سب ٹھیک ہو جائے گا یا۔۔۔“ اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے باریال نے اسے تسلی دی تھی۔۔۔ وہ لب کچل گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

اسے واقعی شاولیز کی سوچ پر افسوس ہوا تھا۔ وہ اپنے ذرا سے فائدے کے لیے اس قدر بھی گر سکتا تھا کہ اپنی ہی بہن سے اس کے

ساتھ پیش آنے والے حادثے سے بھی فائدے کا سوچ سکتا تھا۔ خود اس نے دیدے تک سے یہ بات چھپائی تھی۔ بلکہ بار، بار شاویز کو بھی یہی تلقین کرتا رہا تھا۔ جس قدر لالہ کو وہ جانتا تھا وہ اچھی سلجھی ہوئی لڑکی تھی۔ کام سے کام رکھنے والی، باوقاری شخصیت کی مالک۔۔۔ اسے یقین تھا کہ وہ ہرگز کوئی غلط قدم نہیں اٹھا سکتی تھی۔ اور اب جب سب کچھ کلنیر ہو چکا تھا اسے کسی امیر ماں، باپ کی بگڑی اولاد نے رول کے رکھ دیا تھا تو باریال کے دل میں اس کے لیے ہمدردی ہی ہمدردی تھی۔

اسے اس پیاری سی لڑکی کے لیے سچ میں افسوس محسوس ہوا تھا۔ وہ خود کتنے ہی دن ڈسٹرب رہا تھا۔ امن نے بہر حال اس صورت حال میں اس کا سارا کام بخوبی سنبھالا تھا۔ اور اب شاویز کی سوچ جان کر وہ مزید تاسف میں گھر گیا تھا ایک تو تباہ حال لڑکی، اوپر سے گھر والوں کا یہ پریشہ، اس کی حالت واقعی قابلِ رحم تھی۔ وہ لاکھ خود کو کام میں مصروف رکھتا، وہ سادہ سی معصومیت لیے لڑکی اس کے حواسوں پر سوار رہتی۔ ”کاش میں اس کے لیے کچھ کر سکتا۔“ بے بسی سے وہ صرف سوچ کے رہ جاتا۔ اور کبھی، کبھی قدرت ہماری قسمت میں وہی لکھ دیتی ہے جیسا ہم سوچتے ہیں، شاید باریال کے ساتھ بھی ایسا ہونے لگا تھا لیکن اسے خبر نہ تھی کہ۔۔۔

☆.....☆.....☆

”وہ تو تھی ہی بے عقل۔۔۔ تم ہی عقل کر لیتے حمزہ۔۔۔“ زرینہ تو صبح شام کا چین کھو بیٹھی تھیں۔ کتنے ارمان تھے ان کے دل میں اقرار کی شادی کے۔ کتنے ہی سوٹ انہوں نے بنوا رکھے تھے۔ حمزہ کے غصے نے ان کے خواب چکنا چور کر دیے تھے۔ ”ٹھیک ہے غلطی ہو گئی اس سے۔ ہم سدھار بھی تو سکتے تھے۔“ وہ نم لہجے میں بولیں۔ ”جیسے لالہ سے غلطی ہو گئی۔“ حمزہ نے زخمی لہجے میں کہا۔ ”سدھار سکتی ہیں اس کی غلطی۔۔۔ میں اب بھی اسے اپنانے کے لیے تیار ہوں۔“ اس کی آواز میں طنز ابھر آیا تھا۔ ”نام نہ لینا اس منحوس کا۔۔۔ میری اقرار کو بھی اسی نے شہہ دی ہے۔“ سدا کا تنفر پھر سے لہجے میں بھر گیا تھا۔ ”کاش کبھی دوسروں کی بیٹیوں کی عزت کی ہوتی آپ نے تو آپ کی اور ہماری عزت یوں خراب نہ ہوتی۔“ ”عزت ہماری خراب ہوئی ہے یا اس لالہ نے کی ہے ملیا میٹ سارے خاندان کی عزت۔۔۔ میری اقرار کی تو جوتی کے برابر بھی نہیں ہے وہ۔“ حمزہ تاسف سے انہیں دیکھے گیا۔

”آغا جیسے لڑکے کے لیے وہ ہم سب کے منہ پر تھوک کے چلی گئی ہے امی۔۔۔ کس بات کا غرور ہے پھر اب بھی آپ کو؟“ لب کاٹتے ہوئے تنفر سے کہتا وہ باہر چلا گیا تھا۔ زرینہ بڑبڑاتے ہوئے دوبارہ بین کرنے لگیں۔

☆.....☆.....☆

حادثہ بہت بڑا تھا لیکن وہ بھی بے حد بہادری تھی۔۔۔ سنبھلنے لگی تھی۔۔۔ پہلے جیسی تو وہ نہیں رہی تھی لیکن بہر حال وہ کمزور بھی نہیں

تھی۔ اسے خود کو باور کرانا تھا جو کچھ بھی ہوا تھا وہ اسے بھلا سکتی تھی۔۔۔ یا کم از کم بھولنے کی کوشش تو کر ہی سکتی تھی۔۔۔ لیکن پھر بھی اندر کی ٹوٹ پھوٹ اس قدر زیادہ تھی کہ بار، بار اس کی پلکیں نم ہو جاتیں۔ بار، بار دل میں خلش سی جاگتی، کاش وہ ماں کی بات مان لیتی اور کبھی یونیورسٹی نہ جاتی۔ کاش ضیا کبھی یونیورسٹی نہ آتا۔۔۔ یا وہ ہی اسے دیکھتے ہی پہچان لیتی۔۔۔ اس کی آنکھوں کے رنگ سمجھ کے بھی انہیں اگنور نہ کرتی یا جس دن اس کے اور ضیا کے حوالے سے بات شروع ہوئی تھی یونیورسٹی میں، کاش وہ اسی روز یونیورسٹی چھوڑ دیتی۔

لیکن کاش کہاں پورا ہوتا ہے۔۔۔

کاش کا تو مطلب ہی ایسی حسرت ہے کہ جو انسان کے ساتھ ہی دم توڑتی ہے۔۔۔ اسے بھی شاید اب اپنے آخری دم کا انتظار کرنا تھا۔

نمرہ کو پتا چلا اس کی واپسی کا تو وہ اسی وقت اسے ملنے چلی آئی تھی۔ لالہ اس سے نظریں نہیں ملا پارہی تھی لیکن اندر ہی اندر خود کو مضبوط بھی کر رہی تھی۔ اسے خود کو نارمل رکھنا تھا۔

”تم ٹھیک تو ہونا لالہ۔۔۔؟“ کافی دیر کی خاموشی کے بعد نمرہ نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

”بالکل۔۔۔“ وہ مصنوعی مسکراہٹ لبوں پر سجاتے ہوئے بولی تھی۔ نظریں البتہ ہنوز جھکی تھیں۔

”لالہ اتنی کمزور نہیں کہ ضیا کے ذرا سے فلرٹ سے دل ہار کے بیٹھ جائے۔ لیکن پھر بھی میں خود کو کچھ وقت دینا چاہتی ہوں۔“ وہ پاؤں کے انگوٹھے سے کارپٹ کا سرا دباتے ہوئے بولی۔

”مجھے سچ میں حیرت ہے لالہ۔۔۔ تم جیسی لڑکی جو ماں کو بھی ہر وقت اپنے لیے طعنہ کہا کرتی تھی۔ یہ قدم کیسے اٹھا سکتی ہے۔“ نمرہ کے لہجے میں طنز یہ کاٹ تھی۔

لالہ کی بائیں آنکھ سے ایک آنسو ٹھکتا اس کے دوپٹے میں کہیں جذب ہو گیا۔

”میں بھی خود کو ایسا ہی سمجھتی تھی نمرہ۔۔۔ لیکن یہ دل ہے ناں۔۔۔ یہ کبھی، کبھی ہمیں یونہی بے اختیار کر دیتا ہے۔ مجھے بھی خبر نہ ہوئی کب میں نے ضیا کا ہاتھ تھام لیا۔“ جھوٹ بولتے ہوئے اس کا دل درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ وہ اپنے زخم چھپانے کے لیے سارا الزام اپنے سر کتنے آرام سے لے رہی تھی۔ حالانکہ دل کر رہا تھا چیخ، چیخ کر نمرہ کو ضیا کی حقیقت بتائے۔۔۔ جو اسے ہمیشہ اچھا سمجھتی تھی۔۔۔ لیکن وہ یہ نہیں کر سکتی تھی۔ سین نے ہی تو اسے سمجھایا تھا۔

”سارے پردے عورت کی زبان چاک کرتی ہے۔ اپنے دل اور زبان کو قباؤں میں رکھنا لالہ۔۔۔ اللہ پردہ رکھنے والا ہے۔ وہ ہماری بھی عزت رکھے گا۔“

اور اس بار اسے ماں سے کوئی گلہ نہ تھا۔ اس نے ان کی بات رکھ لی تھی۔ نمرہ جیسی دوست کو بھی اپنے لٹنے کا وہ نہیں بتا سکتی تھی۔

”یہ تو اللہ کا شکر ہے کہ مجھے وقت پہ ضیا کی اصلیت پتا چل گئی۔ اور میں نے اپنی راہیں جدا کر لیں، ورنہ واپسی کے سارے راستے بند ملتے۔“ اس کے طویل جواب پر نمرہ کافی دیر خاموشی سے اس کا بھجا بھجا چہرہ تکتی رہی۔

”یونیورسٹی کب تک جوائن کرو گی؟“ کافی دیر بعد اس نے پوچھا تھا۔

”ابھی نہیں، ویسے بھی فائل ہونے والے ہیں۔ اب شاید ایگزامز میں ہی appear ہوں۔“ اس نے پیر سے کارپٹ کریدنے کا عمل جاری رکھا تھا۔

”Allah bless you Lalaa“ نمرہ اٹھتے ہوئے بولی تھی۔

”آمین۔۔۔“ وہ مسکرا نہ سکی تھی۔

☆.....☆.....☆

وہ جس قدر خود کو ڈھانپنا چاہ رہی تھی۔ شاویز نہ جانے کیوں اسی قدر اس کی چادر کھینچنے پہ تلا ہوا تھا۔ اس نے سنا تھا کہ انسان موسموں کی طرح بدلتے ہیں لیکن اب اسے یقین ہونے لگا تھا۔ واقعی ایسا ہی تھا۔ اس حادثے میں اسے یقین تھا کہ شاویز اس کی ڈھال بننے والا تھا۔ اگر کوئی اسے کچھ کہتا تو یقیناً وہ اس کا منہ نوچ لے گا۔

لیکن۔۔۔ یہاں الٹ ہوا تھا۔ بات اتنی نہیں اچھلی تھی جتنی وہ اچھالنا چاہ رہا تھا۔

اس کمزوری لڑکی کا دل کئی بار ٹکڑوں میں بٹ جاتا اور وہ دوبارہ زخم، زخم ہونے کے لیے دل کو پھر سے تیار کر لیتی۔۔۔ ماں سے کی گئی زیادتی کا خسارہ شاید اسے یونہی ساری عمر بھرنا تھا۔

”اگر تمہارے چھوٹے سے عمل سے میری، ہم سب کی تقدیر سنور سکتی ہے تو تمہیں اعتراض کیوں ہے لالہ۔۔۔؟“ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ لالہ کو زبردستی گھسیٹ کر ان اخباری نمائندوں کے سامنے لے جاتا جو ضیا کی مخالف پارٹی بھیجنے پر بضد تھی۔ وہ لالہ کو صرف ایک بار پریس کے سامنے لانے اور ضیا کے خلاف بیان دینے کی کتنی ہی پُرکشش پیشکش کر چکے تھے۔ اور شاویز جانتا تھا کہ ایک مرتبہ لالہ میڈیا پہ آجاتی تو ملک کی بڑی بڑی شخصیات اور این جی اوز بھی ان تک پہنچنے میں دیر نہ لگاتیں۔

لالہ کچھ دیر غم آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی پھر نظریں پھیر لیں۔

”میری زندہ لاش پہ تمہاری کامیاب زندگی کی بنیاد کس طرح کھڑی ہو سکتی ہے شاویز۔ خدا را مجھے اور ذلیل نہ کرو۔“

”ذلیل۔۔۔“ اس نے حیرت سے کندھے اچکائے، شاویز نے دونوں ہاتھ اٹھا کے دوبارہ یوں گرائے جیسے اسے لالہ کی سوچ پر شدید تا ساف ہوا ہو۔

”تمہیں اس لفظ کے معنی پتا ہیں۔ حیرت ہے۔“ اس کی آواز میں کھلا طنز تھا۔ لالہ کے دل میں درد سا جاگا۔ وہ اٹھ کر اس کے پہلو

سے نکلنے لگی تھی جب اچانک شادویز نے اس کا بازو پکڑا تھا۔ وہ بے اختیار دو قدم پیچھے آئی تھی۔

”ہم سب کے منہ پر ذلالت کی کالک مل کر تمہیں اپنی عزت، ذلت کا خیال آ رہا ہے۔“ وہ ایک، ایک لفظ چباتے ہوئے بولا تھا۔ اس کی گرفت اس قدر سخت تھی کہ لالہ کراہ اٹھی۔

”شادویز چھوڑ دیجھے۔“ وہ سسکتے ہوئے ہاتھ چھڑاتے ہوئے بولی تھی۔

”کل صبح وہ لوگ آئیں گے اور اس بار تمہیں ہر صورت ان کے سامنے آنا پڑے گا۔“ اس نے لالہ کے بازو پر گرفت سخت کرتے ہوئے سخت لہجے میں جیسے حکم دیا تھا۔

”نہیں۔۔۔ تم جو چاہے کر لو شادویز۔۔۔ میں سر بازار اپنا تماشا نہیں لگاؤں گی۔“ لالہ نے بھی مضبوط لہجے میں کہا تھا۔

شادویز کچھ دیر غصیلی نظروں سے اسے گھورتا رہا پھر پھرے ہوئے انداز میں اس کی طرف بڑھا۔ لالہ اس کے انداز کو نہیں سمجھ پائی تھی۔ بالکل اچانک ہی اس نے لالہ کے لمبے بالوں کی چٹیا کو مضبوطی سے پکڑا تھا اور انہی بالوں سے کھینچ کے اسے زمین پہ گرا دیا۔ وہ اس حملے کے لیے قطعی تیار نہ تھی۔ تبھی بری طرح فرش سے ٹکرانی تھی۔ درد کی تیز لہر نے اس کی کمر چیر کے رکھ دی تھی۔ وہ سسکاری بھرتی دُہری ہوئی تھی۔

”(گالی) ہم سب کی عزت خاک میں ملا کر اب تجھے اپنی عزت یاد آ رہی ہے۔“ غصے سے لالہ ہوتا وہ بری طرح اس کی پسلی میں لائیں برسانے لگا تھا۔

درد سوا ہوتا جا رہا تھا۔ وہ پوری قوت سے چلانا چاہ رہی تھی لیکن آواز جیسے گھٹ کے رہ گئی تھی۔ ادھر شادویز جیسے جنونی ہو گیا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا آج لالہ کو جان سے مار دے۔ درد کی تیز لہر نے کمر سے پیٹ کو لپیٹ میں لیا۔

”امی۔۔۔“ لالہ کے منہ سے کربناک آواز نکلی تھی اور اگلے ہی لمحے وہ بے جان سی ہو گئی تھی۔ سین اور نانو بھاگ کے اندر آئی تھیں۔ انہیں دیکھتے ہی شادویز پیر پختا باہر نکلا تھا۔ نانو کے سخت الفاظ نے اس کا پیچھا کیا تھا۔

☆.....☆.....☆

سرداروں کا ایک خاص تاثر بن گیا ہے۔ ظالم جابر۔ سب کو اپنے سے نیچے جاننے والے۔ خدا کی حدود کو پار کرنے والے (استغفار) سردار جب رخصت ہوتے ہیں تو لوگ خوش نہیں ہوتے اور ڈر جاتے ہیں۔ لیکن کہنے والے کہتے ہیں اس دن اس لالہ حویلی کے باہر وہ طویل ہجوم زار، زار رو رہا تھا۔ ہر کوئی خود کو یتیم کہہ رہا تھا۔ لالہ حویلی کے لالہ اینٹوں والے صحن میں کچھی دریوں پہ بیٹھی عورتیں زار، زار اپنے سر سے چھایا اٹھ جانے کا ماتم کر رہی تھیں۔ سب رو رہے تھے، نڈھال تھے۔ مضبوط جسم کا مالک زریاب بھی آج جیسے موم ہوا جاتا تھا۔ آنسو آنکھوں سے لڑیوں کی صورت رواں تھے۔

رات اچانک آفتاب ولی خان کی طبیعت ذرا بگڑی اور چند لمحوں میں سب کے دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔ کوئی بھی یقین نہیں کر پار ہا تھا کہ یوں اچانک اس طرح بھی وہ ساتھ چھوڑ سکتے ہیں۔ ایسے میں اگر کوئی مضبوط تھا تو وہ تھا سہراب علی خان۔ اس کی گھنی مونچھوں تلے دبے لبوں پہ نہ جانے کیوں غبیث سی مسکراہٹ رقصاں تھی۔ کوئی ایک بھی اس کا نوٹس نہیں کر سکا تھا۔ سب صدمے سے نڈھال تھے۔

لیکن تیسرے دن ہی اس کی مسکراہٹ دم توڑ گئی تھی کہ جب پھوڑی (میت کے گھر تین دن تک ایک جگہ دری بچھانے کو کہتے ہیں جہاں لوگ فاتحہ پڑھنے آتے ہیں) کے تیسرے دن قل خوانی کے موقع پر جب وارث کی دستار بندی کا اعلان ہوا اور وراثت کے علاقائی اصولوں اور خان کی وصیت کے مطابق دونوں بھائیوں کو برابر جائیداد اور بڑے ہونے کے ناتے خان کی بلند دستار زریاب ولی خان کو پہنانے کا فیصلہ کیا گیا۔ علاقے کے سب معزز لوگوں نے زریاب کے بڑے بھائی ہونے اور علم و عمل میں بھی سہراب سے دو قدم آگے ہونے کی بنا پر اگلے سردار کے لیے زریاب کا انتخاب کیا تو سہراب علی خان کو گہرا دھچکا لگا۔ صرف عمر اور تعلیم کی وجہ سے وہ زریاب سے ہار گیا تھا۔ اور اس کے سر پہ بندھی وہ بڑی سی پگڑی دیکھ کے اس کے سینے میں آگ سی جل اٹھی تھی۔

زریاب سب سے گلے ملتا اپنی ذمے داری بابا کی طرح احسن طریقے سے نبھانے کے وعدے کرتا رہا اور ادھر سہراب علی خان اس کی بربادی کے وعدے خود سے۔ صرف ایک کاٹنا بچا تھا اور یہ کاٹنا نکالنا اس کے لیے زیادہ مشکل نہیں تھا۔

☆.....☆.....☆

سرکاری اسپتال کے بوسیدہ سے بیڈ پہ پڑا وہ کمزور، زرد سا وجود اس وقت دواؤں کے زیر اثر دنیا و مافیہا سے بے خبر تھا۔ اس سے ذرا فاصلے پہ کرسی پہ بیٹھی سبین کی آنکھیں اس کے وجود پہ جمی تھیں۔ انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے دھیرے، دھیرے ان کا دم ٹکلتا جا رہا تھا۔ اور کاش کہ یہ دم نکل ہی جاتا۔۔۔ کچھ تو تکلیف کم ہوتی۔۔۔ کچھ تو نجات کا سامان ہوتا۔۔۔ لیکن وہ جانتی تھیں۔ زندگی سے فرار ممکن نہیں۔ جو ہے اسے قبول کرنا پڑتا ہے۔

ہر حال میں جینا پڑتا ہے۔

انہیں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی لقمہ و قحط صحرا میں برہنہ سرکھڑی ہیں اور کہیں پناہ نہیں ہے۔

ذہن خالی تھا مگر کانوں میں بار، بار اس لیڈی ڈاکٹر کے الفاظ شور مچا دیتے تھے جس نے درد سے بے حال لالہ کی مسیحا کی تھی۔ ”مجھے حیرت سے زیادہ دکھ ہے۔ اس حالت میں بھی کوئی اپنی بیوی کو اس طرح مار سکتا ہے۔“ ڈاکٹر کی آواز میں صدمہ تھا اور سبین ان کے الفاظ کے معنی تلاش کرنے میں لگی تھیں۔

کون سا شوہر۔۔۔؟

کون سی حالت۔۔۔؟

کس حالت میں۔۔۔؟

”انسان ہے یا جانور۔ میرا دل کر رہا ہے پرچہ کروادوں اس رذیل انسان کے خلاف۔“ ڈاکٹر سخت غصے میں تھی۔

”اس کی اس حرکت سے ماں، بچے دونوں کی جان کو خطرہ ہو سکتا تھا۔ ویسے بھی لڑکی بہت کمزور ہے۔ ایسے میں اگر ذرا سی اونچ نیچ ہوئی تو یہ بھی اپنی جان گنوا سکتی ہے۔“

ڈاکٹر بولے جا رہی تھی اور سین کو لگ رہا تھا جیسے وہ ابلتا سیسہ ان کے کانوں میں ڈال رہی تھی۔ درد بے انتہا تھا۔

ڈاکٹر کے جانے کے بعد وہ یونہی بے جان آنکھوں سے لالہ کو نکلتی رہی تھیں۔

”اس حالت میں کوئی اپنی بیوی کو اس طرح کیسے پیٹ سکتا ہے۔“ اور تبھی دھندلی آنکھوں کے سامنے کچھ منظر واضح ہوئے تھے۔ وہ شادویز تھا جو لالہ کو بالوں سے پکڑ کر گھسیٹ رہا تھا۔ پھر اس نے زور کی لات اس کی پسلی میں دے ماری تھی۔

”شادویز۔۔۔؟“

”شوہر۔۔۔؟“

اک خیال سا اُن کے ذہن میں کوندا تھا۔

”ہاں شادویز ہماری عزت رکھ لے گا۔ وہ مجھے کبھی نہ نہیں کرتا۔“ ایک دم سے سکون سا ان کے دل میں سرایت کرنے لگا تھا۔

انہوں نے ایک مطمئن نگاہ لالہ کے زرد چہرے پہ ڈالی اور تلخ سا مسکرا دی تھیں۔

☆.....☆.....☆

وہ قد آور آئینے کے سامنے کھڑا خود پہ گہری نظریں جمائے لف لنکس بند کر رہا تھا۔ موبائل کی تیز آواز پر اس کے بجھے، بجھے،

چہرے پر جرمی ناگواری سوا ہوئی تھی۔ اس نے اپنا کام جاری رکھتے ہوئے ایک اچھٹی سی نگاہ سیل فون پہ ڈالی تھی۔ نمرہ کے جگمگاتے نام پہ اس کے ہاتھ ایک دم سے رکے تھے۔ اس نے نچلا لب دانتوں سے کترتے ہوئے فون اٹھایا اور کچھ سوچتے ہوئے یس کا سائن پر پریس کیا۔

”ضیا۔۔۔؟“ فوراً پوچھا گیا۔

”ہم۔۔۔“ وہ بس ہنکاری بھر گیا۔

”میں تمہیں کتنا اچھا سمجھتی تھی ضیا۔۔۔ مجھے اپنی سوچ پہ افسوس ہو رہا ہے آج۔“ اس کا تاسف اس کے لہجے سے واضح ہو رہا تھا۔

ضیا نے دوبارہ سے نظریں سامنے آئینے میں اپنے عکس پہ جمادیں۔

”کننے خوب صورت تھے ناں تم۔ تمہیں دیکھتے ہی نہ جانے کیوں خود بہ خود میں خیالوں ہی خیالوں میں لالہ کو تمہارے ساتھ کھڑا

کردیتی تھی۔ مجھے لگتا تھا اگر تمہیں کوئی مکمل کر سکتا ہے تو وہ صرف لالہ ہے۔۔۔ لیکن۔۔۔“
وہ کہتے کہتے رکی۔ ضیا ویسے ہی خاموش کھڑا رہا۔

”جب اس کا ہاتھ تھام ہی لیا تھا تو کیوں چھوڑ دیا ضیا۔ تم تو ہر طرح سے مضبوط تھے پھر ایسی کمزوری کیوں دکھائی ضیا۔۔۔ کیوں اسے یہ راہ دکھا کے خود ہی راستہ بدل دیا۔ کیوں ضیا آخر کیوں؟ تم نے مجھے بہت ہرٹ کیا ہے۔ تمہاری وجہ سے اب لالہ پیپر ز بھی نہیں دے گی۔ اسے پھر سے اپنا لوضیا۔۔۔ اس سے معافی مانگ لو۔ اسے کہہ دو تم مذاق کر رہے تھے۔ کچھ بھی کہہ دو مگر اسے یوں رد نہ کرو۔ دیکھو، لالہ بہت معصوم ہے ضیا۔۔۔“

وہ بولتی جا رہی تھی اور وہ بس خاموشی سے سنتا رہا تھا۔ لالہ نے شاید اس سے حقیقت چھپائی تھی۔ تبھی وہ اب بھی اس سے عزت سے بات کر رہی تھی۔ ورنہ تو شاید وہ اسے گالیاں دیتی اس کے پاس آ کر گریبان چاک کر دیتی اس کا۔
اس نے اور اس کے باپ نے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی لیکن اللہ پاک نے اب بھی لالہ کا پردہ رکھا ہوا تھا۔ ایک گونہ اطمینان اس کے دل میں سرایت کرنے لگا۔ دوسری طرف نمرہ، ضیا، ضیا پکارتی رہی اور کوئی جواب نہ پا کر تھک کر کال کاٹ دی۔
ضیا نے فون سامنے صوفے پہ اچھا لا اور ڈریسنگ پہ پڑا چائے کا کپ اٹھا کے ساری چائے سامنے نظر آتے اپنے وجہ وجود کے عکس پر انڈیل دی تھی۔۔۔ شیشہ دھندلا گیا تھا۔ اس کے نقوش بگڑنے لگے تھے۔

☆.....☆.....☆

اپنے پہلے ہوٹل کی شاندار کامیابی کے بعد باریال بہت خوش تھا۔ شادیز کے مسائل کی وجہ سے یہ خوشی ذرا دھیمی پڑی تھی اور نہ جانے کیوں وہ دل سے اس جانب توجہ نہیں دے پا رہا تھا۔ گل لالہ سے اس کی ملاقات دو تین بار ہی ہوئی تھی اور وہ بھی ایسے کہ لالہ ہمیشہ خود کو چادر میں ڈھانپنے رکھتی تھی۔ اس کے غائب ہونے کے بعد واپسی پہ وہ ایک بار اسے دیکھنے میں کامیاب ہوا تھا۔ جب شادیز اسے صحن میں پرپیس کے سامنے پیش ہونے پہ دباؤ ڈال رہا تھا۔ تب بیٹھک کی کھڑکی سے یونہی ایک نظر باہر ڈالنے پہ اس کا زرد معصوم سا چہرہ دیکھا تھا۔ وہ فوراً وہاں سے ہٹ گیا تھا لیکن وہ چہرہ جیسے دماغ کے پردے سے چمٹ سا گیا تھا۔ جاگتے سوتے وہ شفاف سائل، ایک دوسرے سے پیوست گلابی ہونٹ اور شکوہ کرتی غلافی آنکھیں اسے بے انتہا ڈسٹرب کر دیتیں۔ وہ خود کو اس پریشانی سے نہیں روک سکا تھا۔ کچھ تو تھا کہ وہ لڑکی اس کے حواسوں پہ چھانے لگی تھی۔۔۔ لیکن وہ اپنی اس کیفیت کو صرف ہمدردی کا ہی نام دے سکا تھا۔ جو بھی تھا لیکن اس چہرے نے اس کے کام کو بھی متاثر کیا تھا۔ امن نے اس دوران اس کا خوب ساتھ دیا تھا۔ اس کے شاندار آئیڈیاز اور ٹیکیز کو امن نے کچھ بڑے بزنس آئی کونز سے ڈسکس کیا تو بہت جلد اسے اچھے پارٹنرز مل گئے۔ کچھ تو اس کے کام سے اس قدر متاثر تھے کہ اس کے آئیڈیاز کی بیس پہ دوسرے ملکوں میں بھی پراجیکٹ کرنا چاہتے تھے۔ اور یہی تو باریال کا خواب تھا۔ اسے لگ رہا تھا وہ اب تعبیر کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا۔
اب بھی وہ امن کی ہدایت پہ کہیں جانے کے لیے تیار ہونے لگا جب دیدے اس کے کمرے میں آئیں۔

”باری۔۔۔“ وہ اس قدر کھویا، کھویا سا تھا کہ ان کی آمد کا نوٹس ہی نہیں لیا۔ انہوں نے پکارا تو باریاں بہت بری طرح چونکا۔
 ”دیدے۔۔۔“ انہیں اپنے بے حد قریب کھڑے دیکھ کر وہ واقعی حیران ہوا تھا۔
 ”آپ کب آئیں؟“ اس کے لہجے میں حیرت تھی۔ دیدے مسکرا دیں۔
 ”کہاں کھوئے رہتے ہو؟ لگتا ہے بہت جلد میری بہو آنے والی ہے۔“ ان کی آنکھوں میں شرارت تھی۔
 ”اچھا۔۔۔ وہ کیسے۔۔۔؟“ باریاں مسکرایا۔

”تمہاری کھوئی سی آنکھیں، یہ رف ساحلیہ،“ انہوں نے اس کی بڑھی شیو کی طرف اشارہ کیا۔

”اور سب سے بڑھ کر چہرے پہ چھائی وحشت۔۔۔ مجھے تو یہ سب کسی خوب صورت حادثے کا پتہ دیتی ہے۔“ کہتے وقت ان کی آنکھوں میں اس قدر روشنی تھی کہ باریاں حیران رہ گیا۔ کچھ دیر وہ یونہی کھڑا ماں کی مسکراتی آنکھوں کی خوشی دیکھتا رہا۔ پھر ان کے قدموں میں بیٹھتے ہوئے بولا۔

”خوب صورت نہیں دیدے۔۔۔ کافی بھیا نک حادثہ ہوا ہے۔“

”خدایا خیر۔۔۔“ وہ دہل گئیں۔ ساری خوشی ایک لمحے میں دھیمی پڑی تھی۔

”ایک دوست ہے میرا کافی پرانا۔ اس کے ساتھ کچھ ایسا ہوا ہے دیدے کہ میں آپ کو بتا بھی نہیں سکتا اور سچ بتاؤں تو چاہ کر بھی خود کو پریشان ہونے سے بھی نہیں روک سکتا۔“ وہ واقعی مضطرب تھا۔

”شناویر تو ٹھیک ہے؟“ ان کو فوراً شناویر کا خیال آیا۔

”ہاں، وہ ٹھیک ہے۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ کیونکہ اب اسے جھوٹ بولنا تھا اور ماں سے آنکھیں چرائی تھیں۔ دیدے کے سامنے بیٹھا رہتا تو وہ اس کی چوری پکڑ لیتیں۔

”کسی اور دوست کے ساتھ ہوا ہے یہ حادثہ، آپ نہیں جانتیں۔“ اس نے جھوٹ بولا۔

”اللہ پاک سب کو اپنی امان میں رکھے۔ میں دعا کروں گی اس کے لیے۔ تم بس پریشان نہ ہو۔ اس کے ساتھ رہو اسے حوصلہ دو۔۔۔“ انہوں نے کسی قسم کی تفصیل جاننے کی کوشش کیے بنا اسے ہدایت کی۔ وہ مسکرا دیا۔ دیدے تھیں ہی ایسی۔۔۔
 کبھی کسی بات کو خود سے نہیں کھولتی تھیں۔ کوئی جتنا بتا دے ٹھیک۔ وہ کبھی سوال کر، کر کے بات نہیں کر دیتی تھیں۔

”اچھا دیدے میں چلوں۔ امن نے ایک پارٹی کے ساتھ میٹینگ رکھی ہے۔ دعا کریں میں اپنے مقصد میں کامیاب رہوں۔“ اس نے اجازت مانگی۔

”ہاں جاؤ، اللہ پاک تمہارا مددگار ہو۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے دعا دی۔

☆.....☆.....☆

سین نے حسبِ عادت بات اماں کو بتائی تھی اور ان کے سامنے شاد ویز اور لالہ کے رشتے کی بات بھی رکھی تھی۔ اماں تو سن ہو کے رہ گئیں۔

”اماں! ڈاکٹر کہتی ہے ہم لالہ کی جان کو لے کر کوئی رسک نہیں لے سکتے۔ مجھے لگتا ہے اماں شاد ویز لالہ کی زندگی بچا سکتا ہے۔ وہ میری بات کبھی نہیں ٹالے گا۔“

اماں کئی لمحے خالی خالی نظروں سے زمین کو تکتے گئیں پھر سر اٹھا کے سین کے چہرے کی طرف دیکھا۔
”شاد ویز اور لالہ تو ہمیشہ بہن، بھائی کی طرح رہے ہیں۔ وہ اس بات کے لیے کبھی راضی نہیں ہوگا۔“
”تو پھر اماں۔۔۔؟“ سین کا چہرہ بجھنے لگا۔

”پہلے میں زرینہ سے بات کرتی ہوں۔ حمزہ اور زرینہ ضرور ہماری بات رکھ لیں گے۔“
”لیکن اماں، زرینہ بی بی تو ویسے بھی لالہ کے خلاف رہتی ہے۔ اب جب کہ یہ بچہ بھی۔۔۔ وہ کیسے اس رشتے کے لیے ہاں کرے گی اماں۔“

”زرینہ نہیں مانے گی تو شاد ویز سے بات کر لیں گے لیکن پہلے ایک بار بات تو کرنے دو مجھے۔ اور پھر اتنی کٹھور نہیں ہو سکتی زرینہ۔ آخراں کے اکلوتے بھائی کی نشانی ہے میری لالہ۔۔۔“ نانو نے غم لہجے میں کہتے ہوئے انہیں تسلی دی تھی۔ اور ضعیف آنکھوں کے گرد کی جلد چھل سی گئی تھی۔ وہ لالہ کے لیے رونا نہیں چاہتی تھیں۔ انہیں ہی اب اپنی لالہ کے لیے کچھ کرنا تھا۔
اور اگلے ہی دن وہ شاد ویز کے ساتھ زرینہ کے گھر پہنچ گئیں۔ عجیب سی ویرانی پھیلی تھی وہاں۔ سوکھے پتوں اور گردوغبار نے گھر پہ ڈیرا سا جمالیا تھا۔ بیٹی کے حال پہ دل کڑھاتا پھر حمزہ اور لالہ کی خوشیوں کی بہار یاد آتے ہی انہوں نے صاف بات کر دی تھی۔ زرینہ کا چہرہ غصے سے لال پڑ گیا تھا۔

”یہ کیا کہہ رہی ہیں اماں۔۔۔؟“ وہ تقریباً چلا اٹھی تھیں۔

”عربی بول دی میں نے یا فارسی جو تجھے سمجھ نہیں آرہی۔“ اماں چڑ کر بولیں۔

”کاش عربی، فارسی ہی بولی ہوتی اماں۔۔۔ مجھے سمجھ تو نہ آتی۔ آپ کو بہو، پوتی کا گند چھپانے کے لیے میرا ہی گھر ملا تھا۔“
”تمیز سے بات کر زرینہ۔ وہ تیری بھی کچھ لگتی ہیں۔“ اماں نے انہیں ڈپٹا۔

”ارتضیٰ بھائی کے مرتے ہی ان دونوں سے میرا رشتہ ختم ہو گیا تھا اماں اور اب جو گند لالہ نے کیا ہے اس کے بعد حمزہ اور لالہ۔۔۔؟ نہیں کبھی نہیں۔“ ان کا لہجہ اٹل تھا۔ اماں نے تاسف سے انہیں دیکھا۔

”لیکن پھر بھی آپ کے لیے میں اس رشتے کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور سوچتی۔“ ان کے غصے بھرے چہرے کو دیکھتے ہی انہوں نے

انداز بدلا۔ اماں کا کھنچا کھنچا چہرہ کچھ نرم پڑا۔

”لیکن کیا ہے ناں اماں۔ میں نے تو شزا کی ماں کو زبان دے دی ہے۔“ اماں چونکیں۔

”بلکہ ہم تو بہت جلد کوئی فنکشن رکھنے والے تھے اگر درمیان میں یہ لالہ کا قصہ نہ اٹھتا۔“ ان کی آواز میں طنز تھا۔

”اور اقرار کا قصہ بھی۔۔۔“ اماں نے بھی ویسے ہی لہجے میں تیر چلایا تھا۔ زریہ نہ ٹپ سی گئیں۔

”کیسی ظالم ہیں اماں۔۔۔ نو اسی ہے وہ آپ کی۔“ وہ فوراً شکایت کرتے ہوئے منہ بنا گئیں۔ اماں اٹھتے ہوئے چادر لیے لگیں۔

”لالہ بھی تو جتنی ہے تمہاری۔“ سخت لہجے میں کہتے ہوئے وہ باہر کی طرف بڑھیں۔

”اب کہاں جا رہی ہیں۔ حمزہ آتا ہی ہوگا، چھوڑ دے گا آپ کو۔“ وہ ان کے پیچھے تھیں۔

”رکشے سے چلی جاؤں گی۔ حمزہ کو شزا کی ماں کے کاموں پہ لگا دینا۔ مجھے نہیں ضرورت۔“ ناراض لہجے میں کہتیں وہ دروازے سے باہر نکل گئی تھیں۔ زریہ روکتی رہ گئیں۔

”مجال ہے جو سین یا اس کی پچاھے کٹنی بیٹی کے بارے میں ایک لفظ سن لیں۔“ انہوں نے بڑبڑاتے ہوئے دروازہ بند کر دیا تھا۔

☆.....☆.....☆

آگے ڈائری خالی تھی۔ وہ حیران ہوئی تھی۔ سہراب علی خان، اس کے بابا اس قدر نفرت اپنے اندر پالتے رہے تھے۔ اور ڈائری میں

لکھے اور نام کہاں تھے؟ اسے یاد تھا کچھ، کچھ۔۔۔ جب وہ چھوٹی تھی تب ان کے ساتھ ایک کا کا بھی ہوتے تھے۔ بہت خوب صورت۔ بہت

مضبوط جسم والے اور بہت ہی پیاری فطرت والے ایک مکمل انسان۔ وہ جب بھی گھر آتے، سب سے پہلے اسے ہی گود میں لیتے تھے۔ ایک

دلہن بھی اس کے دماغ کے پردے پہ اکثر عکس دیتی۔ اور وہ دیکھتی کہ وہ دلہن اپنے ہاتھوں سے اپنا عروسی دوپٹا، اپنی چوڑیاں، اپنا زیور سب خود

اتار کے دور، دور پھینک رہی ہے۔ رو رہی ہے، چیخ رہی ہے لیکن وہ کون تھیں؟ یہ نہیں تھا اسے یاد۔۔۔ اللہ لوک تو تھیں ہی ساتھ۔۔۔

البتہ سین بوا بھی اسے یاد تھیں۔ وہ اچانک ہی گھر سے چلی گئی تھیں اور اس نے بابا کو چلاتے سنا تھا کہ کوئی بھی اس گھر میں ان کا

نام دوبارہ نہیں لے گا اور ایسا ہی ہوا تھا۔ اس گھر میں اس نے کسی کو سین بوا کو یاد کرتے نہیں دیکھا تھا۔ پھر کچھ دن بعد ہی زریاب کا کا نے بھی

آنکھیں بند کر لی تھیں۔ سب نے کہا بہن نے بھائی کو نگل لیا۔ وہ کتنا عرصہ گاؤں والوں کو یہ دعا کرتے سنتی رہی۔ ”اللہ کسی کو بیٹی نہ دے۔“

انتابڑا خاندان تھا بابا کی ڈائری کے مطابق تو وہ سب کہاں تھے اب۔ کوئی نہ کوئی تو ان کے ساتھ ہوتا۔ کا کا کی ڈیجھ ہو گئی تھی لیکن

ان کی بیوی، بچہ اور باقی سب۔۔۔؟

وہ پہلی بار پرانے رشتوں کو سوچ رہی تھی۔ وقت نے جو گرد ڈالی تھی، وہ آہستہ آہستہ اڑنے لگی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی۔ اتنی بڑی

حویلی کے مکین صرف اس کے بابا اور وہ ہی کیوں تھے۔ آفتاب ولی خان دا کے سب بچے کہاں تھے۔ کوئی تو ان کے ساتھ ہوتا۔

زریاب کا کاکی فیملی۔۔۔

وہ روتی چلاتی اجڑی دلہن۔۔۔

کوئی بھی۔۔۔ کوئی تو ہوتا۔۔۔

افسردہ سی سوچوں سے نڈھال وہ ڈائری واپس رکھنے اس کمرے میں آئی تھی۔ چوبدار دیو مالائی دروازہ کھولتے ہی وہی چنگھاڑ گونج اٹھی تھی۔ اسی طرح اس کا دل زور سے دھڑک اٹھا تھا۔ بابا ابھی الیکشن کے سلسلے میں کچھ دن حویلی نہیں آنے والے تھے۔ لیکن وہ ڈائری چونکہ نامکمل تھی تو وہ وقت پہ اسے واپس کرنے آئی تھی۔ اس نے دراز بند کی اور پھر پورے کمرے میں ادھر، ادھر دیکھنے لگی۔ اس کی نظر الماری سے ذرا اوپر بنے روشن دان پہ پڑی۔ یہ کافی بڑا روشن دان تھا۔ جس سے آتی تازہ ہوا اسے یہاں تک محسوس ہو رہی تھی۔

”باء جی نے کیا کمرہ بنوایا ہے اپنے مطالعے کے شوق کے لیے۔۔۔“ وہ سر اہے بنا نہیں رہ سکی تھی۔

اس نے ایک طائرانہ جائزہ لیا اور واپسی کے لیے مڑی۔ دیو قیامت دروازے کو بند کرنے کے لیے اپنی طرف کھینچتے ہوئے اس نے پوری طاقت لگائی تھی اور قریب تھا کہ وہ دونوں دروازوں کو یکجا کر لیتی کہ اس کے ہاتھ ایک دم رکے تھے۔ وہ ایک مانوس سی آواز تھی، جس کی صرف سرسراہٹ سی اس نے سنی تھی لیکن اس سرسراہٹ کی دھن اس کے دل کے اس قدر قریب رہی تھی کبھی کہ وہ ایک لمحے میں اسے پہچان گئی تھی۔ اس نے دروازے وہیں چھوڑ دیے تھے اور بھاگ کر کمرے میں آئی تھی۔ وہ دل و جان سے متوجہ تھی۔ وہی سرسراہٹ ایک مرتبہ پھر سے سننے کے لیے۔ بھلے یہ اس کا وہم ہی ہو۔

لیکن بس ایک بار پھر۔۔۔

اور یونہی کئی لمحے سناٹے میں سرک گئے۔

مایوس ہو کے وہ واپس پٹی اور ابھی اس نے قدم بھی نہیں بڑھائے تھے کہ سرسراہٹ اس بار دور سے سنائی دینے والی سرگوشی کا روپ دھار گئی۔

”جدوں حد مکدی اے۔“

سرگوشی روشنندان کی طرف سے آرہی تھی۔ وہ اور قریب آ گئی۔ آواز کچھ واضح ہو گئی۔ ”سب مک جانداں اے۔“ اس نے تیزی سے قریب رکھا اسٹول اٹھا کے الماری کے قریب رکھا اور اوپر چڑھنے لگی۔ کوئی زور، زور سے تالی بجا رہا تھا۔

وہ اوپر آ گئی۔ کھلے روشنندان سے سامنے کا منظر واضح تھا اور دور بھر بھری مٹی سے بنی عمارت جو تقریباً گر چکی تھی کے اندر سے آتی

آواز بھی۔۔۔

”تیری حد مک گئی۔۔۔ بابا بابا۔۔۔“

تیری حد تک گئی۔“

وہ جو کوئی بھی تھا نظر نہیں آ رہا تھا لیکن اوزگل کو اسے پہچاننے کے لیے اسے دیکھنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔
اس نے حیرت سے سرگوشی کی تھی۔

”اللہ لوک۔۔۔!“

☆.....☆.....☆

انہیں بالآخر سین کی بات ماننی ہی پڑی تھی اور ان دونوں نے مل کر شاوینز سے بات کرنے کا سوچا تھا۔ رات کو لالہ کے سوتے ہی وہ اس کمرے میں آئی تھیں۔ سین نے اماں کے اشارے پہ خود ہی بات شروع کی تھی۔ لالہ کے بارے میں نئے انکشاف نے اسے ہلا کے رکھ دیا تھا۔
”اب ہم سب کی عزت تمہارے ہاتھ میں ہے شاوینز۔۔۔!“ سین نے امید بھری نظروں سے اسے دیکھا تھا اور شاوینز نے انہیں ابھی سوالیہ نظروں سے۔
”میں کیسے امی؟“

”لالہ سے شادی کر لو شاوینز۔ اسے اپنا لو۔ اس بچے کو اپنا نام دے دو۔“ نانو نے گویا اس کے سر پہ بم پھوڑ دیا تھا۔ وہ اچھل کے کھڑا ہوا تھا۔

”یہ کیا کہہ رہی ہیں امی آپ۔۔۔؟“ صدے سے اس کی آواز پھٹ سی گئی تھی۔ سین نے اماں کی طرف مدد طلب نگاہوں سے دیکھا۔ انہوں نے نظروں ہی نظروں میں انہیں تسلی دی۔
اور واپس شاوینز کی طرف دیکھنے لگیں۔

”ہم جانتے ہیں شاوینز کہ تم اور لالہ ہمیشہ بہن بھائی کی طرح رہے ہو۔ لیکن اس رشتے کی شرعی طور پہ کوئی حیثیت نہیں بیٹا۔ شادی ہوتے ہی ترجیحات خود بخود بدل جاتی ہیں۔“ نانو اسے نرم لہجے میں سمجھا رہی تھیں اور وہ حیرت سے پھٹی ہوئی نگاہوں سے انہیں دیکھے جا رہا تھا۔
”بالکل بھی نہیں نانو۔۔۔ اگر آپ مجھے پہلے کبھی اس رشتے کے لیے کہتے تو شاید میں ہاں کر بھی دیتا کیونکہ اتنی شریعت میں بھی جانتا ہوں لیکن اب۔۔۔“ وہ غصے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ سین کا دل ڈوب سا گیا تھا۔

”کسی کے منہ کی تھوک کون چاٹتا ہے بھلا۔ پھر اتنی بڑی قربانی میں ہی کیوں دوں۔ حمزہ سے کہیں، وہ تو ویسے بھی پسند کرتا ہے لالہ کو۔“ نانو کی پلکیں بھگینے لگی تھیں۔

”کوئی تو پناہ گاہ بن جاؤ میری لالہ کی۔۔۔ اور تمہیں تو خود سین نے کس قدر پیار سے پالا پوسا، بڑا کیا۔ اس کے احسان ہی یاد کر لو۔“ نانو منت پراتر آئیں۔ سین کا سر جھک سا گیا۔

”احسان۔۔۔ خدا کا نام لیں نانوں۔۔۔ احسان کا مطلب یہ تو نہیں کہ کسی اور کا گند میں اپنے دامن پہل لوں۔ اور پھر لالہ۔۔۔ یہ سب اس کی اپنی غلطی ہے، میں کیوں اس کے گناہ کی بھیٹ چڑھا دوں اپنی ساری زندگی۔“ سین کے سینے میں درد سا جا گا تھا۔ دروازے کی اوٹ سے لگی لالہ کا دل بھی درد سے پھٹا جا رہا تھا۔

”اور میری بات مانیں تو کسی رشتے والی خالہ سے کہیں اور کسی بال بچے والے دوسری، تیسری شادی والے ہی سہی، مناسب جگہ اس کی شادی طے کر دیں۔ کیونکہ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں اب اپنے بابا کے پاس رہوں گا۔ ان کا سب کچھ میرا ہی تو ہے تو اب ضد اور انا کا کیا فائدہ؟ آپ اور امی بھی میرے ساتھ رہیں گی۔ لیکن لالہ کے لیے معذرت۔ میری بات مان لی ہوتی اس نے تب بھی میں اس کے لیے کچھ نہ کچھ کر لیتا۔ لیکن اب مجھ سے کوئی امید نہ رکھیے گا۔ لالہ کے معاملے میں تو ہرگز نہیں۔“ اس نے تو جیسے بات ہی ختم کر دی تھی۔ لالہ اپنا مرا، مراد جو دگھیٹے اپنے کمرے میں آئی تھی۔ امی اور نانو کے تاریک چہرے دیکھنے کی ہمت اس میں نہ تھی۔

”اللہ تمہیں ذلیل و برباد کر دیا۔“ اس نے روتے ہوئے بد دعا دی تھی۔ بہت دور کسی کے دل میں بد دعا جیسا ہی درد جا گا تھا۔ لیکن لالہ بے خبر تھی۔

☆.....☆.....☆

اوزگل تیزی سے وہ کمرہ لاک کرتی باہر آئی تھی اور حویلی کے پیچھے جانے والی ماربل سے بنی کالی پگڈنڈی پہ تقریباً بھاگتی ہوئی حویلی کے پچھلے لان میں آ گئی۔ روشنیاں اس قدر زیادہ تھیں کہ رات میں بھی دن کا سماں معلوم ہوتا۔ وہ تیزی سے دوڑتی لان سے نکل آئی۔ یہ حصہ خاصا پرانا اور اجڑا تھا۔ یہ حویلی سے باہر کچھ غیر آباد زمین کا ٹکڑا تھا۔ جہاں حالیہ ہونے والی تیز بارشوں کے بعد اب ہری بھری گھاس سر اٹھانے لگی تھی۔ حویلی کا کچھ آخری حصہ اسی زمین میں آتا تھا۔ جس میں وہ خوب صورت کمرہ بھی تھا جو باء جی نے اپنے مطالعے کے شوق کو پورا کرنے کے لیے بنوایا تھا۔ اس حصے میں آتے ہی اسے ڈر لگنے لگا تھا۔ یہاں صرف ویرانی ہی ویرانی تھی۔

”کہیں میں نے اللہ لوک کی روح کو تو نہیں سنا۔“ ڈر سے اس کے وجود میں سنسنی سی دوڑنے لگی تھی۔ پھر بھی وہ پیچھے کی طرف نہیں مڑی تھی۔ ذرا اور آگے چلی تھی۔ اور تبھی ٹھٹھک کے رکی تھی۔

وہ ہنسنے کی تیز آواز تھی۔ یہ ہنسی بلاشبہ اللہ لوک کی ہی تھی۔ ان کی آواز سنتے ہی وہ تجسس سے اور آگے بڑھی تھی۔ اور کچھ دور جا کر ہی ایک عجیب سے احساس میں گھر گئی تھی۔ چونکہ یہ حصہ حویلی سے باہر تھا تو اس طرف روشنی کا بھی کچھ خاص انتظام نہ تھا۔ چاند کی چاندنی نے البتہ اندھیرے کا دم گھوٹ رکھا تھا۔ لیکن جس چیز نے اسے ساکت کیا تھا وہ تھی زمین کی درزوں سے چھن، چھن کے باہر آنے والی روشنی کی کرنیں۔۔۔ کرنیں زرد بلب کی تھیں اور تھیں بھی بہت کمزور۔ اس روشنی کو دیکھتے ہی وہ تیزی سے اس طرف آئی تھی۔ اور نیچے بیٹھ کر اس جگہ کا

معائنہ کرنے لگی تھی۔ یہ مضبوط لوہے کے روشن دان تھے۔ اس نے قریب ہو کے دیکھا۔ وہ کسی بوسیدہ کمرے کی چھت تھی۔ اس نے ادھر، ادھر اندر دیکھنے کے لیے اور جگہ ٹولی لیکن سبھی روشن دان چھت ہی دکھا سکتے تھے۔ چھت سے نیچے کا منظر اوجھل تھا۔ وہ کچھ دیر بیٹھی سوچتی رہی۔

پھر گھاس پھوس ہٹاتی آگے بڑھی۔ کچھ دور جا کر ہی ایک دروازہ دکھائی دیا جو زمین سے ذرا نیچے ہی تھا اور غور سے دیکھنے پہ ہی دکھائی دیتا تھا۔ دروازے پر بڑا سا تالا تھا وہ یہاں سے مایوس ہو کے اور آگے بڑھی۔ کافی دوران روشنیوں کے تعاقب میں آتی اچانک اسے زنجیر کھکنے کی آواز نے چونکا دیا۔ آواز بہت واضح تھی۔ مطلب یہاں بھی کوئی کھلی جگہ تھی۔ وہ فوراً آواز کے پیچھے اس طرف آئی اور اگلے ہی پل اس کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔ اس کی محنت بیکار نہیں گئی تھی۔ اسے اندر جانے کا راستہ مل گیا تھا۔ یہ ایک روشن دان ہی تھا۔ جس کے لوہے کا دروازہ شاید موسموں کی تاب نہ لا کر کرب کا نیچے گر گیا تھا۔ جگہ اس قدر تھی کہ وہ آسانی سے نہ صرف نیچے بلکہ واپس اوپر بھی آ سکتی تھی۔

”پہلے جا کر کسی اور کو بلالوں یا اکیلے ہی چلی جاؤں؟“ وہ سوچنے لگی۔

”تیری حد تک گئی، حد پوری ہو گئی۔“ نیند میں ڈوبی آواز پہ وہ چونکی۔

”کچھ تو ہے یہاں۔ اگر کسی کو بتا دیا تو پھر یہ موقع ہاتھ نہیں آئے گا۔ مجھے اکیلے ہی جانا چاہیے۔“ فیصلہ کرتے ہی وہ روشن دان سے اندر جانے لگی۔

دونوں طرف پھنسی لوہے کی ٹوٹی کڑیوں سے لگنے پہ اس کے پہلو جھل سے گئے تھے۔ وہ ہلکا سا کراہی اور نیچے پھسل گئی۔ سامنے کا منظر ہولناک تھا۔ اس کی آنکھیں پھٹنے کو تھیں۔ دونوں طرف لمبی قطار میں چھوٹے تنگ کمرے، ان کے سامنے لگی موٹی لوہے کی مضبوط گرلیں اور اندر قید نگ دھڑنگ مریل سے انسان جن کی ہڈیوں کے پنجرے تک نظر آرہے تھے۔ وہ خوف سے پیچھے کو ہونٹی تھی۔ جب کسی نے اچانک زور سے اس کا پاؤں پکڑا تھا۔ اس نے خوفزدہ ہو کے نیچے دیکھا۔ اور کمزور، تنی سبز رگوں سے بھرے ضعیف سے ہاتھ کو اپنے پاؤں پکڑے دیکھ کے بے اختیار اس کے منہ سے چیخ نکلی تھی اور تہہ خانے کی دیواروں سے ہی ٹکرا کے دم توڑ گئی تھی۔۔۔



ناول ”محبت لفظ ہے لیکن“ ابھی جاری ہے۔ اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی 10 تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

اس کی چیخ سے سارا تہ خانہ زنجیروں کی چھنکار سے گونج اٹھا۔ وہ نہ جاہ کن لوگوں کے آرام میں مغل ہوئی تھی۔ وہ شاید نیند میں کسمسائے تھے۔ کیونکہ فوراً ہی دوبارہ وہی خاموشی چھا گئی۔
موت کے جیسی خاموشی۔۔۔

☆.....☆.....☆

خوف سے آنکھیں بند کئے وہ دوبارہ چیخنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن آواز جیسے گلے میں ہی کہیں پھنس گئی تھی۔ نہ ہی وہ اپنے وجود کو حرکت دے پا رہی تھی۔ وہ خوف سے جیسے پتھر کی ہو گئی تھی۔۔۔
"تو یہاں کیوں آ گئی؟" اور جیسے چھن سے شیشہ سا ٹوٹا تھا۔ سارا خوف ایک لمحے میں زائل ہوا تھا۔ اس آواز میں جو اپنائیت تھی وہ کبھی اس کی زندگی کی اساس رہی تھی۔ اس نے آواز کی سمت نگاہیں نیچے کیں تھیں۔ لمبے اجڑے بکھرے بالوں میں وہ چہرہ اب بھی گم تھا لیکن اب وہ اسے مکمل طور پہ پہچان چکی تھی۔ وہ بے شک اللہ لوک تھی۔
اس کی اللہ لوک۔۔۔

اس کی ماں جیسی اللہ لوک۔۔۔

"اللہ لوک" اسے پہچانتے ہی وہ تیزی سے زمین پہ اس کے سامنے بیٹھتی چلی گئی۔ اللہ لوک نے اب کی بار دھیرے سے چہرہ اٹھایا تھا۔ اس کی لال آنکھیں اس کے رتجوں کا پتہ دے رہیں تھیں اور ہونٹ سوکھ کے پھٹ سے گئے تھے۔ اس عمر میں ان کا یہ حال دیکھ کر اوزگل کی آنکھیں بھر آئیں۔

"اللہ لوک" اس نے سلاخوں کے اندر ہاتھ بڑھا کر نرمی سے ان کے ضعیف چہرے کو چھوا۔ جسے اتنی ہی نرمی سے اللہ لوک نے واپس کر دیا۔۔۔

"تو یہاں کیوں آئی ہے۔ کس نے تجھے یہاں کی راہ دکھا دی۔ جا چلی جا۔۔۔ ورنہ وہ تجھے بھی ساری عمر کے لئے اس جگہ قید کر لے گا۔" وہ محبت سے اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے بولیں تھیں۔

"کون۔۔۔ کون قید کر لے گا اور کیوں اللہ لوک" وہ واقعی نہیں سمجھ پا رہی تھی۔ اس کے بابا کے ہوتے ہوئے یہ جراء کون کر سکتا تھا۔ اس نے اسی وقت فیصلہ کیا تھا وہ جا کر یہ سب بابا کو بتا دے گی۔

"ہاں ہاں۔۔۔ جا۔۔۔"

جا کر بتا دے اپنے باپ جی کو کہ تو نے اللہ لوک کو زندہ دیکھا ہے "وہ اس کی آنکھوں کو پڑھنا جانتی تھیں۔ یہ اسے بھی معلوم تھا۔

"ہاں اللہ لوک۔۔ میں ابھی جا کر بتاتی ہوں" وہ فوراً سر ہلا گئی۔

"اور اس سے یہ ضرور پوچھنا۔ کہ اللہ لوک تو زندہ ہے پھر اس کے سامنے مرا کون۔۔ کس کو دفن آیا وہ۔" وہ جو باپ تک بات پہنچانے کے خیال سے پر جوش سی ہوئی تھی۔ چونکی۔۔۔

"باء جی۔"

"ہاں۔۔ تیرا باپ۔۔۔" اللہ لوک کے منہ سے رال ٹپکنے لگی یہ اس بات کی نشانی تھی کہ اسے غصہ آ رہا تھا۔ وہ جلال میں آچکی تھی۔

دور کہیں سے مرغے نے بانگ دی تھی۔ اللہ لوک نے سر گردایا۔ اس کے چہرے پہ بال بکھر گئے تھے۔

"پلیز اللہ لوک مجھے پوری بات بتاؤ۔۔ ہمارے شہر جانے کے بعد تمہارے ساتھ کیا ہوا۔۔؟

باء جی نے اتنا بڑا جھوٹ کیوں بولا۔۔؟

اور کیا وہ بھی واقعی باخبر ہیں کہ تم یہاں ہو۔۔؟" وہ ایک ہی سانس میں کئی سوال پوچھ گئی تھی۔ کیونکہ اوزگل جانتی تھی۔ اللہ لوک جب بھی جلال میں آجاتی تو کسی سے بات نہ کرتی تھی۔

"حدل گئی تیری" اس کی آواز بلند تھی۔۔

"تے جدوں حد مک جاندی اے۔۔ لکھ نہیں رہیںدا اے۔۔

سب کچھ اوکھا پیندا اے۔۔" وہ بار بار الفاظ دہرانے لگی تھی۔ بے بس ہو کے اوزگل اٹھنے لگی۔ جب اچانک اس نے اوزگل کا ہاتھ تھام لیا۔

"ہو سکے تو کل رات یہاں آجانا۔ بھت کچھ تیرا میرے پاس ہے۔ تجھے لوٹانا ہے۔ لیکن ایسے ہی آنا۔ چور راستے سے۔۔ ورنہ تو بھی کچھ نہیں کر پائے گی۔۔ کچھ نہیں" وہ اب پشتوں میں اسے کہہ رہی تھی۔ اس نے سر ہلایا اور ایک نظر دوسرے قدرے تاریک زندانوں پہ ڈال کے اس روشندان کی طرف بڑھ گئی جہاں سے وہ اندر آئی تھی۔ باہر سے آتی فجر کی اذان بھی اس کے دل کا بوجھ کم نہ کر سکی تھی۔۔

☆.....☆.....☆

زندگی ان کے لئے کچھ آسان تو نہیں رہی تھی لیکن اس قدر مشکل بھی کبھی نہ تھی کہ سانس لینا دو بھر ہو رہا تھا۔۔ پھر اس بار بات ان کی لالہ کی تھی۔ ان پہ یتیمی تو شاید ہمیشہ کی طرح لب سیئے سہہ جاتیں لیکن اب کی بار دل نہ جانے کیوں پھٹا جا رہا تھا۔ شادیز کا یوں اچانک بدلاؤ مزید دکھ کا باعث تھا۔ لیکن وہ انہیں جس قدر عزیز تھا۔ وہ اسے کچھ کہہ بھی نہیں سکتیں تھیں۔ اور لالہ کو اب سمجھ آ رہی تھی۔ نا انصافی سہنا تو جیسے ان کی عادت تھی۔ اور اسی وجہ سے شاید وہ اسی قدر آرام سے لالہ اور زرینہ کی باتیں بھی سہن کر جاتیں تھیں۔

شاویز کے معاملے میں بھی ان کا یہی رد عمل تھا۔ وہ الٹا اسے ہی صبر کا کہتیں۔ شاویز کے سامنے نہ آتیں۔ بات برداشت سے باہر ہو جاتی تو اس جگہ سے اٹھ کر چلی جاتیں۔ لیکن کبھی شاویز کو روک نہ پاتیں۔ لالہ کا وجود مزید بکھرنے لگا تھا۔ گھر سے مایوس ہو کے امی دادو اب جلد سے جلد باہر کا کوئی رشتہ تلاش رہیں تھیں۔

خالہ زہرہ بھی نہ جانے کہاں کہاں سے رنڈوے، عمر رسیدہ کنوارے اور دوسری تیسری شادی والے نکال نکال کے لانا شروع ہو گئیں۔ "زندگی کا کیا ہے لالہ۔۔ ہر صورت گزر رہی جاتی ہے۔ بس عزت کے بغیر نہیں گزرتی۔" سین اس کے آگے اس کے باپ کی عمر کے مردوں کی تصویریں رکھتیں اسے سمجھائے جاتیں اور لالہ خالی خالی نظروں سے ان کے چہرے کو تنکے جاتی۔ سین دل ہی دل میں اس کی چپ پہ خون کے آنسو روئے جاتیں لیکن اس کے سامنے خود پہ مضبوط رکھتیں اور اسے بھی مضبوط بننے کا کہتیں۔ حالانکہ اس کی چپ ان کا سینہ چاک کئے جاتی تھی۔ ایسی چپ تو اسے اجڑ کے بھی نہ لگی تھی جتنا گھر والوں کا رویہ اسے بخش گیا تھا۔ دادو بھی اس سے دور ہی رہنے لگیں تھیں۔ نہ جانے کیوں اسے دیکھتے ہی ضبط کھو بیٹھتی اور یوں پھوٹ پھوٹ کے روتیں کہ لالہ مزید بکھر جاتی۔۔

"تم یہ تصویریں دیکھ لو۔ انہوں نے تو بنا دیکھے ہی ہاں کر لینی ہے۔ پری جیسی لڑکی کے لئے بھلا کون نہ کرے گا" وہ تصویریں اس کے سامنے ڈالتے ہوئے اسے ہدایت کرتے ہوئے پیار سے کہتیں تو لالہ کا دل کرتا وہ ان کے گلے لگ کے خوب روئے اور کہے کہ بے شک اسے قتل کر دیں لیکن اس طرح ذلیل نہ کریں۔ لیکن وہ لب سنپے رہتی۔ خالی نگاہوں سے ان تصویروں کو دیکھتی جاتی۔ اور پھر عکس دھندلاتے اور سین کے کمرے سے جاتے ہی وہ سسک اٹھتی۔۔

"کون ہو گا جو یہ بوجھ اٹھائے گا۔ گناہ کا یہ بوجھ میں نہیں اٹھا پارہی۔ کوئی اور کیسے اسے سہارے گا۔ قبول کرے گا" وہ بھی جیسے شکست کھا چکی تھی۔ اب تو یہی خواہش بچی تھی۔ کوئی بھی ہو بس اسکی ماں اور دادو کی پریشانی ختم کر دے۔ اسے پناہ دے دے۔ اس کا اپنا آپ تو جیسے مر چکا تھا۔ نہ اسے کسی اپنی کسی خواہش کی چاہ تھی نہ ہی اب کسی بھترین ساتھی کی چاہ۔۔ بس کوئی ہو جو اس گناہ کی پوٹلی کو اس سے دور کر دے۔ "اور اس دن روتے روتے نہ جانے اسے کیا ہوا تھا۔ وہ اچانک ہی چیخنے چلانے لگی تھی۔ دادو اور سین دوڑتی ہوئیں اس کے پاس آئیں تھیں۔ وہ بری طرح اپنے پیٹ میں مکے جڑ رہی تھی۔

"لالہ۔۔ وہ دونوں تیزی سے اس کی طرف بھاگیں

"لالہ۔۔ میرے بچے۔" دادو نے اسے خود میں سمیٹ لیا۔

"سنجھا لو خود کو لالہ۔۔ سب ٹھیک ہو جائے گا" سین نے روتے ہوئے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔ بیٹی کا دکھ ان کی روح تک کو گھائل کئے جا رہا تھا۔ لیکن وہ بے بس تھیں۔ کسی بھی طرح اس کی اجڑی ہستی کو سمیٹ نہیں پارہی تھیں۔۔

"امی مجھے مار دیں۔ پلیز مجھے مار" لالہ چلاتے ہوئے بولی تھی۔۔

"مجھے اس گند کو نہیں پالنا۔ امی۔ پلیز اس سے میرا چچا چھڑوا دیں پلیز" وہ ہاتھ جوڑتے ہوئے ماں سے بولی تھی اور سین اس کے ہاتھ تھامتیں انہیں ہاتھوں پہ سر ٹیکتے خود بھی رو دیں تھیں۔ اب وہ اسے کیا بتائیں کہ وہ زندگی کے اس موڑ پہ تھیں جہاں صرف قدرت کی چلتی ہے۔ انسان بالکل بے بس ہو جاتا ہے۔ وہ بھی بے بس تھیں۔ اپنی جان سے پیاری بیٹی کے لئے بھی چاہ کر بھی کچھ نہیں کر پارہیں تھیں۔ انہوں نے اب سب کچھ رب پہ چھوڑ دیا تھا۔ اس کے علاوہ ان کے پاس کوئی چارہ نہ رہا تھا۔۔۔ اور بے شک اللہ ہی بہترین مددگار ہے۔۔۔

☆.....☆.....☆

"باری! ادھر دیکھو۔۔۔ یہ ڈریس کیسی ہے؟" وہ تین دن کے لئے اسلام آباد آئے ہوئے تھے۔ امن کی کوششوں کی وجہ سے کئی بڑے ہوٹلز کے اونرز سے وہ بات کرنے میں کامیاب ہوا تھا۔ بلکہ اسے اچھے انویسٹرز بھی ملے تھے۔ یہاں آ کے تین دن وہ مسلسل آفس کے کاموں میں بسی رہے تھے۔ اور آج فری ہوتے ہی امن ضد کر کے مارکیٹ لے آئی تھی۔

"کتنے کنجوس ہوتم باری۔ اتنی اچھی سٹارنگ کے بعد بھی ابھی تک کوئی گفت نہیں دیا مجھے۔ جبکہ میرے خیال میں تمہاری اکلوتی بیٹ فرینڈ ہوں میں" خوشگوار میٹنگ کے اختتام پہ بلڈنگ سے باہر آتے ہی امن نے اس سے گلہ کیا تھا اور اس نے فوراً اس کی ناراضگی ختم کرنے کے لئے حامی بھر لی تھی۔ اور اب پچھلے ایک گھنٹے سے سائنس میں کتنی ہی شاپس چھان لینے کے باوجود وہ کچھ بھی پسند نہیں کر پائی تھی۔ باریال جلد ہی بیزار ہو گیا تھا۔ اس کے بدلتے موڈ کو دیکھتے ہی اس نے کچھ سوٹ پسند کر کے اسے دکھاتے ہوئے پوچھا تھا۔ باریال بس سر ہلایا تھا جیسے اسے اس سب سے کوئی مطلب ہی نہ ہو۔ امن نے اس بار بدلی سے وہی دو ڈریسز پیک کروائیں اور مزید شاپنگ کا ارادہ ملتوی کرتی باہر کی طرف بڑھی۔

"بس ان دو ڈریسز کے لئے اتنی دیر ادھر ادھر گھومتی رہی تم؟" باریال کو حیرانگی ہوئی۔

"نہیں۔۔۔ صرف تمہارے ساتھ رہنے کے لئے۔۔۔" وہر کے بنا بولی تھی اور گلاس ڈور سے باہر نکل گئی۔ باریال ٹہر سا گیا تھا۔ نہ جانے کیوں سایہ ساس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا تھا۔ وہ تیزی سے سر جھٹکتا باہر آیا۔ امن گاڑی میں بیٹھ چکی تھی۔ وہ بھی اس طرف آیا اور ڈرائیونگ سیٹ سنبھال گیا۔

"اگر اتنی سی بات تھی تو صاف بتا دیا ہوتا کہیں بیٹھ کر وقت بتا لیتے۔ یہاں تو تھکن سے برا حال ہو گیا" اس کے لہجے سے دہلی مسکراہٹ صاف ظاہر تھی۔

"پلیز باری۔۔۔ میں نے تمہیں کئی بار کہا ہے۔ میری فیلنگز کا مذاق مت بنایا کرو۔ یک طرفہ سہی لیکن یہ ایک حقیقت ہے تمہارا ساتھ میرے لئے بہت اہم ہے۔ تم ساتھ ہوتے ہو نہ تو کسی اور چیز کی طلب نہیں ہوتی مجھے۔ شاپنگ تو بس بہانہ تھا۔ مجھے تمہارا ساتھ چاہئے تھا۔

ورنہ تو ہوٹل جاتے ہی تم اپنے روم میں بند ہو جاتے ہو۔ دس دفعہ کال کرو تب کہی جا کر بات کرتے ہو اور اگر کہیں گھومنے کا کہو تو صاف جواب۔۔ میں کام کر رہا ہوں "وہ آج جیسے سارے پرانے کھاتے بے باک کرنے والی تھی۔ بات کے آخر میں اس نے باریال کے لہجے کی نقل کرتے ہوئے کہا تھا۔ باریال کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔

"توبہ امن۔۔ تم تو بھری بیٹھی ہو" وہ ہنستے ہوئے بولا تھا۔۔

"شکر ہے تمہیں بھی خبر ہوئی" وہ منہ بنا گئی۔

"اچھا اب بتاؤ۔ ڈنر کہاں کریں۔ آج کی شام صرف تمہارے نام" وہ مسکرایا۔ لیکن اس کی مسکراہٹ بھی امن کا موڈ درست نہیں کر پائی تھی۔ اس نے سیدھا ہوٹل جانے کی ضد برقرار رکھی تھی۔ ہارمانتے ہوئے باریال نے گاڑی ہوٹل کی طرف موڑ دی تھی۔

☆.....☆.....☆

لال حویلی کے پرانے کنویں کی ٹوٹی لال اینٹوں والی منڈیر پہ بیٹھے چاند کی روشنی میں وہ بس اسے تنکے جا رہی تھی اور وہ حبس کے دیس کا شہزادہ نگاہیں کنوئیں کے اندر نظر آتی سیاہی پہ جمائے یوں باادب بیٹھا تھا۔ جیسے نگاہ اٹھائے گا تو اس محبت کی دیوی کے حسن کو ناپاک کر دے گا۔ اور اس کی یہی ادا تو تھی جس نے گل مینہ کو پاگل بنا دیا تھا۔ وہ اس پہ نظر ڈالتا بھی تو جیسے سوا بار نظر کا وضو کر کے۔ اسے خود پہ رشک آتا۔۔

"خانزادی۔۔۔۔۔" رات کے سناٹے میں جیسے کوئی مقدس سرجا گا تھا۔

مینے نے کنوئیں کی منڈیر پہ لگا وہ واحد زرد پھول بھی جڑ سے اکھاڑا اور اس کی طرف بڑھا دیا۔ ابراہیم نے اس کی طرف دیکھے بنا ہی وہ پھول تھام لیا تھا۔

"میں نے سنا ہے خانزادی۔۔ حویلی کی بیٹیوں کو محبت راس نہیں آتی۔ ابھی بھی وقت ہے اس راہ سے پلٹ جائیں"

"تم پلٹ سکتے ہو۔؟؟" اس نے الٹا سوال کر دیا۔ ابراہیم نے اس بار اس کی طرف دیکھا اور پھر گل مینہ کی نظروں سے نظریں ملتے ہی وہ فوراً نظریں جھکا گیا تھا۔

"میری حیثیت کیا ہے آپ اچھی طرح جانتی ہیں۔ ادب کی راہ ہمیشہ میرے لئے محبت کی راہ سے مقدم رہے گی" وہ بولتے ہوئے دور کہیں خلا میں دیکھنیدگا تھا۔ گل مینہ کھلکھلا۔

"توبہ۔۔ تم نہ بادشاہ اکبر کے دور میں پیدا ہوتے۔ قسم سے کبھی کبھی مجھے ایسے لگتا ہے کسی شاہی غلام کی روح گھس گئی ہے تم میں"

"میں نے اپنے بڑوں سے سنا تھا خانزادی۔۔ حویلی کی عورتوں کو محبت راس نہیں آتی" وہ اس کے لئے فکر مند تھا۔

"پھر میں خان بابا کے ساتھ ساتھ ضیاء کو بھی اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ کبھی اس بات کے لئے راضی نہ ہوں گے کہ ایک

ملک کا رشتہ اپنی بیٹی کے ساتھ طے کر دیں۔ "اس کی بات میں سچائی تھی گل مینہ بھی جانتی تھی۔ لیکن اسے باتوں کو جھٹلانا جانتی تھی۔

"جو قدرت کو منظور ہوتا ہے نہ تو اسے کون روک سکتا ہے ابراہیم... لال حویلی کی عورتوں کو بھی محبت راس آتی ہے۔ یہ میں دنیا کو دکھاؤں گی" وہ ایک ادا سے کہتی اس کا ہاتھ تھام گئی تھی۔ اس نے جھٹکے سے ہاتھ چھڑا لیا اور کپڑے جھاڑتا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"رات ڈھل رہی ہے۔ میرے خیال میں اب اچکوجانا چاہئے" اس نے حویلی کے اندرونی حصے کی طرف دیکھتے ہوئے مینے سے کہا تھا۔ یہ حصہ حویلی کے باہر صرف ان مہمانوں کے استعمال میں رہتا جو شہر سے مہمان بن کے آتے تھے۔ ابراہیم اور ضیاء کے دوسرے دوست بھی اکثر یہیں قیام کیا کرتے تھے۔

اور یہ ایک حقیقت تھی کہ اس طرف عورتوں کا آجانا واقعی ناممکن تھا۔ لیکن اس پاگل لڑکی کے جنون کے آگے وہ بھی مجبور ہو جاتا تھا۔ وہ کسی نہ کسی طرح ان دو حصوں کی درمیانی حد پار کر ہی لیتی تھی۔ اس کے اسی جنون سے کبھی کبھی اسے سخت خوف آتا تھا۔ وہ احسان فراموش ہرگز نہ تھا۔ لیکن لال حویلی کی اس پری میں ایسا کچھ تھا جو اسے بھی مجبور کر دیتا تھا کہ وہ اس کی محبت کے آگے سرنگوں ہو جائے۔ خود پہ اختیار تو وہ کب کا کھو چکا تھا۔ بس اب اس پری کی عزت کا پاس تھا۔ محبت پہ اختیار نہیں ہوتا لیکن نفس پہ اختیار مضبوط مرد کی شان ہے۔ اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ نفس کے کسی ایسے ہی کمزور لمحے کی زد میں آکے وہ اس مقدس رشتے کو داغدار کر لے۔

"جائیں خانزادی۔ اور خدا راکل اس طرف مت آئیے گا۔" وہ چند قدم دور جا ٹھہرا تھا۔ مینے نے خفاسی نگاہ اس کی چوڑی پشت پہ گاڑ دی۔ پھر دھیرے دھیرے چلتی کنوئیں کے قریب آگئی۔ کنوئیں کے پانی میں چاند اور اس کا عکس آپس میں گڈمڈ ہونے لگے تھے۔

"میں تو کل رات بھی آؤں گی۔ مجھے بھلا کون روک سکتا ہے" وہ پانی میں اپنے عکس کو دیکھتے ہوئے دلفریبی سے مسکرا دی۔

"ٹھیک ہے۔۔ آپ کی مرضی" ابراہیم ٹھنڈک سانس بھر کر رہ گیا۔۔

"لیکن پھر آپ کو اکیلے اس خوفزدہ مقام پہ وقت گزارنا ہوگا کیونکہ کل رات میں یہاں نہیں آؤں گا۔" وہ کہہ کے آگے بڑھا۔

"ابراہیم حیات کو جب جب گل مینہ بلائے گی اسے آنا پڑے گا" وہ اس کی طرف مڑی۔ ابراہیم کے بڑھتے قدم رکے۔

"اور اگر نہ آئے تو۔۔؟" مڑے بغیر ہی اس نے سوال کیا تھا۔

"تو حویلی کی تاریخ ایک اور گواہی دے گی کہ لال حویلی کے پرانے کنوئیں کے سیلن زدہ پانی نے ایک اور خوبصورت خانزادی کو نگل لیا تھا" اس کے لہجے میں موت کی سی سچائی تھی۔ ابراہیم کا جسم جیسے پتھر کا ہو گیا تھا۔ وہ مڑ نہیں سکا تھا۔ گل مینہ نے قدم بڑھائے۔

"اور تم جانتے ہو ابراہیم حیات۔۔ مینہ موت سے بھی نہیں ڈرتی" چلتے چلتے وہ اس کے قریب سے گزرتے ہوئے بولی تھی۔

ابراہیم ساکت کھڑا اسے حویلی کے دوسرے پار غائب ہونے تک دیکھتا رہا تھا۔۔

☆.....☆.....☆

"میرا موبائل دیکھا ہے تم نے؟" وہ صبح سے موبائل ڈھونڈ ڈھونڈ کے تھک گئی تھی۔ آغا گھرا آیا تو اقراء نے اس سے پوچھ لیا۔
 "کیوں؟ موبائل کی کیا ضرورت پڑ گئی تھیں" وہ واسکٹ اتار کے اسے پکڑاتے ہوئے بولا۔
 "کیا مطلب ضرورت پڑ گئی۔" اس نے آغا کے ہاتھ سے واسکٹ تھامتے ہوئے کہا۔

"کالز کرنا ہوتیں ہیں۔ امی نانوسب سے بات کرنا ہوتی ہے" وہ اس کے لئے کپڑے نکالتے ہوئے بولی تھی۔ لہجہ تیز تھا۔
 "تو میرے موبائل سے کر لیا کر نہ۔ خالہ کا نمبر بھی سیو ہے اور تمہارے اس کھڑوس بھائی کا نمبر بھی۔ نانوکا سیو کر لو۔ بات ختم" وہ ہاتھ جھاڑتے ہوئے بولا جیسے واقعی سارا کام نبٹا لیا ہو۔

"نہ مطلب کیا ہے تیرا؟" کپڑے لئے وہ تیزی سے اس کی سائیڈ پہ آئی تھی۔ ت۔ ہارے سے تیرے پہ آنے سے صاف ظاہر تھا اس کا موڈ بگڑ چکا ہے۔ آغا نے غصیلی نگاہ اس کے خوبصورت چہرے پہ ڈالی تھی اور پھر اچانک ہی آگے بڑھ کے اس کے گال دبوج لئے تھے۔
 "مطلب یہ کہ تیرا موبائل میں نے بیچ دیا اور رسم ضائع کر دی۔ اب تجھے جس سے بھی بات کرنی ہو میرے موبائل پہ کر لینا" اس کی گرفت اس قدر سخت تھی کہ اقراء کی آنکھیں بھرا آئیں۔ اس کے آنسو دیکھ کے آغا کے دل کو کچھ ہوا۔ اس نے فوراً ہاتھ ہٹا لئے اور اس کے ہاتھوں سے اپنے کپڑے لینے لگا۔

"ویسے بھی ابھی تیری عمر ہی کیا ہے۔ یہی سترہ اٹھارہ کی ہوگی مشکل سے۔ اور میں نہیں چاہتا میری طرح تو کسی اور سے بھی عشق معاشرے کر لے۔ عورت کی عقل تو ہوتی ہی گٹوں میں ہے۔۔۔ چل جا کھانا نکال میرے لئے" اسے سائیڈ پہ دھکا دیتا وہ ہاتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔ اور وہ بس اس کے آخری جملے کو سوچتی وہیں کھڑی رہ گئی تھی۔
 "عورت کی عقل تو گٹوں میں ہوتی ہے"

اس کی غلطی تھی یا اماں کی لالہ کے بارے میں کہی باتیں سامنے آ رہی تھیں۔ وہ اندازہ نہی لگا پائی تھی۔

☆.....☆.....☆

کل رات اس نے جو کچھ بھی تہہ خانے میں دیکھا تھا۔ وہ اس کے روٹھے کھڑے کر دینے کے لیے کافی تھا۔ بات معمولی نہی تھی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ حویلی میں پر مارنے والے پرندے تک کی خبر ہوتی ہے باء جی کو، تو ایسا کیسے ممکن تھا کہ اللہ لوک زندہ ہو اور باء جی کو خبر نہ ہو۔

ان کے سامنے وہ اللہ لوک کے لئے کس قدر اداس تھے۔ رو رہے تھے۔ تو کیا یہ سب باء جی کے حکم پہ۔
 "نہی۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔" وہ فوراً نفی کر گئی۔

"باء جی تو اتنی پیاری فطرت کے مالک ہیں۔ وہ بھلا ایسا کس طرح کر سکتے ہیں" وہ اس نہج پہ سوچنا بھی نہیں چاہ رہی تھی۔

لیکن دل تھا کہ بار بار باء جی کے خلاف ہی ہوا جارہا تھا۔

"کیا میں کسی اور سے یہ سب ڈسکس کر لوں۔" اس نے جیسے خود سے سوال کیا۔

"ضیاء یا مینے سے؟" ان کے علاوہ اعتماد کے قابل اور کوئی تھا بھی نہیں۔

"نہیں۔۔۔ نہیں" اس نے فوراً اپنی نفی کی تھی۔ "اللہ لوک نے کہا تھا کسی کو پتہ نہ چلے۔ چور راستے سے آنا۔۔۔" اس نے جیسے

خود کو باور کروایا۔

"مجھے فی الحال اس بات کا ذکر کسی سے نہیں کرنا ہوگا۔ ورنہ ہو سکتا ہے ایک بار پھر میں اللہ لوک کو کھودوں اور اس بار شاید ہمیشہ کے

لئے" اس نے خود کو مضبوط کرتے ہوئے فیصلہ کیا۔ دن نکل آیا تھا۔ اسے رات کا انتظار کرنا تھا۔ ساری رات جاگتے رہنے سے اب سر میں

بھی درد ہو رہا تھا۔ وہ رات کا پلان مرتب کرتی بیڈ پہ لیٹ گئی۔ کچھ ہی دیر میں وہ گہری نیند سوچکی تھی

☆.....☆.....☆

شادی کا گھر تھا۔ ڈھول کی تیز تھاپ اور پہ ٹانگوں کے شور سے کان پھٹنے جا رہے تھے۔ وہ مسلسل کانوں پہ ہاتھ رکھے جیسے اس شور

سے بچنا چاہیے رہا تھا۔ سر درد تھا کہ بڑھا جا رہا تھا۔ تبھی شور اٹھا تھا۔

"دلہن۔۔۔ ہائے دلہن" کی ہوا تھا۔ اسے حیرت ہوئی۔ وہ بھی ماجرہ دیکھنے کو ذرا سا آگے ہوا۔ تو حیرت سے اسے شدید جھٹکا

لگا۔ دلہن کے خوبصورت روپ میں وہ بلاشبہ لالہ تھی۔ اس کے لبوں اور ناک سے خون کی لکیری بہہ رہی تھی۔ تبھی اچانک اس کے سر سے

زرتاش دوپٹہ کسی نے زور سے کھینچا تھا اور اس کے بال بکھر گئے تھے۔ تکلیف سے اس کی آنکھوں میں آنسو بھرنے لگے تھے۔ تبھی وہ اچانک

اٹھ کر بھاگی تھی اور نہ جانے کس چیز سے ٹھوکر کھا کے گرنے لگی تھی جب باریال کے مضبوط بازوؤں نے اسے تھام لیا تھا۔

"لالہ" وہ بے اختیار پکارا تھا اور ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس نے اپنے چاروں طرف کا جائزہ لیا

وہ اس وقت اپنے کمرے میں تھا اپنے بیڈ پہ۔

"لالہ۔۔۔" اس نے زیر لب وہ نام دہرایا تھا۔ دل نے بے اختیار ہی ایک بیٹ مس کی تھی۔

وہ اس پری بیکر کو سوچتا سیدھا لیٹ گیا۔ نیند اب آنکھوں سے بھٹ دور تھی۔ فجر کی نماز ادا کر کے وہ سیدھا دیدے کے پاس چلا آیا۔

"آج تو بڑا بختاوردن ہے باری خود جاگا ہے نماز کے لئے" اسے رات کو دیر سے سونے کی عادت تھی۔ تبھی ہمیشہ فجر کے لئے

دیدے ہی اسے جانتیں تھیں۔ آج اسے جاگادیکھ کے خوشگوار حیرت سے بولی تھیں۔

"کہیں میری ہونے والی بہو نے تو نہیں جگادیا" ان کے لہجے میں شرارت تھی۔ باریال کی نگاہوں میں دلہن بنی لالہ کا سراپا لہرا گیا۔

"بہو۔۔۔؟" وہ زیر لب بڑبڑایا۔

"ہاں نہ۔ امن نے کال شال کر کے تو نہیں جگایا" اب کی بار پہ نہ جانے کیوں باریال کا منہ بن گیا۔

"نہیں دیدے۔ خود جاگا ہوں۔ اور وہ آپ کی ہونے والی بہو نہیں ہے۔ میں بتا چکا ہوں آپ کو" اس نے یاد دہانہ کر دوائی۔

دیدے کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔

"کتنی پاگل ہے وہ تمہارے پیچھے۔ تمہیں تو ویسے بھی کوئی اور نہیں پسند۔ اسے ہی تسلیم کر لو۔ مجھے بھی چین ملے" وہ اٹھ کر کچن

میں آگئیں۔ باریال بھی ان کے پیچھے تھا۔

"ایک بات بتائیں دیدے" انہوں نے چائے کے لئے پانی رکھا تو وہ سلیب سے ٹیک لگا کر پوچھنے لگا۔

"ہاں۔۔۔"

"اگر کسی کا دکھ اچکھ پریشان کرے تو آپ کو کیا کرنا چاہئے؟"

اس نے ماں کا چہرہ دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"سادہ سی بات ہے۔ اس کا دکھ بانٹ لینا چاہئے" ان کا چہرہ ہمیشہ کی طرح پرسکون تھا۔

"اور اگر دکھ بھٹ بڑا ہو" وہ مطمئن نہ ہوا۔

"تب تو اور بھی جلدی کرنی چاہئے۔۔۔" وہ اس کی طرف مڑتے ہوئے مسکرائیں۔

"کیونکہ بانٹ لینے سے بڑے سے بڑا دکھ بھی چھوٹا ہو جاتا ہے۔۔۔" ہاں مگر خلوص شرط اول ہے۔ "ان کے لہجے میں بھی ان کی

شخصیت کے رنگ بولتے تھے۔ اسے ماں پہ نخر ہوا۔

"اچھا۔ اب جلدی سے اس کا نام بتا دو جس کے رنگ تمہاری آنکھوں میں لودینے لگے ہیں" وہ جیسے اس کی چوڑی پکڑ چکی تھیں۔

وہ سر کھجا گیا۔

"ایسی کوئی اتنی نہیں دیدے بس کسی کی پریشانی سہی نہیں جارہی"

"تب تو بالکل صاف ہے۔ جا کے اس کا دکھ بانٹ دو۔ دونوں کے لئے سہنا آسان ہو جائے گا" انہوں نے مسکراتے ہوئے حل

بتایا۔ وہ اب آملیٹ بنا رہی تھیں۔۔۔

"یہ آسان نہیں ہے دیدے" وہ پاؤں سے زمین پہ نہ جانے کیا ترانے جارتا تھا۔

"دکھ بھٹ بڑا ہے اور میرا طرف بھٹ چھوٹا"

"کاش لالہ کے لئے یہ فیلنگز پہلے جاگیں ہوتیں" آخری بات اس نے جیسے خود سے کہی تھی۔

"اچھا" انہوں نے آملیٹ پلیٹ میں ڈالتے ہوئے حیرت سے کہا۔

"میرے خیال میں تو تم اب بالکل تیار ہو۔"

اب دیکھنا یہ ہے کہ تم خود کو کب سمجھتے ہو "مسکرا کر اس کے گال تپتھپھاتے ہوئے وہ اس کے لئے ناشتہ ٹیبل پہ رکھنے لگیں۔ وہ ساکت سا کھڑا انہیں دیکھے گیا۔"

☆.....☆.....☆

جب سے وہ اس حادثے سے گزری تھی۔ زندگی میں جیسے تاریکی اتر آئی تھی۔ آج بھی سر شام گھر آنے والے بادلوں نے ہر طرف اندھیرا سا پھیلا رکھا تھا۔ اور اسے اب اندھیروں سے خوف سا آنے لگا تھا۔ وہ جائے نماز لئے اندر کمرے میں آگئی اور سارے بلب آن کر دئے۔ کمرہ روشنیوں میں نہا سا گیا تھا۔ اس نے دروازے اور کھڑکیوں پہ پردے گرا دئے اور کھڑکی کے قریب ہی جائے نماز بچھا کے نماز پڑھنے لگی۔ تیز ہوا اور بارش شروع ہوئی تو پردوں سے بوچھاڑ سی اندر آتی اور اسے ہلکے سے بھگو دیتی۔ سکون سا اس کی ذات کا حصار کرتا اور رب کا ذکر کرتی وہ بے آواز رونے لگتی۔ آنسو جیسے روح کی ساری غلاظت دھوٹے محسوس ہوتے۔ وہ نہ جانے کتنی دیر ایسے ہی آنسو بہاتی رہتی جب سین کی کمزور آواز پہ چونک پڑی۔ وہ اس کے قریب ہی کارپٹ پہ بیٹھی اسے پکار رہی تھیں۔

"اتنی گم سم کیوں ہو جاتی ہو لالہ کہ سب ویران سا لگنے لگتا ہے مجھے۔"

زندگی میں بھت کچھ ایسا ہوتا ہے جس کے بارے میں ہم سوچنا بھی نہیں چاہتے لیکن اس سب کا مقابلہ کرنا ہی اصل ہے زندگی کی۔ سب کچھ ہار کے بیٹھ جانا تو کوئی حل نہیں نہ "اس نے نم آنکھوں سے ماں کے دھندلے پڑتے چہرے کو دیکھا تھا۔

"امی۔۔۔ وہ حادثہ گزر جاتا تو میں بھی شاید سن بھل جاتی" اس کے گال مسلسل بھیگ رہے تھے۔

"لیکن یہ حادثہ تو جیسے ٹھہر سا گیا ہے میری زندگی پہ۔۔۔ زندگی چھوٹے تو کہیں جا کے امان ملے امی۔۔۔ اور آپ بتائیں اب اس زندگی سے ہاتھ چھڑاؤں تو کیسے۔۔۔"

"نہ میرا بچہ۔۔۔ سین نے فوراً اسے خود میں سمیٹ لیا۔"

"ایسی باتیں نہیں کرتے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" وہ اس کا سر آہستگی سے تپتھپھاتے ہوئے کہنے لگیں تھیں۔

"شواہز بتا رہا تھا۔ ایک بھت اچھا رشتہ ملا ہے تمہارے لئے۔ اپنا کماتا ہے۔ الگ گھر ہے کوئی اتنی بڑی فیملی بھی نہیں ہے۔ دو بھائی ہیں وہ بھی اپنی فیملیز کے ساتھ دوسرے شہر میں سیٹل ہیں۔ پہلی بیوی سے اولاد نہیں ہوئی تو طلاق ہو گئی۔ اگر تم کہو تو کل انہیں گھر پہ بلا لیں انہوں نے ڈرتے ڈرتے اصل مدعا بیان کیا۔ لالہ ان کے سینے میں منہ چھپائے خاموش رہی۔

"پرایا بوجھ بھی اپنا سمجھ کے دل سے لگا لے گا۔ شواہز تو کل ہی نکاح کا کہہ رہا ہے تاکہ اور دیر نہ ہو اور کسی طرح ہمارا پردہ رہ جائے۔ وہ ٹھہرا بے اولاد آدمی اسے اس بات کی خبر بھی نہ ہو پائے گی کہ بچہ اس کا ہے ہی نہیں" وہ جیسے شواہز کے ہی لہجے میں سارا منصوبہ بتا

رہیں تھیں۔ لالہ کا دل کٹنے لگا۔ وہ آہستگی سے ان سے الگ ہو گئی۔

"میں تیار ہوں امی۔ آپ انہیں کل شام کا کہہ دیں" دھیرے سے انہیں اقرار سوچتی اس نے جیسے ان کے سر سے ایک بڑا بوجھ اتارا تھا۔ وہ اسے دعائیں دیتیں باہر نکل گئیں اور وہ سارا بوجھ دل پہ لئے دوبارہ رونے لگ گئی تھی۔ باہر برستی بارش میں ایک دم تیزی آئی تھی۔ بوچھاڑ اب بھی پردے سے ٹکراتی اسے بھگور رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

سمندر کی تیز لہریں اس کے قدم چھوتیں اور اتنی ہی تیزی سے واپس بھی پلٹ جاتیں۔ اور وہ بیزاری سے چند قدم ان کے پیچھے آگے بڑھاتا اور پھر ان کے واپس آتے ہی خود بھی پیچھے ہو جاتا۔ اس عمل میں وہ اس قدر محو تھا کہ قریب موجود لوگ اسے حیرت سے دیکھنے لگتے۔ بلیو جینز پہ وائٹ شرٹ کی آستینیں فولڈ کئے وہ نہ جاے کتنے وقت سے اس مشغلے میں مصروف تھا۔ قریب سے گزرتی لڑکیاں اس کی شخصیت کے سحر میں جیسے گرفتار ہوتیں اسے پلٹ کے دیکھنے پہ مجبور ہو جاتیں۔ اور وہ خود سے بے نیاز سمندر کی لہروں سے وہی کھیل جاری رکھے ہوئے تھا۔ یہ کھیل اور کتنی دیر چلتا جب اس کے موبائل پہ ہونے والی تیز بپ نے اسے چونکا دیا۔ اس نے دور سمندر کے بچوں بچ ڈوبتے اس نارنجی گولے پہ نظریں جماتے ہوئے فون نکالا اور بنا نظر ڈالے ہی کال پک کر لی۔

"کہاں ہو خان؟" زمزمہ کی پریشان آواز پہ اس نے نچال لب ہلکے سے دانتوں تلے دبایا تھا۔ یوں جیسے اس وقت اس کی کال اسے سخت ناگوار گزری ہو اور وہ ناگوار چھپانے کی کوشش کر رہا ہو۔

"کراچی آیا ہوا ہو دوستوں کے ساتھ" اس نے دوستوں کے بارے میں جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔ جبکہ وہ یہاں اکیلے آیا تھا۔

"اتنے دنوں سے غائب ہیں اور کال بھی نہیں اٹھا رہے۔ بندہ ایسے تھوڑی کرتا ہے۔ میں پریشان ہو گئی تھی"

"اس میں پریشانی والی کون سی بات ہے؟" وہ اب پانی کو پاؤں سے دور اچھال رہا تھا۔

"اصل میں خان یہاں .. وہ اسے کچھ بتانے لگی تھی لیکن پھر خاموش ہو گئی تھی۔ ضیاء ۱ کولگا وہ جیسے دوسری طرف کسی کے نہ ہونے کی تسلی کر رہی تھی۔

"کیا بات ہے زمزمہ..؟ کھل کے بتاؤ" وہ فوراً پریشان ہوا تھا۔

"خان صبح میں نے آپکے خاص ملازم کو فون پہ بڑے خان سے بات کرتے سنا تھا۔ وہ بتا رہے تھے کہ کوئی سیاسی رقیب لالہ والے واقعے تک پہنچ گیا ہے اور وہ لالہ کو بڑے خان کے خلاف استعمال کرنا چاہتے ہیں۔"

"تو۔۔" آدھی بات سن کر ہی ضیاء گاڑی کی طرف چل پڑا تھا

"اور کیا بات ہوئی۔ جلدی بتاؤ؟" وہ صرف چند سیکنڈز میں گاڑی تک آیا تھا۔ اور ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہوئے بے تابی سے بولا تھا۔

"خان وہ بڑے خان کو کہہ رہا تھا کہ یہ لڑکی ان کے لئے کوئی بڑا خطرہ بن سکتی ہے۔ پھر بڑے خان نے پتہ نہیں اسے کیا حکم دیا وہ بس جی خان جی خان کرتا رہا"

"اچھا۔ ٹھیک ہے۔ تم فون رکھو میں رات تک پہنچتا ہوں"

"ٹھیک ہے خان۔۔ خدائے پہ امان" اس نے فوراً کال کاٹ دی تھی۔ ساحل سمندر پہ گاڑی دوڑاتے ہوئے اس نے کال ملائی تھی۔

"سنو مجھے ابھی پشاور کے لئے نکلتا ہے۔ میری ٹکٹ کنفرم کروا کے مجھے اطلاع دو" اس نے دوسری طرف اپنے ملازم کو ہدایت کی تھی اور اس کا جواب سنتے ہی فون ڈیش بورڈ پہ اچھال دیا تھا۔ سڑک پہ آتے ہی اسکی کار فرار لے بھرنے لگی تھی۔

☆.....☆.....☆

اسلام آباد سے واپس آتے ہی وہ سب سے پہلے شاوینز سے ملنے اس کے گھر گیا تھا۔ نہ جانے کیا بات تھی کہ دل مسلسل اس لڑکی کو سوچ کے پریشان تھا۔ اس کے بارے میں وہ اپنے جذبات کو اب بھی نہیں سمجھ پارہا تھا لیکن وہ یہ ضرور جاننا چاہتا تھا کہ اب وہ کیسی ہے؟ شاوینز نے اپنی ضد چھوڑی یا اس لڑکی نے ہتھیار ڈالے۔ لیکن شاوینز کی بیٹھک میں قدم رکھتے ہی اسے کچھ انہونی ہونے کا احساس سا ہوا تھا۔ بیٹھک کھلی تھی۔ تبھی وہ شاوینز کے اشارے پہ اندر چلا آیا تھا۔ بیٹھک میں ایک ادھیڑ عمر شخص پہلے سے موجود تھا۔ اس کا رنگ کافی گہرا تھا۔ سر کے سامنے سے بال غائب تھے اور دائیں طرف سے چہرے سے لے کر گردن تک مکمل جلنے کے نشان تھے۔ اسے دیکھ کے نہ جانے کیوں باریال کو اس سے کوفت سی محسوس ہوئی۔ یہ نہیں تھا کہ وہ کم صورت لوگوں سے نفرت کرنے والوں میں سے تھا۔ لیکن اس شخص میں کچھ تو ایسا تھا جو اسے وہ اچھا نہیں لگا تھا۔

"دیکھیں۔ اس لڑکی کو ہم نے پال پوس کے بڑا تو کر دیا لیکن اب مجھے کہیں اور شفٹ ہونا ہے اور اسے بھی میں یوں اکیلے چھوڑ کے نہیں جاسکتا۔ اور اسی لئے ہمیں وہ جیسے کسی سمجھدار اور اچھے آدمی کی ہی تلاش ہے جو ہمارے بعد اپنوں کی طرح اس کا خیال رکھے" شاوینز اس آدمی سے مسلسل بات کرنے میں مصروف تھا اور باریال اس آدمی کا جائزہ لینے میں۔ اسے ان دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو کا کوئی اندازہ نہیں ہو پارہا۔ تقریباً پندرہ منٹس بعد معاملہ طے ہوا اور وہ شخص جانے کے لئے اٹھا تو باریال نے سکون کا سانس لیا۔

"کچھ عجیب نہیں تھا یہ شخص اور اس کی شادی سے تمہارا کیا لنک۔۔ میرج بیورو تو نہیں کھول لیا" اس کے جاتے ہی وہ اپنی اسی دوستانہ جون میں واپس آیا تھا۔

"نہیں یار۔ وہی لالہ والا معاملہ سیٹ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں" شاوینز بیزار سا صوفے پہ بیٹھتے ہوئے بولا۔

"لالہ۔۔۔ مطلب کیا ہے تمہارا۔۔؟ اس شخص کا کیا تعلق لالہ کے معاملے سے؟" شاوینز کی بات پہ اس کی سانس اکھڑنے لگی

تھی۔ جو اسے سمجھ آ رہی تھی اب وہ اسے جھٹلانا ہی چاہتا تھا۔

"مطلب صاف ہے یار۔ لالہ کی شادی طے کر دی ہے۔ کل شام کو نکاح ہے سادگی سے"

"تم ہوش میں تو ہو شادویز۔۔۔ لالہ کی شادی اور اس آدمی سے۔ دماغ تو ٹھیک ہے تمہارا" وہ ضبط سے ہونٹ کچلتا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"جس طرح کے حالات ہیں نہ اس میں یہ رشتہ بھی ایک نعمت سے کم نہیں۔ پھر یہ سب خود لالہ کا کیا دھرا ہے۔ اب بھگتے ساری عمر"

وہ خود غرضی کی انتہا چھونے لگا تھا۔ باریال کو اس کی دوستی پہ پہلی بار افسوس ہوا تھا۔

"اور آئی۔۔۔ وہ اس بات کے لئے مان گئیں؟"

"انہیں ماننا ہی پڑا باری۔ لالہ از پر کیگھٹ۔۔۔ اور اب زیادہ عرصہ یہ بات چھپائی نہیں جاسکے گی" اس نے گویا بم پھوڑا

تھا۔ باریال شاکد کھڑا رہ گیا تھا۔

"اسی لئے میں نے اسے اپنی مجبوری بتا کے کل شام ہی نکاح اور سادگی سے رخصتی کے لئے تیار کیا ہے تاکہ لالہ کو بھی آگے کوئی

مسئلہ نہ ہو" شادویز کا لہجہ مطمئن تھا۔ باریال کو اس وقت اس پہ شدید غصہ آ رہا تھا۔ لیکن وہ خود پہ ضبط کئے کھڑا رہا۔

"پھر بھی شادویز۔۔۔ یہ آدمی اور وہ بھی لالہ کے لئے۔ ہم کوئی اچھا آپشن بھی تو ڈھونڈ سکتے ہیں"

اس کی بات پہ شادویز کی آنکھوں میں طنز سا جاگ اٹھا تھا۔

"تم نے شاید میری پوری بات سنی نہیں۔۔۔ شی از ایکسیکٹنگ مانی ڈئیر۔ اور ایسی حالت میں اس سے بھتر آپشن بھلا اور کون ہوگا۔

کون ہے جو کسی اور کی تھوک اپنے دامن سے صاف کرے گا۔ میں یا تم۔۔۔" اس کے لہجے میں طنز تھا۔ زیر تھا۔ باریال لب کاٹے گیا۔

"یہ بھی اس بات سے لاعلم ہے ورنہ شاید یہ بھی راضی نہ ہو۔ لالہ اب وہ لالہ نہیں رہی۔ پاک صاف چمکتی سی لالہ۔ اس کے

ماتھے پہ سجاداغ ابھی نہیں تو چند دن بعد واضح ہو جائے گا۔ اور اسی لئے میں ان صاحب کا انتخاب کیا ہے۔ ورنہ یہ ساری سچائی جاننے کے

بعد لالہ کو کون اپنا سکتا ہے۔۔۔ ہاہ" کہتے ہوئے اس نے دونوں ہاتھ یوں نیچے گرائے تھے جیسے اسے باریال کی لالہ کے لئے ہمدردی پہ

بھی افسوس ہوا ہو۔ باریال نے تب بس ایک نظر اس پہ ڈالی تھی اور اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"میں اپنا تا ہوں اسے اس کے ہر گناہ ہر داغ کے ساتھ۔ آج رات آٹھ بجے نکاح کا انتظام کرو میں اپنے آدمی لے کر پہنچ جاؤں

گا۔" اس کا لہجہ بالکل صاف تھا۔ ذرا سی لغزش ذرا سا تذنب نہ تھا اس کی آواز میں۔

شادویز جیسے ساکت رہ گیا تھا۔

"اور ہاں رات آٹھ بجے ہی میں اسے ساتھ لے جاؤں گا۔ سادگی لیکن پوری ایمانداری کے ساتھ۔" کہہ کر وہ رکا نہیں تھا۔ باہر

نکل گیا تھا۔ دروازے سے لگ کے کھڑی سبین کی جیسے خدا نے سن لی تھی۔ وہ وہیں زمین پہ سجدہ ریز ہو گئیں۔۔۔

☆.....☆.....☆

سر شام گھر آنے والے بادلوں کی وجہ سے آج اندھیرا قدرے زیادہ تھا۔ پھر بھی اس کے انداز سے کل والا خوف مفقود تھا۔ وہ

آج بے خوف سی حویلی کے اس ویران بیرونی حصے کی طرف آئی تھی۔ اور ٹھیک اس جگہ آئی جہاں اس نے کل نشانی رکھی تھی۔ کل رات جاتے ہوئے اس نے ایک ٹوٹی ہوئی لمبی شاخ یہاں سوراخ کے سہارے کھڑی کر دی تھی تاکہ اس کا وقت ضائع نہ ہو اور وہ سیدھا زندان کے اسی روشن دان سے اندر جائے جس کے سرے پہ اللہ لوک کا کمرہ تھا۔

وہاں پہنچ کے اس نے وہ لکڑی نکال کے پاس ہی رکھ دی۔ پھر قریب رکھی بوسیدہ سی سرخ اینٹ اٹھائی اور آہستہ سے سائیڈز پہ بھرے نوکیلے کیلوں پہ مارتے ہوئے انہیں اندر دھکیل دیا۔ اب جگہ صاف تھی۔ اور وہ آسانی سے اندر جاسکتی تھی۔ اس نے کچھ دیروہیں بیٹھ کے ارد گرد کا جائزہ لیا۔

"جدوں حد مک جاندی اے۔۔۔"

لکھ نہیں رہندا۔۔۔

سب کینا ای اوکھا پیندا۔۔۔"

اللہ لوک کی بڑی ٹاہٹ واضح ہونے لگی تھی۔ اس نے اینٹ ایک طرف اچھالی

اور خود سمٹ کے روشن دان کے اندر پھسل گئی۔ اس بار وہ آسانی سے اندر آ گئی تھی۔ ورنہ کل رات ان کیلوں کی وجہ سے اس کے پہلو اچھے خاصے چھل گئے تھے۔ نیچے آ کے اس نے اپنے کپڑے آہستگی سے جھاڑے اور اللہ لوک کے تنگ و تاریک کمرے کی طرف آ گئی۔ اللہ لوک دیوار کے سہارے ٹیک لگائے لیٹی ہوئیں تھیں لیکن پھر بھی پیرسلاخوں سے باہر آ رہے تھے۔ انہیں مکمل لیٹنے میں کس قدر تکلیف ہوتی ہوگی سوچ کر ہی اس کی آنکھیں بھرانے لگیں۔

اللہ لوک کا سر جھکا تھا اور لمبے کھلے بکھرے بالوں نے ان کا چہرہ ڈھانپ رکھا تھا۔ وہ مسلسل وہی الفاظ دہرا رہی تھیں جو وہ اکثر کہتی رہتیں تھیں۔ وہ اندازہ نہیں لگا پا رہی تھی کہ اللہ لوک جاگ رہیں یا نیند میں تھیں۔

"اللہ لوک" اس نے دھیرے سے پکارا۔ تاکہ اگر وہ سو بھی رہیں ہیں تو ڈسٹرب نہ ہوں۔ اسنے طے کر لیا تھا اگر وہ سو رہی ہیں تو وہ ایسے ہی واپس چلی جائے گی۔ لیکن اس کی اس دھیمی پکار پہ ہی انہوں نے فوراً سر اٹھایا تھا۔ اوزگل نے ایک لمبی سانس بھری۔ اللہ لوک کچھ دیر بالوں کے اندر سے ہی اسے گرم سمی گھورتی رہیں پھر ایک جھٹکے سے آگے آئیں۔ اوزگل بے اختیار کچھ پیچھے ہوئی۔

"آنکھیں کھول دے اس سے پہلے کہ کالک تجھے بھی کالا شاء ل کر دے" وہ سلاخوں کے اندر سے سراس کے قریب لاتے ہوئے یوں سرگوشی میں بولیں جیسے کوئی گہرا راز بتا رہی ہوں۔۔۔

"اللہ لوک۔ میں نے بابا کی ڈائری پڑھ لی۔ لیکن میں حیران ہوں" وہ اللہ لوک کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے اسے بتانے لگی۔ "اس ڈائری میں اتنے سارے لوگوں کا ذکر ہے۔ اور ان میں سے کچھ مجھے تھوڑا تھوڑا یاد بھی ہیں۔ لیکن اب وہ سب کہاں ہیں۔ ہمیں اور باء جی کو انہوں نے کیوں چھوڑ دیا۔ کیا آپ جانتی ہیں۔؟" اس نے ان سے پوچھا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اللہ لوک ہی ایک ایسی ہستی

تھی جسے سب پتہ ہو سکتا تھا۔ یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ اللہ لوگ صرف اس سے ہی بات کرتی تھی ورنہ عام لوگ انہیں پاگل ہی مانتے تھے۔ صرف اوزگل ہی جانتی تھی کہ وہ نہ صرف عام لوگوں کی طرح بات سمجھتی اور بولتیں تھیں بلکہ کبھی کبھی ان کی باتیں خود اوزگل کو بھی حیران کر دیتیں تھیں۔ حلے اور حرکات سے وہ واقعی اللہ لوگ ہی لگتی تھیں لیکن اوزگل ہی صرف اس بات کی گواہ تھی کہ جب وہ بولنے پر آتیں تو انتہائی کام کی بات کرتیں۔ ابھی بھی اوزگل کی بات سن کر انہوں نے چونک کر پہلے اس کی طرف دیکھا تھا۔ پھر بے اختیار ہنسنے لگیں تھیں۔۔۔

"حد مک گئی۔"

پردے چکن دائیم آگیا اے" وہ تالیاں بجاتے ہوئے بولیں۔ اس کا مطلب ابھی وہ بات کرنے کے لئے راضی نہ تھیں۔

"اللہ لوگ۔۔۔ آپ اس طرح کریں گی تو میں چلی جاؤں گی۔ اور پھر کبھی یہاں نہیں آؤں گی" وہ خفا ہوئی

"باہا با۔۔۔ سب کچھ تو ننگا ہونے والا ہے۔"

سب ظاہر ہو جائے گا۔

حد مک گئی اے۔۔۔

لکھ رہے ہیں۔

سب واپس پلٹ جائے گا۔

باہا با۔۔۔ وہ اور زور سے ہنسنے لگیں۔ اوزگل مایوسی سے کچھ دیر انہیں ہنستا دیکھتی رہی۔ پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تجھے کیا بتاؤں؟" روتے روتے وہ اچانک سسک دیں تھیں۔ اوزگل کے بڑھتے قدم رکے تھے۔

"کیا کیا حساب باقی ہے؟"

کیا کچھ نکل گیا ایک سنہو لیا۔۔۔ وہ رونے لگیں تھیں۔ اوزگل مڑ کے دوبارہ ان کے پاس بیٹھ گئی۔

"سب بتا دیں اللہ لوگ۔"

اپنے اندر اترا کچھ زہر مجھے بھی دان کر دیں۔ کچھ تو آسانی ہو" وہ ان کا کمزور سا ہاتھ تھامتے ہوئے بولی تھی۔ اور اللہ لوگ دھاڑیں مارنے لگی تھی۔

زندہ ان کا بند علاقہ دردناک آواز سے گونج اٹھا تھا۔ اوزگل ابھی بھی ان کے بولنے کی منتظر تھی

☆.....☆.....☆

یہ لال حویلی کا وہی لال اینٹوں والا کنواں تھا۔ جس کی منڈیر پہ سر ٹکائے لمبے کالے بال کھولے وہ پری پیکر ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔

اس کے خوبصورت چہرے پہ محبت لودے رہی تھی۔ اس کی خوبصورت نیلی آنکھیں سامنے بیٹھے شاہ عیسیٰ پہ جمیں تھیں۔ جو ایک نظر اس پہ ڈالتا اور فوراً یوں آسمان کی طرف پھیر لیتا جیسے اس نے اس پری پیکر کے حسن کی توہین کر دی ہو۔

"گلتا ہے تمہیں واقعی مرنے کا شوق ہے شاہ عیسیٰ جو روز اس طرف آ جاتے ہو" لمبے بالوں کو ہاتھوں سے سنوارتے ہوئے وہ ایک غرور سے بولی تھی۔

"جبکہ تم جانتے ہو اس لال کنویں کے سیاہ پانی نے کتنے ہی اجلے رنگین آنچل اپنے کالے دامن میں سمیٹے ہیں۔ کتنے ہی خوبصورت جوان اس کنویں کے سامنے اپنی زندگی ہارے ہیں۔ کیوں اپنی اور میری جان کے درپے ہو۔ پلٹ جاؤ" اس شہزادے نے ایک نظر اس وجود پہ ڈالی تھی اور جھکا لی تھی۔

"یہ کنواں اس لال حویلی کی ہر محبت کا گواہ ہے۔ یہ میری بھی گواہی دے گا۔ کہ شاہ عیسیٰ نے محبت کی تھی اور جان لٹا دی تھی" اور اس سب کا فائدہ؟ "وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"محبت فائدہ یا خسارہ کب دیکھتی ہے۔ یہ تو بس ہو جاتی ہے۔ کاش کا کا کی شادی پہ یہ سونے جیسا روپ میرے سامنے نہ آتا ورنہ خدا کی قسم شاہ عیسیٰ ایسے مات کھانے والوں میں سے نہیں تھا۔" اس کے لمبے میں کردار کا غور تھا۔ شہزادوں جیسی شان رکھنے والا وہ شخص اس کے پیچھے دیوانہ تھا۔ جس کے پیچھے پانچویں کلمے کی لڑکیاں بھی پاگل تھیں۔ وہ دل ہی دل میں خود پہ نازاں تھی۔

"تمہارا یہی کردار ہی تو مجھے یہاں تمہاری بات سننے کے لئے پہ مجبور کر دیتا ہے۔ میں خود کو لاکھ سمجھانے کے باوجود بھی تمہاری راہ پہ قدم دھرنے سے نہ روک سکی۔ لیکن خدا گواہ ہے شاہ عیسیٰ مجھے ہماری محبت سے زیادہ تمہاری جان عزیز ہے۔ پلٹ جاؤ اس سے پہلے کہ دیر ہو جائے" وہ جانے کے لئے مڑ چکی تھی۔

"میں کل زریاب لالہ سے ہماری شادی کی بات کرنے آ رہا ہوں۔ اپنے کا کا کی کے ساتھ" اس پری پیکر کے پاؤں پتھر کے ہوئے تھے۔ وہ پلٹ نہ سکی تھی۔

"وقت طے کر دے بہت جلد۔۔ محبت یا موت۔۔"

مجھے تمہارے لئے یہ دونوں بخوشی قبول ہیں "کوئی کہتے ہوئے ذرا سادب سے جھکا تھا۔ پھر اس نے بھاری قدموں کی چاپ اٹی جانب دور،، بہت دور جاتی سنی تھی۔ لیکن وہ خود اپنی جگہ سے ہل بھی نہ سکی تھی۔



ناول ”محبت لفظ ہے لیکن“ ابھی جاری ہے۔ اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی 5 تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

رات کے دو بج رہے تھے۔ جب نامانوس سے شور سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ یہ بیل ڈور کی آواز تھی۔ وہ کیونکہ اکتوبر کے آخر تک باہر سونے کا عادی تھا۔ تبھی اس نے یہ آواز سن لی تھی۔ ورنہ رات کو بند کمروں میں ڈور بیل کی آواز سنائی ہی نہیں دیتی تھی۔

"اس وقت کون ہو سکتا ہے۔؟" شاویز ساتھ پڑے موبائل پر دقت دیکھتے ہوئے بڑبڑایا۔ بیل دوبارہ چنگھاڑی تھی۔ ناچار اسے اٹھنا ہی پڑا تھا۔ بیل دوبارہ بجائی گئی تھی۔ اس نے تیزی سے آگے بڑھ کے بنا پوچھے ہی دروازہ کھول دیا۔

تین چار گن بردار تیزی سے اندر آئے تھے اور اسے اپنے گھیرے میں لے لیا۔ کچھ دیر تک تو وہ ساخت سا کھڑا انہیں دیکھتا رہا۔ پھر یکدم ہی اس کی آنکھوں میں حیرت کی جگہ اب غصے نے لے لی تھی۔

"یہ کیا تمیزی ہے۔؟" اس نے تیز لہجے میں کہا۔

"سہراب علی خان تم سے بات کرنا چاہتے ہیں" ان میں سے ادھیڑ عمر مضبوط جسم کے مالک آدمی نے اسے اتنے ہی تیز لہجے میں جواب دیا تھا۔

"کون سہراب علی خان" وہ کندھے آچکا گیا۔ حیرت انگیز طور پر اس کے چہرے پہ خوف کا شائبہ تک نہ تھا۔ اس سے پہلے کہ ان میں سے کوئی اس کی بات کو جواب دیتا۔ سہراب علی خان نے قدم دروازے سے اندر دھرتھے۔

"میں سہراب علی خان۔۔۔ ضیاء علی خان کا باپ۔۔۔" ان کی بھاری آواز پہ شاویز ایک پل کے لئے چونکا۔ پھر فوراً ہی اس کے لبوں پہ کیمینی سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"اوہ۔۔۔ تو خبر پہنچ گئی آپ تک"

"شکر کرو کہ پہنچ گئی۔۔۔ ورنہ دیر ہو جاتی تو نقصان تمہارا ہی ہونا تھا بچے۔۔۔ سہراب علی خان کا آج تک کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکا۔ اس کی قسمت بھی نہیں" ان کے لہجے میں غرور تھا۔

"اتنا اعتماد بھی اچھا نہیں ہوتا خان صاحب۔۔۔ بعض دفعہ ہمیں وہیں مات ہو جاتی ہے جہاں جیت ہماری نظر میں یقینی ٹھہرتی ہے۔" وہ بھی انہی کے انداز میں بولا تھا۔

"کافی تیز ہوا چھا لگا تم سے مل کر" انہوں نے مسکراتے ہوئے اس کے کا ندھے پہ ہاتھ رکھا۔

"میرے خیال میں کام کی بات ہو جائے۔؟" اس نے آہستہ سے ان کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا۔ سہراب علی خان کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

"میرا خیال تھا تم کام سمجھ گئے ہو گے"

"میرا بھی یہی خیال تھا کہ آپ کافی سمجھدار ہوں گے۔ کام بغیر دام کے تو ہوتے نہیں" اس نے خباثت سے ہاتھ سے کیش کا اشارہ کیا۔

"میں میڈیا کے سامنے بہن لانے سے انکار کر دوں گا لیکن بدلے میں ہمیں۔۔۔۔۔"

"دوران۔۔۔ اس سے بینک اکاؤنٹ اور دوسری معلومات لے لو۔ اور دیکھو اسے کوئی شکایت نہیں ہونی چاہئے" سہراب علی خان نے تیز نظروں سے اسے گھورتے ہوئے گھنی مونچھوں کو تادیتے ہوئے دوران کو حکم جاری کیا۔۔

"جی خان" وہ سر جھکا گیا۔

"آپ بھی بے فکر ہو جائیں۔ کل ہی میری بھس کی شادی ہے۔ وہ یہاں سے دور چلی جائے گی" شادوین نے دانت نکالتے ہوئے انہیں بے فکر کیا۔

"صرف بہن نہیں۔۔ تم سب بھی۔۔" سہراب خان کے لہجے میں تحکم تھا۔

"ہم سب۔۔۔؟؟ مطلب۔۔۔؟؟؟" وہ حیران ہوا۔۔

"تم سب بھی یہاں سے کسی دوسرے شہر چلے جاؤ۔ پیسے کی فکر نہ کرو۔ بس تمہاری فیملی کا کوئی بھی آدمی ضیاء یا میرے دشمنوں کے ہاتھ نہ لگے۔۔ سمجھ گئے" ان کی بات پہ شادوین کے ماتھے پہ سوچ کی شکنیں گہری ہو گئیں۔

"فائدے کی بات میں اتنا سوچا نہیں کرتے برخوردار۔" انہوں نے اس کا کندھا تھپکا۔۔

"امید کرتا ہوں۔ آئندہ ہماری ملاقات کی نوبت نہیں آئے گی۔ کیونکہ دوسرا چانس سہراب علی خان اپنوں کو بھی نہیں دیتا۔" عقاب نے نظروں سے اسے وارن کرتے ہوئے وہ واپس مڑ گئے تھے۔ ان کے بدرگوں نے بھی ان کی پیروی کی تھی۔ اور شادوین اس نے بے اختیار جھرجھری لی تھی۔

"اف ان کی آنکھیں کتنی خوفناک تھیں" اس نے گیٹ بند کرتے ہوئے خود کلامی کی تھی۔

"بلکل سانپ کی طرح۔۔۔ زہریلی سی"۔۔۔۔

لیکن ان خوفناک آنکھوں کا اثر جلد ہی زائل ہو گیا تھا۔ کچھ دیر بعد ہی بستر پہ لیٹا وہ اپنی بدلی زندگی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس کے لبوں پہ مسکراہٹ رقص کرتی رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

باریال تو اسی دن نکاح کا خواہاں تھا۔ لیکن شادوین نے سین کے کہنے پہ اسے کل رات کا وقت دیا تھا۔

دوسرے دن

شام سے کچھ دیر پہلے باریال لالہ اور سین کو لینے آیا تھا۔ اس کے مطابق لالہ کا بھی حق تھا کچھ خواہشوں پہ۔ لالہ نے تو فوراً انکار کر دیا تھا۔ لیکن سین اور دادو تو جیسے کھل اٹھیں تھیں۔ خصوصاً دادو تو خوشی سے چکنے لگیں تھیں۔ انہوں نے لالہ کو سین اور باریال کے ساتھ جانے کے لئے کسی نہ کسی طرح منایا لیا تھا۔

"ویسے اماں، میں سوچ رہی تھی کہ زریہ بی بی کے گھر کے راستے سے گزریں کیوں نہ انہیں بھی دعوت دیتی آؤں۔"

"خبردار۔" دادو نے فوراً ہی انہیں ٹوک دیا۔

"اس خوشی کے موقعے پہ وہ آفت کا پر کالہ دور ہی رہے تو بہتر ہے۔"

انہوں نے قطعی لہجے میں کہا۔

"پھر بھی اماں۔ لالہ کی اکلوتی پھپھو ہیں وہ۔ اتنے اہم موقعے پہ ان کو نہ بلایا تو ناراض ہو جائیں گی" سین پریشان ہوئیں۔

"ہاں پہلے تو بڑی راضی ہے وہ ہم سب سے" اماں نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ لہجے میں اس قدر ناگواری تھی جیسے یہ موضوع ہی تکلیف دے رہا ہو ان کو۔

"اور پھر اس قدر مشکل دور میں جو کردار نبھایا ہے نہ اس اکلوتی پھپھو نے۔ وہی کافی ہے۔ تم بس چپ چاپ بسم اللہ کرو۔ سب کچھ جس قدر خاموشی سے ہو جائے اتنا بہتر ہے" انہوں نے فیصلہ سنایا۔ سین اس بار خاموشی سے سر ہلا گئیں۔

وہ اور لالہ چادر لے کر باہر آئیں تو گاڑی کے بونٹ پہ بیٹھا موبائل میں بڑی باریال ان کا منتظر تھا۔ ان کے باہر آتے ہی وہ فوراً آگے بڑھا اور گاڑی کا دروازہ ان کے لئے کھول دیا۔ لالہ تیزی سے پچھلی سیٹ پہ بیٹھ گئی۔

"آئی آپ آگے بیٹھ جائیں" باریال نے مسکراتے ہوئے ان کے لئے دروازہ کھولا۔ سین مشکور نگاہوں سے اسے دیکھتیں آگے بیٹھ گئیں۔ ان کے بیٹھے ہی باریال نے دروازہ بند کیا اور خود رانیوٹنگ سیٹ سنبھالتے ہوئے گاڑی آگے بڑھا دی۔ کچھ دیر بعد ہی وہ پشاور کے مشہور ڈیزائنرز رلائی کے بوتیک کی چمکتی گلاس بلڈنگ کے سامنے رکے تھے۔

"آپ لوگ آجائیں" باریال نے گاڑی سے اترتے ہوئے ان سے کہا تھا اور خود پھر سے موبائل پہ مصروف ہو گیا۔ سین باہر نکل آئیں۔ لالہ نے ایک نظر گلاس ونڈوز سے نظر آتے عروسی ملبوسات پہ ڈالی تھی۔ اس نے خود کو اس بندھن کے لئے کس قدر پاک رکھا تھا۔ ہر ایک لمحہ اپنی اور اپنے خیالات کی حفاظت کی تھی۔ لیکن جس قدر مشکل سے اس نے اپنا کردار بچایا تھا اسی قدر آسانی سے وہ روزماں کے کردار کے کتنے پر نچے اڑا دیا کرتی تھی۔ اور آج دامن پہ وہ داغ لگا تھا کہ شادی جیسا پوتر بندھن گناہ کی طرح چھپ چھپا کے ہونے جا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں جلنے لگیں تھیں۔

"لالہ" سین نے اس کی طرف آپکے شیشہ بجایا۔ لالہ نے چونک کر نظریں اٹھائیں۔ سین اس کی منتظر تھیں۔ عین اسی وقت باریال نے بھی اس کی طرف دیکھا تھا۔ اور ان کٹورا آنکھوں کی شکستگی اسے اداس سا کر گئی تھی۔ اسے دیدے نے ہی بتایا تھا۔

"کچھ لوگوں سے ہمارا روح کا رشتہ ہوتا ہے۔ کسی بھی طرح کا رشتہ نہ ہو پھر بھی انکی مسکراہٹ ہمیں خوشی اور ان کے آنسو ہمیں تکلیف دیتے ہیں۔۔"

اور اس معاملے میں اس کے ساتھ واقعی ایسا ہوا تھا۔ لالہ کو بے بس دیکھ وہ بھی اسی قدر بے بس ہو جاتا تھا۔ اکثر شادویز کے گھر آتے جاتے اس نے اس چادر میں لپٹے اس نازک وجود کو دیکھا تھا۔ لیکن ہمیشہ بس ایک جھلک۔۔۔ نامکمل۔۔۔ چادر میں چھپا سنہرا سا عکس۔۔۔ مکمل عکس اس دن اس کے سامنے آیا تھا جب شادویز اسے میڈیا کے سامنے آنے پہ تنگ کر رہا تھا۔ اس دن بے بس سی آنکھیں لئے وہ لڑکی اسے دل کے بھت پاس محسوس ہوئی تھی اور بے اختیار ہی اس کا دل کیا تھا وہ اس کے سارے غم، سارے پچھتاوے سمیٹ لے۔ اسے ہر پریشانی سے آزاد کر دے۔۔

یہ بھی صحیح تھا کہ وہ یہ فیصلہ کرنے کا ظرف نہیں کر پار ہا تھا۔ لیکن شاید دیدے صحیح تھیں۔ وہ واقعی فیصلہ کر چکا تھا۔ بس خود کو سمجھنے کا وقت شاید ابھی نہیں آیا تھا اور پھر آج شادویز اور اس آدمی کی باتوں نے وہ آگہی بھی اسے سوپ دی تھی۔۔۔ وہ واقعی تیار تھا۔

"چلیں بیٹا۔۔۔" لالہ کے باہر آتے ہی سین نے باریال کو پکارا تو وہ چونک کے سیدھا ہوا۔

"جی۔۔۔" اس نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔۔۔

اندر آ کے سین ہی لالہ کے لئے کپڑے سیلیکٹ کرتی رہیں۔ وہ وہاں ہو کے بھی وہاں سے غائب تھی۔ باریال کا وائٹ کے قریب رکھی چیمبر پہ بیٹھا دونوں ہاتھوں کی پوائنٹنگ فنگرز ہونٹوں پہ جمائے کبھی گلاس سے باہر کبھی لالہ پہ نظر جمالیتا۔۔۔

"لالہ۔۔۔ صرف نکاح کے لئے تو سوٹ خود پسند کر لو نیچے" سین نے کچھ عروسی ملبوسات اس کے سامنے پھیلاتے ہوئے کہا۔

لالہ نے نظریں اٹھا کے مرے مرے انداز سے انہیں دیکھا۔

"آپ دیکھ لیں ندامی" وہ اداسی سے بولی

"یاد ہے جب تم اور نمرہ اکثر شادی کے کپڑوں پہ بات کرتی تھیں۔ اور تم ہمیشہ کہتی تھیں۔۔۔ تم تو بس وہ رنگ پہنو گی جو وہ پسند کریں گے تمہارے لئے۔۔۔" سین نے اس کے چہرے پہ ہاتھ بھیرتے ہوئے پیار سے کہا۔۔۔ وہ بس نظریں چرا گئی۔۔۔

"بس یہ پیک کر دیں" سین نے ٹھنڈی سانس بھرت ہوئے ایک عروسی اور تین چار سادہ سے ملبوسات منتخب کر کے فائل کر دئے۔ باریال نے پیمنٹ کا کہہ کر ان کو باہر گاڑی میں ویٹ کرنے کا کہا اور خود کا وائٹ پہن لیا۔

"مجھے سرخ رنگ کا عروسی لباس دکھائیے۔" اس نے فرمائش کی۔

اجی سر "ڈیسک کے اس پار کھڑا نو جوان فوراً آگے بڑھ گیا۔

"فاسٹ پلیز۔" باریال نے اسے ایک ہی جگہ مصروف دیکھ کے تیز لہجے میں کہا تو وہ سر ہلاتا اس کے پاس آ گیا۔ ہاتھوں میں سرخ رنگ کے دوروشنی کی کرنیں بکھیرتے لباس تھے۔ ان میں سے ایک پہ تلے اور موتیوں کا گولڈن کام بھت ہی خوبصورت لگ رہا تھا۔ سرخ زرتار دوپٹے اور لہنگے کے کناروں پہ پہ سنہری جھلملاتی لائن اور بلکل ویسی ہی سرخ کام سے سچی جھلملاتی لائن سنہری شرٹ پہ۔ وہ بے حد خوبصورت لباس تھا۔

"یہ پیک کر دیں" اس نے فوراً آرڈر دیا۔ اور پھر دونوں شاپر اٹھائے باہر آ گیا۔۔۔ جیولری کا سیٹ اس نے خود جا کے لیا اور پھر انہیں گھر تک چھوڑنے آیا۔

"آئی۔" ان کے گاڑی سے اترتے ہی وہ بھی باہر آیا تھا۔ اس کی پکار پہ سین رکی تھی لیکن لالہ اندر چلی گئی تھی۔
"یہ سوٹ لے لیں۔۔۔ میں نے لالہ کے لئے پسند کیا ہے" اس کے ہاتھ سے شاپر لیتے ہوئے سین کی آنکھیں جگمگاسی اٹھیں تھیں۔۔۔

"تم آ جاو گے نہ بیٹا۔۔۔" وہ مڑنے لگا تھا جب سین کی منت بھری آواز پہ اس کے قدم پتھر کے ہوئے تھے۔ وہ ان کی طرف واپس مڑا اور مسکراتے ہوئے کہا۔۔۔

"ہاں آئی۔۔۔ ٹھیک دس بجے۔۔۔ لالہ میرے نکاح میں ہوگی۔ یہ میرا وعدہ ہے آپ سے" ادب سے ان کے سر پہ ہاتھ رکھتا وہ واپس مڑ گیا تھا۔ اور جانے کیوں سین کو لگا تھا۔ اس لمس میں کسی بے حد اپنے کی خوشبو بھسی تھی۔ وہ گاڑی کے غائب ہونے تک مڑ نہ سکیں تھیں۔۔۔

☆.....☆.....☆

بارش کافی تیز ہو چکی تھی اور کھلی کھڑکی سے اندر آتی ہلکی سی بوچھاڑ اب تیز دھار پانی کی شکل اختیار کرتی جا رہی تھی۔ لیکن وہ اسی طرح بھیکتی، ہاتھ باہر پھیلائے بت بنی کھڑی تھی۔

"نگی۔۔۔ اللہ کا نام لیں اب تو کھڑکی بند کر لیں۔ دیکھیں سارا فرش بھگینے لگا ہے" ان کی چھوٹی بہن کمرے میں آئی تو انہیں یونہی بھگتا دیکھ کر بولی۔

"ہاں تو موسم بھی تو دیکھو کتنا پیارا ہو رہا ہے" وہ اس کی طرف مڑے بغیر بولی۔

"لیں۔۔۔ ہمارے گاؤں کا موسم تو ہر دوسرے دن ایسے ہی پیارا ہو جاتا ہے۔ کوہ سلیمان کی چھاؤں میں جو بسا ہے" وہ گرما گرم پکڑے اور چائے کا ٹرے دونوں بہنوں کے مشترکہ بیڈ پہ رکھتے ہوئے کہا۔ لہجہ ہوں تھا جیسے نگین کی بات پہ اسے حیرت ہوئی ہو۔

"پاگل ہوتم۔۔۔ یہ موسم تمہارے لئے عام سہی لیکن میرے لئے اب بھت خاص ہو گیا ہے۔۔۔ لیکن خیر تم نہیں سمجھو گی" نگین نے مسکرا کر کہتے ہوئے کھڑکی بند کر دی۔ شور ایک دم سے کم ہوا تھا۔

"ویسے یہ جن موسموں کی بات ہو رہی ہے نہ۔۔۔ میں بھی اچھی طرح سمجھتی ہوں" چھوٹی نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے دائیں آنکھ شرارت سے دبائی۔۔۔ نگین کو زور سے اچھولگ گیا۔۔۔ وہ قہقہہ لگا گئی۔۔۔

"کیا مطلب۔۔۔؟" اسے گھورتے ہوئے نگین نے پوچھا۔ نظروں میں خوبصورت رنگوں کی جگہ یکدم خوف جاگ اٹھا۔ "مطلب یہ کہ آپ اور عیسیٰ بھائی جو آنکھ مجھ کو لی کھیل رہے ہیں۔ اس میں، مابدولت جانتے ہیں" وہ سرخم کرتے ہوئے شاہانہ انداز میں بولی۔

"چھوٹی تم۔۔۔" نگین کی آنکھیں حیرت سے پوری کھل گئیں۔ "اور صبح جب شاہ عیسیٰ اپنی والدہ کے ساتھ آپ کا ہاتھ مانگئے آئے تھے تو میں نے بی بی کو بھی بتا دیا تھا۔ اور۔۔۔۔۔" وہ ادھر ادھر ٹہلتے ہوئے مطمئن انداز میں بتائے جارہی تھی اور نگین۔۔۔۔۔ اس کی سانس رکنے سی لگی تھی۔۔۔

"اور کیا چھوٹی۔۔۔۔۔" وہ جھٹکے سے اٹھ کر اس کے قریب آئی۔۔۔ "اور۔۔۔۔۔" بھابی نے وعدہ کیا ہے کہ وہ زر لالا کو سمجھالیں گی۔۔۔ یہ رشتہ تو اب وہ کروا کے رہیں گیں "چھوٹی نے خوشی سے تقریباً چیختے ہوئے اسے ہاتھوں سے تھاما اور کمرے میں گھوم گھوم کر چکر لگانے لگی۔

"ارے ارے رکو تو سبین پاگل ہو گئی ہو۔۔۔" نگین کا سانس پھولنے لگا تھا۔ سبین نے اسے بیڈ پہ گراتے ہوئے خود بھی اس کے قریب لیٹ گئی۔

"ہائے نگی۔۔۔ کتنا مزہ آئے گا نہ۔۔۔ تم دلہن بنو گی اور میں خوب سارے سندرے گاؤں گی" دعا کرو چھوٹی۔۔۔ لالا مان جائیں "نگین کہتے ہوئے آٹھ بیٹھیں۔ نہ جانے کیوں دل بیٹھا جا رہا تھا۔ خوشی وہ محسوس نہیں کر پا رہی تھیں۔

"توبہ۔۔۔ یہ وہم محبت۔۔۔۔۔" سبین نے آہ بھری۔ "آپ پالتی رہیں یہ خواہ مخواہ کے خوف۔۔۔ میں تو لالا سے بات کروں گی کہ میرے واپس شہر جانے سے پہلے ہی یہ سب معاملہ طے کر دیں۔ ورنہ پھر میرے امتحان۔۔۔ خواہ مخواہ کی دیر ہو گی"

"تمہیں بڑی جلدی ہے میرے جانے کی" نگین نے اسے آنکھیں دکھائیں "سمجھا کریں نہ۔۔۔ کچھ میرے لئے بھی جگہ نکلے" اس نے شرارت سے آنکھ دبائی۔۔۔

"سین کی بچی۔۔۔" اس سے پہلے کہ وہ اسے پکڑتی وہ ہنستے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی۔ نگین کے چہرے پہ مسکان چل اٹھی تھی۔

☆.....☆.....☆

رات کے پڑاؤ ڈالنے کا وقت قریب آنے لگا تھا۔ اور حمزہ ابھی تک گھر نہیں آیا تھا۔ جب سے لالہ والا واقعہ ہوا تھا وہ بکھر سا گیا تھا۔ اور شزا سے منگنی کے بعد تو اس کے اوقات کار بھی بدل گئے تھے۔ وہ جیسے ابھی سے گھر سے باہر رہنے کی روٹین بنانے لگا تھا۔ جیسے اسے شادی کے بعد ایسے ہی بڑی رہنا تھا۔

"کہیں میں نے کچھ غلط تو نہیں کر دیا۔۔۔" صحن میں ٹہلتے ہوئے انہوں نے خود سے سوال کیا تھا۔۔۔

"کچھ۔۔۔۔" اور ان سے کچھ ہی فاصلے پہ طنزیہ نظر ان پہ ڈالتا وہ ان کا ہی تو ضمیر تھا۔ وہ اسے بغور دیکھے گئیں۔۔۔ مبادا نظر بھٹکے اور وہ ضمیر کی یہ عدالت بھی کھو" دیں۔ رشتے تو وہ پہلے ہی کھو چکیں تھیں۔۔۔۔

"سب کچھ تو ختم کر دیا تم نے زریہ بیگم۔۔۔ سب کچھ۔۔۔ اور وہ بھی صرف اپنی اولاد کا" وہ کتنا تلخ بولتا تھا۔۔۔ اور کیوں نہ ہوتا انہی کا تو ضمیر تھا۔۔۔

تلخی تو ان کا ہی خاصہ تھا۔

نم آنکھوں سے وہ تلخی سے مسکرا دیں۔۔۔۔

"تینوں کیڑی شے داغور،

تیرا تن من خاک و خاک۔۔۔

ہک خلق دا بچدے سرور،

باقی سب کچھ را کھو را کھ۔۔۔

باقی سب کچھ را کھو را کھ۔۔۔۔"

اور پکے صحن کے کونے مین لگے جامن کے نیچے وہ اکیلی کھڑی رہ گئیں تھیں۔ نماز کا بھی من نہیں تھا۔ سامنے برآمدے مین بچے جائے نماز پہ نظر ڈالتیں اور پھر ہٹا لیتیں۔ انسان کو اپنے اندر کی کالک کا پتہ چل جائے نہ تو سب سے پہلے اپنے رب سے نظریں چراتا ہے۔۔۔ ان کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ انہیں آج اپنے بلند کردار سے بھی گھن آرہی تھی۔ نہ جانے کب ان کی آنکھوں سے آنسو بہنا شروع ہوئے۔ انہوں نے ان کو صاف کرنے کی بھی زحمت نہ کی تھی۔ بس روتی چلی گئیں۔ اس قدر محویت سے کہ حمزہ کب گھر آیا یہ بھی خبر نہ ہوئی۔ وہ ماں کو یوں صحن کے کونے میں کھڑے روتے دیکھا۔ تو پریشان سا ان کی طرف بڑھا۔۔۔

"امی۔۔۔ کیا ہوا ہے امی۔۔۔؟" فکر مندی سے کہتا انہیں کندھوں سے تھام کر پہلے چار پائی پہ بٹھایا۔ زریہ اور زور سے

رونے لگیں۔ حمزہ بھاگ کے ان کے لئے پانی لے آیا۔ انہوں نے حمزہ کے ہاتھ سے ہی دو گھونٹ لئے اور ہاتھ سے گلاس دور کر دیا۔

"امی۔۔۔ کیا ہوا ہے۔۔۔؟ کچھ بتائیں تو۔۔۔؟" وہ پریشان سا انہیں پکار گیا۔۔۔

"حمزہ۔۔۔۔۔" انہوں نے روتے ہوئے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔

"جی امی۔۔۔۔۔" اس کی نظریں ماں کے اجاڑ حال چہرے پہ جمیں تھیں۔۔۔

"مجھے اماں کے پاس لے چلو" ان کے لہجے میں منت تھی۔ آنسو ابھی بھی تواتر سے بہہ رہے تھے۔

"اس وقت۔۔۔؟؟" اس نے وقت دیکھا۔ دس بجنے والے تھے۔۔۔

"ہاں اسی وقت۔۔۔ جاو میری چادر لے آو۔۔۔ ابھی جانا ہے مجھے۔۔۔ ورنہ دیر ہو جائے گی" ان کے لہجے میں بچوں جیسی ضد بھی

تھی اور انتہا کی بے بسی بھی۔۔۔

"اچھا۔۔۔ آپ روئیں تو مت نہ" اس نے اٹھتے ہوئے ان کے آنسو صاف کئے۔

"میں لے آتا ہوں چادر۔۔۔" ان کو تسلی دیتا وہ کمرے کی طرف بڑھ گیا۔۔۔ زرینہ کا دل مطمئن ہونے لگا تھا۔۔۔ انہیں لگ رہا تھا

انہوں نے ابھی بھی دیر نہیں کی تھی۔۔۔ لیکن یہ تو حقیقت ہے نہ۔۔۔ وقت ہمارے حساب سے چال کب رکھتا ہے۔۔۔

☆.....☆.....☆

ستمبر کا آغاز ہوتے ہی دن مختصر ہونا شروع ہو گئے تھے۔ دن میں کچھ پیش ہوتی لیس سرشام لہرانے والی ٹھنڈی ہلکی ہوائیں تھکے

ہارے انسانوں کا من شانت کر دیتیں تھیں۔

سہراب علی خان گاؤں لوٹ چکے تھے۔ اور گاؤں کے غریب عوام سے مجلسیں جاری تھیں۔ ابھی انتخابات میں کافی وقت تھا۔ لیکن

سہراب علی خان ان لوگوں میں سے تھے جو وقت سست کئی قدم آگے چلنا چاہتے ہیں۔ اسی لئے انہوں نے اتنے ماہ قبل ہی عام لوگوں سے

رابطہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ اور صرف چند ایک بیٹھکوں میں ہی انہیں سمجھ آ گئی تھی کہ اس بار ان کے حریف جاں باز خان کا پلڑا بھاری تھا۔

پچھلے پانچ سال وہ حکومت میں رہے تھے لیکن یہ ایک حقیقت تھی کہ اپنے اختیارات انہوں نے صرف دوستیاں اور اپنی جائیداد میں اضافے

کے لئے ہی استعمال کئے تھے۔ جبکہ جانبا ز خان نے پاور نہ ہوتے ہوئے بھی اس علاقے کے غریب عوام کا کافی ساتھ دیا تھا۔ اور نوکریوں

میں نہ صرف مردوں بلکہ خواتین کو بھی اچھا خاصا حق دلویا تھا۔ تبھی اس بار سہراب خان نے نوٹ کیا تھا۔ کہ لوگوں کی توجہ حاصل کرنے میں وہ

کامیاب رہا تھا اور سہراب خان کی پسندیدگی کا گراف کافی گر گیا تھا۔

"خان۔ لوگوں کا رش نہیں ہے اس بار پہلے جیسا" کارن میٹنگ سے نکلتے ہی دوران نے ان کے لئے گاڑی کا دروازہ کھولتے

ہوئے کہا۔

"نہم۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ گئے۔ دوران مشین گن سنبھالتا اگلی سیٹ پہ بیٹھ گیا۔ اس کے بیٹھے ہی ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھادی تھی۔

"اس بار میں چاہ رہا تھا۔ چھوٹی سیٹ پہ ضیاء^۱ کو سامنے لاوں۔ لیکن اس جانباز خان کے ہوتے ہوئے مجھے یہ سب مشکل لگ رہا ہے" سہراب خان نے کہا۔ نظریں سوچ میں گم باہر اڑتی دھول پہ جمی تھیں۔

"بلکل خان۔ ابھی ابراہیم نے بتایا۔ چھوٹے خان گاؤں آچکے ہیں اور آپ سے فوراً ملنا چاہتے ہیں۔ وہ تو میٹنگ میں ہی آنا چاہتے تھے لیکن ابراہیم کو ان کا مزاج برہم لگا تو وہیں روک لیا بہانے سے" دوران انہیں تفصیل سے بتانے لگا۔

"خہ۔۔ خیر بہ سی (اچھا۔۔ ٹھیک ہو جائے گا سب)" انہوں نے مختصر جواب دیا اور سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کے آنکھیں بند کر لیں۔ گاڑی لال حویلی کی طرف رواں تھی۔۔۔

☆.....☆.....☆

خزاں دا خوف تاں،

مالی نو بزدل کرنیں سکدا۔۔

چمن آباد رکھ،

باد صبا جانے،

خدا جانے۔۔۔

وہ تو سوچ بھی نہیں سکتیں تھیں۔ خواب بھی تعبیر پاتے ہیں۔۔

تتلیاں صرف دبوچے جانے کے لئے نہیں ہوتی۔ ان کے رنگ بھی نکھرتے ہیں۔۔۔

خزاں کے اجاڑ موسم میں بھی کلیاں کھل سکتی ہیں۔۔۔

فضائیں مہک سکتی ہیں۔۔۔

زریاب لالانے اس کے سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے اسے زندگی کی نوید سنائی تھی۔ اس کی طرح سین بھی بے حد خوش تھی۔ گئی گئی

پکارتی ساری حویلی میں اس نے شور مچا رکھا تھا۔

زریاب دونوں بہنوں کی خوشی کی دعا مانگتے اپنے اس کمرے میں آگئے جہاں وہ اکثر غم یا خوشی کے لمحے اکیلے بتایا کرتے تھے۔

اس کمرے سے انہیں خاص انسیت تھی۔ یہ ان کے لئے آن کے باء^۱ جی کا تحفہ تھا۔ وہ جانتے تھے کہ زریاب کو مطالعے کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ تبھی انہوں نے حویلی کے بلکل آخری سرے پہ باہر کے کچھ علاقے کو کمرے کی شکل دے کر اس کے لئے خوبصورت ترین سٹڈی

بنوادی تھی۔ ملک ملک سے اہم کتب منگوا کے یہاں رکھوائیں جن میں بعد میں زریاب کے شوق نے خود بھی کافی اضافہ کیا۔

انہیں ابھی وہاں آئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی جب انہوں نے سہراب علی خان کو غصے میں اندر آتے دیکھا تھا۔

"زریاب لالا۔۔۔ یہ میں کیا سن رہا ہوں۔؟" اندر آتے ہی وہ تقریباً چلا آٹھے تھے۔

"کیا ہو گیا سہراب" زریاب فوراً آٹھ کران کے قریب آئے۔

"یہی کہ آپ نے مکی اور شاہ عیسیٰ کا رشتہ پکا کر دیا ہے" وہ اس قدر طیش میں تھے کہ ان کی سانس پھولنے لگی تھی۔

"ہاں تو اس میں اتنا تاوکھانے والی کیا بات ہے۔؟" انہیں حیرت ہوئی۔۔

"کیا؟" سہراب صدمے سے جیسے پھٹ پڑے۔

"ابھی بھی آپ مجھ سے پوچھ رہے ہیں یہ بات؟" اس کی آنکھوں میں تاسف سا تھا۔

"مجھے سچ میں سمجھ نہیں آرہی کہ تم کیا کہنا چاہ رہے ہو۔؟" وہ واپس اپنی چیمبر پہ بیٹھ گئے۔

"شاہ عیسیٰ ہماری برادری کا نہیں ہے اور آپ اچھی طرح جانتے ہو کہ ہم اپنی بیٹیوں کی خاندان سے باہر شادی نہیں کرتے" زریاب کی نادانی پہ جیسے انہیں اور طیش آ رہا تھا۔

"کیوں نہیں کرتے۔ ہمارے خاندان کے کئی مردوں نے خاندان سے باہر ہی شادی کی ہے" وہ دونوں اس وقت پشتوں میں بات کر رہے تھے۔

"صرف مردوں نے۔۔" سہراب نے زور دیتے ہوئے کہا۔ جیسے ان کی توجہ مبذول کروا رہا ہو۔

"تو۔۔ لڑکیاں کیوں نہیں کر سکتیں؟" زریاب خان کے چہرے پہ پیاری سی مسکراہٹ مچلی۔

"کیونکہ یہ ہمارا رواج نہیں ہے" سہراب ڈٹا رہا۔

"چاہے وہ ساری عمر اپنے ارمانون کی لاش لئے ہماری ہر خوشی کو حسرت سے دیکھتی رہیں"

"ہر لڑکی اپنا نصیب لکھوا کے لاتی ہے لالا۔۔۔ ان کے لئے ہم اب رواج تو نہیں توڑ سکتے" سہراب کے لہجے میں ضد تھی۔

زریاب آٹھ کھڑے ہوئے۔

"میں اپنی بہنوں کے لئے کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ رواج تو بہت معمولی چیز ہے۔" انہوں نے نرم لہجے میں کہتے ہوئے ان کا

کاندھا تھپکا۔

"پھر یہ بھی تو دیکھو۔ خاندان میں ایک بھی رشتہ نہیں ہے۔ ایسے میں شاہ عیسیٰ جیسے شریف لڑکے کو ٹھکانیکی غلطی میں نہیں کر سکتا۔

پھر جنت نے مجھے بتایا ہے خود نگین بھی اس رشتے سے بہت خوش ہے" ان کی بات پہ سہراب کی آنکھیں ضبط کے مارے سرخ ہونے لگیں۔

"خیر تم جاؤ۔ انتظامات دیکھو۔ اسی جمعرات بارات ہے۔ اللہ پاک سب خیر کرے گا۔" انہوں نے انہیں تسلی دی اور کمرے سے باہر نکل گئے۔ سہراب نے ایک زبردست ٹھوکر میز کر رسید کی اور خود بھی باہر کی طرف بڑھ گئے۔۔ سانس البتہ ابھی بھی عجب سی پھنکار رہی تھی۔۔۔

☆.....☆.....☆

وہ ڈیرے پہ پہنچے تو سہابنجانا کے درخت کی ٹھنڈی چھاؤں تلے پاؤں چار پائی سے نیچے لٹکائے، تکتے سے ٹیک لگائے، ہلکی نیند میں گم ان کا منتظر تھا۔

"کیا بات ہے جان باء۔۔۔ انہوں نے قریب جاتے ہی پیار سے ضیاء^۱ کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے پکارا تھا۔ وہ فوراً آٹھ بیٹھا تھا۔

"ایسی بھی کیا اہم بات تھی کہ اتنی تھکن کے باوجود یہاں اتنی گرمی میں میرا انتظار ہو رہا ہے۔ اندراپنے کمرے میں سو جاتے۔ میں نے حویلی ہی آنا تھا۔

"آپ اور دوران لالہ کے گھر گئے تھے باء جی۔" اس نے جیسے ان کی کوئی بات سنی تک نہ تھی۔ سوال اس قدر اچانک تھا کہ دوران خان کے ساتھ ساتھ خود خان بھی ششدر رہ گئے تھے۔

"نہیں تو۔۔۔ تمہیں کانے بتایا؟" انہیں سنہلنے میں کچھ وقت لگا تھا اور اس سارے وقت میں ضیاء کی اداس سی خوبصورت آنکھیں مسلسل انہیں دیکھتی رہیں تھیں۔

"مجھے افسوس ہے باء جی۔" وہ آٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے کندھے پہ رکھا خان کا ہاتھ نیچے گر گیا تھا۔

"آپ مجھے بھی دھوکہ دیں گے یہ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔" اس کی آواز میں واقعی دکھ تھا۔ سہراب خان آٹھ کھڑے ہوئے۔

"کون سا دھوکہ بچیا۔۔۔؟؟ قسم پہ خدا یا۔۔۔ ماتہ سہ خبر اشنہ تہ سہوائے۔۔۔ (اللہ کی قسم مجھے کچھ خبر نہیں۔۔۔ تم کیا کہہ رہے ہو؟" وہ صاف مکر گئے۔ ضیاء نے ایک دکھ بھری نگاہ ان پہ ڈالی۔

"آپ اور دوران نے کچھ تو ضرور کیا ہے باء جی اور یہ سب بھی میں بہت جلد پتہ لگا لوں گا۔" اس کی آواز میں تلخی تھی۔

"تم اس دو ٹکے کی لڑکی کے لئے اب مجھ سے، سہراب علی خان سے پوچھ گچھ کرو گے؟" انہیں غصہ آنے لگا۔

"ہاں۔" وہ تیزی سے کہتا پورے قد سے ان کے سامنے کھڑا ہوا۔

"اس کے لئے اب بہت کچھ کروں گا۔ اور اگر آپ کو یہ۔۔۔" اس نے دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی اپنے سینے پہ رکھی۔

"یہ ضیاء^۱ علی خان ذرا سا بھی پیارا ہے نہ تو آج کے بعد آپ یا آپ کا کوء بھی آدمی مجھے اس لڑکی کے اس پاس نہ دکھائی

دے۔۔۔ ورنہ۔۔۔"

اس کے لہجے پہ سہراب علی خان کا طیش بڑھنے لگا تھا۔

"ورنہ۔۔۔۔۔" انہوں نے لب کچلتے ہوئے پوچھا۔۔

"ورنہ میں اپنی جان لے لوں گا۔۔۔" سخت لہجے میں کہہ کر وہ رکنا نہیں تھا۔ لمبے لمبے ڈگ بھرتا حویلی کے اندرونی حصے کی طرف بڑھ گیا۔ سہراب علی خان کو اپنی جان نکلتی محسوس ہوئی تھی۔ وہ گرنے کے سے انداز پہ وہیں چار پائی پہ بیٹھ گئے۔

☆.....☆.....☆

آج خلاف معمول گھر کا دروازہ کھلا تھا۔ جبکہ رات کے دس بج رہے تھے۔ زرینہ کے پیچھے پیچھے حمزہ بانیک لئے اندر آیا تو نہ جانے کیوں کسی انہونی کے خدشے نے دل دھڑکا سا دیا۔ اس نے بانیک گیٹ کے قریب ہی کھڑی کر دی۔ باہر صحن مین کوئی نہیں تھا۔ میٹھک سے البتہ لوگوں کی آواز آرہی تھی۔ زرینہ اسے وہیں چھوڑ کے اندر اماں کے کمرے کی طرف بڑھیں تو نہ جانے کیوں وہ بھی بیٹھک میں جانے کی بجائے ماں کے پیچھے ہی آ گیا۔ اور پھر اسے دروازے پہ ہی رک جانا پڑا تھا۔ زرینہ بھی اس سے چند قدم آگے ساکت سی کھڑی تھیں۔ سرخ عروسی لباس میں چمکتا، معصوم سا روپ کئے وہ ہر وقت خفا خفا سی لالہ تو ہرگز نہ تھی۔ وہ تو پرستان کی اداس پری جیسی لگ رہی تھی۔

جسے کسی ظالم دیونے وقت کے سخت پنجرے میں قید کر لیا تھا۔ اور وہ۔۔۔۔۔

وہ چاہ کر بھی اس کے لئے کچھ نہ کر پایا۔

نہ اس کے زخموں پہ مرہم رکھ سکا۔

نہ اسے اس پنجرے سے رہائی دلا سکا۔

وہ تو یہ سب کرنا چاہتا تھا۔۔۔۔۔

پھر بھی خالی ہاتھ رہا تو وہ۔۔۔

اس کی آنکھیں جلنے لگیں۔

وہ روپ اس کی آنکھیں چدھیا نے لگا تھا۔ لیکن پھر بھی اس نے نظریں نہیں ہٹائیں تھیں۔ وہ اسے دیکھتا رہا تھا۔ باوجود اس کے کہ وہ اسے بچا نہیں سکتا تھا۔۔۔

لیکن۔۔۔۔۔

لیکن وہ کون تھا جس نے اسے اس قید سے رہائی دلانے کا فیصلہ لیا تھا۔

شاید کوئی رٹڈ وا۔۔۔

یا پھر ادھیڑ عمر کنوارہ۔۔۔

اس کے اندر تاسف بھرنے لگا۔

"ارے زرینہ بی بی۔۔ آئیں آئیں" سبین کی نظر پڑی تو فوراً آگے بڑھیں۔

"حمزہ مرد بیٹھک میں ہیں تم بھی بیٹاؤ ہاں چلے جاؤ میں چائے بھجواتی ہوں" انہوں نے حمزہ کو بھی کہا۔۔

اور طلسم ٹوٹ گیا۔۔۔

اس سے لالہ کو مزید دیکھنے کی اجازت چھین لی گئی۔۔۔۔

یا شاید اس کی بینائی۔۔۔۔۔

ہمیشہ کے لئے۔۔۔۔۔

کیا اب کبھی وہ کسی کو یوں محبت سے دیکھ پائے گا۔

شاید نہیں۔۔۔۔

کہ یہ تو کسی کسی کے نصیب میں ہوتا ہے۔ اس کے نصیب میں نہیں تھا۔ وہ سمجھدار تھا تبھی خاموشی سے پلٹ گیا تھا۔

زرینہ مبہوت سی آگے بڑھیں تھیں۔ لہن بنی لالہ کی خوبصورتی میں اداسی نور بن کے گھلی تھی۔ اور وہ نور کا یہ ہالہ جیسے انہیں اپنے

حصار میں لینے لگا تھا۔ دل کسی بڑے خسارے کی خبر دینے لگا تھا۔ نہ جانے کیوں انہیں لگا تھا۔ وقت ان کے ہاتھ سے ریت کی طرح پھسل

گیا تھا۔ وہ مرے مرے قدموں سے آگے بڑھیں۔ سبین چمکتا چہرہ لئے آن کے ساتھ تھیں۔ اماں کے چہرے پہ ابھی بھی ناراضگی تھی۔

انہوں نے نظریں ملتے ہی نظریں پھیر لیں تھیں۔

"یہ سب کیا ہے اماں۔؟" انہوں نے بمشکل پوچھا۔ لہجہ ایسے تھا جیسے وہ جواب جانتی ہوں۔

"تجھے نظر نہیں آ رہا۔ اللہ نے عزت رکھ لی ہماری" اماں کے لہجے میں پہلے نخوت اور پھر بات کے آخری حصے پہ تشکر گہرا۔

"یہ کیا اماں۔۔ اتنی بڑی بات ہوگئی اور آپ سب نے مجھے بتایا تک نہیں" زرینہ کا لہجہ کمزور تھا شکوہ کرتے وقت۔ نہ جانے کیوں

وہ مان نہیں تھا جو ماں بیٹی کے رشتے کی شان ہوتا ہے۔

"کیوں زرینہ۔۔ ماں ہوں تیری۔ بھول تو نہیں جاؤں گی کس طرح تو نے چھٹکارا تھا اس گند کو" اماں کے لہجے میں درد تھا۔ کرب تھا۔

"نہ اماں۔۔۔ بیٹیوں کی باتیں مائیں کہاں یاد رکھتی ہیں۔ مائیں تو انہیں معاف کر دیتی ہیں نہ اماں۔۔۔" زرینہ تڑپ کے ماں

کے پاؤں میں آگری تھی۔

"سیدھے سیدھے بتا زینہ۔ پھر کیا تماشا کرنے آئی ہے؟ اس رضیہ نے ہی خبر دے دی ہوگی تجھے۔" اماں تو جیسے ان پر سے اعتماد ہی ہار بیٹھیں تھیں۔ ان کے لہجے میں کا قدر اجنبیت تھی۔ زینہ کا دل کٹنے لگا۔

"نہ اماں۔۔۔ اللہ کی قسم لے لو۔۔۔" زینہ تڑپ کے ان کے قریب ہوئیں۔ آنکھوں سے ایک بار پھر آنسو بہنا شروع ہو گئے۔ اماں تو ششدر رہ گئیں۔ زینہ تو دوسروں کو خون کے آنسو رلانے والوں میں سے تھیں۔ انہیں تو ہمیشہ دوسروں کو دکھ دے کر خوشی ملتی تھی۔ بے حس اتنی تھیں کہ کسی کا غم ان کا دل نہ پیچ پاتا تھا۔ اور کہاں یہ روانی لئے مسلسل بہتے آنسو۔۔

"میں یہاں تماشا کرنے نہیں آئی اماں۔۔۔ قسم لے لو۔۔۔ میں تو خود تماشا بن گئی ہوں" کب سے بت بنی لالہ کی پلکوں نے پہلی بار جنبش کی تھی۔ پھپھو کو یوں سسکتا دیکھ کے وہ بھی حیران رہ گئی تھی۔

"نہ تو ٹھیک تو ہے نہ زینہ۔۔۔؟" اماں نے ہاتھ سے ان کا چہرہ اٹھاتے ہوئے پوچھا۔۔

"کہاں اماں۔۔۔ مجھے تو لگتا ہے اپنی خواہ مخواہ کی ضد میں، میں نے سب کچھ بگاڑ دیا اماں۔ اپنے اقراء^۱ اور حمزہ کی زندگی کی زندگی میں، میں نے خود مٹھی بھر بھر کا نئے بچھا دئے اماں۔۔۔" وہ سسکتی جا رہی تھیں۔ اماں ماں تھیں۔ ادھیڑ عمر بیٹی کو یوں روتا دیکھ کر ان کا دل بھی نرم پڑ گیا۔

"آدھر میرے پاس بیٹھ" انہوں نے اسے اپنے قریب اوپر بٹھالیا۔

"جا پانی لے کے آس کے لئے" پھر غم آنکھیں لئے قریب کھڑی سبین سے کہا وہ فوراً پانی لینے چلی گئیں۔

پانی پلانے کے بعد اماں نے کچھ دیر انہیں پرسکون ہونے دیا۔ پھر نرمی سے کہا۔۔

"اب بتا کیا ہوا ہے۔۔ اس وقت کیسے ماں کی یاد آگئی" ان کے سر پہ ہاتھ رکھے وہ بالکل وہی پرانی اماں لگ رہیں تھیں جیسی ان کے بچپن میں تھیں۔ ان کا دل پھر سے بھرانے لگا۔

"اماں۔۔ حمزہ خوش نہیں ہے۔ میرا بیٹا ویران ہو رہا ہے۔ میں آج یہاں حمزہ کے لئے لالہ کا ہاتھ مانگنے آئی ہوں" انہوں نے جیسے دھماکہ کیا، سب نے ہی چونک کے انہیں دیکھا۔

"لیکن حمزہ کی تو تمنگی ہو چکی ہے نہ شزا کے ساتھ" اماں نے حیرت بھرے لہجے میں انہیں یاد دلایا۔

"ہاں تو تمنگی ہوئی ہے نہ اماں نکاح تو نہیں ہوا کہ بھت دیر ہو گئی ہو" انہوں نے دلیل دی

"لیکن زینہ۔۔۔۔۔" اماں گم سمی ہو گئیں۔۔

"لیکن کیا اماں۔۔ گھر کا بچہ ہے حمزہ۔۔ باہر والے کو چلتا کریں آپ بھی۔ ابھی تو اتنی دیر نہیں ہوئی" وہ واپس اپنی عادت پہ آچکیں تھیں۔ یہی تو مسء اللہ تھا ان کے ساتھ۔ انہیں سب کچھ اپنی دسترس میں لگتا تھا۔

"بھت دیر ہو چکی ہے زرینہ" اماں نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔

"لالہ کا تو نکاح ہو چکا ہے" زرینہ کا تو منہ کھل گیا۔

"یہ کیا کہہ رہی ہیں اماں۔" بمشکل بول پائیں

"سچ کہہ رہی ہوں۔ ایسے موقعے پہ مذاق کروں گی تم سے" اماں کو غصہ آ گیا۔

"لیکن۔۔۔۔۔ ایسے اچانک۔۔۔ اتنی جلدی۔۔۔ میں تو سمجھی کوئی چھوٹا موٹا فنکشن ہے بس" وہ ابھی بھی شکد تھیں۔۔۔

"تجھ سے کون سی بات چھپی ہے اس گھر کی زرینہ۔۔۔ جس طرح کے حالات تھے ایسے اچانک اتنی جلدی یہ سب ہو گیا۔ یہ بھی

میرے رب کا کرم ہے۔ ورنہ سچ کہوں تو میں تو مایوس ہو گئی تھی اپنی لالہ کے مقدر سے۔" اماں کی آنکھوں کے ساتھ ان کا لہجہ بھی بھینگنے لگا تھا۔

"یہ تو اللہ پاک نے سنبھال لیا۔ وہ بڑا کریم ہے بے شک" انہوں نے ساتھ بیٹھی لالہ کے سر پہ بوسہ دیا اور دوپٹے سے یوں آنسو

رگڑ ڈالے جیسے اس وقت ان کی آمد انہیں سخت ناگوار گزری ہو۔

"امی۔۔۔ لالہ کو لے آئیں۔۔۔" تبھی شادیز نے دروازے پہ آ کے آواز دی تھی۔

"باریال کو دیر ہو رہی ہے" اس کی آواز سنتے ہی دادو بھی تیزی سے نیچے اتریں۔ سین اور زرینہ نے آٹھ کر لالہ کو سہارا دیا۔

"لالہ۔۔۔" زرینہ ہاتھ جوڑے اس کے سامنے آ گئی۔ لالہ کی پتھر نظریں موم ہونے لگیں تھیں۔

"مجھے معاف کر دو لالہ۔۔۔ میں اپنے مرحوم بھائی کی لاج نہ رکھ سکی" ہاتھ باندھے منت کرتی وہ پھوٹ پھوٹ کے رو دیں

تھیں۔

"میں تو خود سزا جزا کی زد میں ہوں پھچھو۔ آپ کو کیا معاف کروں گی۔ میرے لئے دعا کیجئے گا۔ یہ زندگی کی یہ تلوار کی دھار جیسی

پل صراط زیادہ طویل نہ ہو" اس نے آنسو پیتے ہوئے اجنبی لہجے میں کہا تھا اور ماں کے ساتھ آگے بڑھ گئی تھی۔

"اللہ تجھے شاد و آباد رکھے۔ تو کوئی دکھ نہ دیکھے لالہ" زرینہ نے اس پیچھے چلتے ہوئے اسے دل سے دعا دی تھی۔ باہر باریال اور

شادیز ان کے منتظر تھے۔ البتہ حمزہ کہیں نہیں تھا۔۔۔ اسے وہاں نہ دیکھ کر

زرینہ نے شکر ادا کیا تھا۔ کسی تکلیف سے تو بچ گیا تھا اس کا بیٹا۔۔۔۔۔

☆.....☆.....☆

سب کچھ جیسے لمحوں میں طے ہوا تھا۔ لالہ حویلی پہلی بار کسی بیٹی کی شادی کے لئے دلہن بنی تھی۔ لوگ خوش تھے۔ برادری کے نام

پہ ماں باپ کی چوکھٹ پہ ارمانوں کی قبر پہ ماتم کرتی زندہ لاشیں پھر سے امید باندھنے لگیں۔ زریاب ولی خان اس علاقے کا وہ نیک دل

بادشاہ تھا۔ جس کی تقلید کرنا لوگ پسند کرتے تھے۔ اس نے آج پھر ایک اچھی مثال قائم کی تھی۔

لال حویلی کو دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ اور اس رات حویلی کے دروازے گاؤں کے ہر امیر غریب کے لئے کھول دئے گئے تھے۔ آفتاب ولی خان کے بعد پہلی مرتبہ لال حویلی میں خوشیوں کی روشنی بکھی تھی۔ شادیانے بجا اٹھے تھے۔ زریاب نے ایک ایک کام اپنی زیر نگرانی کروایا تھا۔

سبز جھلملاتا گھاگرا پہنے سنہاروپ لئے ادھر ادھر ناچتی پھر رہی تھی۔ آج بارات تھی۔ ننگین کو گاؤں کی لڑکیاں تیار کرنے میں مصروف تھیں۔ وہ اس وقت اپنے کمرے میں تھی۔ سین اوپر آئی تو وہ دلہن بنی غضب ڈھا رہی تھی۔

"اللہ اللہ۔" سین لپک کے ان سے چٹ گئی۔
 "سین۔۔۔" اس کا زرتار دوپٹہ الجھا تو وہ کراہے رہ گئی۔
 "اچھا سوری۔۔۔ سوری۔۔۔" وہ فوراً کان پکڑ گئی۔
 "ویسے۔۔۔ گئی آج تو آپ قیامت ڈھا رہی ہیں" وہ ان کو کمر سے تھام کر قہر اور آئینے کے سامنے کرتے ہوئے بولی۔ دونوں بہنوں کا خوبصورت عکس آئینے میں مسکرانے لگا تھا۔

"سچ۔۔۔ عیسیٰ بھائی تو موقع پر ہی اللہ کو پیارے۔۔۔۔۔"
 "اللہ نہ کرے" ننگین نے فوراً اس کے منہ پہ ہاتھ رکھتے ہوئے اسے بات مکمل کرنے سے روکا تھا۔
 "سوچ سمجھ کے بولا کرو سین" اس کا دل بے اختیار دھڑک اٹھا تھا۔ سانسیں جیسے ساتھ چھوڑنے لگیں تھیں۔ عیسیٰ ان کے لئے کیا تھا انہیں آج اندازہ ہو رہا تھا۔ وہ تو انہیں پاگل کہتی تھیں اور آج شاہ عیسیٰ کے لئے ایسی حالت۔۔۔
 "اللہ لگی۔۔۔ میں تو سمجھتی تھی صرف عیسیٰ بھائی آپ کے لئے پاگل ہیں۔ آپ تو ان سے بھی زیادہ۔۔۔" سین کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔
 ننگین کا چہرہ مارے حیا^۱ سے سرخ ہو گیا۔

"شکایت کروں گی زریاب لالا سے تمھاری۔۔۔ بھت بد معاش ہوتی جا رہی ہو" ننگین نے محبت سے اس کا گال کھینچا تھا۔
 "عیسیٰ بھائی کی محبت میں آپ کو میں یاد رہوں گی تب نہ۔۔۔" وہ کھلکھلائی تھی۔۔۔ ننگین کی مسکراہٹ گہری ہوئی تھی۔ آنے والے سنہارے دنوں کی کرنیں اس کی آنکھوں میں جھلملانے لگیں تھیں۔۔۔

☆.....☆.....☆

رات کے گیارہ بجنے والے جب وہ باریال کے گھر پہنچے تھے۔ لالہ پچھلی سیٹ پہ سٹی بیٹھی تھی۔ اوپر لی گئی سادہ کالی چادر میں اس کا معصوم ساروپ مزید نکھر سا گیا تھا۔

باریال نے گاڑی گھر کے قریب روکی اور اتر کر اس کی سائیڈ پہ آیا۔ لالہ سنبھل کے بیٹھی تھی۔ اس نے جیسے ہی دروازہ کھولا وہ تیزی سے خود ہی اترنے لگی۔ جب باریال اس طرح گاڑی کے قریب آ گیا کہ اب اس کے لئے باہر نکلنا محال تھا۔ وہ جتنی تیزی سے آگے ہوئی تھی اتنی تیزی سے پیچھے چلی گئی تھی۔

"لالہ۔۔۔" باریال نے دھیرے سے پکارا۔ لالہ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہم جیسے ہی گھر میں داخل ہوں گے سب سے پہلے لاؤنچ آتا ہے۔ لاؤنچ کے ترچھے سرے پہ بنا کرہ میرا ہے۔ ہم جیسے ہی اندر جائیں گے تم تیزی سے اس کمرے میں چلی جانا" اس کی ہدایت پہ لالہ کی آنکھیں جلنے لگیں تھیں۔ کئی معاملوں میں مرد بھی کافی کمزور ہوتے ہیں خاص کر عزت کے معاملے میں۔۔۔ وہ خود پہ مضبوط کرتے ہوئے اثبات میں سر ہلا گئی۔ باریال نے اس کی اتنی بڑی مدد کی تھی۔ اس کے لئے یہ تو کچھ نہیں تھا۔ کہ وہ اپنا وجود چھپا لیتی۔

"کچھ غلط مت سوچنا۔ اصل میں ہو سکتا ہے ابھی امی تمہیں نہ دیکھیں۔۔۔ تو فی الحال میں اس بات کو گول کر جاؤں گا۔ کل پھر آرام سے تمہیں ان سے ملوا دوں گا۔ تم ان سے مل کر بھت خوش ہوگی اور وہ تم سے مل کر۔۔۔" اس کی اگلی بات پہ سر جھکاتی لالہ نے حیرت سے چونک کے سر اٹھایا تھا۔ وہ اسے کس غرور سے اپنا رہا تھا۔ جب اس کے اپنوں نے اس کی ذات کو گند سمجھ لیا تھا۔

"آجاؤ۔۔۔" اس نے کالے روئیں سے بھرا مضبوط ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔

"میں اس ہاتھ کو تھامنے کے قابل نہیں ہوں ولی۔" اس نے سرگوشی کی۔ جو اس کے لبوں پہ ہی دم توڑ گئی۔

"لالہ۔۔۔ کم آن" باریال نے ہاتھ مزید آگے بڑھایا تھا۔ اس بار لالہ نے آہستگی سے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ باریال اس کا ہاتھ تھامے اسے اپنے ساتھ اندر لایا تھا۔ اور لاؤنچ میں آتے ہی اس کی ہدایت کے مطابق وہ اس کے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی۔ باریال دیدے کے کمرے میں آ گیا تھا۔ بیڈ پہ بیٹھیں تسبیح کرتیں وہ اس کی ہی منتظر تھیں۔۔۔

"السلام علیکم دیدے" ان کے سامنے بیڈ پہ لیٹا وہ مسکرایا تھا۔

"وعلیکم السلام۔۔۔ جیتے رہو۔ شادر ہو"

"سو۔۔۔ کیسا رہا دن۔۔۔؟؟" وہ تکیہ سینے کے نیچے رکھتا الٹا لیٹ گیا۔ دیدے کی نظریں اس کے چہرے پہ جمیں تھیں اور آج اسے ان میں ایک عجیب سی چمک محسوس ہو رہی تھی۔۔۔

"دن تو بھت فضول گزرا۔۔۔ بور" انہوں نے منہ بنایا۔۔۔

"او۔۔۔۔۔ ریلی۔۔۔" وہ مسکرایا۔

"ہاں جی۔ لیکن رات اب بھت خوش اور پر جوش گزرے گی" ان کی بات پہ وہ حیران ہوا۔

"اچھا۔۔۔ وہ کیوں۔۔۔؟" باریال حیران ہوتا آٹھ کر بیٹھ گیا۔۔۔
 "ایک سر پرانز تھے تمہارے لئے۔ ابھی تم جا کر آرام کرو صبح بتاؤں گی"
 "اتنا ویٹ"

"میں نے بھی تو ویٹ کیا نہ آج تمہارا اتنا۔۔۔" دیدے نے فوراً شکوہ کیا۔۔۔
 "اچھا۔۔۔ بدلہ۔۔۔" اس نے آنکھ دبائی۔
 "یونہی سمجھ لو" انہوں نے بھی شرارت سے آنکھ ماری۔ باریال ہنس دیا۔۔۔
 "چلیں پھر ملتے ہیں صبح۔"

"انشاء اللہ" انہوں نے آگے ہو کے اس کی چوڑی پیشانی پہ لب دھر دئے۔ باریال پرسکون سا ہوتا باہر نکل گیا۔ دیدے کے لبوں پہ بھت پیاری مسکان مچل رہی تھی۔۔۔

☆.....☆.....☆

وہ کمرے میں آیا تو لالہ پاؤں لٹکائے جہازی ساز بیڈ کے کنارے پہنکی تھی۔ باریال نے کرسی کی پشت اس کی طرف کرتے ہوئے رکھی اور خود کرسی کی پشت پہ دونوں ہاتھ جماتا اس کے سامنے بیٹھ گیا۔۔۔
 "تمہیں کیا لگا میرا روم۔۔۔؟" اس کی نظریں لالہ پہ جمیں تھیں۔ وہ اس کے نکاح میں تھی۔ اس کے پاس حق تھا۔ اور وہ اس روپ کو دل پہ منعکس ہوتا پارہا تھا۔

"اچھا۔۔۔ میرے روم سے تو بھت اچھا ہے؟" اس نے سادگی سے موازنہ کیا۔ باریال ہنس دیا۔
 "ویسے تم حیران تو ہو رہی ہو گی نہ کہ اس روم میں یہ جہازی ساز بیڈ۔۔۔ وہ بھی صرف میرے لئے؟" اس کی بات پہ وہ بس نفی میں سر ہلا گئی۔ جیسے یہ عام سی بات ہو۔
 "سنو گی تو ہنس دو گی"

"کیوں،۔۔۔؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"کیونکہ یونیورسٹی تک میں یہاں دیدے کے ساتھ ہی سوتا تھا۔ اکیلے مجھے ڈر لگتا تھا" اس کی بات پہ لالہ کوہنسی آ گئی۔
 نور سحر کے نکھرتے ہی ہر سو پرندوں کی مقدس چہکار جیسی ہنسی۔۔۔
 بے حد دھیمی لیکن دل کے تار چھیڑتی۔۔۔

باریال نے حیرت سے اسے ہنستے ہوئے دیکھا تھا۔ ہنستے ہنستے اس کی آنکھیں نم ہونے لگیں تھیں۔

"پھر میرا سامان بڑھنے لگا بیڈ پر، مطلب بکس، لیپ ٹاپ، پین وغیرہ اور لائٹ جلی رہنے لگی تو دیدے نے اور ساتھ نبھانے سے معذرت کر لی "وہ مزے سے بتا رہا تھا۔ اور وہ ہنسیجا رہی تھی۔۔۔
تبھی ہنستے ہنستے اس کے قہقہے بھگینے سے لگے تھے۔

چہرہ ایک دم سے تنگیا تھا۔۔۔ اور باریال نے دیکھا وہ واقعی رونے لگی تھی۔ سسک اٹھی تھی۔ باریال ٹھنڈی سانس بھرتا اٹھکراس کے پاس آ بیٹھا تھا۔

"لالہ۔۔۔ میں نہیں جانتا۔۔۔ میں نے یہ سب کیوں کیا؟ میں بھی ایک عام مرد ہوں۔ اپنے لئے سب سے انمول چیز چاہتا ہوں۔ جس کی سوچ تک میں کسی اور کا گزرنہ ہوا ہو۔۔۔ لیکن پھر بھی میں نے فیصلہ لیا۔

اس دن شادویز کے سامنے تمھاری ایک بے بس جھلک نے مجھ سے سارے اختیار چھین لئے۔ میرے لئے فی الحال سب سے اہم تمھاری عزت ٹھہری۔۔۔ باقی زندگی کا مجھے نہیں پتہ لیکن۔۔۔" وہ نرم لہجے میں بات کرتا خاموش ہوا۔ لالہ نے لال ہوتی آنکھوں سے اسے دیکھا۔

"لیکن ہمارا یہ رشتہ کس قدر پختہ ہے یہ میں بھی نہیں جانتا۔ نہ قانونی طور پر مجھے اس معاملے کی معلومات ہیں۔ نہ ہی میں اپنے ظرف کی گارنٹی دیتا ہوں۔ میں نہیں جانتا ایسی حالت میں ہمارا رشتہ جائز ہے کہ نہیں۔ شادویز کی طرف سے اگر میں مطمئن ہوتا تو ضرور کچھ معلومات کرتا پہلے۔ لیکن وہ تو۔۔۔" لالہ لب کھلنے لگی۔ خونی رشتوں سے جڑی اس کی تکلیف اس سے ڈھکی چھپی تو نہیں تھی تبھی وہ خاموش ہو گیا تھا اسے لب کھلتا دیکھ کے۔۔۔

"تبھی مجھے فوراً فیصلہ لینا پڑا۔ لیکن میں تم سے وعدہ کرتا ہوں لالہ۔ جب تک ہمارا ریلیشن ہماری اور قانون کی نظر میں کلئیر نہیں ہو جاتا۔ ہم بس اچھے دوست رہیں گے۔ میں تم سے کوئی لمبے چوڑے وعدے نہیں کروں گا۔ ہاں مگر اتنا ضرور کہوں گا۔ جب تک تم میرے ساتھ ہو۔ دیدے کے بعد میرے لئے سب سے اہم ہو "اس کے لہجے میں کتنا مان تھا۔ جو وہ اسے دان کر رہا تھا۔

یہ کیسا مرد تھا۔۔۔

حمزہ،،،

شادویز۔۔۔۔

زرینہ کچھ پھو۔۔۔۔

وہ سب کیا تھے اور اس کے سامنے کیا بن کر آئے تھے۔ ساری عمران کے ساتھ گزار کر بھی وہ اس کے لئے اپنا ظرف بڑا نہ کر پائے تھے۔ تو وہ کون تھا۔۔۔

کوئی فرشتہ۔۔۔۔

ضیاء۔۔۔ جس سے ہمیشہ اسے خوف آتا تھا۔۔۔

پھر اس نے کش قدر خوبصورتی سے اپنا اعتبار سونپا تھا۔

اور اس دن مشکل کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کی زندگی تباہ کر دی تھی۔

صرف باپ کے نام نہاد بدلے اور ضد کے لئے۔۔

شیطان کا اگر زندہ روپ کوئی دیکھنا چاہے تو بے شک وہ سہراب اور ضیاء^۱ کا ہاتھ کھینچ کر سب کے سامنے لادیتی۔۔

اور یہ باریال ولی خان۔۔۔

جسے اس نے کچھ دیر پہلے پورے ہوش و ہواس اسے اپنے سارے حقوق سونپ دئے تھے۔ وہ اسے رشتوں کی باریکیاں اور

عزت بتا رہا تھا۔ وہ پورے حق کے ساتھ کتنی دیر سے اس کے ساتھ تھی اور اس نے ابھی تک اسے چھونے کی کوشش تک نہ کی تھی۔ اسے نام دیا

تھا۔ اور حلال بندھن میں بندھے ہونے کے باوجود اسے ابھی بھی خدا کی نافرمانی کا ڈر تھا۔

"جس طرح کے حالات میں ہماری شادی ہوئی، تم بھی یہ سب باریکیاں اچھی طرح سمجھ سکتی ہو۔ میں چاہتا ہوں اس رشتے کے

لئے تم مجھے کچھ وقت دو

لیکن ہاں ایک دوست کی طرح تم مجھے ہمیشہ اپنے ساتھ پاؤ گی۔" اس نے مضبوط لہجے میں درخواست بھی کی تھی اور یقین بھی

اسے سونپا تھا۔

"آپ نے جو کچھ مجھے سونپا ہے ولی۔ آپ کو خود اندازہ نہیں۔۔۔ یہ سب میں اچھی طرح سمجھ سکتی ہوں۔ آپ نے میری عزت

رکھی۔ اس سے بڑھ کر مجھے اور کچھ نہیں چاہئے" وہ سر جھکا کر بولی تھی۔ اس کے مطمئن انداز پہ وہ بھی پرسکون ہو گیا تھا۔ اور کچھ ہی دیر بعد

اسے پرسکون نیند میں ڈوبا دیکھ کر وہ کتنے ہی وقت تک اس سے کافی فاصلے پہ لیٹے اسے تکتی رہی تھی۔ زندگی کچھ تو آسان ہوئی تھی۔ نہ جانے

کتنے دنوں بعد سکون سے وہ نیند کی وادیوں میں اترتی تھی۔۔

☆.....☆.....☆

بارات آگئی تھی۔ سین سمیٹ سب لڑکیاں تھقبے لگاتی ہوئے باہر نکل گئیں تھیں۔۔ وہ اکیلے ہوتے ہی باہر نکل آئی۔ لال حویلی

سے رخصت ہونے کا وقت قریب آ گیا تھا۔ وہ بھاری لہنگا سنبھالتی باہر آگئی۔ اس کے کمرے سے دائیں طرف سیڑھیاں تھیں۔ وہ

سیڑھیاں چڑھتی چھت پہ آگئی۔ یہ چھوٹا سا چوکور صحن تھا۔ باقی پوری حویلی کی چھت سے الگ اور ذرا سا اونچا۔۔ اس کی چار دیواری بھء

نسبتاً چھوٹی تھی۔۔ وہ اس طرف آگئی جہاں سے حویلی کے پچھلے صحن کا منظر نمایاں تھا۔ بارات اندر آرہی تھی۔ یہ مردانہ حصہ تھا۔ گھوڑے پہ

سہرا ڈالے دولہا اور پیچھے باراتی۔۔ مسکراہٹ اس کے لب چھونے لگی تھی۔ وہ پلٹ کے اس طرف آگئی جہاں گھر والا حصہ تھا۔ یہ حصہ آج ویران تھا۔ وسیع لان اور وہ ان کی حویلی کا سفید جھولا۔ جس کے بارے میں مشہور تھا کہ شام کے بعد وہاں سفید کپڑوں والی روحیں جھولا لیتی تھیں۔ اور جوڑ کی بھی اس پہ بیٹھتی، وہ بھء پھر سفید لباس پہننے والی بدروح بن جاتی تھی۔۔ اس کا کتنا پرانا ساتھی تھا وہ جھولا۔ جبکہ سین تو اس کے قریب بھی نہ پھٹکتی تھی۔ اس سے خوف کھاتی تھی۔

لان کے بلکل آخری سرے پہ ضعیفے جھکتا سو سال پرانا برگد کا درخت جس کی مضبوط رگیں دور دور تک پھیل گئیں تھیں۔ دن میں بھی اس کے سائے کے نیچے رات پڑا کو کیا کرتی تھی۔ مرد اس کے قریب جانے سے ڈرتے تھے اور وہ وہاں گھر گھر کھیل کرتی تھی۔ وہ بھی اکیلے۔۔۔

"نگی۔۔ تم پھر وہاں گئیں تھیں۔ کتنی بار منع کیا ہے تمہیں بیٹا۔ وہاں برا سایہ ہے۔ کسی لڑکی پہ اس کا دل آجائے نہ تو ساری عمر اس کا گھر نہیں بسنے دیتا۔ تمہارے بابا کے خاندان کی کتنی لڑکیوں کی جوانی نگل گیا یہ آسب۔ تمہیں ڈر کیوں نہیں لگتا" اماں اسے ڈھونڈتے ہوئے وہاں آتیں تو خوف سے کانپ کانپ جاتیں۔۔ اور وہ ان کا ڈراڈرا چہرہ دیکھ کر ہنس جاتی۔ وہ بابا سے بھی شکایت کرتیں۔

"شیرھے میرا بچہ۔ کسی سائے کی مجال جو میری بیٹی کی خوشیاں نگل سکے۔" پرانی یادوں سے اس کی آنکھیں بھگینے لگیں۔

لال حویلی۔۔

اس کے بچپن کی یادوں۔۔۔

اس کے اور پیارے بابا جان کی محبت کی گواہ۔۔۔

اس کی سب سے پہلی سہیلی۔۔۔

آج وہ ہمیشہ کے لئے اسے چھوڑ کے جا رہی تھی۔۔ شہنائی شروع ہو چکی تھی۔ وہ نم آنکھوں سے مسکراتی اس طرف آگئی جہاں نیچے ساری حویلی کی چھت کا دوسرا الگ حصہ تھا۔ یہ ذرا نیچے تھا اس پورشن سے۔ یہاں اندھیرا تھا آج۔ شاید ملازم دوسرے کاموں میں مصروف یہاں روشنی کرنا بھول گئے تھے۔ وہ رتار دوپٹہ سنبھالتی پلٹنے کو تھی جب بھاری مردانہ آواز پہ وہ چونک کے رکی تھی۔

"خان کیا حکم ہے پھر۔۔"

"دوران خان! حکم تو بھت واضح ہے۔ آفتاب ولی خان کی حویلی میں پہلی بیٹی کی شادی ہے۔ یادگار ہونی چاہئے" وہ سہراب لالا کی آواز تھی۔ ان کے لہجے میں مسکراہٹ چھپی تھی۔ وہ دونوں نیچے اندھیرے میں کہیں تھے تبھی دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

"کوئی اس شادی کو بھول نہ پائے۔ سب کو یاد دہنی چاہئے یہ شادی"

"ایسا ہی ہوگا خان" دوران نے ادب سے جواب دیا تھا۔ نگیں مسکراتے ہوئے واپس ہوئی تھی۔ خدا نے اسے کتنے پیارے بھائی

دئے تھے۔ وہ خود کو دنیا کی خوش نصیب بہن مانتی تھی۔ مسکراتے ہوئے وہ واپس پلٹ گئی تھی۔ سہراب اور دوران کی آوازیں کہیں پیچھے رہ گئیں تھیں۔۔۔

☆.....☆.....☆

کارنر میٹنگ سے فارغ ہو کر وہ حویلی جانے کے لئے نکلے تو راستے میں کھیتوں میں درختوں تلے سستاتے کسانوں کو دیکھ کر رک جاتے۔ ان کے ساتھ بیٹھ کر ان کے مسائل سنتے اور ان کے حل کا وعدہ کرتے ساتھ منشی کو اشارہ کرتے، وہ فوراً سر ہلاتا ان کو چند ہرینوٹ دے دیتا۔ غریب کسانوں کے چہرے کھل اٹھتے۔

"یہ گاؤں ہمارا ہے۔ ہم سے زیادہ اس کا بھلا کون چاہ سکتا ہے۔ یہ غیر لوگ پیسہ لگا کر یہاں کا غیور عوام کا خون خریدنا چاہتے ہیں۔" وہ ان کو اپنی ایمانداری کا یقین دلارہے تھے۔

"میں نے لڑکیوں کا کالج بھی منظور کروا لیا ہے۔ اور انشاء اللہ اس بار گاؤں سے شہر تک ساری سڑک بھی دوبارہ وسیع اور پختہ کی جائے گی تاکہ آپ سب کے اجناس وقت پر اور آسانی سے منڈی پہنچ سکے اور آپ سب بہترین ریٹ حاصل کر سکو" وہ پشتو میں بات کر رہے تھے۔ لوگوں کے کھلتے چہرے انہیں مطمئن کرنے کے لئے کافی تھا۔

"اور اس بار میرا ارادہ ہے میں خود بڑی سیٹ پہ آؤں گا اور اپنی سیٹ پہ ضیاء ل کو لاؤں گا۔ نئی پودھے، زیادہ جوش اور جنون سے بھری۔ انشاء اللہ مزید ترقی ہوگی۔" سب نے ان کی بات پہ تالیاں بجا کر داد دی۔ تقریباً سہ پہر کے قریب وہ حویلی پہنچے تھے۔

"خان لگتا ہے۔ آپ کی گھر گھر جانے والی ترکیب کام کر رہی ہے" گاڑی سے اترتے ہی دوران نے ان سے کہا تھا۔ سہراب علی خان کے چہرے پہ سوچ کی لکیریں بچھی تھیں۔

"ضیاء ل کو یہ سب کس نے بتایا؟ کچھ پتہ چلا۔" ڈیرے میں لگے درخت کے ہرے بھرے درخت کے نیچے کچھی چار پائی پہ بیٹھتے ہوئے انہوں نے پوچھا تھا۔

"نہیں خان۔۔۔ کیونکہ آپ اور ہم چار نوکروں کے علاوہ کوئی یہ بات نہیں جانتا۔ اور باقی تین سے میں پوچھ چکا ہوں۔ ان سب نے لاعلمی کا اظہار کیا ہے۔"

"تو پھر یہ کون ہو سکتا ہے۔؟ کہیں شاویز۔۔۔"

"نہیں خان۔۔۔ اس سے بھی میری بات ہوئی ہے۔ اس نے بتایا کہ اس کی ضیاء ل سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی اور یہ بھی کہ اس لڑکی کی شادی کے بعد وہ راتوں رات وہ گھر چھوڑ رہے ہیں" دوران انہیں سری تفصیل بتا رہا تھا۔ ان کی آنکھوں میں گہری پریشانی رقم تھی۔

"اچھا ایسا کرو اندر پیغام دو کہ ضیاء^۱ کو میرے پاس بھیجیں" انہوں نے تکتے سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔
 "خان۔۔ چھوٹے خان تو فجر سے بھی پہلے نکل گئے تھے واپس" دوران کی بات پہ وہ جھٹکا کھا کے سیدھے ہوئے تھے۔
 "کون کون سا تھ گیا ہے؟" ان کے لہجے میں تشویش تھی۔

"اکیس گئے ہیں خان۔ میں نے کہا بھی کہ بدرگے ساتھ کے جائیں لیکن انہوں نے منع کر دیا"

"تو۔۔ اس نے منع کر دیا تو کیا ہوا تم لوگ پیچھے دوسری گاڑی میں بھی تو جاسکتے تھے" وہ چلا آٹھے تھے۔

"حالات کا بھی پتہ ہے۔ ضیاء^۱ اس وقت میرا دایاں بازو ہے۔ کوئی بھی دشمن اسے نقصان پہنچانے کا سوچ سکتا ہے" غصے سے وہ کاپٹنے لگے تھے۔

"غلطی ہوگئی خان" دوران فوراً سر جھکا گیا۔

"اب جاؤ۔۔ ظفر اور خاور کو ساتھ لے جاؤ۔ اور ضیاء جہاں بھی جائے، ساتھ رہو۔۔"

"جی خان"

"اور ہاں ضیاء پہ نظر رکھو اور کسی بھی صورت وہ شاویز سے نہیں مل پائے" سہراب نے اسے ہدایت کی۔ وہ فرمانبرداری سے سر ہلا

گیا۔

"جاو اب۔۔۔۔۔ جتنی جلدی ہو سکے نکل جاو"

"ہم ابھی نکلتے ہیں خان" وہ سعادت مندی سے کہتا ایک طرف بڑھ گیا۔ سہراب علی خان اب سنجیدگی سے ضیاء^۱ کے متعلق کوئی

وقتی فیصلہ لینے کا سوچ رہے تھے۔۔۔

☆.....☆.....☆

جب اس کی گاڑی فارم ہاؤس میں داخل ہوئی شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ وہ گاڑی ڈرائیو سے پہ دوڑاتا سیدھا ریڈیو پیشیل ایریا کی طرف آگیا۔ سامنے ہی برآمدے کی سیڑھیوں پہ زمزمہ بیٹھی کتاب پڑھ رہی تھی۔ سفید اور پنک کنٹراسٹ کے سوٹ میں وہ اس وقت بے حد نکھری نکھری لگ رہی تھی۔ وہ بھی ضیاء^۱ کی گاڑی دیکھتے ہی آٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"شکر ہے خان۔۔ آپ کو بھی ادھر کا خیال آیا" اس کے قریب آتے ہی اس نے مسکراتے ہوئے ضیاء کا استقبال کیا تھا۔ وہ بھی

اداسی دے مسکرا دیا تھا۔

"کیسی ہو زمزم۔۔؟" اس نے زمزمہ کے قریب سے گزرتے ہوئے پوچھا تھا۔ وہ اندر جا رہا تھا۔ اس کی حسن سے ایسی

بے نیازی اکثر زمزمہ کو اداس کر دیتی تھی۔ کردار کے اتنے پختہ مرد کو اس کے اپنے ہی باپ نے کس قدر پستی میں گرایا تھا۔

"میں ٹھیک ہوں خان" وہ دروازہ کھول کے اندر چلا آیا۔ زمزمہ اس کے پیچھے تھی۔۔

"اپنے کمرے میں جا رہے ہیں" اسے ایک طرف مڑتے دیکھ کر اس نے فوراً سوال کیا تھا۔ ضیاء ۱۔ اس بار اس کی پکار کو رد نہ کر سکا تھا۔ رک گیا تھا۔

"ہاں۔۔ فریش ہو کے کچھ دیر آرام کروں گا" وہ اب اس کی طرف دیکھتے ہوئے بات کر رہا تھا۔

"چائے لے آؤں" زمزمہ نے پوچھا۔

"ہاں بھجوادینا۔ تم آرام کرو خواہ مخواہ تکلیف ہوگی تمہیں" وہ مڑ گیا۔ زمزمہ چائے بنانے کچن میں آگئی۔۔

وہ چائے بنا کے کمرے میں آئی تو ضیاء نہا چکا تھا۔ وہ ڈرینگ کے قریب کھڑا بال بنا رہا تھا۔ ڈرینگ کے قد آور آئینے پہ پتہ نہیں اس نے کیا کیا تھوپ رکھا تھا، ٹوٹھ پیسٹ، شیونگ جیل، ہنیر جیل اور پتہ نہیں کیا کیا اس طریقے سے پھیلا یا تھاشیشے کی سطح پہ کہ باقی منظر اوجھل ہو گئے۔

"ببخ۔ خان یہ کیا کیا ہوا ہے؟" وہ تیزی سے اس طرف آئی تھی۔

"خود سے نفرت ہو جائے تو آئینوں سے اسی طرح خوف آنے لگتا ہے۔" اس نے شرٹ کے بٹن بند کرتے ہوئے لا پرواہی سے کہا تھا۔

"ایک بات کہوں خان" وہ اس سے پیالی لینے قریب آیا تو زمزمہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

"تمہیں کبھی منع کیا ہے میں نے" وہ بیڈ پہ بیٹھتے ہوئے بولا۔

"آپ لالہ سے ملیں" اس نے بے ساختہ کہا تھا۔ ضیاء ۱۔ کا مضبوط ہاتھ کانپ سا گیا تھا۔ اور اس سے پہلے کہ چائے کپ سے چھلکتی اس کا دامن داغدار کر جاتی اس نے دوسرا ہاتھ بے اختیار نیچے کیا تھا۔ چھلکی چائیاں کی ہتھیلی جلا گئی۔ دل کی جلن تھی یا ہتھیلی کی، اسے سارا وجود جلتا محسوس ہوا تھا۔

"میں نے کل ایک دو اچھے وکیلوں سے رابطہ کیا تھا نیٹ کے تھروان کے کنٹیکٹس سرچ کر کے۔ اور انہوں نے یہی بتایا کہ آپ بے تصور ہو کیونکہ آپ نشے میں تھے" وہ اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولی۔

"میں نشے میں نہیں تھا زمزمہ" وہ ضبط مٹھیاں بھینچا آٹھ کھڑا ہوا۔

"میں اس کے پاس پورے ہوش و حواس میں گیا تھا۔ وہ ایک ایک پل مجھے بھولتا نہیں۔ کس قدر سفاکی سے میں نے لالہ کو۔۔۔" تکلیف نا قابل برداشت ہوئی تھی۔۔۔

"آآآآآآآآآآآآ" وہ زور سے چیخا تھا اور چائے سے بھرا کپ کھڑکیوں پہ دے مارا تھا۔ کانچ ٹوٹنے کی زوردار آواز پہ

زمزمہ سہم کے پیچھے ہٹی تھی۔۔

"زمزمہ جاوا بھی یہاں سے" ضیاء کو اس قدر وحشت میں بھی اس کا خیال تھا۔ زمزمہ کی پکلیں بھگینے لگیں۔۔

"خان۔۔" اس نے آگے بڑھ کر ضیاء کے بازو پہ اپنا ہاتھ دھرا تھا اور بالکل اچانک ضیاء نے اس کا وہی ہاتھ تھام کر اسے اپنے بے حد قریب کر لیا تھا۔ ضیاء کی جلتی سانسیں اس کا چہرہ جلانے لگیں تھیں۔ ضیاء کی نظریں اس کے لب کے ننھے کالے تل پہ جم سی گئیں تھیں۔

"لاسٹ وارنگ دے رہا ہوں زمزمہ۔ مجھ جیسے وحشی سے دور رہا کرو۔ ورنہ لالہ کی طرح۔۔" اس کی خوبصورت آنکھیں چھل دینے لگیں تھیں۔ اس نے چند پل بے بسی سے ہونٹ کاٹتے ہوئے زمزمہ کو دیکھا تھا، پھر جھٹکے سے اس کا ہاتھ چھوڑتا سائیڈ ٹیبل سے گاڑی کی چابی اٹھا تا باہر نکل گیا۔ زمزمہ اس مضبوط مرد کی بے بسی پہ سسک اٹھی تھی۔۔

☆.....☆.....☆

بلیک کرولا سے کچھ فاصلہ پہ سفید شلوار قمیض میں ملبوس وہ گرمی سے نڈھال ہو رہا تھا۔ اس کے کپڑے پسینے کی وجہ سے اس کے جسم سے چپک گئے تھے اور اس کا کسرتی جسم واضح ہونے لگا تھا۔ سن گلاسز لگائے وہ مسلسل نیل بجائے جا رہا تھا۔ لیکن اندر سے جواب ندارد۔۔۔

ارد گرد سے گزرنے والے لوگ خصوصاً لڑکیاں اسے دیکھ کے ٹھہرتیں اور پھر ان کی دبی دبی سرگوشیاں اور ہنسی اس کی کوفت میں مزید اضافہ کر دیتی۔ کافی دیر کے بعد جب وہ مایوس ہو کے پلٹنے والا تھا۔ گیٹ کھلنے کی آواز پہ اس کے چہرے پہ ایک دم جوش سا چمکا تھا۔ لیکن اگلے ہی لمحے پہلے والی مایوسی چھا گئی تھی۔ وہ ساتھ والے گھر کا دروازہ تھا۔ جہاں سے اب شوخ سی قبول صورت لڑکی اپنی گول گول آنکھیں گھما گھما کر اس کا جائزہ لینے میں مصروف تھی۔

"کیوں بار بار اس گھر کی نیل بجا رہے ہو۔؟" آنکھوں میں اس کے لئے ستائش کے باوجود انداز سخت تھا۔

"سوری مس۔۔ مجھے شایہ سے ملنا تھا۔" اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

"وہ لوگ تو یہ گھر چھوڑ کے چلے گئے" اس لڑکی نے گویا دھماکہ کیا۔

"چھوڑ کے چلے گئے۔۔ لیکن کیوں؟" اس نے تیزی سے سوال کیا۔

"ان کی بہن کا کوئی معاملہ تھا۔" وہ دروازے کی چوکھٹ سے لٹک کر بتانے لگی۔

"بھاگ کے گئی تھی کسی کے ساتھ،" آواز سرگوشی میں بدل گئی۔

"وہ منہ پہ کالک مل کے یہیں دروازے پہ پھینک گیا۔" اس کا انداز نفرت سے بھرا تھا۔ ضیاء لب چبانے لگا۔

"وہ بے چارے تو پھر بھی چپ تھے لیکن اب کئی دنوں سے رات کو گن بردار لوگ آنے لگے تھے ان کو دھمکانے تو بس دنوں میں

بیٹی کی شادی کی اور نکل گئے"

"شادی۔۔۔؟؟ کس بیٹی کی شادی۔؟"

"لالہ کی اور کس کی" اس نے گول آنکھیں ہوں گھمائیں جیسے اسے ضیاء کے سوال نے خاصا بد مزہ کیا ہو۔ ضیاء البتہ کچھ بولنے کے قابل ہی نہیں رہا تھا۔

"اچھا اب جاو۔۔ اور ہاں یہ بات کسی اور کو مت بتانا۔ اور ہاں اب بیل بھی نہ بجانا۔ اس وقت ہم سب سونے کے عادی ہیں۔" روکھے لہجے میں اسے ہدایت کرتی اس نے کھڑاک سے دروازہ بند کیا تھا۔ ضیاء کچھ دیر لالہ کے گھر کا دروازہ دیکھتا رہا تھا۔ پھر گاڑی کی طرف مڑ گیا۔ سورج کی پیش ایک دم ہی اس کا وجود جلانے لگی تھی۔

☆.....☆.....☆

صبح وہ ناشتے کے لئے باہر آیا تو دیدے ناشتہ سجائے اس کی منتظر تھیں۔ اور لوازمات دیکھ کے وہ واقعی حیران رہ گیا تھا۔
"یہ کیا دیدے۔۔ اتنا سب کچھ" وہ پوچھتے ہوئے بیٹھا۔
"سب کچھ خود بنایا ہے"

"واو۔۔ زبردست۔۔" وہ خوش ہوتا بیٹھ گیا۔ اور بھاپ اڑاتا چائے کا کپ اٹھا کے لبوں سے لگاتے ہوئے پوچھا
"لیکن یہ سب کس خوشی میں۔۔۔؟"

"تمھاری شادی کی خوشی میں۔۔۔" جس انداز میں اس نے سوال کیا تھا دیدے نے اتنے ہی پیارے انداز میں اچانک کہا تھا۔ باریال نے منہ میں لیا چائے کا گھونٹ فورے کی صورت باہر اچھالا تھا۔ دیدے کی مسکراہٹ مزید گہری ہوئی۔
"کک۔۔۔۔۔ کک۔۔۔۔۔ کون سی شادی۔۔۔۔۔"
"کک۔۔۔۔۔ کک۔۔۔۔۔ کلکس کی شادی" وہ بوکھلا گیا تھا۔ دیدے آٹھ گنیں۔

"بچپن سے تمھاری عادت ہے۔ تم جھوٹ بولتے ہوئے یونہی گڑ بڑ جاتے ہو۔ اور اسی لئے بچپن سے ہی تمھیں میں یہ کہتی آرہی ہوں کہ جھوٹ مت بولا کرو" وہ اب کپڑا اٹھا کر میز پر گری چائے صاف کر رہی تھیں۔ اس بار وہ شرمندہ سا بیٹھا رہا۔

"جاو اسے لے کے آو باہر۔۔۔"

"لیکن دیدے آپ کو کیسے۔۔۔؟"

"باری پلیز یہ باتیں بعد میں۔ اسے بھوک لگی ہوگی۔ جاو" دیدے نے لہجہ میں سختی لاتے ہوئے اسے کہا تھا۔ اسے اٹھنا ہی پڑا تھا۔ اس کے مڑتے ہی دیدے نے اپنی ہنسی بمشکل کنٹرول کی تھی۔

☆.....☆.....☆

بلیک کرولا سے کچھ فاصلے پہ سفید شلوار قمیض میں ملبوس وہ گرمی سے نڈھال ہو رہا تھا۔ اس کے کپڑے پسینے کی وجہ سے اس کے جسم سے چپک گئے تھے اور اس کا کسرتی جسم واضح ہونے لگا تھا۔ سن گلاسز لگائے وہ مسلسل بیل بجائے جا رہا تھا۔ لیکن اندر سے جواب ندارد۔۔۔ ارگرد سے گزرنے والے لوگ خصوصاً لڑکیاں اسے دیکھ کے ٹہرتیں اور پھر ان کی دبی دبی سرگوشیاں اور ہنسی اس کی کوفت میں مزید اضافہ کر دیتی۔ کافی دیر کے بعد جب وہ مایوس ہو کے پلٹنے والا تھا۔ گیٹ کھلنے کی آواز پہ اس کے چہرے پہ ایک دم جوش سا چمکا تھا۔ لیکن اگلے ہی لمحے پہلے والی مایوسی چھا گئی تھی۔ وہ ساتھ والے گھر کا دروازہ تھا۔ جہاں سے اب شوخ سی قبول صورت لڑکی اپنی گول گول آنکھیں گھما گھما کر اس کا جائزہ لینے میں مصروف تھی۔

"کیوں بار بار اس گھر کی بیل بجا رہے ہو۔؟" آنکھوں میں اس کے لئے ستائش کے باوجود انداز سخت تھا۔

"سوری مس۔۔ مجھے شاویز سے ملنا تھا۔" اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

"وہ لوگ تو یہ گھر چھوڑ کے چلے گئے" اس لڑکی نے گویا دھماکہ کیا۔

"چھوڑ کے چلے گئے۔۔ لیکن کیوں؟" اس نے تیزی سے سوال کیا۔

"ان کی بہن کا کوئی معاملہ تھا۔" وہ دروازے کی چوکھٹ سے لٹک کر بتانے لگی۔

"بھاگ کے گئی تھی کسی کے ساتھ،" آواز سرگوشی میں بدل گئی۔

"وہ منہ پہ کالک مل کے یہیں دروازے پہ پھینک گیا۔" اس کا انداز نفرت سے بھرا تھا۔ ضیاء^۱ لب چبانے لگا۔

"وہ بے چارے تو پھر بھی چپ تھے لیکن اب کئی دنوں سے رات کو گون بردار لوگ آنے لگے تھے ان کو دھمکانے تو بس دنوں میں

بیٹی کی شادی کی اور نکل گئے"

"شادی۔۔۔؟؟ کس بیٹی کی شادی۔؟"

"لالہ کی اور کس کی" اس نے گول آنکھیں ہوں گھمائیں جیسے اسے ضیاء^۱ کے سوال نے خاصا بد مزہ کیا ہو۔ ضیاء^۱ البتہ کچھ

بولنے کے قابل ہی نہیں رہا تھا۔

"اچھا اب جاؤ۔۔ اور ہاں یہ بات کسی اور کو مت بتانا۔ اور ہاں اب بیل بھی نہ بجانا۔ اس وقت ہم سب سونے کے عادی ہیں۔"

روکھے لہجے میں اسے ہدایت کرتی اس نے کھڑاک سے دروازہ بند کیا تھا۔ ضیاء^۱ کچھ دیر لالہ کے گھر کا دروازہ دیکھتا رہا تھا۔ پھر گاڑی کی

طرف مڑ گیا۔ سورج کی تپش ایک دم ہی اس کا وجود جلانے لگی تھی۔

☆.....☆.....☆

سہراب علی خان بیٹھک میں مصروف تھے۔ علاقے کے علماء آج ان کی دعوت پہ ان سے ملنے آئے تھے۔ سہراب اچھی طرح

جانتے تھے کہ ان کے علاقے میں اگر کوئی ان کے بعد پادور رکھتا ہے غریب عوام پہ تو وہ علماء ہی تھے۔ ان کے صاف کردار اور سادہ زندگی کی وجہ سے لوگ ان کی عزت کرتے تھے اور ان کی پیروی کرنا اپنا فرض کرتے تھے۔ یہ ملاقات بھی الیکشن کے سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ اگر علماء ان کے ساتھ ہو جاتے تو انہیں زیادہ محنت کی ضرورت نہ پڑتی۔

"آپ لوگوں کو مساجد کے لئے کسی بھی چیز کی ضرورت ہو بے دھڑک منشی تک پیغام بھجوادیا کریں۔" انہوں نے پتہ پھینکا۔

"خان آپ کے تو پہلے بھی کافی احسان ہیں ہم پہ، پچھلے سال کی بارشوں سے تباہ حال مسجد اور حجرے کی بحالی آپ کی مدد سے ہی ممکن ہو پائی" مولوی عبدالکریم نے احسان مندانہ لہجے میں کہا۔

"نہ نہ مولوی صاحب۔۔۔ مدد کیسی۔ یہ تو ہم سب کا فرض ہے۔ ہمارے علاقے کے لئے ہم کام نہیں کریں گے تو اور کون کرے گا۔ لیکن ایک مسئلہ ہے اور اسی لئے آپ سب کو یہاں تکلیف دی ہے میں نے" سہراب خان اصل بات کی طرف آتے ہوئے بولے۔

"کیسا مسئلہ خان؟ آپ حکم کریں ہم سب اس علاقے کی بہتری کے لئے آپ کے ساتھ ہیں" امام محمد بخش نے یقین دہانی کرائی۔

"بات دراصل یہ ہے کہ پہلی دفعہ ہمارے مقابلے پہ باہر کا کوئی آدمی کھڑا ہونے کی جرات کر رہا ہے۔ جانباز خان کے نام سے تو آپ سب ہی واقف ہیں اب اچھی طرح۔ وہ الیکشن میں میرا حریف ہر دم بنے لیکن جھوٹ موٹ کی وقتی ہمدردی دکھا کے جس طرح وہ علاقے کے لوگوں کو بیوقوف بنا رہا ہے اس نے مجھے فکر مند کر دیا ہے۔"

"یہ بات تو آپ کی ٹھیک ہے خان۔ لیکن اس معاملے میں ہم سے جو بھی ہو سکا ہم کریں گے"

"آپ لوگ بس یہ کوشش کریں کہ جمعہ کے ہر خطبے بلکہ دن کی ہر نماز کے بعد تھوڑا سا اہل علاقہ کو سمجھانے کے لئے بات کر لیا کریں۔ اس طرح عوام میں شعور پیدا ہوگا اور پھر آپ کی بات کو سچی اہمیت دیتے ہیں۔ ان کو پتہ چل جائے گا کہ علاقے کی بہتری علاقے کے لوگوں کا ہی مشن ہے۔ دوسرے بس یہاں قدم جما کے ہمیں کمزور کرنا چاہتے ہیں۔" سہراب خان نے مونچھوں کو تاد دیتے ہوئے کہا۔

"بلکل ٹھیک کہہ رہے ہیں خان جی۔ ہمیں آج سے ہی اپنے لوگوں کی اصلاح کرنا ہوگی۔" مولوی عبدالحق اٹھتے ہوئے بولے۔

باقی سب نے تائید انداز میں سر ہلاتے ہوئے ان کی حمایت کی تھی۔

"انشاء اللہ میں پھر کبھی حجرے پہ بھی حاضر ہوں گا" سہراب خان نے سینے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے انہیں الوداع کیا۔ ان کے باہر نکلتے ہی دوران اندر آیا تھا۔

"خان"

"کیا بات ہے دوران؟" سہراب نے تیز نظر اس کے چہرے پہ ڈالی تھی۔

"چھوٹے خان شادویز کے گھر گئے تھے۔" اس نے اطلاع دی۔ سہراب خان کی آنکھوں میں غصہ لودینے لگا تھا۔
"پھر۔۔؟"

"وہ لوگ انہیں نہیں ملے خان۔ شادویز ایک ہفتہ قبل ہی گھر چھوڑ کے جا چکا ہے اور بہن کی اس نے شادی کر دی تھی" اس کی بات پہ سہراب کے ہونٹوں پہ کینی سی مسکراہٹ بکھری تھی۔

"خس کم جہاں پاک" انہوں نے تلخ لہجے میں کہا تھا۔

"اب کیا حکم ہے میرے لئے خان"

"ضیاء کے ساتھ سلیم خان کو کر دو اور ابراہیم کو بھی ہدایت دو کہ سارا وقت ضیاء کے ساتھ رہے۔ تم اب میرے ساتھ رہنا۔ یہاں بھی کافی ضرورت تھے تمہاری۔ ویسے بھی اب ضیاء کی طرف سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہمیں" انہوں نے ہدایت دی۔ دوران ادب سے سر جھکا تا باہر نکل گیا۔

☆.....☆.....☆

باریال نے جیسا بتایا تھا۔ دیدے بالکل ویسی ہی تھیں۔ انہوں نے جس طرح بنا سوال کئے اس کا اس گھر میں استقبال کیا تھا وہ واقعی ششدر رہ گئی تھی۔

"باری میرا بیٹا ہے۔ وہ کبھی کچھ غلط کر ہی نہیں سکتا انشاء اللہ۔۔ مجھے یقین ہے اللہ ہمیشہ اس کا مددگار ہے" انہوں نے باریال کی زبردستی وضاحت دینے کی کوشش بھی ناکام بناتے ہوئے کہا تھا۔ وہ واقعی خاموش ہو گیا تھا۔ انہوں نے ناشتے کے بعد لالہ کو سارا گھر دکھایا تھا۔ پھر دیر تک اپنے کمرے میں اس سے باتیں کرتی رہیں تھیں۔ باریال ان دونوں کو بڑی دیکھ کر آفس کے لئے نکل گیا تھا۔ لالہ واقعی ان کا ساتھ پا کے ہلکی پھلکی ہو گئی تھی۔ وہ پہلے اسے اپنے بارے میں بتاتی رہیں۔ ان کا خاندان، ان کا آبائی گھر، کس طرح بچپن گاؤں کی سرسبز گلیوں میں آڑا تاریکین آئینل میں جوانی لئے سمٹ آیا۔ کب باری کے بابا زندگی میں آئے اور پھر باری۔ پھر کچھ ایسے حالات جب ان سے باری کے بابا اور گھر چھن گیا۔ اور وہ باری کو لئے یہاں آ گئیں۔ سب کچھ نیا۔

اپنے بارے میں بتانے کے بعد وہ لالہ کی طرف دیکھ کے مسکرائیں جو بھت توجہ سے انہیں سنے جا رہی تھی۔
"اچھا۔۔ بھت ہو گئیں میری باتیں۔ اب تم بتاؤ۔ کہاں ملیں میرے باریال کو اور اپنا دیوانہ بنا لیا۔" انہوں نے محبت سے پوچھا تھا۔ لالہ چونکے تھی۔

"کسی کالج کے گیٹ پہ، یونیورسٹی میں، یا پھر کافی ہاؤس یا شانگ مال" وہ مسکرا کر اندازے لگا رہی تھی۔۔
"یونیورسٹی، کافی ہاؤس" اور وہ دلفظ اس کی سماعت سے جو تک کی طرح چمٹ گئے۔

"ایک کپ کافی لینا پسند کرو گی میرے ساتھ "خونی اس کے کانوں تک ریگنے لگی تھی اس نے گھبرا کر دونوں ہاتھ کانوں پر رکھے تھے۔
"لالہ۔۔ تم ٹھیک ہو۔۔؟؟" دیدے اسے یوں اچانک اس طرح ری ایکٹ کرتا دیکھ کے پریشان ہو گئیں۔

"لالہ کے لئے صرف ضیاء۔۔ تمہارا ہر راستہ میری طرف ہی نکلے گا" خونی چونک اس کے کان کے اندر گھس گئی تھی۔ درد بڑھنے لگا تھا۔ جسم کے روئیں روئیں سے چونک چمٹنے لگیں تھیں۔

"نہیں۔۔ نہیں۔۔" وہ زور زور سے چلانے لگی تھی۔ اپنے ہاتھوں سے اپنا ہی وجود نوچنے لگی تھی۔ اس کی سسکیوں میں کرب تھا۔ دیدے اسے سنبھالتے سنبھالتے خود بے دم سی ہونے لگیں تھیں۔ چیختے چیختے وہ خود ہی ہوش کھو کر ان کی گود میں بے دم سی گری تو انہوں نے محبت سے اس کا بکھرا وجود خود میں سمیٹ لیا۔

"اللہ تم دونوں پہ مہربان رہے" انہوں نے نرم آنکھوں سے اپنی اولاد کو دعا دی تھی۔۔۔

☆.....☆.....☆

باء جی شہر سے واپس آچکے تھے اور اب اسے اور گل مینے کو واپس شہر جانا تھا۔ شام تک نکلنا تھا انہیں۔ اور وہ جانے سے پہلے کچھ وقت ضرور اللہ لوک کے پاس گزارنا چاہتی تھی۔ لیکن رات سے پہلے یہ کسی طرح خطرے سے خالی نہ تھا۔ کیونکہ رات دن حویلی کے سارے اندرونی و بیرونی مورچوں پہ سخت نگرانی ہوتی تھی۔ رات کو پھر بھی اس طرف ویرانی اور اندھیرا ہوتا تھا تو وہ فائدہ اٹھا لیتی تھی۔ لیکن دن کے وقت وہ یہ رسک نہیں لے سکتی تھی۔ کیونکہ دن کی روشنی میں وہ آسانی سے کسی کی بھی نظر میں آسکتی تھی اور پھر شاید وہ اس زیر زمین زندان اور اس لال حویلی کے چھپے راز کبھی نہ جان پاتی۔ اتنا تو اسے اندازہ ہو گیا تھا۔ اس کے باء جی کی شخصیت میں کچھ تو غلط تھا۔ وہ ویسے نہیں تھے جیسا نظر آتے تھے۔ کچھ پرت چڑھے تھے ان کے کردار پہ اور یہ پرت اس وقت اس کے سامنے کوئی کھول سکتا تھا تو وہ صرف اللہ لوک ہی تھی۔

رات ان سے سنی گئی داستان میں وہ اتنا تو جان ہی گئی تھی کہ جو دلہن بنی وہ گئی تھیں۔ کیونکہ سین پھپھو کے بارے میں اس نے سنا تھا وہ گھر سے بھاگ گئیں تھیں اور اس کے بعد آج تک ان کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ لیکن یہ بات اس کے لئے ابھی بھی اچنبھے کا باعث تھی کہ اگر گنگی کی شادی اتنی دھوم دھام سے ہوئی تو وہ خود کو نوج نوج کے اجاڑنے والی وہ دلہن لڑکی کون تھی؟ اللہ لوک سے آج اسے یہی جاننا تھا۔ اور اسے اسی بے صبری کے باعث دن کا ٹنا مشکل ہو رہا تھا۔ اوپر سے اب باء جی کا نیا حکم۔ وہ ہفتیتا پریشان ہو کے رخ گئی تھی۔

"جو بھی بہر حال اللہ لوک سے ملے بغیر میں ابھی نہیں جاسکتی" اس نے جیسے تہیہ کیا تھا۔ لیکن وہ خود بھی جانتی تھی یہ سب اتنا آسان نہ تھا۔ کافی دیر تک وہ کمرے میں بند ادھر سے ادھر ٹہلتی اللہ لوک سے ملنے کا راستہ تلاش کرتی رہی اور پھر اچانک ہی اسے ابراہیم کا خیال آیا تھا۔ ابراہیم وہ شخص تھا جس پہ وہ اعتبار کر سکتی تھی۔ وہ قابل بھروسہ تھا۔ اور جس طرح کی پتویشن تھی وہی ایک آدمی تھا جو نہ صرف اس پہ اعتبار کرتا بلکہ مدد بھی کرتا۔ اس نے فوراً اسے تلاش کرنا شروع کیا۔ وہ حویلی کے پچھلے صحن میں اپنے کوارٹر میں موجود اپنے سامان کی پیننگ میں

مصرف تھا۔

"ابراہیم" اس نے دروازہ ہلکے سے بجاتے ہوئے آہستگی سے پکارا۔ ابراہیم کے ہاتھ اس کی آواز پہ یکدم رکے۔

"خان زادی" وہ مڑے بغیر دھیرے سے بولا تھا۔ گل مینہ سے تو اسے اس قسم کی حرکت کی ہمیشہ امید اور ڈر رہتا تھا۔ لیکن اوزگل اس کے کمرے تک آجانے کی ہمت کر لے گی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اسے پریشانی گھیرنے لگی تھی۔

"مجھے جانے سے پہلے حویلی کے ویران بیرونی حصے میں ایک ضروری کام ہے۔ تم بس میری یہ مدد کرو کہ اس طرف والے مورچے کے لوگوں کو آدھے گھنٹے کے لئے دوسری طرف مصرف رکھو۔ میں شہر جا کے تمہیں سب بتا دوں گی۔ میں چار بجے تمہارا انتظار کروں گی" یہ کہہ کر وہ کی نہیں۔ واپس بھاگ گئی۔

ابراہیم حیران سادروازے تک آیا تو وہ پچھلا صحن عبور کرتی برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔

"خان زادی کو مجھ اس ویرانے میں ایسا کیا کام کہ انہیں میری مدد کی ضرورت پڑ گئی۔" وہ اب پلٹتے ہوئے پریشانی سے سوچ رہا تھا۔ ہونہ ہو کوئی بڑی بات تھی ورنہ ایسی بے باکی کی توقع گل مینہ سے کی جاسکتی تھی۔ لیکن اوزگل۔۔۔۔۔

وہ جس مزاج کی لڑکی تھی۔ ابراہیم حیات اچھی طرح جانتا تھا۔ کسی بھی صورت وہ کسی بھی مرد کو کبھی مخاطب نہیں کرتی تھی۔ گھر کے مردوں کو بھی بھت کم ہچکچاتے ہوئے۔۔۔ اور ایسے میں اس قدر اچانک اسے تقریباً حکم سنا کہ اس کا چلے جانا کام کے واقعی اہم ہونے کا پتہ دے رہا تھا۔۔۔

گل مینہ ہوتی تو وہ یقیناً ٹال جاتا لیکن اب اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ ٹھیک چار بجے وہاں ضرور اس کی مدد کرنے جائے گی۔ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ مطمئن ہو کر وہ دوبارہ اپنے کام میں مشغول ہو گیا تھا۔۔۔

☆.....☆.....☆

اس کی آنکھ کھلی تو رات ہونے لگی تھی۔ اس کا سر سہلاتی دیدے بالکل اسے قریب بیٹھیں تھیں۔ ان کے چہرے پہ اس کے لئے پریشانی تھی۔ وہ شرمندہ سی ہو کر آٹھ بیٹھی۔

"آئم ساری۔۔۔ پتہ نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا۔" اپنے ہاتھ کی انگلیوں کو مروڑتے ہوئے اس نے معذرت کی تھی۔ اور لب دان توں تلے کچلتے ہوئے اپنے آنسوؤں پہ ضبط کرنے کی کوشش کی تھی۔

"آنسوؤں کو روکنا نہیں چاہئے۔ انہیں بہہ جانے دیا جائے تو زیادہ اچھا ہوتا ہے۔۔۔ اس سے من کے اندر کا سارا میل دھل جاتا ہے۔ جیسے بارش کے بعد پتے پتے پہ جمی گرد صاف ہو جاتی ہے۔ ویسے ہی من کے کئی درد' کئی گھاوان کے ساتھ بہہ جاتے ہیں" انہوں نے نرمی سے اس کا کامل سا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا تھا۔ لالہ کی پلکیں اس بار آنسوؤں کا بوجھ نہیں سہار پائیں تھیں۔ وہ بے آواز

رونے لگی تھی۔

"تم اور باری، زندگی کے کس موڑ پہ آچکے ہو میں نہیں جانتی اس کے باوجود بھی کہ۔ باری مجھے سب حالات بتا چکا ہے۔ لیکن مجھے نہیں معلوم کیا وجہ تھی جو تمہیں یوں رسوا کر گئی لیکن باری نے ایک مرد ہونے کے ناطے جو کچھ کیا وہ میرے لئے فخر کی بات ہے۔ پھر بھی لالہ۔۔۔" انہوں نے اس کا ہاتھ نرمی سے دباتے ہوئے تھوڑا توقف کیا۔۔۔

"پھر بھی میں چاہتی ہوں کہ تمہاری زندگی مکمل ہو اور میرے باریال کی بھی۔ وہ لاکھ بڑا ظرف کر لے 'ہے تو ایک مرد ہی۔۔۔ اور اس طرح تو تم دونوں ہر دن اذیت میں گزارو گے۔ میں چاہتی ہوں کوئی ایسا راستہ تلاش کروں کہ تمہاری اور باری دونوں کا راستہ سہل ہو جائے۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے جب تم مجھے ساری حقیقت بتا دو۔۔۔" لالہ سسکنے لگی تھی۔

"میرا یقین کرو میں تمہارا پردہ رکھوں گی۔ بالکل تمہاری ماں کی طرح" انہوں نے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام کر اسے یقین دلایا تھا۔ اور وہ بکھر کے رو دی تھی۔ زور زور سے چلا کے۔۔۔

درد اور کرب سے اس کی آواز پھٹی جا رہی تھی۔۔۔

اسے خود میں بھینچتے ہوئے دیدے نے اسے کھل کے رونے دیا تھا۔۔۔

کل اس کی حالت سے ہی وہ سمجھ گئیں تھیں۔ اس کے ساتھ جو بھی حادثہ ہوا تھا وہ ابھی تک اندر ہی اندر گھٹ رہی تھی۔ اندر ہی کہیں پلنے والے درد کو باہر آنے کا راستہ نہیں ملا تھا۔ سب اپنوں کو جیسے اپنی عزت اور وقار کی پڑ گئی تھی۔ کسی نے اس کا دکھ سمجھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ تبھی وہ اندر ہی اندر بھر رہی تھی۔ دیدے کی ذرا سی محبت پہ وہ سارا درد آتش فشاں سے نکلتے لاوے کی طرح باہر آیا تھا۔

"وہ گناہ گار ہے میرا۔۔۔"

اللہ گواہ ہے میرا میں اس کے ساتھ نہیں گئی تھی۔ بس حالات ایسے تھے کہ اس وقت مجھے وہ ٹھیک لگا۔ ورنہ لالہ تو مرد کے سائے سے بھی دو گز دور بھاگتی تھی۔ "وہ روتے روتے بتانے لگی تھی۔

دیدے اس کی کمر سہلاتی رہیں۔۔۔

اور پھر اس نے ساری بات بتادی تھی۔

"مجھے ضیاء^۱ کے ہاتھ اور اس بوڑھے شخص کی زہریلی نظریں نہیں بھولتیں۔ انہوں نے میری زندگی برباد کر دی۔ اس دن اگر حالات ایسے نہ ہوتے تو خدا کی قسم لالہ ضیاء^۱ کا بڑھا ہاتھ ہمیشہ کی طرح جھٹک کے چلی جاتی۔ عزت کے ڈر سے میں خود کمزری کے اس جال میں گھس گئی جو نہ جانے کب سے میرے لئے بنا جا رہا تھا۔ اور یہ سب امی کا دل دکھانے کی وجہ سے ہوا میرے ساتھ۔ میں ماں کو بد کردار اور خود کو بلند کردار کہنے والی لڑکی۔۔۔ دیکھیں کتنی غلیظ ہو گئی ہوں میں۔۔۔"

کتنابد بودار ہو گیا ہے میرا وجود۔۔۔

اور یہ میرے اندر پنیٹا گند۔۔۔۔۔" وہ اپنے پیٹ میں مکے مارنے لگی تھی۔

"مجھے ماردیں۔۔ میں اسی قابل ہوں۔۔۔" اس پہ پھر وہی جنونی کیفیت طاری ہونے لگی تھی۔ دیدے نے بھت مشکل سے

اسے سنبھالا تھا۔

"میں بھی چاہتی ہوں لالہ تم بھی ایک مکمل زندگی جیو۔ یہ تمہارا حق ہے۔ لیکن اس طرح خود کو تباہ نہ کرو۔ یہ بچہ تمہیں نہیں چاہئے

ہم اس کا بھی کچھ کریں گے۔ میں تمہیں خود لے کے جاؤں گی جہاں تم کہو گی۔ میں تمہارا مکمل ساتھ دوں گی لالہ۔ لیکن اس طرح خود کو اذیت

پہنچا کر تم اپنے رب کی نافرمانی کرو گی یوں۔ اس کی نافرمان نہ بنو لالہ۔ اس آزمائش پہ اس کو پکارا تم اسے ہمیشہ اپنے ساتھ پاؤ گی بیٹا۔" وہ

اس کے نرم بال سہلاتے ہوئے اسے سمجھا رہی تھیں اور اس کی آنکھوں سے بہتا گرم پانی ان کی گردن جلانے جارہا تھا۔ وہ جیسے اپنا سارا درد

ان کو سونپ رہی تھی۔

"زندگی کب ایک سیدھی لکیر کی طرح رہی ہے۔ یہ تو بل کھاتے راستوں کی طرح ہوتی ہے۔ ایک طرف گہری کھائیاں اور

دوسری طرف پر کیف نظارے۔۔۔ کبھی آسان لمبا سیدھا راستہ تو کبھی بل کھاتے پر خطر موڑ۔۔۔ گرنے کا خشہ ہمیشہ رہتا ہے۔" وہ اس کا

نم چہرہ اپنے سامنے لاتے ہوئے بولیں۔۔

"میں مانتی ہوں لالہ تم سے کوتاہی ہوئی۔ اور بھت بڑی کوتاہی ہوئی۔ ہمارے بزرگوں کا ماننا ہے ماں باپ کے سامنے بولا ہمارا

ایک اچھا یا برا کلام کبھی کبھی ہماری ساری قسمت پہ حاوی ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ کس نے کہا لالہ۔۔۔۔۔ کہ غلطی کی معافی نہیں۔۔۔ پھر ہمارا

مذہب تو ایسا مذہب ہے جو ہمیشہ امید اور گنجائش نکالتا ہے۔ مایوس سے مایوس حالت میں بھی یقین کا دامن نہ چھوڑنے کا درس دیتا ہے۔"

وہ کچھ دیر کیں تھیں۔

"لیکن میں تو باغتاب ٹھہری۔ بے اماں ٹھہری۔۔ معافی تلافی کی تو گنجائش ہی نہ بچی آنٹی۔ صرف سزا رہ گئی۔ منہ پہ اس طرح

کا لک لگی کہ شاید ہی کبھی دھل پائے" وہ پوری طرح مایوس تھی۔

"ٹھوکر انہیں بھی لگتی ہے لالہ جو اللہ سے ہر معاملے میں ڈرتے ہیں۔ یہ اور بات کہ اللہ پاک انہیں سنبھال لیتا ہے۔ تمہارا معاملہ

ایسا ہے کہ تم ماں کے معاملے میں اس رب کی نافرمان ہو گئیں۔ تم نے ٹھوکر کھائی اور تمہاری روح بھی تارتار ہوئی لیکن توبہ کا دروازہ ہمیشہ کھلا

رہتا ہے۔ وہ ٹھوکر والوں کو سہارا دے دے تو وہ ولی بن جاتے ہیں۔ خود سے سوچنا چھوڑ دو اور اس رب کے آگے جھک جاؤ۔ اپنے گناہ

تسلیم کرو اور سچے دل دے توبہ کرو۔ وہ بے شک بڑا مہربان ہے "انہوں نے نرم لہجے میں کہا تھا اور آٹھ کھڑی ہوئیں تھیں۔

"نماز پڑھ لو۔ پھر کھانا کھاتے ہیں۔ کل باری کے جانے کے بعد تم اور میں صوفی صاحب کے پاس چلیں گے۔ وہ ضرور ہماری مدد

کریں گے۔ تمہارے ساتھ ساتھ اب یہ سب باری کے لئے بھی ضروری ہے۔ تم تو پھر بھی ایک آزمائش سے گزر چکی ہو۔ باریال ابھی امتحان کی زد میں ہے اور میں تم دونوں کی مدد کرنا چاہتی ہوں "لالہ نے سرخ ہوتی نظروں سے ان کا پر نور چہرہ دیکھا تھا۔ اور پھر خود کو سنبھالتی وضو کرنے آٹھ گئی۔ کہ بعض اوقات رب کے در کے علاوہ انسان کے پاس اور کوئی در نہیں رہتا کھٹکھٹانے کو۔۔۔ دیدے اسے اٹھتا دیکھ کر مطمئن ہوتے ہوئے باہر نکل گئیں تھیں۔۔۔

☆.....☆.....☆

دن مختصر ہونے لگے تھے۔ تبھی فضا میں بھی گرمی اور پیش کی جگہ نمی اور ٹھنڈک لینے لگی تھی۔ صبح سویرے گھاس پہ ٹھنڈی اوس کے قطرے سردی کی دستک دیتے محسوس ہوتے۔

جب سے لالہ اس جگہ سے گئی تھی۔ وہ بالکل بدل گیا تھا۔ پہلے والا لالہ ابالی، لا پروا سا ضیاء کہیں کھو گیا تھا۔ ساری ساری رات جاگنے اور دو پہر کو صبح کرنے والا ضیاء اب سرشام لیٹ جاتا۔ دواؤں کے استعمال کے باوجود رات کے آخری حصے میں ہی اس کی آنکھ کھل جاتی تھی۔ اور باقی سارا وقت وہ پھر سگریٹ کے دھوئیں میں اڑا دیتا۔ سورج کی کرنیں دھرتی کا سیدہ جگمگانے لگتیں تو وہ باہر لان میں آ جاتا۔ پیروں میں اڑ سے آرام دہ چپل برآمدے میں ہی اتار دیتا اور ننگے پیر گھاس پہ آ جاتا۔ ٹھنڈی نرم گھاس اس کے تن من کو شانت سا کر دیتی تھی۔

کافی وقت ادھر ادھر ٹہلنے سے جب وہ تھک گیا تو وہیں ٹالی کے درخت کی ٹھنڈی چھواؤں تلے لیٹ گیا۔ دونوں ہاتھ سر کے پیچھے رکھ کے جیسے تکتے کی طرح سر اور گردن کو سہارا دیا۔ اور ٹالی کی گھنی لمبی شاخوں پہ نظر جما گیا۔

"خان۔۔۔" شہباز کی آواز پہ وہ چونکا ضرور تھا لیکن اس نے اس آدمی کی طرف دیکھنے کی زحمت نہیں کی تھی۔

"بولو۔۔۔"

"خان۔۔۔ ان لوگوں کا کچھ پتہ نہیں چلا۔ محلے والوں نے بھی یہی بتایا کہ نہ تو وہ ان کے نئے گھر کے بارے میں جانتے ہیں نہ ہی اس لڑکے کے بارے میں جس سے اس لڑکی کی شادی ہوئی ہے۔ لیکن خان۔۔۔" بات کے آخر میں وہ ذرا رکاوٹوں جیسے کچھ تذبذب کا شکار ہو۔

"پوری بات بتاؤ۔۔۔ شہباز" وہ آٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس کی پیشانی پہ غصے کی لکیریں گہری ہونے لگیں تھیں۔۔۔

"بڑے خان نے ہم سب کو سختی سے منع کر دیا ہے خان اس لڑکی کے بارے میں کوئی بھی بات بتانے سے، انہوں نے کہا ہے کہ اگر ہم میں سے کوئی بھی ایسا کرے گا تو وہ اسے مار دیں گے" اس آدمی کے لہجے میں خوف تھا۔ ضیاء کی بھنویں ذرا دیر سکڑی تھیں۔ پھر جیسے اس نے خود کو کمپوز کیا تھا۔

"اور تم جانتے ہو اگر تم بے یہ کام نہیں کیا تو میں خود کو ختم کر لوں گا"

"لیکن خان۔۔۔۔۔" اس کا چہرہ زرد ہونے لگا تھا۔ ضیاء علی خان ان سب کی گود میں پلا بڑھا تھا۔ وہ اس کی فطرت اس کی ایک ایک عادت سے اچھی طرح واقف تھے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے ضیاء علی خان جو کہتا ہے وہ کر دکھاتا ہے۔ اپنی بات سے ایک قدم پیچھے ہٹنا اسے گوارا نہیں

رہتا۔

"تم گاؤں واپس جاسکتے ہو شہباز خان۔۔۔ بڑے خان کو تمھاری ضرورت ہے" اس نے آگے بڑھ کے شہباز کے کندھے سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا۔

"اور ہاں اپنے دوسرے آدمیوں کو بھی یہاں سے لیتے جانا۔ میں یہ کام خود کر لوں گا" اس نے آخر میں سخت لہجے میں کہا تھا۔ جس کا مطلب صاف تھا اب وہ ان کو اپنے فارم ہاؤس میں مزید برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ ضیاء کے وہاں سے اندر جاتے ہی اس نے سہراب خان کا نمبر ملایا تھا۔ آخری حکم بہر حال انہی کا ہوتا تھا۔ دوسری طرف ٹیل جا رہی تھی۔ وہ منتظر تھا۔۔۔

☆.....☆.....☆

چار بجنے میں ابھی کچھ وقت تھا۔ اس نے باہر باء جی کا پیہ کر دیا۔ وہ ابھی کسی کارز میٹنگ کے سلسلے میں کہیں باہر تھے۔ مطلب ان کے خاص کارندے سبھی ان کے ساتھ تھے۔ حویلی میں وہی اکا دکا پہرے دار ہی تھے باقی ہوتے بھی تو میٹھک کی طرف ہوتے یا مردان خانے کی طرف۔ سو وہ بے فکری سے حویلی کے ویران حصے تک تو جا ہی سکتی تھی۔ جب تک ابراہیم اس کی مدد کو آتا تب تک وہ کافی اچھی طرح حالات کا جائزہ بھی لے سکتی تھی اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وقت سے پہلے ابراہیم کے آنے سے پہلے ہی قسمت اس کا کام آسان کر دیتی۔ تب تو اور بھی اچھا تھا۔ وہ یہ بات ابراہیم کو بھی نہ بتاتی اور یہ راز، راز ہی رہتا۔ لیکن بہر حال یہ سب سوچنے میں ضرور آسان تھا۔ عمل میں اسی قدر مشکل۔

وہ بڑی سی چادر میں خود کو اچھی طرح ڈھانپتی حویلی کی اندرونی راہداری سے ہوتی پچھلی طرف بارہ دری کے قریب کھلنے والی کھڑکیوں میں آٹھہری۔ اس نے کھڑکی میں کھڑے ہو کے دور مردان خانے کی چھت کے کونے پہ بنے مورچے پہ نظر ڈالی۔ وہاں دو ہٹے کٹے آدمی گپ شپ میں مصروف تھے لیکن ان میں سے ایک کی توجہ مکمل طور پہ حویلی کے اسی ویران حصے کی طرف ہی تھی۔ یہ ویران حصہ آگے جا کر پرانی نہر پہ جا کے ختم ہو جاتا تھا اور اس کے دوسری طرف کی کیکر اور ببول کے پودوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ تھا۔ تبھی اس طرف سے دشمنوں کا خطرہ کم تو تھا لیکن بہر حال کوئی اس صورتحال کا فائدہ نہ اٹھالے اس کے لئے خاص طور پہ یہ مورچہ بنایا گیا تھا۔ یہ واحد مورچہ تھا جو زمانہ حصے سے بھی نظر آتا تھا اور اسی کی وجہ سے وہ اکثر صرف حویلی کے تیسرے حصے میں ہی محصور رہتے تھے۔ سامنے اور اس طرف والے صحن میں جانے کی ان کو اجازت نہ تھی۔

وہ سوچوں میں غلطان ٹہری تھی۔ جب سیٹی کی تیز آواز نے اسے چونکا دیا تھا۔ اس نے سر کھڑکی سے ذرا سا باہر نکال کے دیکھا۔ سیٹی کی آواز یقیناً مردان خانے کی طرف سے آئی تھی۔ مطلب چند لمحوں میں ابراہیم کو اسی مورچے پہ ہونا تھا۔ وہ احتیاطاً پیچھے ہو کر اس طرف دیکھنے لگی۔ اور اس کی توقع کے عین مطابق صرف چند منٹس میں ابراہیم مورچے پہ چڑھتا دکھائی دیا تھا۔ سفید رنگ کے کاٹن میں اس کا خوب رو سراپا چمکتی دھوپ میں چمکنے لگا تھا۔ آستینیں فولڈ کئے اوپر آتے ہوئے وہ ان دونوں آدمیوں سے کچھ بولا تھا۔ ان کی توجہ ابراہیم کی طرف ہو چکی تھی۔ ان میں سے ایک آدمی مورچے کے ساتھ لگی لکڑی کی سیڑھی سے نیچے اتر گیا تھا۔ دوسرا اب مکمل طور پہ ابراہیم کے ساتھ بات چیت میں مصروف تھا۔ ابراہیم نے اس کی تلاش میں نظریں دو ذائین تھیں اور اس نے تیزی سے باہر آ کر خود کو ظاہر کیا تھا۔ اسے دیکھتے ہی ابراہیم نے آہستگی سے یوں ہاتھ ہلا کے سر کے پیچھے لے گیا تھا جیسے بال سیٹ کر رہا ہو۔ اس کا اشارہ ملتے ہی وہ تیزی سے ویرانے کی طرف بھاگی تھی۔ مطلوبہ جگہ تک پہنچنے میں اسے چند لمحے لگے تھے۔ اس جگہ پہ پہنچتے ہی اس نے تیزی سے ہاتھ مار کے گھاس پھوس ہٹایا۔ راستہ سامنے تھا۔ وہ ادھر ادھر دیکھے بغیر تیزی سے اندر پھسل گئی۔ حیران کن طور پہ آج اللہ لوک بالکل پرسکون تھیں اور پوری شدت سے اس کی ہی منتظر تھیں۔ آج نہ انہوں نے کوئی عجیب لفظ بولے تھے نہ ہی چلائیں تھیں۔ اسے دیکھتے ہی اطمینان سا ان کے چہرے پہ پھیل گیا تھا۔

"تو آگئی۔۔۔ مجھے پورا یقین تھا تو ضرور آئے گی"

"لیکن میں آج بس جانے کے لئے آئی ہوں اللہ لوک۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ ہمیں آج شہر کے لئے نکلنا ہے اور باء جی بس آنے ہی والے ہوں گے" وہ تیزی سے انہیں بتانے لگی۔

"آپ نے کہا تھا مجھ سے۔ آپ نے مجھے بھت کچھ دینا ہے" اس نے اس طرح ان کے سامنے اپنا دایاں ہاتھ پھیلا دیا جیسے وہ واقعی اسے کچھ دینے والی تھیں۔

"لیکن تیری ہتھیلی تو بھت چھوٹی ہے اور بھار (بار۔۔۔ وزن) بہت زیادہ۔۔۔ تو کیسے اٹھائے گی اتنا بھار۔۔۔" اللہ لوک نے مایوس لہجے میں کہا۔ اوزگل نے مایوسی سے اپنے پھیلے ہاتھ کو دیکھا تھا۔ جیسے واقعی اب اس کا آنا ضائع ہو جائے گا۔

"جا چلی جا۔ اس سے پہلے کہ دیر ہو جائے۔۔۔ اس سے پہلے کہ حرس کا شیطان تجھے بھی قید کر لے۔ تنہائی اور بھوک تیرا بھی مقدر بن جائے۔۔۔ بھاگ جا یہاں سے۔۔۔" انہوں نے اس کی طرف پشت کرتے ہوئے آنکھیں بند کیں تھیں پھر بھی اوزگل نے ان کے گال پہ بہتے پانی کی لکیر دیکھ لی تھی۔

"لیکن اتنا تو بتا دیں اللہ لوک۔ اس دہن کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ میں واپس چلی جاؤں گی۔ بس اتنا بتا دیں پلیز ورنہ یہ سوال مجھے چین سے نہیں رہنے دے گا" اسے محسوس ہو رہا تھا۔ اللہ لوک بے آواز رونے لگیں تھیں۔

"تیرے باپ کے پاس ایک رتی ڈیری (سرخ ڈائری) ہوگی۔ جا اسے ڈھونڈ لے سب جان لے گی۔ دوبارہ ادھر نہیں آنا۔"

انہوں نے سختی سے آنسو رگڑتے ہوئے اسے کہا تھا۔

"لیکن کیوں اللہ لوک؟" وہ ان کے یوں صاف جواب دینے پہ تڑپ گئی۔

"مردوں کو اگر انسانوں کی عادت ہو جائے نہ تو قبر تنگ پڑنے لگتی ہے۔ جامیری قبر تنگ نہ کر۔۔ چلی جا۔۔" وہ منہ پھر گئیں

تھیں۔ اب ان کی مکمل پشت تھی۔ وہ انکا چہرہ نہیں دیکھ سکتی تھی۔۔

"اللہ لوک" وہ بے بسی سے انہیں پکارتی رہی۔ پھر جواب نہ پا کر مجبوراً آٹھ کر باہر آ گئی۔ ہاتھوں سے دوبارہ اس جگہ کو دوبارہ

ڈھکا اور حویلی کے حصے میں آتے ہی ابراہیم کو دیکھا۔ وہ ابھی بھی وہیں تھا۔ اس کا منتظر۔ اس آدمی کو اس نے خوب باتوں میں لگا رکھا تھا۔

اوزگل پہ نظر پڑتے ہی اس کے چہرے پہ اطمینان دوڑتا چلا گیا تھا۔ اوزگل نے ہاتھ ہلا کے اسے اشارہ کیا اور اندر آ گئی۔ ہر چیز سے اس کا

دل سخت اچاٹ ہو گیا تھا۔ لیکن پھر

بھی وہ اپنے کمرے میں جانے کی بجائے باء جی کے کمرے کی طرف آ گئی۔ اسے اب ہر حال میں وہ سرخ کتاب ڈھونڈنی

تھی۔۔۔

☆.....☆.....☆

چار بجنے میں ابھی کچھ وقت تھا۔ اس نے باہر باء جی کا پیہ کر دیا۔ وہ ابھی کسی کارنر میٹنگ کے سلسلے میں کہیں باہر تھے۔ مطلب ان

کے خاص کارندے سبھی ان کے ساتھ تھے۔ حویلی میں وہی اکا دکا پہرے دار ہی تھے باقی ہوتے بھی تو میٹنگ کی طرف ہوتے یا مردان خانے

کی طرف۔ سو وہ بے فکری سے حویلی کے ویران حصے تک تو جا ہی سکتی تھی۔ جب تک ابراہیم اس کی مدد کو آتا تب تک وہ کافی اچھی طرح حالات

کا جائزہ بھی لے سکتی تھی اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وقت سے پہلے ابراہیم کے آنے سے پہلے ہی قسمت اس کا کام آسان کر دیتی۔ تب تو اور بھی

اچھا تھا۔ وہ یہ بات ابراہیم کو بھی نہ بتاتی اور یہ راز، راز ہی رہتا۔ لیکن بہر حال یہ سب سوچنے میں ضرور آسان تھا۔ عمل میں اسی قدر مشکل۔

وہ بڑی سی چادر میں خود کو اچھی طرح ڈھانپتی حویلی کی اندرونی راہداری سے ہوتی پچھلی طرف بارہ دری کے قریب کھلنے والی

کھڑکیوں میں آٹھ رہی۔ اس نے کھڑکی میں کھڑے ہو کے دور مردان خانے کی چھت کے کونے پہ بنے مورچے پہ نظر ڈالی۔ وہاں دو ہٹے

کٹے آدمی گپ شپ میں مصروف تھے لیکن ان میں سے ایک کی توجہ مکمل طور پہ حویلی کے اسی ویران حصے کی طرف ہی تھی۔ یہ ویران حصہ آگے

جا کر پرانی نہر پہ جا کے ختم ہو جاتا تھا اور اس کے دوسری طرف کی کیکر اور ببول کے پودوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ تھا۔ تبھی اس طرف

سے دشمنوں کا خطرہ کم تو تھا لیکن بہر حال کوئی اس صورتحال کا فائدہ نہ اٹھالے اس کے لئے خاص طور پہ یہ مورچہ بنایا گیا تھا۔ یہ واحد مورچہ تھا

جو زمانہ حصے سے بھی نظر آتا تھا اور اسی کی وجہ سے وہ اکثر صرف حویلی کے تیسرے حصے میں ہی محصور رہتے تھے۔ سامنے اور اس طرف والے

صحن میں جانے کی ان کو اجازت نہ تھی۔

وہ سوچوں میں غلطان ٹہری تھی۔ جب سیٹی کی تیز آواز نے اسے چونکا دیا تھا۔ اس نے سر کھڑکی سے ذرا سا باہر نکال کے دیکھا۔ سیٹی کی آواز یقیناً مردان خانے کی طرف سے آئی تھی۔ مطلب چند لمحوں میں ابراہیم کو اسی مورچے پہ ہونا تھا۔ وہ احتیاطاً پیچھے ہو کر اس طرف دیکھنے لگی۔ اور اس کی توقع کے عین مطابق صرف چند منٹس میں ابراہیم مورچے پہ چڑھتا دکھائی دیا تھا۔ سفید رنگ کے کاٹن میں اس کا خوب رو سراپا چمکتی دھوپ میں چمکنے لگا تھا۔ آستینیں فولڈ کئے اوپر آتے ہوئے وہ ان دونوں آدمیوں سے کچھ بولا تھا۔ ان کی توجہ ابراہیم کی طرف ہو چکی تھی۔ ان میں سے ایک آدمی مورچے کے ساتھ لگی لکڑی کی سیڑھی سے نیچے اتر گیا تھا۔ دوسرا اب مکمل طور پہ ابراہیم کے ساتھ بات چیت میں مصروف تھا۔ ابراہیم نے اس کی تلاش میں نظریں دو ڈائین تھیں اور اس نے تیزی سے باہر آ کر خود کو ظاہر کیا تھا۔ اسے دیکھتے ہی ابراہیم نے آہستگی سے یوں ہاتھ ہلا کے سر کے پیچھے لے گیا تھا جیسے بال سیٹ کر رہا ہو۔ اس کا اشارہ ملتے ہی وہ تیزی سے ویرانے کی طرف بھاگی تھی۔ مطلوبہ جگہ تک پہنچنے میں اسے چند لمحے لگے تھے۔ اس جگہ پہ پہنچتے ہی اس نے تیزی سے ہاتھ مار کے گھاس پھوس ہٹایا۔ راستہ سامنے تھا۔ وہ ادھر ادھر دیکھے بغیر تیزی سے اندر پھسل گئی۔ حیران کن طور پہ آج اللہ لوک بالکل پرسکون تھیں اور پوری شدت سے اس کی ہی منتظر تھیں۔ آج نہ انہوں نے کوئی عجیب لفظ بولے تھے نہ ہی چلائیں تھیں۔ اسے دیکھتے ہی اطمینان سا ان کے چہرے پہ پھیل گیا تھا۔

"تو آگئی۔۔۔ مجھے پورا یقین تھا تو ضرور آئے گی"

"لیکن میں آج بس جانے کے لئے آئی ہوں اللہ لوک۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ ہمیں آج شہر کے لئے نکلنا ہے اور باء جی بس آنے ہی والے ہوں گے" وہ تیزی سے انہیں بتانے لگی۔

"آپ نے کہا تھا مجھ سے۔ آپ نے مجھے بھت کچھ دینا ہے" اس نے اس طرح ان کے سامنے اپنا دایاں ہاتھ پھیلا دیا جیسے وہ واقعی اسے کچھ دینے والی تھیں۔

"لیکن تیری ہتھیلی تو بھت چھوٹی ہے اور بھار (بار۔۔۔ وزن) بہت زیادہ۔۔۔ تو کیسے اٹھائے گی اتنا بھار۔۔۔" اللہ لوک نے مایوس لہجے میں کہا۔ اوزگل نے مایوسی سے اپنے پھیلے ہاتھ کو دیکھا تھا۔ جیسے واقعی اب اس کا آنا ضائع ہو جائے گا۔

"جا چلی جا۔ اس سے پہلے کہ دیر ہو جائے۔۔۔ اس سے پہلے کہ حرس کا شیطان تجھے بھی قید کر لے۔ تنہائی اور بھوک تیرا بھی مقدر بن جائے۔۔۔ بھاگ جا یہاں سے۔۔۔" انہوں نے اس کی طرف پشت کرتے ہوئے آنکھیں بند کیں تھیں پھر بھی اوزگل نے ان کے گال پہ بہتے پانی کی لکیر دیکھ لی تھی۔

"لیکن اتنا تو بتا دیں اللہ لوک۔ اس دہن کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ میں واپس چلی جاؤں گی۔ بس اتنا بتا دیں پلیز ورنہ یہ سوال مجھے چین سے نہیں رہنے دے گا" اسے محسوس ہو رہا تھا۔ اللہ لوک بے آواز رونے لگیں تھیں۔

"تیرے باپ کے پاس ایک رتی ڈیری (سرخ ڈائری) ہوگی۔ جا اسے ڈھونڈ لے سب جان لے گی۔ دوبارہ ادھر نہیں آنا۔"

انہوں نے سختی سے آنسو رگڑتے ہوئے اسے کہا تھا۔

"لیکن کیوں اللہ لوک؟" وہ ان کے یوں صاف جواب دینے پہ تڑپ گئی۔

"مردوں کو اگر انسانوں کی عادت ہو جائے نہ تو قبر تنگ پڑنے لگتی ہے۔ جامیری قبر تنگ نہ کر۔۔ چلی جا۔۔" وہ منہ پھر گئیں تھیں۔ اب ان کی مکمل پشت تھی۔ وہ انکا چہرہ نہیں دیکھ سکتی تھی۔۔

"اللہ لوک" وہ بے بسی سے انہیں پکارتی رہی۔ پھر جواب نہ پا کر مجبوراً اٹھ کر باہر آ گئی۔ ہاتھوں سے دوبارہ اس جگہ کو دوبارہ ڈھکا اور حویلی کے حصے میں آتے ہی ابراہیم کو دیکھا۔ وہ ابھی بھی وہیں تھا۔ اس کا منتظر۔ اس آدمی کو اس نے خوب باتوں میں لگا رکھا تھا۔ اوزگل پہ نظر پڑتے ہی اس کے چہرے پہ اطمینان دوڑتا چلا گیا تھا۔ اوزگل نے ہاتھ ہلا کے اسے اشارہ کیا اور اندر آ گئی۔ ہر چیز سے اس کا دل سخت اچاٹ ہو گیا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ اپنے کمرے میں جانے کی بجائے باء لہجی کے کمرے کی طرف آ گئی۔ اسے اب ہر حال میں وہ سرخ کتاب ڈھونڈنی تھی۔۔۔

☆.....☆.....☆

"میرے ہر اک کل ہر اک لمحے میں۔۔۔

تو لکھ دے میرا اسے۔۔۔

ہر کہانی میں،

سارے قصوں میں۔۔۔

دل کی دنیا کے۔۔۔

سچے رشتوں میں۔۔۔

زندگانی کے۔۔۔۔

سارے حصوں میں۔۔۔

تو لکھ دے میرا اسے۔۔۔

اے خدا۔۔۔ اے خدا۔۔۔

جب بنا اس کا ہی بنا۔۔۔۔۔"

بارش جس قدر تیز ہوتی جا رہی تھی اس کے اندر کی گھٹن مزید بڑھتی جا رہی تھی۔ اس نے تیز ہوا اور بارش کی پرواہ نہ کرتے ہوئے سارے شیشے گرا دیے تھے۔ ہوا پہلے ہی جھونکے میں اس کے بال بکھیر گئی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ سے سٹیرنگ سنبھالنے ہوئے دوسرے

ہاتھ سے سختی سے سینے کو مسلاتھا۔ پھر شرٹ کے اوپر کے دو تین بٹن اسی ہاتھ سے کھول لئے تھے۔ سانس لینے میں آسانی ہوئی تھی لیکن درد تھا کہ بڑھتا جا رہا تھا۔ اس نے میوزک اور تیز کر دیا۔۔

"اے خدا۔۔۔ اے خدا۔۔۔"

جب بنا اس کا ہی بنا۔۔۔۔

ہراک لمحے میں۔۔۔

ہراک پنے پہ۔۔

تو لکھ دے میرا سے۔۔۔۔۔

یا خدا۔۔۔ اے خدا۔۔۔۔"

سب کچھ اس کے خلاف تھا۔ رب گواہ تھا۔ اس کا رواں رواں اس کا طلب گار تھا۔ وہ اس سے نفرت کا دعوے دار کبھی بھی اس کی عزت کا دشمن نہیں ہوا تھا۔ وہ نہ سہی اس کی عزت اسے عزیز تھی۔ اس نے سوچا تھا۔ بس چھوٹا سا تماشہ ہوگا۔ اس کے باپ کا سالوں سے انتقام میں جلتا دل کچھ ٹھنڈک پائے گا، وہ چپ چاپ اسے گھر چھوڑ آئے گا اور اس کے اور لالہ کے راستے ہمیشہ کے لئے الگ ہو جائیں گے۔ بات ختم ہو جائے گی لیکن۔۔۔۔

لیکن بات ختم کہاں ہوئی تھی بات تو جیسے ابھی شروع ہوئی تھی۔ سب کچھ پلٹ گیا تھا۔

اس کے باپ کا دل بھلے سکون پا گیا تھا لیکن اس نے سکھ چین سب کھو دیا تھا۔ دو کٹورا آنکھیں اور اس کے مضبوط ہاتھوں سے سمجھتے نرم کوئل ہاتھ۔۔۔۔ اس کے وجود سے لپٹ کے رہ گئے تھے۔

اس کا وجود چنا ہو گیا۔۔۔

اور لالہ جیسے اس کی نس نس میں سما گئی تھی۔۔۔

وہ کہیں نہیں رہا تھا۔۔۔

وہ تو انتقام کی جلتی بجھتی چنگاری کو ہمیشہ کے لئے ٹھنڈا کرنے چلا تھا۔ اور۔۔۔

اس کا تن من جل کے سوا (راکھ) ہو گیا تھا۔

انتقام کی چنگاری نے نہ جانے کب

بھڑکتے ہوئے عشق کے شعلے کی شکل اختیار کر لی تھی۔ کبھی کسی سے نہ ہارنے والا ضیاء^۱ علی خان

"اس کا اس میں ہوں اسے ہوں اسی کا رہنے دے۔۔۔"

میں تو پیسا ہوں ہے دریا وہ ذریعہ وہ جینے کا میرے۔

دل مجھے دے اگر
درد دے اس کا پر
اس کی وہ ہونسی
گو نچے جو میرا گھر۔۔۔

اے خدا۔۔۔ اے خدا
جب بنا اس کا ہی بنا۔۔۔۔۔
اسے لگا درد سے اس کا دل پھٹ جائے گا۔۔ اس نے گانا بدل دیا تھا۔
"اور گاڑی روک کے باہر نکل آیا تھا۔۔
"یار کو ہم نے جا بجا دیکھا۔۔۔
کہیں ظاہر کہیں چھپا دیکھا۔۔۔"
بارش اسے بری طرح بھگونے لگی تھی۔ نئے موسم کی کھلتی سردی بھی اس کے اندر کی تپش نہیں کم کر پا رہی تھی۔

"کہیں وہ بادشاہ تخت نشین
کہیں کا سائے گدا دیکھا۔۔۔۔
یار کو ہم نے جا بجا دیکھا۔۔۔"
سفید پاکیزہ آنچل تھا جو اس کے دل کو اپنے ساتھ لپیٹے اڑا تھا۔
تخیل کامل ہونے لگا تھا۔۔
درد بڑھنے لگا تھا۔۔

"کہیں وہ ڈرلباس معشوقاں

برسر ناز اور ادا دیکھا۔۔۔

کہیں ظاہر کہیں چھپا دیکھا۔۔۔۔۔"

دونوں ہاتھ بالوں میں پھنسا تھوئے وہ درد سے چلاتا زمین پہ بیٹھتا چلا گیا تھا۔ بارش اور تیز ہوئی تھی۔ اور اس کی آنکھوں سے

بہتے آنسو بھی۔۔۔

چٹانوں کی طرح خود کو مضبوط سمجھنے والا ضیاء علی خان ریت کی طرح بکھر گیا تھا۔۔۔



ناول ”محبت لفظ ہے لیکن“ ابھی جاری ہے۔ اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی 5 تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

انعم خان کا بہت خوبصورت نیا ناول

اس دل میں بسے ہو تم

ہر ماہ باقاعدگی سے کتاب گھر پر پیش کیا جا رہا ہے
نئی اقساط پڑھنے کیلئے وزٹ کریں

kitaabghar.com

عابدہ سبین کا بہت خوبصورت نیا ناول

جب پیار کی رت بدل جائے

ہر ماہ باقاعدگی سے کتاب گھر پر پیش کیا جا رہا ہے
نئی اقساط پڑھنے کیلئے وزٹ کریں

kitaabghar.com

قسط نمبر 12

باء جی شہر سے واپس آچکے تھے اور اب اسے اور گل مینے کو واپس شہر جانا تھا۔ شام تک نکلنا تھا انہیں اور وہ جانے سے پہلے کچھ وقت ضرور اللہ لوک کے پاس گزارنا چاہتی تھی۔ لیکن رات سے پہلے یہ کسی طرح خطرے سے خالی نہ تھا کیونکہ رات دن حویلی کے سارے اندرونی و بیرونی مورچوں پہ سخت نگرانی ہوتی تھی۔ رات کو پھر بھی اس طرف ویرانی اور اندھیرا ہوتا تھا تو وہ فائدہ اٹھالیتی تھی لیکن دن کے وقت وہ یہ رسک نہیں لے سکتی تھی کیونکہ دن کی روشنی میں وہ آسانی سے کسی کی بھی نظر میں آ سکتی تھی اور پھر شاید وہ اس زیر زمین زندان اور اس لال حویلی کے چھپے راز کبھی نہ جان پاتی۔ اتنا تو اسے اندازہ ہو گیا تھا۔ اس کے باء جی کی شخصیت میں کچھ تو غلط تھا۔ وہ ویسے نہیں تھے جیسا نظر آتے تھے۔ کچھ پرت چڑھے تھے ان کے کردار پر اور یہ پرت اس وقت اس کے سامنے کوئی کھول سکتا تھا تو وہ صرف اللہ لوک ہی تھی۔ رات ان سے سنی گئی داستان میں وہ اتنا تو جان ہی گئی تھی کہ جو دلہن بنی وہ لگی تھیں۔ کیونکہ سین پھپھو کے بارے میں اس نے سنا تھا وہ گھر سے بھاگ گئی تھیں اور اس کے بعد آج تک ان کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا لیکن یہ بات اس کے لئے ابھی بھی اچنبھے کا باعث تھی کہ اگر لگی کی شادی اتنی دھوم دھام سے ہوئی تو وہ خود کو نوچ نوچ کے اجاڑنے والی وہ دلہن لڑکی کون تھی؟ اللہ لوک سے آج اسے یہی جاننا تھا اور اسے اسی بے صبری کے باعث دن کا ٹنا مشکل ہو رہا تھا۔ اوپر سے اب باء جی کا نیا حکم۔ وہ حقیقتاً پریشان ہو کے رخ گئی تھی۔

”جو بھی بہر حال اللہ لوک سے ملے بغیر میں ابھی نہیں جاسکتی۔“ اس نے جیسے تہیہ کیا تھا لیکن وہ خود بھی جانتی تھی یہ سب اتنا آسان نہ تھا۔ کافی دیر تک وہ کمرے میں بند ادھر سے ادھر ٹھہرتی اللہ لوک سے ملنے کا راستہ تلاش کرتی رہی اور پھر اچانک ہی اسے ابراہیم کا خیال آیا تھا۔ ابراہیم وہ شخص تھا جس پہ وہ اعتبار کر سکتی تھی۔ وہ قابل بھروسہ تھا اور جس طرح کی سپورٹس تھی وہی ایک آدمی تھا جو نہ صرف اس پہ اعتبار کرتا بلکہ مدد بھی کرتا۔ اس نے فوراً اسے تلاش کرنا شروع کیا۔ وہ حویلی کے پچھلے صحن میں اپنے کوارٹر میں موجود اپنے سامان کی پیکنگ میں مصروف تھا۔

”ابراہیم۔“ اس نے دروازہ ہلکے سے بجاتے ہوئے آہستگی سے پکارا۔ ابراہیم کے ہاتھ اس کی آواز پہ یکدم رکے۔

”خان زادی۔“ وہ مڑے بغیر دھیرے سے بولا تھا۔ گل مینہ سے تو اسے اس قسم کی حرکت کی ہمیشہ امید اور ڈر رہتا تھا لیکن اوڑگل اس کے کمرے تک آ جانے کی ہمت کر لے گی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اسے پریشانی گھیرنے لگی تھی۔

”مجھے جانے سے پہلے حویلی کے ویران بیرونی حصے میں ایک ضروری کام ہے۔ تم بس میری یہ مدد کرو کہ اس طرف والے

مورچے کے لوگوں کو آدھے گھنٹے کے لئے دوسری طرف مصروف رکھو۔ میں شہر جا کے تمہیں سب بتا دوں گی۔ میں چار بجے تمہارا انتظار کروں گی۔“ یہ کہہ کر وہ رکی نہیں، واپس بھاگ گئی۔

ابراہیم حیران سادروازے تک آیا تو وہ پچھلا صحن عبور کرتی برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔

”خان زادی کو مجھ اس ویرانے میں ایسا کیا کام کہ انہیں میری مدد کی ضرورت پڑ گئی۔“ وہ اب پلٹتے ہوئے پریشانی سے سوچ رہا تھا۔ ہونہ ہو کوئی بڑی بات تھی ورنہ ایسی بے باکی کی توقع گل مینہ سے کی جاسکتی تھی لیکن اوزگل۔۔۔

وہ جس مزاج کی لڑکی تھی۔ ابراہیم حیات اچھی طرح جانتا تھا۔ کسی بھی صورت وہ کسی بھی مرد کو کبھی مخاطب نہیں کرتی تھی۔ گھر کے مردوں کو بھی بہت کم، ہچکچاتے ہوئے۔۔۔ اور ایسے میں اس قدر اچانک اسے تقریباً حکم سنا کہ اس کا چلے جانا کام کے واقعی اہم ہونے کا پتہ دے رہا تھا۔

گل مینہ ہوتی تو وہ یقیناً ٹال جاتا لیکن اب اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ ٹھیک چار بجے وہاں ضرور اس کی مدد کرنے جائے گا۔ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ مطمئن ہو کر وہ دوبارہ اپنے کام میں مشغول ہو گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

اس کی آنکھ کھلی تو رات ہونے لگی تھی۔ اس کا سر سہلاقی دیدے بالکل اسے قریب بیٹھی تھیں۔ ان کے چہرے پہ اس کے لئے پریشانی تھی۔ وہ شرمندہ سی ہو کر آٹھ بیٹھی۔

”آئم سوری۔۔۔ پتہ نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا۔“ اپنے ہاتھ کی انگلیوں کو مروڑتے ہوئے اس نے معذرت کی تھی اور لب دانتوں تلے چپکتے ہوئے اپنے آنسوؤں پہ ضبط کرنے کی کوشش کی تھی۔

”آنسوؤں کو روکنا نہیں چاہئے۔ انہیں بہہ جانے دیا جائے تو زیادہ اچھا ہوتا ہے۔ اس سے من کے اندر کا سارا میل دھل جاتا ہے۔ جیسے بارش کے بعد پتے پتے پہ جمی گرد صاف ہو جاتی ہے۔ ویسے ہی من کے کئی درد، کئی گھاؤ ان کے ساتھ بہہ جاتے ہیں۔“ انہوں نے نرمی سے اس کا کامل سا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا تھا۔ لالہ کی پلکیں اس بار آنسوؤں کا بوجھ نہیں سہار پائی تھیں۔ وہ بے آواز رونے لگی تھی۔

”تم اور باری، زندگی کے کس موڑ پہ آچکے ہو، میں نہیں جانتی اس کے باوجود بھی کہ باری مجھے سب حالات بتا چکا ہے۔ لیکن مجھے نہیں معلوم کیا وجہ تھی جو تمہیں یوں رسوا کر گئی لیکن باری نے ایک مرد ہونے کے ناطے جو کچھ کیا وہ میرے لئے فخر کی بات ہے۔ پھر بھی لالہ۔۔۔“ انہوں نے اس کا ہاتھ نرمی سے دباتے ہوئے تھوڑا توقف کیا۔

”پھر بھی میں چاہتی ہوں کہ تمہاری زندگی مکمل ہو اور میرے باریال کی بھی۔ وہ لاکھ بڑا ظرف کر لے، ہے تو ایک مرد

ہی۔۔ اور اس طرح تو تم دونوں ہر دن اذیت میں گزارو گے۔ میں چاہتی ہوں کوئی ایسا راستہ تلاش کروں کہ تمہاری اور باری دونوں کا راستہ سہل ہو جائے۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے جب تم مجھے ساری حقیقت بتا دو۔“ لالہ سسکنے لگی تھی۔

”میرا یقین کرو میں تمہارا پردہ رکھوں گی۔ بالکل تمہاری ماں کی طرح۔“ انہوں نے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام کر اسے یقین دلایا تھا اور وہ بکھر کے رو دی تھی۔ زور زور سے چلا کے۔

درد اور کرب سے اس کی آواز پھٹی جا رہی تھی۔ اسے خود میں بھنپتے ہوئے دیدے نے اسے کھل کے رونے دیا تھا۔

کل اس کی حالت سے ہی وہ سمجھ گئی تھیں۔ اس کے ساتھ جو بھی حادثہ ہوا تھا وہ ابھی تک اندر ہی اندر گھٹ رہی تھی۔ اندر ہی کہیں پلنے والے درد کو باہر آنے کا راستہ نہیں ملا تھا۔ سب اپنوں کو جیسے اپنی عزت اور وقار کی پڑ گئی تھی۔ کسی نے اس کا دکھ سمجھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ تبھی وہ اندر ہی اندر بھر رہی تھی۔ دیدے کی ذرا سی محبت پہ وہ سارا درد آتش فشاں سے نکلتے لاوے کی طرح باہر آیا تھا۔

”وہ گناہ گار ہے میرا۔ اللہ گواہ ہے میرا میں اس کے ساتھ نہیں گئی تھی۔ بس حالات ایسے تھے کہ اس وقت مجھے وہ ٹھیک لگا۔ ورنہ لالہ تو مرد کے سائے سے بھی دو گز دور بھاگتی تھی۔“ وہ روتے روتے بتانے لگی تھی۔

دیدے اس کی کمر سہلاتی رہیں۔ اور پھر اس نے ساری بات بتا دی تھی۔

”مجھے ضیاء کے ہاتھ اور اس بوڑھے شخص کی زہریلی نظریں نہیں بھولتیں۔ انہوں نے میری زندگی برباد کر دی۔ اس دن اگر حالات ایسے نہ ہوتے تو خدا کی قسم لالہ ضیاء کا بڑھا ہاتھ ہمیشہ کی طرح جھٹک کے چلی جاتی۔ عزت کے ڈر سے میں خود مکڑی کے اس جال میں گھس گئی جو نہ جانے کب سے میرے لئے بنا جا رہا تھا اور یہ سب امی کا دل دکھانے کی وجہ سے ہوا میرے ساتھ۔ میں ماں کو بدکردار اور خود کو بلند کردار کہنے والی لڑکی۔۔ دیکھیں کتنی غلیظ ہو گئی ہوں میں۔ کتن

ابد بودار ہو گیا ہے میرا وجود۔۔ اور یہ میرے اندر پنپتا گند۔۔“ وہ اپنے پیٹ میں مکے مارنے لگی تھی۔

”مجھے ماریں۔۔ میں اسی قابل ہوں۔۔“ اس پہ پھر وہی جنونی کیفیت طاری ہونے لگی تھی۔ دیدے نے بہت مشکل سے اسے سنبھالا تھا۔

”میں بھی چاہتی ہوں لالہ تم بھی ایک مکمل زندگی جیو۔ یہ تمہارا حق ہے۔ لیکن اس طرح خود کو تباہ نہ کرو۔ یہ بچہ تمہیں نہیں چاہئے ہم اس کا بھی کچھ کریں گے۔ میں تمہیں خود لے کے جاؤں گی جہاں تم کہو گی۔ میں تمہارا مکمل ساتھ دوں گی لالہ۔ لیکن اس طرح خود کو اذیت پہنچا کر تم اپنے رب کی نافرمانی کرو گی یوں۔ اس کی نافرمان نہ بنو لالہ۔ اس آزمائش پہ اس کو پکارا تم اسے ہمیشہ اپنے ساتھ پاؤ گی بیٹا۔“ وہ اس کے نرم بال سہلاتے ہوئے اسے سمجھا رہی تھیں اور اس کی آنکھوں سے بہتا گرم پانی ان کی گردن جلانے جا رہا تھا۔ وہ جیسے اپنا سارا درد ان کو سونپ رہی تھی۔

”زندگی کب ایک سیدھی لکیر کی طرح رہی ہے۔ یہ تو بل کھاتے راستوں کی طرح ہوتی ہے۔ ایک طرف گہری کھائیاں اور دوسری طرف پر کیف نظارے۔۔۔ کبھی آسان لمبا سیدھا راستہ تو کبھی بل کھاتے پر خطر موڑ۔۔۔ گرنے کا خدشہ ہمیشہ رہتا ہے۔“ وہ اس کا نرم چہرہ اپنے سامنے لاتے ہوئے بولیں۔

”میں مانتی ہوں لالہ تم سے کوتاہی ہوئی اور بہت بڑی کوتاہی ہوئی۔ ہمارے بزرگوں کا ماننا ہے ماں باپ کے سامنے بولا ہمارا ایک اچھا یا برا کلام کبھی کبھی ہماری ساری قسمت پہ حاوی ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ کس نے کہا لالہ۔۔۔ کہ غلطی کی معافی نہیں۔۔۔ پھر ہمارا مذہب تو ایسا مذہب ہے جو ہمیشہ امید اور گنجائش نکالتا ہے۔ مایوس سے مایوس حالت میں بھی یقین کا دامن نہ چھوڑنے کا درس دیتا ہے۔“ وہ کچھ دیر کی تھیں۔

”لیکن میں تو باعتاب ٹھہری۔ بے اماں ٹھہری۔۔۔ معافی تلافی کی تو گنجائش ہی نہ بچی آئی۔ صرف سزا رہ گئی۔ منہ پہ اس طرح کا لک لگی کہ شاید ہی کبھی دھل پائے۔“ وہ پوری طرح مایوس تھی۔

”ٹھوکرا نہیں بھی لگتی ہے لالہ جو اللہ سے ہر معاملے میں ڈرتے ہیں۔ یہ اور بات کہ اللہ پاک انہیں سنبھال لیتا ہے۔ تمہارا معاملہ ایسا ہے کہ تم ماں کے معاملے میں اس رب کی نافرمان ہو گئیں۔ تم نے ٹھوکرا کھائی اور تمہاری روح بھی تارتار ہوئی لیکن توبہ کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔ وہ ٹھوکروالوں کو سہارا دے دے تو وہ ولی بن جاتے ہیں۔ خود سے سوچنا چھوڑ دو اور اس رب کے آگے جھک جاؤ۔ اپنے گناہ تسلیم کرو اور سچے دل دے توبہ کرو۔ وہ بے شک بڑا مہربان ہے۔“ انہوں نے نرم لہجے میں کہا تھا اور آٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

”نماز پڑھ لو۔ پھر کھانا کھاتے ہیں۔ کل باری کے جانے کے بعد تم اور میں صوفی صاحب کے پاس چلیں گے۔ وہ ضرور ہماری مدد کریں گے۔ تمہارے ساتھ ساتھ اب یہ سب باری کے لئے بھی ضروری ہے۔ تم تو پھر بھی ایک آزمائش سے گزر چکی ہو۔ باریاں ابھی امتحان کی زد میں ہے اور میں تم دونوں کی مدد کرنا چاہتی ہوں۔“ لالہ نے سرخ ہوتی نظروں سے ان کا پر نور چہرہ دیکھا تھا اور پھر خود کو سنبھالتی وضو کرنے اٹھ گئی کہ بعض اوقات رب کے در کے علاوہ انسان کے پاس اور کوئی در نہیں رہتا کھٹکھٹانے کو۔۔۔ دیدے اسے اٹھتا دیکھ کر مطمئن ہوتے ہوئے باہر نکل گئی تھیں۔

☆.....☆.....☆

دن مختصر ہونے لگے تھے۔ تبھی فضا میں بھی گرمی اور تپش کی جگہ نمی اور ٹھنڈک لینے لگی تھی۔ صبح سویرے گھاس پہ ٹھنڈی اوس کے قطرے سردی کی دستک دیتے محسوس ہوتے۔

جب سے لالہ اس جگہ سے گئی تھی۔ وہ بالکل بدل گیا تھا۔ پہلے والا لالہ ابالی، لاپروا سا ضیاء کہیں کھو گیا تھا۔ ساری ساری رات جاگنے اور دو پہر صبح کرنے والا ضیاء اب سرشام لیٹ جاتا۔ دواؤں کے استعمال کے باوجود رات کے آخری حصے میں ہی اس کی آنکھ کھل جاتی

تھی اور باقی سارا وقت وہ پھر سگریٹ کے دھوئیں میں اڑا دیتا۔ سورج کی کرنیں دھرتی کا سینہ جگمگانے لگتیں تو وہ باہر لان میں آجاتا۔ پیروں میں اڑ سے آرام دہ چپل برآمدے میں ہی اتار دیتا اور ننگے پیر گھاس پہ آجاتا۔ ٹھنڈی نرم گھاس اس کے تن من کو شانت سا کر دیتی تھی۔

کافی وقت ادھر ادھر ٹہلنے سے جب وہ تھک گیا تو وہیں ٹالی کے درخت کی ٹھنڈی چھاؤں تلے لیٹ گیا۔ دونوں ہاتھ سر کے پیچھے رکھ کے جیسے تنکے کی طرح سر اور گردن کو سہارا دیا اور ٹالی کی گھنی لمبی شاخوں پہ نظر جما گیا۔

”خان۔“ شہباز کی آواز پہ وہ چونکا ضرور تھا لیکن اس نے اس آدمی کی طرف دیکھنے کی زحمت نہیں کی تھی۔
”بولو۔“

”خان! ان لوگوں کا کچھ پتہ نہیں چلا۔ محلے والوں نے بھی یہی بتایا کہ نہ تو وہ ان کے نئے گھر کے بارے میں جانتے ہیں نہ ہی اس لڑکے کے بارے میں جس سے اس لڑکی کی شادی ہوئی ہے۔۔۔ لیکن خان۔۔۔“ بات کے آخر میں وہ ذرا رکاوٹوں جیسے کچھ تذبذب کا شکار ہو۔

”پوری بات بتاؤ۔ شہباز۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس کی پیشانی پہ غصے کی لکیریں گہری ہونے لگی تھیں۔
”بڑے خان نے ہم سب کو سختی سے منع کر دیا ہے خان اس لڑکی کے بارے میں کوئی بھی بات بتانے سے، انہوں نے کہا ہے کہ اگر ہم میں سے کوئی بھی ایسا کرے گا تو وہ اسے مار دیں گے۔“ اس آدمی کے لہجے میں خوف تھا۔ ضیاء کی بھنویں ذرا دیر سکڑی تھیں۔ پھر جیسے اس نے خود کو کمپوز کیا تھا۔

”اور تم جانتے ہو اگر تم نے یہ کام نہیں کیا تو میں خود کو ختم کر لوں گا۔“
”لیکن خان۔۔۔“ اس کا چہرہ زرد ہونے لگا تھا۔ ضیاء علی خان ان سب کی گود میں پلا بڑھا تھا۔ وہ اس کی فطرت اس کی ایک ایک عادت سے اچھی طرح واقف تھے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے ضیاء علی خان جو کہتا ہے وہ کر دکھاتا ہے۔ اپنی بات سے ایک قدم پیچھے ہٹنا اسے گوارا نہیں رہتا۔

”تم گاؤں واپس جاسکتے ہو شہباز خان۔ بڑے خان کو تمہاری ضرورت ہے۔“ اس نے آگے بڑھ کے شہباز کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا۔

”اور ہاں اپنے دوسرے آدمیوں کو بھی یہاں سے لیتے جانا۔ میں یہ کام خود کر لوں گا۔“ اس نے آخر میں سخت لہجے میں کہا تھا۔ جس کا مطلب صاف تھا اب وہ ان کو اپنے فارم ہاؤس میں مزید برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ ضیاء کے وہاں سے اندر جاتے ہی اس نے سہراب خان کا نمبر ملا یا تھا۔ آخری حکم بہر حال انہی کا ہوتا تھا۔ دوسری طرف ٹیل جا رہی تھی۔ وہ منتظر تھا۔

چار بجنے میں ابھی کچھ وقت تھا۔ اس نے باہر باء جی کا پتہ کروایا۔ وہ ابھی کسی کارزمیننگ کے سلسلے میں کہیں باہر تھے۔ مطلب ان کے خاص کارندے سبھی ان کے ساتھ تھے۔ حویلی میں وہی اکا دکا پہرے دار ہی تھے۔ باقی ہوتے بھی تو بیٹھک کی طرف ہوتے یا مردان خانے کی طرف۔ سو وہ بے فکری سے حویلی کے ویران حصے تک تو جا ہی سکتی تھی۔ جب تک ابراہیم اس کی مدد کو آتا تب تک وہ کافی اچھی طرح حالات کا جائزہ بھی لے سکتی تھی اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وقت سے پہلے ابراہیم کے آنے سے پہلے ہی قسمت اس کا کام آسان کر دیتی۔ تب تو اور بھی اچھا تھا۔ وہ یہ بات ابراہیم کو بھی نہ بتاتی اور یہ راز، راز ہی رہتا۔ لیکن بہر حال یہ سب سوچنے میں ضرور آسان تھا۔ عمل میں اسی قدر مشکل۔ وہ بڑی سی چادر میں خود کو اچھی طرح ڈھانپتی حویلی کی اندرونی راہداری سے ہوتی پچھلی طرف بارہ دری کے قریب کھلنے والی کھڑکیوں میں آٹھری۔ اس نے کھڑکی میں کھڑے ہو کے دور مردان خانے کی چھت کے کونے پہ بنے مورچے پہ نظر ڈالی۔ وہاں دو ہٹے کٹے آدمی گپ شپ میں مصروف تھے لیکن ان میں سے ایک کی توجہ مکمل طور پہ حویلی کے اسی ویران حصے کی طرف ہی تھی۔ یہ ویران حصہ آگے جا کر پرانی نہر پہ ختم ہو جاتا تھا اور اس کے دوسری طرف کی کیکر اور بول کے پودوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ تھا۔ تبھی اس طرف سے دشمنوں کا خطرہ کم تو تھا لیکن بہر حال کوئی اس صورتحال کا فائدہ نہ اٹھالے اس کے لئے خاص طور پہ یہ مورچہ بنایا گیا تھا۔ یہ واحد مورچہ تھا جو زنانہ حصے سے بھی نظر آتا تھا اور اسی کی وجہ سے وہ اکثر صرف حویلی کے تیسرے حصے میں ہی محصور رہتے تھے۔ سامنے اور اس طرف والے صحن میں جانے کی ان کو اجازت نہ تھی۔

وہ سوچوں میں غلط ٹھہری تھی۔ جب سیٹی کی تیز آواز نے اسے چونکا یا تھا۔ اس نے سر کھڑکی سے ذرا سا باہر نکال کے دیکھا۔ سیٹی کی آواز یقیناً مردان خانے کی طرف سے آئی تھی۔ مطلب چند لمحوں میں ابراہیم کو اسی مورچے پہ ہونا تھا۔ وہ احتیاطاً پیچھے ہو کر اس طرف دیکھنے لگی۔ اور اس کی توقع کے عین مطابق صرف چند منٹس میں ابراہیم مورچے پہ چڑھتا دکھائی دیا تھا۔ سفید رنگ کے کاٹن میں اس کا خوبروسراپا چمکتی دھوپ میں چمکنے لگا تھا۔ آستینیں فولڈ کئے اوپر آتے ہوئے وہ ان دونوں آدمیوں سے کچھ بولا تھا۔ ان کی توجہ ابراہیم کی طرف ہو چکی تھی۔ ان میں سے ایک آدمی مورچے کے ساتھ لگی لکڑی کی سیڑھی سے نیچے اتر گیا تھا۔ دوسرا اب مکمل طور پہ ابراہیم کے ساتھ بات چیت میں مصروف تھا۔ ابراہیم نے اس کی تلاش میں نظریں دوڑائی تھیں اور اس نے تیزی سے باہر آ کر خود کو ظاہر کیا تھا۔ اسے دیکھتے ہی ابراہیم نے آہستگی سے یوں ہاتھ ہلا کے سر کے پیچھے لے گیا تھا جیسے بال سیٹ کر رہا ہو۔ اس کا اشارہ ملتے ہی وہ تیزی سے ویرانے کی طرف بھاگی تھی۔ مطلوبہ جگہ تک پہنچنے میں اسے چند لمحے لگے تھے۔ اس جگہ پہ پہنچتے ہی اس نے تیزی سے ہاتھ مار کے گھاس پھونس ہٹایا۔ راستہ سامنے تھا۔ وہ ادھر ادھر دیکھے بغیر تیزی سے اندر پھسل گئی۔ حیران کن طور پہ آج اللہ لوک بالکل پرسکون تھیں اور پوری شدت سے اس کی ہی منتظر تھیں۔ آج نہ انہوں نے کوئی عجیب لفظ بولے تھے نہ ہی چلائی تھیں۔ اسے دیکھتے ہی اطمینان سا ان کے چہرے پہ پھیل گیا تھا۔

”تو آگئی۔۔ مجھے پورا یقین تھا تو ضرور آئے گی۔“

”لیکن میں آج بس جانے کے لئے آئی ہوں اللہ لوک۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ ہمیں آج شہر کے لئے نکلنا ہے اور باء جی بس آنے ہی والے ہوں گے“ وہ تیزی سے انہیں بتانے لگی۔

”آپ نے کہا تھا مجھ سے۔ آپ نے مجھے بہت کچھ دینا ہے۔“ اس نے اس طرح ان کے سامنے اپنا دایاں ہاتھ پھیلا یا جیسے وہ واقعی اسے کچھ دینے والی تھیں۔

”لیکن تیری ہتھیلی تو بہت چھوٹی ہے اور بھار (بار، وزن) بہت زیادہ۔۔ تو کیسے اٹھائے گی اتنا بھار۔“ اللہ لوک نے مایوس لہجے میں کہا۔ اوزگل نے مایوسی سے اپنے پھیلے ہاتھ کو دیکھا تھا۔ جیسے واقعی اب اس کا آنا ضائع ہو جائے گا۔

”جا چلی جا۔ اس سے پہلے کہ دیر ہو جائے۔۔ اس سے پہلے کہ حرس کا شیطان تجھے بھی قید کر لے۔ تنہائی اور بھوک تیرا بھی مقدر بن جائے۔ بھاگ جا یہاں سے۔۔“ انہوں نے اس کی طرف پشت کرتے ہوئے آنکھیں بند کی تھیں پھر بھی اوزگل نے ان کے گال پہ بہتے پانی کی لکیر دیکھ لی تھی۔

”لیکن اتنا تو بتا دیں اللہ لوک۔ اس دہن کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ میں واپس چلی جاؤں گی۔ بس اتنا بتا دیں پلیز ورنہ یہ سوال مجھے چین سے نہیں رہنے دے گا۔“ اسے محسوس ہو رہا تھا۔ اللہ لوک بے آواز رونے لگی تھیں۔

”تیرے باپ کے پاس ایک رتی ڈیری (سرخ ڈائری) ہوگی۔ جا اسے ڈھونڈ لے سب جان لے گی۔ دوبارہ ادھر نہیں آنا۔۔“ انہوں نے سختی سے آنسو گرڑتے ہوئے اسے کہا تھا۔

”لیکن کیوں اللہ لوک؟“ وہ ان کے یوں صاف جواب دینے پہ تڑپ گئی۔

”مردوں کو اگر انسانوں کی عادت ہو جائے نہ تو قبرتنگ پڑنے لگتی ہے۔ جا میری قبرتنگ نہ کر۔۔ چلی جا۔۔“ وہ منہ پھیر گئی تھیں۔

اب ان کی مکمل پشت تھی۔ وہ ان کا چہرہ نہیں دیکھ سکتی تھی۔

”اللہ لوک۔“ وہ بے بسی سے انہیں پکارتی رہی۔ پھر جواب نہ پا کر مجبوراً اٹھ کر باہر آ گئی۔ ہاتھوں سے دوبارہ اس جگہ کو دوبارہ ڈھکا اور حویلی کے حصے میں آتے ہی ابراہیم کو دیکھا۔ وہ ابھی بھی وہیں تھا۔ اس کا منتظر۔ اس آدمی کو اس نے خوب باتوں میں لگا رکھا تھا۔

اوزگل پہ نظر پڑتے ہی اس کے چہرے پہ اطمینان دوڑتا چلا گیا تھا۔ اوزگل نے ہاتھ ہلا کے اسے اشارہ کیا اور اندر آ گئی۔ ہر چیز سے اس کا دل سخت اچاٹ ہو گیا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ اپنے کمرے میں جانے کی بجائے باء جی کے کمرے کی طرف آ گئی۔ اسے اب ہر حال میں وہ سرخ کتاب ڈھونڈنی تھی۔

”میرے ہراک کل ہراک لمحے میں۔۔۔

تو لکھ دے میرا اسے۔۔۔

ہر کہانی میں۔۔۔

سارے قصوں میں۔۔۔

دل کی دنیا کے۔۔۔

سچے رشتوں میں۔۔۔

زندگانی کے۔۔۔

سارے حصوں میں۔۔۔

تو لکھ دے میرا اسے۔۔۔

اے خدا۔۔۔ اے خدا۔۔۔

جب بنا اس کا ہی بنا۔۔۔“

بارش جس قدر تیز ہوتی جا رہی تھی اس کے اندر کی گھٹن مزید بڑھتی جا رہی تھی۔ اس نے تیز ہوا اور بارش کی پرواہ نہ کرتے ہوئے سارے شیشے گرا دیئے تھے۔ ہوا پہلے ہی جھونکے میں اس کے بال بکھیر گئی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ سے سٹیئرنگ سنبھالتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے سختی سے سینے کو مسلاتھا۔ پھر شرٹ کے اوپر کے دو تین بٹن اسی ہاتھ سے کھول لئے تھے۔ سانس لینے میں آسانی ہوئی تھی لیکن درد تھا کہ بڑھتا جا رہا تھا۔ اس نے میوزک اور تیز کر دیا۔

”اے خدا۔۔۔ اے خدا۔۔۔

جب بنا اس کا ہی بنا۔۔۔

ہراک لمحے میں۔۔۔

ہراک پنپے پنپے۔۔۔

تو لکھ دے میرا اسے۔۔۔

یا خدا۔۔۔ اے خدا۔۔۔“

سب کچھ اس کے خلاف تھا۔ رب گواہ تھا۔ اس کا رواں رواں اس کا طلب گار تھا۔ وہ اس سے نفرت کا دعوے دار کبھی بھی اس کی عزت کا دشمن نہیں ہوا تھا۔ وہ نہ سہی اس کی عزت اسے عزیز تھی۔ اس نے سوچا تھا۔ بس چھوٹا سا تماشا ہوگا۔ اس کے باپ کا سالوں سے

انتقام میں جلتا دل کچھ ٹھنڈک پائے گا، وہ چپ چاپ اسے گھر چھوڑ آئے گا اور اس کے اور لالہ کے راستے ہمیشہ کے لئے الگ ہو جائیں گے۔ بات ختم ہو جائے گی لیکن۔۔۔

لیکن بات ختم کہاں ہوئی تھی بات تو جیسے ابھی شروع ہوئی تھی۔ سب کچھ پلٹ گیا تھا۔ اس کے باپ کا دل بھلے سکون پا گیا تھا لیکن اس نے سکھ چین سب کھو دیا تھا۔ دو کٹورا آنکھیں اور اس کے مضبوط ہاتھوں سے سمجھتے نرم کومل ہاتھ۔۔۔ اس کے وجود سے لپٹ کے رہ گئے تھے۔

اس کا وجود فنا ہو گیا۔۔۔

اور لالہ جیسے اس کی نس نس میں سما گئی تھی۔۔۔

وہ کہیں نہیں رہا تھا۔۔۔

وہ تو انتقام کی جلتی بجھتی چنگاری کو ہمیشہ کے لئے ٹھنڈا کرنے چلا تھا۔ اور۔۔۔

اس کا تن من جل کے سوا (راکھ) ہو گیا تھا۔

انتقام کی چنگاری نے نہ جانے کب بھڑکتے ہوئے عشق کے شعلے کی شکل اختیار کر لی تھی۔ کبھی کسی سے نہ ہارنے والا ضیاء علی خان۔

اس کا اس میں ہوں اسے ہوں اسی کا رہنے دے

میں تو پیسا ہوں ہے دریا وہ ذریعہ وہ جینے کا میرے

دل مجھے دے اگر

درد دے اس کا پر

اس کی وہ ہونسی

گو بنجے جو میرا گھر۔

”اے خدا۔۔۔ اے خدا

جب بنا اس کا ہی بنا۔۔۔“

اسے لگا درد سے اس کا دل پھٹ جائے گا۔ اس نے گانا بدل دیا تھا اور گاڑی روک کے باہر نکل آیا تھا۔۔۔

”یار کو ہم نے جا بجا دیکھا۔۔۔

کہیں ظاہر کہیں چھپا دیکھا۔۔۔“

بارش اسے بری طرح بھگونے لگی تھی۔ نئے موسم کی کھلتی سردی بھی اس کے اندر کی تپش نہیں کم کر پارہی تھی۔

”کہیں وہ بادشاہ تخت نشین

کہیں کا سالے گدا دیکھا۔۔۔

یار کو ہم نے جا بجا دیکھا۔۔۔“

سفید پاکیزہ آنچل تھا جو اس کے دل کو اپنے ساتھ لپیٹے اڑا تھا۔

تخیل کامل ہونے لگا تھا۔

درد بڑھنے لگا تھا۔

”کہیں وہ ڈرباس معشوقاں

برسر ناز اور ادا دیکھا۔۔۔

کہیں ظاہر کہیں چھپا دیکھا۔۔۔“

دونوں ہاتھ بالوں میں پھنساتے ہوئے وہ درد سے چلاتا زمین پہ بیٹھتا چلا گیا تھا۔ بارش اور تیز ہوئی تھی اور اس کی آنکھوں سے

بہتے آنسو بھی۔

☆.....☆.....☆

یہ کمرہ اس حویلی کا سب سے بڑا کمرہ تھا۔ پہلے تین اطراف کمروں کے آگے برآمدہ تھا۔ اور درمیان میں چھوٹا سالان جس کے

اوپر درمیان سے کھلی چھت تھی۔ لیکن اب یہ سارا حصہ ایک بڑے لاؤنج کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ دو کمروں کو یکجا کر کے باء جی کا یہ کمرہ بنایا

گیا تھا اور اس کی ہر چیز بہترین تھی۔ پردوں سے لے کر ننھے سے شوپیس تک اپورٹڈ تھے۔ اس نے اندر داخل ہوتے ہوئے کھڑکی کھول دی

تھی۔ یہ کھڑکی گیراج کی طرف کھلتی تھی۔ اس طرح باء جی جیسے ہی گھر آتے اسے فوراً پتہ چل جاتا اور وہ آرام سے نکل سکتی تھی۔

یہاں سے بے فکر ہو کے اس نے دھیان سے وہ جگہیں دیکھنا شروع کر دی تھیں۔ احتیاط سے ساری الماریاں، دراز چیک کرنے

کے باوجود وہ ناکام رہی تھی۔

”ایسا کیا ہوگا اس ڈائری میں۔“ وہ سوچتی رہی۔ مایوس سی ہونے لگی تھی جب یونہی اس کی نظر باء جی کی کونے میں رکھی اس میز پہ

پڑی جس پہ ان کی زمینوں کا سارے کھاتا جات پڑے رہتے تھے۔ وہ تیزی سے اس طرف آئی تھی اور عین اسی وقت ہی حویلی کا آہنی گیٹ

کھلنے کی آواز آئی تھی۔ وہ کانپ سی گئی تھی۔ اس نے تیزی سے کھڑکی بند کی۔ گاڑی کے انجن کا شور اس کے دل کی دھڑکنیں بڑھا گیا تھا۔ وہ

تیزی سے پلٹی تھی اور بالکل اچانک ہی میز کے کونے پہ پڑی بہت گہرے سرخ رنگ کی ڈائری نے جیسے اس کے قدم جکڑ لئے تھے۔ اس کا

رنگ بے حد عجیب تھا۔ بہت ہی عجیب سرخ۔

”یہی ہے۔۔۔؟“ اس نے خود سے سوال کیا۔ پھر تیزی سے اسے اٹھایا اور دوپٹے میں چھپاتی باہر نکل گئی۔

☆.....☆.....☆

آج صبح صبح ہی باریال اسے اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ کچھ دیر یونہی گاڑی سڑکوں پہ گھمانے کے بعد وہ شہر سے کافی دور ایک قبرستان کی طرف نکل آئے۔ باریال نے گاڑی روکی تو اسے حیرت سی ہوئی۔ وہ نیچے اتر کر اس کی طرف آیا تھا۔
”لالہ باہر آ جاؤ۔“ اس نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے اسے پکارا تھا۔
”یہاں۔۔ یہاں کیوں۔؟“ نہ جانے کیوں اس کا دل ڈوب سا گیا تھا۔

”باہر تو آؤ یا ر۔۔ بتاتا ہوں۔“ اس نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ لالہ نے کچھ سوچتے ہوئے اس کا ہاتھ تھاما اور گاڑی سے اتر آئی۔ دل اور شور مچانے لگا تھا۔ وہ خود اپنی کیفیت نہیں سمجھ پا رہی تھی۔ باریال کی ذرا سی توجہ اسے جس قدر خوشی دیتی تھیں آج اس خوشی کا احساس مکمل نہیں ہو پا رہا تھا۔ کچھ ایسا تھا جو اس خوشی پہ درد کو حاوی کر رہا تھا۔

”ولی بتائیں پلیز۔؟“ خاردار جھاڑیوں سے خود کو بچاتی وہ اس کا ہاتھ تھامے اس کے پیچھے پیچھے چلتی بار بار اسے پکار بھی لیتی لیکن باریال مسلسل اسے جیسے اگنور کر رہا تھا۔ وہ خاموشی سے اس کا ہاتھ تھامے احتیاط سے اسے آگے بڑھاتا رہا تھا۔
ایک جگہ پہ آ کے اس نے دھیرے سے لالہ کا ہاتھ چھوڑا اور ایک طرف بڑھ گیا۔ لالہ اس کے پیچھے بڑھنے کے ساتھ ساتھ ارد گرد کا حیران سا جائزہ بھی لے رہی تھی۔

یہ جگہ قدرے کھلی تھی۔ برگد کا گھنا درخت دور دور تک چھایا غرور سے سر اٹھائے کھڑا تھا۔ تھوڑی دور جا کر باریال رک گیا تھا۔
لالہ ابھی بھی ارد گرد کا جائزہ لینے میں بزی تھی۔

”ادھر آؤ لالہ۔۔“ اس نے لالہ کا بازو تھامتے ہوئے اسے نرمی سے آگے کیا تھا۔ یہ کچی تازہ قبر تھی۔ جس پہ پانی سے تازہ چھڑکاؤ کیا گیا تھا اور اس پہ بکھرے تروتازہ گلاب کی پتیوں کی مہک ساری فضا کو معطر کر رہی تھیں۔ لالہ کا دل بے اختیار سا ہوا تھا۔
”یہ سب کیا ہے ولی؟“ وہ پریشان سی پیچھے ہٹتی اس کے ساتھ جا لگی تھی۔ باریال نے نرمی سے آگے کندھے کے گرد اپنا بازو پھیلایا اور پھر اسے اس قبر کے قریب لے آیا۔

”لالہ۔“ اس کا ہاتھ تھامے ہوئے وہ نیچے گھٹنوں کے بل بیٹھتے ہوئے اسے بھی ساتھ بیٹھنے پہ مجبور کر گیا تھا۔
”دادو۔۔“ اس کے اگلے لفظ پہ لالہ نے بے یقینی سے اسے دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اس قدر بے یقینی تھی کہ باریال نظریں نہ ملا سکا تھا۔

”دادو اس دنیا میں نہیں رہیں۔“ اس نے بہت مشکل سے جملہ مکمل کیا تھا۔ گھٹنوں کے بل بیٹھی لالہ بے اختیار ہی زمین پہ گرنے

کے سے انداز میں بیٹھی تھی۔ ہاتھ پہ مضبوط گرفت اور سخت ہوئی تھی۔

”دادو۔۔۔“ اس کا لہجہ درد سے پر تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ اس کچی گیلی قبر پہ جمائے اور جیسے اس کی مٹی کو محسوس کر کے یقین کیا کہ وہ واقعی دادو کی قبر ہے؟ وہ پھوٹ پھوٹ کے رو دی تھی۔ باریال نے اسے خود میں سمولیا تھا۔ اس کا نازک سراپا کپکپا رہا تھا۔ وہ ہچکیوں میں رو رہی تھی۔ باریال نے اسے روکا نہیں تھا۔ وہ چاہتا تھا وہ دل بھر کے رولے۔ سارا درد سارا غبار نکل جائے۔ آنسو من کا میل اتار لیتے ہیں۔ ہر بوجھ دھو ڈالتے ہیں۔ روح تک شفاف ہو جاتی ہے۔ اس نے بھی لالہ کو رونے دیا تھا۔ اسے چپ کرانے کی کوشش نہ کی تھی۔

☆.....☆.....☆

”شاویز ایسا کیسے کر سکتا ہے حد ہوتی ہے بھی خود غرضی کی۔“

جب سے باریال نے انہیں بتایا تھا کہ دادو کی ڈیٹھ ان کی شادی کے تیسرے دن ہی ہوئی تھی اور شاویز نے اسے اور لالہ کو اطلاع دینا بھی مناسب نہیں سمجھا تھا۔ وہ مسلسل شاویز کو سنائے جا رہی تھیں۔ باریال نے انہیں یہ بھی بتایا تھا کہ وہ گھر بھی چھوڑ کے جا چکے ہیں کہاں یہ بھی کوئی نہیں جانتا۔

”اسے لالہ سے واقعی جان چھڑانا تھی سو وہ چلا گیا۔“ باریال نے تاسف بھرے لہجے میں کمرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ جہاں لالہ سو رہی تھی۔ ویسے بھی اس کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ اوپر سے اس طرح کی بات کا ایک دم سے سامنے آ جانا۔ اسے بری طرح توڑ گیا تھا۔ دادو میں اس کی جان بستی تھی اور وہ اتنی بدنصیب کہ ان کے آخری دیدار سے بھی محروم ہو گئی تھی۔

”لالہ تو سن بھل ہی جائے گی۔ وقت بہت پیارے مرہم رکھ دیتا ہے زخموں پہ۔ لیکن شاویز۔۔۔ اسے اللہ پاک کبھی معاف نہیں کرے گا۔ دیکھ لینا تم۔“ وہ غصے سے بولیں۔

”اچھا آپ تو اتنا سٹرپس نہ لیں اب۔“ وہ اٹھ کر ان کے شانوں کے گرد بازو پھیلا گیا۔

”کیسے نہ لوں۔ ساری عمر اب لالہ بیچاری کو صبر مشکل ہو جائے گا۔ اللہ پاک نہ جانے اس پھول سی لڑکی کی یہ آزمائشیں کب ختم کرے گا۔“ وہ فکر مند تھیں۔ باریال مسکرا دیا۔

”آپ ہیں نہ لالہ کے ساتھ۔ انشاء اللہ جلدی سن بھل جائے گی۔“ اس کے لہجے میں ماں کے لئے غرور تھا۔

”انشاء اللہ۔“ انہوں نے سادہ لیکن پریقین لہجے میں کہا تھا۔

☆.....☆.....☆

گل مینہ کے کالج جانے کے بعد اس نے احتیاط سے دروازہ لاک کیا اور اپنے بیڈ پہ آ گئی۔ اپنی طرف والی سائیڈ ٹیبل کے پہلے دراز کا لاک کھول کر اس نے وہ سرخ ڈائری نکال لی جو اس نے باء جی کی میز سے اٹھائی تھی۔ یہ کسی بھی طرح کی کتاب ہو سکتی تھی۔

شاید زمینوں کا کھاتہ۔۔

الیکشن کا حساب کتاب۔۔

یا پھر شاید واقعی اپنے سینے میں چھپائے بھت سے راز۔۔۔

اس کتاب کا رنگ بہت عجیب سرخ تھا۔ جیسے خون سے اسے رنگا گیا ہو۔

بے حد سرخ۔۔

لال سی۔۔۔

”یا اللہ پاک میری مدد فرما۔ میں جاننا چاہتی ہوں آخر کیا ہے جو اتنا واضح ہونے کے باوجود بھی نظروں سے اوجھل ہے۔ بے شک تو مددگار ہے۔“ اس نے آنکھیں بند کر کے دعا کی تھی۔ پھر کچھ دیر یوں ہی آنکھیں بند کئے درود پاک کا ورد کیا اور دھیرے دھیرے آنکھیں کھول دیں۔

لرزتے ہاتھوں سے اس نے وہ ڈائری کھول دی تھی۔ پہلے چند صفحات زمینوں کے حساب کتاب سے بھرے تھے۔ جن میں مختلف علاقوں میں زمین کے تمام رقبوں کی تفصیلات تھیں۔ اور ان کی مالیت وغیرہ کا حساب کتاب۔ اس نے جو سوچ کے یہ ڈائری اٹھائی تھی ویسا کچھ نہ تھا۔ اس نے غلط ڈائری اٹھائی تھی۔ وہ بددلی سے صفحات پلٹنے لگی۔ تبھی اس کی نظر ایک سرخ رنگ کے مارکر سے لکھی عبارت پہ جمی تھی۔

”پہلا خون“

اس کا جسم کانپ سا گیا تھا۔ اس نے لرزتے ہاتھ سے اس صفحے کو دو انگلیوں میں تھام لیا۔ اور پھر ڈرتے ڈرتے صفحہ الٹ دیا تھا۔

اس نے غلط کتاب نہیں اٹھائی تھی۔ وہ وہی سرخ ڈائری تھی جس کے بارے میں اللہ لوک نے بتایا تھا۔

داستان شروع ہوئی تھی۔۔۔

☆.....☆.....☆

لال حویلی دہن کی طرح سجائی گئی تھی۔ زریاب ولی خان کے خاندان میں پہلی لڑکی کی شادی تھی۔ ایک روایت ٹوٹنے جا رہی تھی۔ ننگین پہلی لڑکی تھی جو برادری سے باہر خوشیاں تلاشنے جا رہی تھی اور اسی لئے زریاب لالانے اس کی شادمانی میں کوئی کسر نہیں رہنے دی تھی۔ آج ہر آنکھ رشک سے دیکھ رہی تھی لال حویلی کو۔ زریاب ولی خان ویسے بھی ان لوگوں میں سے تھے جن کے لئے دل سے دعا نکلتی ہے۔ اللہ پاک نے انہیں اچھی شخصیت کے ساتھ بلند کردار و اخلاق سے بھی نوازا تھا۔ تبھی وہ اپنے علاقے کے ہر دلعزیز سردار مانے جاتے تھے۔ بارات آپکی تھی۔ ہر طرف شور و غل مچ گیا تھا۔ بارات میں شامل دو لہے کے دوستوں نے نکاح کے فوراً بعد ہوائی فائرنگ

شروع کر دی تھی۔ اوپر سے لڑکیوں کا ہلہ گلہ۔۔۔ نکین کا سر چکرانے لگا تھا۔ اس نے مہندی سے سبے خوبصورت ہاتھ کانوں پہ رکھ لئے۔ پھر بھی آواز کم نہ ہوئی تھی۔ سامنے ہی گلابی فراک پہنے سین جھوم جھوم کے ناچے جا رہی تھی سہیلیوں کے نرغے میں۔۔۔ اس نے محبت بھری نگاہ بہن پہ ڈالی تھی اور بالکل غیر ارادی طور پہ اس کی نگاہ سامنے چھت کے دور ویران کو نے پہ پڑی تھی۔ اس طرف گرل لگتی تھی لیکن ابھی یہ کام ملتوی تھا۔ اسے وہاں ہیو لاسا دکھائی دیا۔ اس نے غور کیا۔ وہ واقعی کوئی آدمی تھا اور اس کے ہاتھ میں تھمی وہ لمبی نال۔۔۔

”کیا بدرگہ ہے کوئی؟“ اس نے حیرت سے سوچا۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس طرف کسی بھی مرد کو آنے کی اجازت نہ تھی۔ اور وہ تو بالکل سامنے کو نے پہ اس قدر اونچائی سے سب صاف دیکھ سکتا تھا۔

”پھر یہ کون؟“ وہ سوچے گئی۔ فائرنگ کی آواز تیز ہوئی تھی۔

”اس شادی کو یادگار بنادو۔ لوگ صدیوں تک لال حویلی کی اس شادی کو نہ بھول پائیں۔“ باتیں وہی تھیں لیکن سہراب علی خان کا لہجہ اور انداز بالکل اب کی بارنیا تھا۔ مطلب جو اس نے سنا تھا وہ سچ تھا لیکن جو اس نے اس وقت خوشی کے عالم میں سمجھا تھا وہ غلط تھا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور بھاری گھیرا سنبھالتی تیزی سے اس طرف بھاگی تھی۔ تبھی سامنے ناچتی لڑکیوں سے بری طرح سے ٹکرائی۔

”نگی۔۔۔“ سین تیزی سے اس کی طرف آئی تھی۔

”کیا ہوا آپ کو نگی۔۔۔ آپ ٹھیک ہیں نہ؟“

”وہ۔۔۔ وہ عیسیٰ سین۔۔۔ عیسیٰ کو مار دے گا۔“ وہ تڑپی۔

”کون۔۔۔ کون مار دے گا۔؟“ سین کا دل ڈوب کے ابھرا۔

”لالا۔۔۔ سہراب لالا۔۔۔“

”تو بہ کریں گی کیا کہہ رہی ہیں۔“

تبھی فائرنگ کی تیز آواز میں ایک چیخ سی گونجی تھی۔ بہن کے بازو تھامتھی، تڑپی نگی کے ہاتھ ایک دم سے پتھر کے ہوئے تھے اور وہ کسی لاش کی طرح بیدم ہوتی زمین پہ گرتی چلی گئی تھی۔

”دو لہے کو گولی لگ گئی ہے۔“ تھوڑی ہی دیر میں طوفان سا اٹھا تھا۔

”ہوائی فائر لگ گیا بیچارے کو۔“ خوشی پہ ایک دم ترس، افسوس اور دکھ کا ماحول غالب آنے لگا تھا۔ سین نے حیرت سے پھٹی آنکھوں سے نکین کو دیکھا تھا۔ جواب چلاتے ہوئے اپنے ہی بدن، آپ نے ہی زیور نوچ رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

وہ ابھی فجر کی نماز پڑھ کے فارغ ہوا تھا جب دروازے پہ ہونے والی دستک نے اسے چونکا دیا تھا۔

”اس وقت۔۔۔؟ اس وقت کون ہو سکتا ہے۔“ وہ حیران سا وقت دیکھتا دروازے کی طرف آیا تھا۔ دروازہ دوسری بار بجایا گیا تھا اور اس بار دستک کافی تیز بھی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کے دروازہ کھول دیا۔ سامنے کھڑے فرد کو دیکھ کر اس کی حیرت دوچند ہوئی تھی۔

”تم۔۔۔ اس وقت۔“ وہ اپنی حیرت چھپانے کا تھانہ ہی اس نے کوئی کوشش کی تھی چھپانے کی۔ امن منہ بناتے ہوئے اسے ایک طرف تقریباً دھکیلتی اندر آگئی۔

”جب آؤ نواب زادے ملتے ہی نہیں۔ سوچا اس وقت تو لازمی گھیر لوں گی۔“ وہ بے فکری سے ڈائمنگ ٹیبل کی طرف آگئی اور بے تکلیف سے ایک کرسی سنبھال لی۔

”ہاں تو نیا نیا بزنس ہے۔ تم جانتی ہو اچھی طرح میرا کیا کام ہے۔“
”کم آن باری۔۔۔ ہاں تو کسی بھی مقصد کا مطلب یہ تو نہیں کہ بندہ اپنے دوسرے فرائض بھول ہی جائے۔“ اس نے سامنے پڑی باسکٹ سے ایک سیب اٹھایا۔

”مثلاً کون سا فرض بھول گیا۔“ وہ اب آستینیں فولڈ کرتا اوپن کچن کی طرف آگیا۔
”تمہیں ہر بار یاد دلانا پڑے گا۔ ایک گھر ہے تمہارا۔۔۔
ایک ماں جو سارا دن اکیلی ہوتی ہے۔۔۔ اور۔۔۔ وہ اسے گنوار ہی تھی۔
”اور۔۔۔؟“ وہ اب چائے بنا رہا تھا۔

”اور ایک عدد لڑکی بھی ہے جو جلد یا بدیر تمہارے فرائض میں آنے ہی والی ہے۔“ اس نے بغور باریال پہ نظریں جانتے ہوئے آخری بات کہی تھی۔ باریال کے چلتے ہاتھ ایک پل کے لئے رکے تھے۔

”تمہیں نہیں لگتا وہ لڑکی زبردستی اپنی ذمہ داری اس بیچارے پہ ڈال رہی ہے۔“ اس نے امن کی طرف دیکھے بغیر کہا تھا۔
”بالکل نہیں۔۔۔ میں خوابوں پہ یقین رکھنے والی لڑکی ہوں۔“ اس کے لہجے میں اعتماد تھا۔

”یکطرفہ خواب جب ٹوٹتے ہیں تو انسان کو بھی توڑ دیتے ہیں۔ سوان خوابوں سے خود کو آزادی ہی رکھیں تو بہتر ہے۔“ چائے نکالتے ہوئے اس نے امن کو جیسے سمجھایا تھا۔

”تو ایشو کیا ہے۔ تم بھی تو سنگل ہی ہو۔ جتنا میں تمہیں جانتی ہوں تم کسی کے ساتھ کھڑے نہیں ہو۔ تو پھر میں کیوں نہیں؟“ وہ اٹھ کر اس کے پاس آئی تھی۔

”ولی۔ آپ یہاں کیا کر رہے ہیں۔ مجھے جگا دیا ہوتا۔“ لالہ بالکل اچانک وہاں آئی تھی۔ امن اس کی آواز پہ ہوں جھٹکا کھا کے

مڑی تھی جیسے سودا کا جھٹکا لگا ہو۔

”تم آرام کرو۔ میں عادی ہوں۔ بنالیتا ہوں کبھی کبھی۔ تمہارے لئے بھی لا رہا تھا۔“ اسے دیکھتے ہی باریال کے چہرے پہ کھلتی مسکراہٹ امن کا دل دھڑکا گئی تھی۔

”یہ کون ہے باری۔؟“ وہ خود پہ ضبط کھوتے ہوئے لب کچلتے بولی تھی۔ لالہ بھی اسے دیکھ چکی تھی۔ فوراً سلام کیا تھا جسے اس نے کوئی لفٹ نہیں کروائی تھی۔

”کیا ہو گیا۔۔۔؟“ باریال اسے ایک دم بارش ہوتا دیکھ کے حیران سا اس کی طرف پلٹا۔

”میری بات کا جواب دو باری۔۔۔ یہ کون ہے اور تمہیں ولی کیوں کہہ رہی ہے۔ یہ کیا ڈرامہ ہے۔“

”ڈونٹ بی بارش امن۔۔۔ میں تمہارے ہر سوال کا جواب دینے کا پابند نہیں ہوں۔ اور یہ بات میں تمہیں کئی بار سمجھا چکا ہوں۔“

”اوہ۔۔۔ واہ۔۔۔ میرے لئے تو اتنے سخت رولز اور خود گھر میں ایک خوبصورت نوجوان لڑکی کے ساتھ موجود ہیں موصوف تو

کوئی بڑی بات نہیں۔ اور یہ دیدے کہاں ہیں۔ ضرور گھر پہ نہیں ہوں گی تبھی اس غلیظ لڑکی نے تمہیں مائل کر لیا اپنی طرف۔۔۔“

”امن۔۔۔“ باریال دھاڑا تھا۔ کمزوری لالہ کانپ کے پیچھے سلیب کے ساتھ جا لگی تھی۔ امن البتہ اب بھی ویسے ہی تن کے

کھڑی تھی۔

”یہ میری بیوی ہے اور اب اگر اس کے بارے میں ایک لفظ بھی کہنا نہ تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔“ شہادت کی انگلی سے اسے

وارن کرتا اس نے لالہ کی کمر کے گرد بازو پھیلایا تھا۔ ذات کی پستی میں گرتی لالہ کو جیسے کسی فرشتے نے اٹھا کر بلندی پہ پہنچا دیا تھا۔ اس کی روح تک میں سکون اتر گیا تھا۔

”تم۔۔۔ تم۔ ڈیڈ سچ کہتے ہیں۔ تم لوگ ہوتے ہی غلاظت کا ڈھیر ہو۔ اپنے جیسوں کو ہی پسند کر سکتے ہو۔“

”شٹ اپ امن۔۔۔ جسٹ شٹ اپ۔۔۔“ باریال غصے سے اس کی طرف بڑھا۔

”میں تمہیں کہیں کا نہیں چھوڑوں گی باری۔ تم بہت پچھتاؤ گے۔۔۔ بہت زیادہ۔“ امن کا بس نہیں چل رہا تھا۔ سامنے کھڑی

لالہ کا خون چوس لے۔

”تم جانتی ہو امن۔ باریال اللہ کے بعد کسی سے نہیں ڈرتا۔ سو جا وجود ل کرے کرلو۔ لیکن ناؤ گیٹ لاسٹ پلیز۔“ لالہ کو آرام

سے ٹیبل کے ساتھی چیز پہ بٹھاتے ہوئے وہ اس بار خاصی بے مروتی سے امن سے مخاطب تھا۔ امن نے ایک زہریلی نگاہ اس کیل پہ ڈالی تھی

اور پرس اٹھاتی باہر نکل گئی تھی۔ باریال نے آگے بڑھ کر دروازہ بند کر دیا تھا۔

☆.....☆.....☆

لمحوں میں جیسے زندگی اپنے معنی کھو بیٹھی تھی۔ روشنیوں سے جگمگاتی لال حویلی بخت کی سیاہی میں ڈوبتی چلی گئی تھی۔ شادیانوں کی آواز ایک دم ہی سسکیوں اور آنسوؤں میں ڈوب گئی تھی۔ بارات کے ساتھ آنے والی عورتوں کی چیخ و پکار سے زمین و آسمان لرزنے لگے تھے۔ نگیں۔۔۔ اس کی تو اور حالت خراب تھی۔

وہ تو اپنے حواس کھو بیٹھی تھی۔۔۔

اس نے نوج نوج کے اپنے سارے گھنے اتار پھینکے تھے۔ بالوں میں پن ہوا زرتار دوپٹہ دورا چھال دیا تھا۔

سین اسے خود میں سمو سمو کے سنبھالنے کی کوشش کرتی رہی لیکن وہ سنبھالی نہیں جاتی تھی۔ زریاب لالا فوراً اس کے پاس آئے تھے۔ ان کا اپنا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔

”نگی۔۔۔ بھی بچے۔“ انہوں نے بہن کو اپنی مضبوط پناہ میں لیتے ہوئے اسے پکارا۔ نگیں نے چونک کر بھائی کو دیکھا۔

”لالا۔۔۔ لالا سہراب لالا نے۔۔۔ میں نے خود دیکھا انہوں نے۔۔۔“ وہ ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں بتاتی ان کی آغوش میں آنکھیں مونڈ گئی۔ زریاب اس کی بات نہیں سمجھ پائے تھے۔ تبھی اسے اٹھا کر اندر لے آئے تھے۔ باہر کا اور شرابا اسے مزید نقصان دے سکتا تھا۔ اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ عیسیٰ کی طرح وہ اپنی بہن کو بھی کھودیں۔

”یہ سب کیا ہو گیا لالا۔۔۔؟“ وہ اسے بیڈ پہ لٹ کے مڑی ہی تھی جب سین اندر آئی تھی۔

”میں نے منع بھی کیا تھا کہ ہوائی فائرنگ نہیں کی جائے گی۔ لیکن سہراب اور عیسیٰ کے دوست۔۔۔ اتنی چھوٹی سی غلطی کا کتنا بڑا خمیازہ بھگتنا پڑا ہم سب کو۔“ وہ پریشان سے اس کے سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔

”لیکن بھی تو کچھ اور کہہ رہی تھیں۔“ وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔

”کیا بول رہی تھی۔“ زریاب چونکے۔

”نہیں۔ کچھ نہیں۔۔۔ بعد میں بات کروں گی ابھی آپ جائیں باہر آپ کی ضرورت ہے۔“ اس نے فوراً خود پہ قابو پاتے ہوئے بات سنبھالی تھی۔

”تم اس کے ساتھ رہنا۔ میں کوشش کرتا ہوں صبح تک کسی اچھے ڈاکٹر کا بندوبست ہو سکے۔ اس کا ہوں پریشان رہنا خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔“ زریاب نے اسے ہدایت کی۔

”جی لالا۔۔۔“ سین نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ وہ باہر نکل گئے۔ سین کے چہرے پہ جی سوچ کی لہریں گہری تھیں۔ وہ مسلسل گئی کے سہراب لالا پہ شک کو سوچے جا رہی تھی۔ آخر اس نے کیا دیکھا یا سنا تھا۔ اور آخر سہراب لالا ایسا کریں گے ہی کیوں۔ لیکن فی الحال اس کے پاس انتظار کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ ٹھنڈی سانس بھری بہن کے پاس آنے بیٹھ گئی۔

باہر رونے کی آوازوں میں تیزی آتی جا رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

سردیوں کی پہلی بارش اس بار اس کے لئے کسی بھی طرح کے جوش سے خالی تھی۔ وہ جو بارش ہوتے ہی سردی کی پرواہ کئے بنا ہی گھنٹوں بارش میں بھی گایا کرتی آج اتنی تیز بارش میں کھڑکی کھولے بہت بددلی سے باہر دیکھے جا رہی تھی۔ باریال کمرے میں آیا تو اسے یوں دور سے بارش میں گم دیکھ کر مسکرایا تھا۔

”لگتا ہے تمہیں عام لڑکیوں کی طرح بارش سے عشق نہیں؟“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا اور اپنی اوئی شال کندھوں سے اتار کر آہستگی سے اسے اوڑھادی۔ مضبوط ساحصار سا بندھا تھا لالہ کے گرد اس نے چادر کے کونوں کو مضبوطی سے تھام لیا۔

”عشق۔۔۔۔۔ جہاں پلیدگی پھیل جائے وہاں سے عشق منہ پھیر لیتا ہے ولی۔“
 ”عشق ہی بندگی کی طرف موڑ بھی لیتا ہے لالہ۔۔۔ اور خطا عشق کبھی کبھی عشق کی پہلی سیڑھی بھی ثابت ہوئی ہے۔“ وہ اس کے برابر آٹھرا تھا۔

”شاید۔۔۔ لیکن مجھے اب کوئی تمنا نہیں رہی۔ اپنے اس بدبودار وجود سے کسی کی بھی زندگی سجانے کی۔“
 ”مطلب تم مجھے چھوڑنے کا سوچ رہی ہو۔۔۔؟“ وہ اس کی طرف منہ کرتا کھڑکی سے ٹیک لگا گیا۔ لالہ نے اس کی طرف دیکھا۔ خوبصورت گہری نیلی آنکھیں اس پہ جمی تھیں۔ ان میں مسکراہٹ تھی۔۔۔ بے حد اجلی۔۔۔ بے حد شفاف مسکراہٹ۔۔۔ وہ نظریں ہٹانے لگی۔
 ”اگر ایسا کوئی خیال ہے بھی تمہارا تو سوری۔۔۔ اسے بھول جاؤ کیونکہ میں نے تمہیں اپنا دوست مانا ہے اور میں اپنے دوستوں کو کبھی نہیں چھوڑتا۔“ باریال کی آنکھوں کے ساتھ لب بھی مسکرا دئے تھے۔
 ”صبح وہ لڑکی کون تھی؟“ لالہ نے اچانک سوال کیا۔

باریال اس سوال پہ اسے توجہ سے دیکھنے لگا۔
 ”دوست ہے میری۔ امن۔۔۔ تمہیں پہلے بھی بتایا تھا بزنس میں ساتھ ہے میرے۔“ نہ جانے کیوں وہ وضاحت دینے لگا تھا۔
 ”آپ نے اسے بھی تو چھوڑ دیا۔۔۔ میرے لئے۔۔۔ تو بس مجھے بھی چھوڑ دینا آپ اس کے لئے۔“ وہ دھیرے سے اس کی چادر اتارتی بیڈ پر رکھتے ہوئے بولی۔ باریال کچھ دیر اس خفا خفا لڑکی کو دیکھتا رہا۔ پھر دھیرے دھیرے چلتا اس کے پاس آ گیا۔
 ”اس لڑکی کو جانتی ہو؟“ اس نے ایک پاؤں زمین پہ رکھتے ہوئے دوسرے گھٹنے کے بل اس کے سامنے زمین پہ بیٹھتے ہوئے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے پوچھا۔

”اس کے بارے میں ویسی کوئی غلط بات کرو گی نہ تو تمہیں بھی چھوڑ ہی دوں گا۔۔۔ کیونکہ۔۔۔“ لالہ کی گھنی پلکیں لرزتی اٹھیں۔۔۔

”یہ۔۔۔ یہ میری بیوی بھی ہے۔۔۔ صرف دوست نہیں۔“ اس نے لب اس کے ہاتھ پہ دھردیئے تھے۔ لالہ کی پکلیں بھگنے لگی تھیں۔ باریال نے اٹھ کر اس کے پاس بیٹھتے ہوئے اسے خود سے لگایا تھا۔

”وقت سب ٹھیک کر دے گا لالہ۔۔۔ میرا اعتبار کرو۔“ اس کی آواز میں یقین تھا۔ لالہ اس کے سینے میں سر چھپا کے سسک دی تھی۔ بارش بھی شور مچانے لگی تھی۔

☆.....☆.....☆

باء جی کے خاندان سے مکمل مایوس ہونے کے بعد اس نے لالہ کا پتہ کرنے کا کام شاہد، زید اور ابراہیم کو سونپا تھا۔ وہ جانتا تھا۔ زید اور شاہد پھر بھی کام سے جان بچانے والوں میں سے تھے لیکن ابراہیم۔۔۔ کسی بھی طرح اس کا پتہ چلا لیتا اور دوسرا کسی بھی طرح وہ ضیاء کی کوئی بات سہرا ب خان یا اس کے کسی بھی کارندے تک نہیں پہنچنے دیتا۔ ابراہیم حیات دنیا میں وہ آدمی تھا جس پہ وہ آنکھیں بند کر کے اعتبار کر سکتا تھا۔ تبھی تھک ہار کر اس نے یہ سب ابراہیم کے ذمے لگایا تھا اور خود بھی پھولوں کی طرح ہر جگہ پتہ کر رہا تھا۔

ابراہیم نے سب سے پہلے لالہ کے محلے والوں سے رابطہ کیا تھا اور ان سے شایز کے حوالے سے بات کی تھی۔ وہاں سے اسے اتنی معلومات ملیں کہ اپنے کسی دوست سے ہی شایز کی بہن کی شادی طے ہوئی تھی۔ اب اسے شایز کے دوستوں کا پتہ کرنا تھا۔ یہ اس کے کئے اتنا مشکل نہیں تھا۔ محلے کے کئی لڑکے اس کے کلاس فیلو رہے تھے۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی وہ شخص نہیں تھا جو لالہ کا نصیب بنا تھا لیکن انہی میں سے ایک شخص نے بتایا تھا کہ وہ ان ہی کا کلاس فیلو تھا اور اب اپنا بزنس چلا رہا تھا۔ اس کا پتہ ملتے ہی ابراہیم پہلے خود اس کے گھر پہنچا تھا۔ دروازہ اس کی ماں نے کھولا تھا۔ وہ آفس کے لئے نکل چکا تھا۔ تب ابراہیم نے اس کے آفس کا رخ کیا تھا اور باریال کو دیکھتے ہی اسے یک گونہ اطمینان حاصل ہوا تھا۔ اس نے واپس آ کر ضیاء کو بھی تسلی دی تھی۔

”لالہ! اپنی زندگی میں واپس لوٹ چکی ہے۔ ایک مکمل زندگی جی رہی ہے اب تم بھی پرسکون ہو جاؤ۔“ ابراہیم لالہ کے لئے خوش تھا۔

”تم پاگل ہو؟“ وہ جو لالہ کے بارے میں سن کر ہی بہت دل سے تیار ہونے میں لگا تھا۔ طائرانہ نگاہ آئینے پہ ڈالتے ہوئے اس کی بات کے جواب میں کہا تھا۔ اس کے لہجے میں کچھ تو ایسا تھا جو ابراہیم کو چونکا گیا تھا۔

”مطلب؟“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”مطلب صاف ہے میرے بھائی۔“ وہ مسکراتے ہوئے اس کی طرف پلا۔

”لالہ کی زندگی صرف ضیاء ہی مکمل کر سکتا ہے اور کوئی نہیں۔۔۔“ اس کے کندھے کو دبا تا وہ سیٹی بجاتا باہر نکل گیا تھا۔ ابراہیم کو احساس ہوا تھا اس نے ایک بار پھر غلطی کر دی تھی۔

☆.....☆.....☆

سب کچھ ویسا ہوا تھا جیسا انہوں نے پلان کیا تھا۔ وہ لاکھ اس خاندان کا فرد سہی پھر بھی اختیارات سارے ابھی زریاب لالا کے پاس تھے۔ آخری فیصلہ انہی کا ہونا تھا۔ وہ اور زریاب ایک ہی خاندان کے تھے اور ان کے خاندان میں برادری سے باہر لڑکی لی تھی لیکن کبھی اس خاندان کی لڑکی دی نہیں تھی۔ وہ ابھی بھی اس بات کے حق میں نہیں تھے۔ ایک مرتبہ یہ رواج چل جاتا تو انہیں سبین، اوزگل سب کے لئے یہ راہ کھلی رکھنا پڑتی اور زمین اور جائیداد کا حصہ الگ غیروں کے ہاتھ جاتا۔ لیکن بہر حال کسی بھی صورت وہ اس شادی کو روک نہیں پائے تھے۔ زریاب بہت خوش تھے اور یہ بات زہرسان کے اندر بھر رہی تھی۔ تبھی انہوں نے کچھ اور سوچا تھا۔ کسی بھی طرح انہوں نے اس رسم کو ٹوٹنے سے روکنا تھا۔ ورنہ ساری عمر خسارہ ان کے ہاتھ ہی آنا تھا۔ آج یا کبھی نہیں۔ ان کے پاس وقت نہیں تھا۔ اسی لئے انہوں نے وران خان کو سمجھا دیا تھا۔ جیسے ہی وہ اور عیسیٰ کے دوست فارنگ شروع کریں گے وہ فائدہ اٹھالے موقع کا۔ اور کے پی کے کے اکثر علاقوں میں شادیوں میں ہونے والی ہوائی فارنگ میں ایسے حادثات ہونا عام بات تھی تو ان کو شک بھی نہیں ہونا تھا۔ پلان بالکل صاف تھا اور کسی کو شک نہیں ہونا تھا لیکن۔۔۔ لیکن زریاب کی بانہوں میں تڑپتی نگین کے الفاظ سے انہیں جھٹکا سا لگا تھا۔

اسے کیسے خبر ہوئی تھی؟ اتنا واضح اس نے سہراب کا نام لیا تھا۔ یہ کیسے؟

اسے اگر شک بھی ہوتا تو ضرور صرف شک ظاہر کرتی۔ لیکن اس کے لہجے سے صاف ظاہر تھا وہ سب جانتی تھی۔

اسے پتہ تھا سہراب نے ہی سب کچھ کیا ہے۔ لیکن کیسے۔۔۔؟ وہ لب کچلتے سوچے گئے۔ اب حالات دوسری ڈگری پہ چل پڑے تھے۔ پہلے وہ بہت کچھ خفیہ طور پہ کرنا چاہتے تھے۔ پلان بن رہے تھے۔ لیکن ابھی صرف وہ جانتے تھے یا ان کی وہ لال ڈائری جس میں وہ اپنا لائحہ عمل طے کرتے تھے۔

لیکن۔۔۔ انہیں اب جو بھی کرنا تھا کھل کے کرنا تھا۔ وہ نگین کے سامنے آچکے تھے۔۔۔ کس طرح۔۔۔ وہ خود بھی نہیں جانتے تھے۔ لیکن بہر حال یہ ہو چکا تھا۔

وہ اس دن سارا دن نگین کے ارد گرد ہی رہے۔ اس کی حالت خراب تھی۔ دواؤں کے زیر اثر اسے نیند میں رکھا گیا تھا۔ وہ اور زریاب مل کر عیسیٰ کی تدفین میں مصروف رہے تھے اور بالکل سگے بھائیوں کی طرح اس کی فیملی کو سپورٹ کیا تھا۔ اور تیسرے دن ہی موقع ملتے ہی انہوں نے نبی کو جالیا تھا۔

”کیا دیکھا تم نے۔۔۔؟“ کمزور سی لگی انہیں کمرے میں آتا اور کنڈی لگا تا دیکھ کر بیڈ سے نیچے اتری تھی۔ سہراب تیر کی سی تیزی سے اس کے پاس آیا تھا اور اس کو بالوں سے پکڑ کر دیوار سے لگا دیا تھا۔ نفرت کی تیز لہر نگین کے دل میں جا گئی تھی۔

”سب۔۔۔۔۔ سب دیکھ اور سن چکی ہوں۔ آپ کی اور دوران کی ایک ایک بات۔ ایک ایک حرکت۔۔۔“ سارا خوف ایک لمحے میں ہوا ہوا تھا۔ سہراب کی گرفت اور سخت ہوئی تھی۔ لگی کے بال اکھڑنے لگے تھے۔

”اور بھی بھت کچھ ہے بتانے کو جانا چاہوگی۔“ اس نے اسے دیوار سے لگاتے ہوئے کمینگی سے کہا۔

”نہیں۔۔۔ اب صرف بتانا چاہوں گی۔۔۔ اور بتاؤں گی پوری دنیا کو۔۔۔ زریاب لالا کو۔۔۔ سب کو۔“ وہ نفرت سے بولی۔
”تمہیں ذرا بھی ڈر نہیں لگتا۔“

”نہیں۔ کیونکہ اب میرے پاس کھونے کے لئے کچھ نہیں بچا۔۔۔“

”زریاب۔۔۔ ولی۔۔۔ کچھ بھی نہیں۔۔۔“ وہ اس کا منہ دبوچتے ہوئے کمینگی سے مسکرائے تھے۔

”اور وہ ننھی پری سین۔۔۔ اس کا بھی ڈر نہیں رہا تمہیں۔“

اور نکلن کا دل زور سے دھڑکا تھا۔

”چلو۔۔۔ تمہیں یہی خوش ہے تو ایسا ہی سہی۔۔۔ سوچتا ہوں پھر کچھ۔“ اسے جھٹکے سے چھوڑتے ہوئے وہ تہقہہ لگاتے ہوئے واپس

پلٹ گئے تھے۔ نکلن کو موت کی سردی لپیٹنے لگی تھی۔ خوف سے اس کا وجود کاپنے لگا تھا۔

☆.....☆.....☆

لالہ جس قدر اچانک اس کی زندگی میں آئی تھی اسی قدر تیزی سے وہ اسے اپنے دل کے قریب تر ہوتی محسوس ہوئی تھی۔ اور یہ

بات جہاں اسے مطمئن کر دیتی وہیں پریشان بھی۔ جو بھی تھا لالہ کے ساتھ ہونے والا حادثہ ایک مکمل سچائی تھا۔ اس نے بے شک اس کی

عزت بچانے کے لئے اس سے شادی کر لی تھی لیکن ابھی اس معاملے میں وہ ایک فیصد بھی کلیئر نہیں تھا کہ کیا وہ واقعی اب اس کے حقوق

سویٹ میں آچکی تھی کہ نہیں۔ دوسری طرف امن کا ایک دم سے ایسا ہارش رویہ۔۔۔ وہ ایک بار پھر کسی بھی طرح کی انتقامی کارروائی کر سکتی

تھی۔ ایسے میں وہ آنے والے دنوں کے لئے کوئی دوسری ٹینشن نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ آج اس نے آفس کا کام جلدی نمٹا کر صوفی صاحب

کے گھر کی راہ لی تھی۔ صوفی صاحب اس کے استاد بھی تھے اور زندگی میں جب بھی اسے کوئی مشکل ہوئی تھی انہوں نے ہمیشہ انہیں صحیح راستہ

دکھایا تھا۔ اسے امید تھی اس بات میں بھی وہ اس کی مدد کر سکتے تھے۔

خوش قسمتی سے صوفی صاحب بیٹھک میں ہی موجود تھے اور تھے بھی اکیلے۔ وہ کافی ریلیکس ہو گیا۔ اسے دیکھتے ہی مسکراہٹ ان

کے لب چھو گئی تھی۔ وہ اس کے استقبال کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

”السلام علیکم صوفی انکل۔“ وہ مسکراتا ہوا ان کے گلے لگ گیا تھا۔

”بہت دیر کی مہربان آتے آتے۔“ محبت سے اسے دیکھتے ہوئے انہوں نے کہا تو وہ ہنس دیا۔

”آپ کی یاد لے آئی صوفی انکل۔“

”ایک استاد کو اپنا قابل شاگرد کبھی نہیں بھولتا۔ وہ اس کا وارث جو ہوتا ہے۔ استاد کو ساری امیدیں اسی سے ہوتی ہیں۔“ انہوں

نے محبت سے کہا تھا۔ وہ ادب سے نظریں جھکا گیا تھا۔

”اچھا کہاں صوفی انکل۔ بس ادب رہا آپ کا یہ اللہ پاک کا احسان ہے۔“ اس کی آواز میں عاجزی تھی۔

”ادب ہی کاملیت کی پہلی سیڑھی ہے بیٹا۔۔ پھر چاہے عشق ہو محبت سے یا کوئی بھی رشتہ اسے مکمل یہی صفت کرتی ہے۔“

”بے شک“ وہ مسکرایا۔

”اچھا یہ بتاؤ کیا لوگے۔ قبوہ کہوں تمہاری خالہ کو۔“

”نہیں نہیں۔ انکل۔ بس مجھے آپ سے ایک مدد چاہئے تھی۔ ایک بہت بڑی مشکل میں پھنس گیا ہوں۔“

”یا اللہ خیر۔“ صوفی صاحب فوراً پریشان ہو گئے۔

”کیا ہوا ہے باریال۔۔۔ سب خیریت؟“ انہوں نے فوراً استفسار کیا۔ باریال انہیں آہستگی سے سارا معاملہ بتانے لگا تھا۔ سارا

واقعہ سنتے سنتے جہاں صوفی صاحب پہلے اداس ہونے لگے وہیں باریال کا فیصلہ جان کے پرسکون بھی۔ انہوں نے اٹھ کر بیٹھک کا بیرونی

دروازہ بند کر دیا تھا اور لائٹ آن کرتے ہوئے واپس اپنی کرسی پہ آ گئے۔ باریال اب خاموشی سے ان کے بولنے کا منتظر تھا۔

”زنا ایک ناسور ہے۔ آج کے دور میں اس پھیلتی بیماری کی سب سے بڑی وجہ قرآن سے دوری ہے۔ اور اگر کچھ لوگ قرآن کے

قریب ہیں بھی تو ان میں اکثر اسے اپنے مطلب کے لئے ہی استعمال کرتے ہیں۔ بہت کم لوگ ہیں جو لوگوں کی فلاح کا بیڑہ اٹھائے

ہوئے ہیں۔

اسلام کا قرب ہی اس ناسور کا علاج ہے۔ دنیا کا سب سے بڑا مسئلہ آبادی ہے اور اس میں پھر جنس کا مسئلہ خاصا گھمبیر۔۔

لڑکیاں لڑکوں پہ نہ صرف آبادی بلکہ لیاقت و محنت میں بھی بہت آگے بڑھ گئی ہیں۔ اور ایسے میں آزادی کا مطلب بالکل الٹ کر رہ گیا ہے۔

کہیں مرد اپنی حدود یاد رکھتا ہے تو عورت پار کر جاتی ہے۔ عورت یاد رکھتی ہے تو مرد پہ شیطان حاوی ہو جاتا ہے۔ آج حالات یہ ہو گئے ہیں

کہ لوگ ناجائز بندھن رکھنے کے لئے تورب سے نہیں ڈرتے لیکن دوسری شادی کا سوچتے ہی بیوی فیملی اور عزت کا ڈر لگ جاتا ہے۔ جب

کہ یہ شریعت ہے۔ آج پہلے ہمارے علاقے میں دیکھ لو۔ ایک ایک گھر میں کتنی لڑکیاں ماں باپ کی چوکھٹ پہ بالوں میں چاندی اتار بیٹھی

ہیں۔ اچھے کھاتے پیتے مرد ہیں خاندان میں۔ الحمد للہ ہر طرح سے انصاف کر سکتے ہیں لیکن بری نظر ڈال لیں گے پناہ نہیں دیں گے۔

لیکن زنا بالجبر بالکل الگ چیز ہے۔ اس میں تو صبر کرنے والیوں کے لئے بہت اجر ہے جو واپلا نہ کریں اور پردہ کر لیں۔ اور

آگے کے لئے توبہ کریں اور اپنا حصار کریں۔

اسلام کی تاریخ میں یہ ایسے واقعات ہیں جو ایسے ہی کالے کروں سے بھرے پڑے ہیں۔ مسلمان عورتوں کو ہمیشہ اس چیز کا

معاملہ پیش رہا اور اسی لئے اس معاملے میں قرآن کی تعلیمات بھی بہت واضح ہیں۔ شام اور فلسطین اور کشمیر کی بیٹیوں کی حالت زار سے کون

واقف نہیں۔ ان حالات میں ان کو عزت دے کر اپنا لینا ہی انسانیت ہے لیکن کچھ روایات ہیں علماء اس بات پہ بھی متفق ہیں کہ ان حالات میں اگر میاں بیوی کے درمیان فاصلہ رہے تو زیادہ بہتر ہے۔ لیکن ایک بات واضح ہے ان عورتوں کے لئے اجر اور عظیم اجر کا وعدہ ہے جو اس آزمائش میں صبر کرتی ہیں اور اوہلا نہیں کرتیں۔ بیٹی کو حوصلہ دو۔“

”اور صوفی صاحب۔ بچہ۔۔۔ لالہ بالکل بھی بچہ نہیں چاہتی۔“

”اس کے لئے میں تمہیں ایک واقعہ سناتا ہوں۔ ایک مرتبہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک عورت آئی اور اس نے قبول کیا کہ اس سے زنا ہوا ہے اور وہ حاملہ بھی ہو چکی ہے۔ میری بات غور سے سنو، زنا ہوا ہے۔ مطلب گناہ کبیرہ سرزد ہوا ہے۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ جائے اور بچے کو جنم دینے کے بعد آئے۔ تب وہ عورت بچے کے جنم تک نہ آئی اور جب آئی تو بچہ گود میں تھا۔ وہ اب بھی سزا چاہتی تھی تاکہ آخر کے عذاب سے بچ سکے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جا کر اسے دو سال تک دودھ پلاؤ پھر آنا۔ بالآخر دو سال بعد وہ لوٹی اور سزا پوری کی گئی۔

بچہ جائز نا جائز نہیں ہوتا۔ وہ اب انسانی جان ہے اور انسانی جان کی اسلام میں کیا اہمیت ہے یہ تم بھی اچھی طرح جانتے ہو۔ پھر ہمارے قانون میں تو ایسی عورت سے مکمل شادی بالکل جائز ہے۔ اور اس بچے کا ابارشن کرنا بھی۔ لیکن اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا۔۔۔ لالہ گناہ گار نہیں ہے وہ دوسری والی عورت ہے جس پہ ظلم ہوا۔ اس کے لئے اجر ہے اور اگر وہ اس بچے کو بھی پیدا کرتی ہے تو ایک جان بچانے کا ثواب بھی۔ اب تم کس طرح اسے سمجھاتے ہو یہ تم پہ منحصر ہے۔“ باریال کا تنا تو جو د کچھ ہلکا ہوا تھا۔ وہ اب بالکل ریلیکس محسوس کر رہا تھا۔

”مجھے خوشی ہے باریال تم نے عام مردوں سے ہٹ کر سوچا اور کیا۔“

”میں کہاں صوفی انکل۔ یہ تو بس اللہ پاک کا حکم تھا۔ بس دعا کریں لالہ سن بھل جائے۔“

”تم جیسا مہربان ساتھ ہو تو سن بھل ہی جائے گی۔ بس اپنا طرف بڑا رکھنا بچے۔“

”انشاء اللہ۔“ اس نے ادب سے سر جھکا یا تھا۔ صوفی صاحب مسکرا دیئے تھے۔

☆.....☆.....☆

سہراب علی خان کو اب سکون نہیں تھا۔ وہ زیادہ تر زیریاب کے ساتھ ساتھ رہنے لگا تھا۔ سانپ جیسی زہریلی نظریں نگین کو ڈھونڈتی رہتی تھیں۔ بہر حال جلد ہی اسے اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اپنے مقصد میں کسی حد تک کامیاب ہو چکا تھا۔

یوں اچانک عیسیٰ کی موت کے دکھ پہ اپنوں کی جان کا خوف واقعی حاوی ٹھہرا تھا۔ نگین اسے ہر اس نظر سے دیکھتی اور بجائے واویلا کرنے کے خاموشی سے کہیں چھپنے کی کوشش کرتی۔ سین اس کی بے بس حالت پہ تڑپ کے رہ جاتی۔ ادھر دن بہ دن غم اور

بڑھتے خوف اور سٹریس کی وجہ سے گنگی کا دماغ ماؤف ہونے لگا تھا۔ اسے دورے پڑنے لگے تھے۔ بیٹھے بیٹھے تو کبھی کبھی نیند میں ہی اچانک وہ زور زور سے چلانے لگتی۔ کسی کے قابو میں نہ آتی۔ اکثر رات میں اسے کئی بار مردان خان کے پرانے لال کنویں سے بھی پکڑ کے لایا گیا۔ رات کو نہ جانے وہ موم بتیاں جلا جلا کے اس کنویں کے کالے گہرے پانی میں کس کو کھوجنے نکل جاتی۔ نہ رات کے اندھیرے کا خیال کرتی نہ سردی گرمی کی پرواہ۔

کئی بار حویلی کے بڑے پھانک تک کو پار کر گئی۔ نہر کے قریب سے لوگوں نے پہچان کے عزت سے حویلی واپس پہنچایا۔ سین اور زریاب تو اب پریشان سے ہونے لگے تھے اور سہراب اسی قدر پرسکون۔ وہ جس قدر خود سے غافل ہوتی جاتی سہراب علی خان کے لئے اتنا ہی اچھا تھا۔ انہیں اس طرف کی کوئی پریشانی ہی نہ رہتی۔

سین کو پڑھائی مکمل کرنے واپس شہر جانا تھا اور گنگی کو اس حالت میں چھوڑ کے جانا اسے بالکل بھی مناسب نہیں لگ رہا تھا۔ خود عیسیٰ لالا جیسے پیارے انسان کو یاد کر کے دن میں کئی بار اس کی پلکیں بھیگ بھیگ جاتیں۔ دل پہروں اداس رہتا۔ عیسیٰ لالا کی معصوم سی مسکراہٹ متواتر اس کی پلکیں نم کئے رکھتی اور پر سے گنگی کی یہ حالت۔

لیکن۔۔

اس دنیا میں ہر شے فانی ہے۔۔۔ اپنے وقت پہ سب ختم ہو جاتا ہے۔۔۔ زندگی یونہی چلتی رہتی ہے۔ کسی لے لئے نہیں رکتی۔ کوئی نہ بھی چلنا چاہے تب بھی قدم آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ اپنی مرضی چلتی ہی کہاں ہے وقت کے پہنیے پہ اور یہی تو وقت کا حسن ہے۔ یہ ہر درد پہ دھول ڈال ہی دیتا ہے۔ درد ختم نہ سہی کم کر ہی دیتا ہے۔ وہ سب بھی آہستہ آہستہ وقت کے پہنیے کے ساتھ چلنے لگے تھے۔ زندگی نے نئی ڈگر جو سنبھالنی تھی۔

☆.....☆.....☆

”اتنا خوبصورت کپیل ہے آپ کا ماشاء اللہ۔ اور شادی کے شروع کے دنوں میں ہی اللہ پاک کی اتنی بڑی نعمت۔۔۔ تو یہ ناشکری کیوں؟“ لالہ کا مکمل چیک اپ کرنے کے بعد اس ڈاکٹر نے حیرت سے باریال سے پوچھا تھا۔

”میری وائف پرسکون نہیں ہے اور مجھے وہ نہیں چاہئے جو انہیں نہیں پسند۔“ باریال خود کو پہلے سے ان سوالوں کے لئے تیار کر کے آیا تھا۔ اس نے اعتماد سے فوراً جواب دیا تھا۔ لالہ نے حیرت سے اس ”مرد“ کو دیکھا تھا۔۔۔ ڈاکٹر کی آنکھوں میں بھی حیرت ابھری تھی۔

”اتنی چھوٹی سی بات کے لئے آپ اللہ پاک کی اتنی بڑی ناشکری کرنے پہ تلے ہیں۔ خدا کا خوف نہیں رہا آپ کو۔ اور تم۔۔۔ تم تو خوش قسمت ہو ماں کے مرتبے پہ فائز ہونے جا رہی ہو۔ بچے سے ماں کو بے سکونی۔ اس ریلی سٹریٹج۔۔۔“ اس نے کندھے اچکاتے ہوئے تلخ لہجے میں کہا تھا۔

”ڈاکٹر پلینز۔“ باریال نے ہاتھ اٹھا کے انہیں مزید کچھ بھی کہنے سے منع کیا اور آگے بڑھ کر لالہ کی بیڈ سے اترنے میں مدد کرنے لگا۔

”ہو جاتا ہے اکثر۔ آپ نہیں سمجھیں گی۔“ وہ اب اسے ساتھ لئے کھڑا تھا۔ لالہ نے دیکھا وہ قد میں کتنا اونچا تھا۔ اسے خود پہ پہلی بار رشک آنے لگا تھا۔

”تھینکس فار یور کنسرن۔ ہم کوئی اور کلینک دیکھ لیتے ہیں۔“ باریال نے مسکراتے ہوئے ان کا شکریہ ادا کیا۔

”میں پھر بھی یہی کہوں گی۔ ایسا کوئی کام نہ کریں جو اللہ پاک کے عذاب کو دعوت دے۔ اسلام میں تو ناجائز بچے کا قتل جائز نہیں۔ یہ تو پھر ماشاء اللہ ایک مکمل کپل کا بچہ ہے۔ یہ سراسر ناشکری ہے۔“

ان کی بات پہ لالہ نے چونک کے انہیں دیکھا تھا۔ باریال ان سے اجازت لیتا اسے لے کر باہر آ گیا تھا۔

”یہ ڈاکٹر کیا کہہ رہی تھی ناجائز بچے کا قتل بھی جائز نہیں۔“ گاڑی کے آگے بڑھتے ہی لالہ نے باری سے پوچھا تھا۔

”صحیح کہہ رہی تھی۔ یہی تو میں اور دیدے تمہیں سمجھانا چاہ رہے تھے۔“ وہ سامنے دیکھتے ہوئے بولا۔

”لیکن آپ نے کہا تھا ولی اگر میں نہیں رکھنا چاہتی تو میں اسے ابارٹ کروا سکتی ہوں۔“

”بے شک۔ لیکن اب یہ ہے تو انسان نا۔ اس کا کوئی قصور نہیں ہے بہر حال اب اس کا ابارٹن قتل ہی ہوگا۔ اگر اسے جنم دوگی تو ایک جان بچا لوگی۔“

”لیکن یہ مجھے وہ درد، وہ رات نہیں بھولنے دیتا ولی۔ مجھے جب بھی اپنے اندر اس کا وجود محسوس ہوتا ہے ایک ایک زخم جیسے کھرچنے لگتا ہے۔“ اس کی آواز بھرانے لگی۔ باریال نے بائیں ہاتھ سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”میں تمہارے ساتھ ہوں نالالہ۔ کسی کے دیئے زخموں کو بھول کر میری دوستی یاد کر لیا کرو۔ تمہیں یہ سب پھر تکلیف نہیں دے گا۔“ اس نے لالہ کا ہاتھ تھامے رکھا تھا۔

”یہ مشکل ہے ولی۔ میں اس بوجھ کو اپنے اندر نہیں رکھ سکتی بس۔“ وہ سسک اٹھی تھی۔

”اچھا جا رہے ہیں نہ دوسرے کلینک۔ یہ والے ضرور ہماری مشکل حل کر دیں گے۔“ اس نے تسلی دیتے ہوئے گاڑی بائیں طرف ایک تنگ گلی میں موڑ دی تھی۔ ذرا دور جا کر ایک اونچے پرانے زنگ آلود دروازے کے سامنے گاڑی روکی۔ گیٹ کھلا تھا۔ وہ اسے لئے اندر آ گیا۔ یہ ایک بنگلے کا وسیع احاطہ تھا جو اس وقت بالکل خالی تھا۔ ایک طرف کونے میں بڑا سا ڈسٹ بنا ہوا تھا اور اس طرف سے عجیب سی بدبو اٹھ رہی تھی۔ لالہ کا دل خراب ہونے لگا اس نے فوراً دوپٹہ ناک پہ رکھا۔

”یہ کیسی جگہ ہے ولی۔“ اسے خوف سا آنے لگا تھا۔ اس نے باریال کا بازو تھامتے ہوئے پوچھا۔

”غلط کام کرنے والوں کے کلینک ایسے ہی ہوتے ہیں۔ خوفناک اور سرد۔ تم گھبراؤ مت میں ہوں نا۔“ اس نے تسلی دی۔ اسی وقت اندرونی دروازہ کھلا ہوا تھا اور ایک ادھیڑ عمر عورت لہورنگ ہاتھ میں گوشت کے لوتھرے اٹھائے باہر آئی تھی۔ اسے دیکھ کے لالہ کو بے اختیار ابکائی آئی تھی۔ باریال نے اسے سنبھالا تھا۔ ان دونوں کو دیکھ کے وہ عورت ٹھٹھک کے رکی تھی پھر گنداس ڈسٹ بن میں پھینک کر واپس ان کے پاس آئی تھی۔ اب اس کے چہرے پہ معنی خیزی مسکراہٹ تھی۔

”آ جاؤ اندر۔ ڈاکٹر صاحبہ موجود ہیں۔“ اس نے کہا تو باریال لالہ کو ساتھ لئے اس کے پیچھے بڑھ گیا۔

ڈاکٹر نے کچھ دیر ان سے بات کر کے باریال کو باہر انتظار کرنے کا کہا تھا۔

”اسی کا بچہ ہے جو ساتھ ہے مہارے۔“ ڈاکٹر نے باریال کے باہر جاتے ہی اس سے پوچھا۔ وہ خاموش رہی۔

”اتنا تو میں سمجھ گئی ہوں تم دونوں میاں بیوی ہو نہیں۔“ اس نے تیر چلایا۔ لالہ نے چونک کے اس کی طرف دیکھا۔

”لیکن ڈرو نہیں۔ یہاں ہر کام پوری رازداری سے کیا جاتا ہے۔ سمجھو تم کبھی اس عمارت میں آئی ہی نہیں۔“

”ہم واقعی میاں بیوی ہیں۔“ لالہ نے اس کی غلط فہمی دور کی۔ نہ جانے کیوں باریال کے لئے اس کی یہ سوچ اسے بہت بری لگی۔

”رینلی۔“ اب کی بار حیران ہونے کی باری ڈاکٹر کی تھی۔

”جی۔“

”تو پھر یہ سب کیوں۔۔۔؟“

”بس مجھے ابھی بچہ نہیں چاہیے۔“

وہ نظریں جھکا گئی۔

”اوہ! آج کل کی لڑکیوں کا یہ فٹنس کریز۔ کیا کیا کر لیتی ہو تم لوگ۔۔۔“ وہ اب واپس پلٹ چکی تھی۔ نیل بختے ہی باریال اندر آیا تھا۔

”آپ نہیں کل لے آئیں۔ میں آپریشن کر دوں گی اور ان کی حالت بہت کمزور ہے ہمیں خون کی بھی ضرورت پڑ سکتی ہے۔“

انہوں نے ہدایت کی۔ باریال وہ چھوٹی سی چٹ پکڑتا سر ہلا گیا۔

باہر آتے ہوئے لالہ نے بس یونہی ایک نظر ڈسٹ بن کی طرف دیکھا تھا۔ گوشت کا لوتھر ادھوپ میں رکھا چمک رہا تھا۔

”ولی۔ میں اس بچے کو جنم دوں گی۔“ اس نے گاڑی میں بیٹھتے ہی کہا تھا۔ باریال کو جھٹکا سا لگا تھا۔ اس نے حیرت سے لالہ کو

دیکھا تھا۔

”لیکن اس کے بعد ہم اسے کسی اچھے خاندان میں دے دیں گے جن کی اولاد نہ ہو۔ آپ مجھے فورس نہیں کریں گے اسے رکھنے

کے لئے۔“ اس نے باریال کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

”تم ہمیشہ مجھے اپنے ساتھ پاؤ گی لالہ۔“ اس نے مسکراتے ہوئے اس کا گال چھوا تھا اور لالہ نے سر سیٹ سے لگاتے ہوئے بے اختیار سوچا تھا۔ کاش وہ اس خالص مرد کے لئے ویسی ہی خالص اور پاک رہی ہوتی کہ وہ اسے چھوتا تو ناپاک نہ ہوتا۔۔۔ بند پکوں کے پیچھے سے آنسو لڑکھڑاس کے گال پہ پھسل گیا۔ باریال نے اس کی طرف دیکھے بنا مطمئن انداز میں گاڑی آگے بڑھا دی تھی۔

☆.....☆.....☆

وہ اپنا سامان پیک کر رہی تھی جب اس کی ایک نوٹ بک اس کے ہاتھ سے چھوٹ کے نیچے جا گری۔ اس میں سے ایک سفید کاغذ نکل کے سیدھا ساتھ بیٹھی ننگین کے پیروں میں آگرا۔ سین کی نظر اس پہ نہیں پڑی تھی۔ اس نے کتاب اٹھائی اور بیگ میں رکھ لی۔ ننگین نے گم سم انداز میں وہ کاغذ اٹھایا اور یونہی کھول کر پڑھنے لگی۔ زیادہ نہیں پڑھا گیا لیکن جتنا بھی پڑھا اس سے اس کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔ وہ تیزی سے اٹھی تھی اور کھڑکیاں دروازے بند کرنے لگی تھی۔ سین نے حیرت سے اسے اچانک یہ سب کرتے دیکھا تھا اور فوراً اس کی طرف آئی۔

”نگی۔۔۔ نگی کیا ہوا ہے۔ آپ ٹھیک تو ہیں؟“ وہ پریشانی سے اسے پکارتی اسے روکنے کی کوشش کرنے لگی۔
 ”ہشش۔ ہشش۔“ نگی نے ہاتھ اس کے منہ پہ رکھ کے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ چپ ہو گئی۔ اسے چھوڑ کر نگی دوبارہ کھڑکی دروازوں کو دیکھنے لگی۔ جب سب بند ہونے کی اچھی طرح تسلی ہو گئی تو وہ بہن کا ہاتھ تھام کر بیڈ کی طرف لے آئی۔
 ”یہ کون ہے؟“ اس نے وہ سفید خوبصورت لکھائی سے بھرا کاغذ اس کی طرف بڑھایا وہ رقعہ دیکھ کے سین گھبرا سی گئی۔
 ”یہ۔۔۔ یہ۔۔۔“

”گھبرا نہیں بتاؤ مجھے۔۔۔ یہ لڑکا کون ہے۔“ انہوں نے اسے تسلی دی۔ ایک پل کو سین کو حیرت بھی ہوئی۔ ننگین اتنے دنوں بعد ہوں نارمل ہو کے بات کر رہی تھیں۔

”بتاؤ نہ چھوٹی۔۔۔ کون ہے یہ لڑکا۔۔۔ جلدی۔“ انہوں نے سین کا کاندھا ہلایا۔ وہ بری طرح چونکی۔
 ”سید ہیں۔ بہت قابل ہیں اور اچھے انسان بھی۔ ہمارا ایڈمیشن لیٹ ہوا تو انہوں نے بہت مدد کی۔“ وہ بتانے لگی۔
 ”اور۔۔۔“ نگی پر جوش سا اس کے قریب ہوئی۔
 ”وہ مجھے پسند کرتے ہیں اور مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔“
 ”اور تم۔۔۔؟“

”مجھے بھی اچھے لگتے ہیں وہ۔“ وہ ہاتھ چھڑا کر اٹھ گئی۔ ننگین اس کے پیچھے ہی اٹھی۔
 ”لیکن میں جانتی ہوں یہ ممکن نہیں ہے۔ ہمارا ذات کا فرق اور پھر لالہ۔۔۔ کبھی بھی اس کے لئے نہیں مانیں گے۔“

”ممکن ہے۔ اور تم غلط کہہ رہی ہو لا لامان جائیں گے سہراب نہیں مانے گا۔“ نکین نے لب کچلتے ہوئے کہا تھا۔ سہراب کے نام پہ جو نفرت ان کے لہجے میں گھل گئی تھی اس نے سین کو ششدر کر دیا تھا۔

”کیا مطلب لگی۔ آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں۔“

”ادھر آؤ میری بات غور سے سنو۔“ انہوں نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے بستر پہ اپنے قریب بٹھایا۔

”خبردار۔ اس بات کی ہوا تک نہ جانے پائے اس کمرے سے باہر۔ اور یہ کاغذ۔ ابھی کے ابھی اس سب کو چھپالو۔ اور میری بات غور سے سنو۔ تم آج جاؤ گی تو دوبارہ اس حویلی نہیں آؤ گی۔“ انہوں نے شہادت کی انگلی دکھاتے ہوئے سخت لہجے میں کہا تھا۔

”یہ کیا کہہ رہی ہیں لگی۔“ وہ دنگ رہ گئی۔

”بالکل ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ اس حویلی پہ آسیب بیٹھ گیا ہے۔ وہ جب دل کرتا ہے اپنے خوفناک لمبے پنچے بڑھا کے اپنا من پسند شکار کر لیتا ہے۔ اس بار اس کی خونی غلیظ نظر تم پہ ہے۔“ وہ آنکھیں پھاڑا سے بتائے جا رہی تھیں۔ سین کا دل دھڑک اٹھا تھا۔

”یہ کیا کہہ رہی ہیں لگی۔ کیوں مجھے پریشان کر رہی ہیں۔ آسیب کب ہوتے ہیں بھلا۔؟“ وہ اٹھنے لگی جب لگی نے ہاتھ پکڑ کے اسے دوبارہ بٹھالیا۔

”آسیب ہے۔ سہراب نام ہے اس کا۔“

”سہراب لا لا۔۔۔“ وہ مزید حیران ہوئی۔

”لا لا نہیں ہے وہ کالا سانپ ہے زہر سے بھرا ہوا جو عیسیٰ کو نگل گیا۔ اب اس کی نظریں تم پہ جمی ہیں۔“

”مجھ پہ۔۔۔؟“ وہ ساکت سی ہوئی۔

”ہاں سین تم پہ۔۔۔“

”کیا کہہ رہی ہیں لگی۔“ وہ الجھ گئی۔

”میں نے کبھی غلط کہا کچھ تم سے۔“ انہوں نے پوچھا۔ وہ نفی میں سر ہلا گئی۔

”تو بس تم اس کے بعد کسی کو نہیں ملو گی۔ نہ ہی واپس آؤ گی۔ اس لڑکے کے ساتھ گھر بساؤ گی ورنہ یاد رکھنا سین، عیسیٰ تو مر گیا تم مر بھی نہ سکو گی۔ حویلی کے لال کنویں کا تو تمہیں علم ہی ہے اب تو وہ بھی پناہ نہیں دیتا۔“ انہوں نے اپنے بستر پہ لیٹتے ہوئے آنکھوں پہ بازو رکھ دیا۔ سین خوف سے بت بنی بیٹھی ان کی باتوں کو سوچتی رہی۔

واقعی کچھ دن پہلے لگی نے بھی خود کشی کی کوشش کی تھی لیکن انہیں بچا لیا گیا تھا۔

”تو کیا سہراب لا لا۔۔۔ اور مجھ پہ نظر۔۔۔“ سوچ سوچ کے اس کی روح کانپ رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا واقعی اسے اب فیصلہ

کرنا تھا اور اس بار جو ملی سے نکلتے ہوئے وہ فیصلہ کر چکی تھی۔

☆.....☆.....☆

گھر واپس آتے وقت جس قدر اس کا موڈ خوشگوار ہوا تھا وہاں سے آفس کے لئے نکلتے وقت اسی قدر اس کا موڈ بگڑ چکا تھا۔ امن اور اس کے باپ نے نہ صرف خود کا ٹریکٹ ختم کر دیا تھا بلکہ دوسرے انوسٹرز نے بھی۔ اور باریال کو اچھی طرح اندازہ تھا کہ یہ سب امن کے بابا کی ہی حرکت ہو سکتی تھی۔

وہ گاڑی بھگتا سب سے پہلے انوسٹرز سے ملنے گیا تھا۔ انہوں نے اسی خوش دلی سے اس کا استقبال کیا تھا لیکن اس کے ساتھ آگے کام کرنے سے معذرت کر لی تھی۔ کافی دیر تک وہ ان سے بحث کرتا رہا لیکن لا حاصل۔ اپنے ہاتھوں کی دونوں پوائنٹنگ فنگرز ہونٹوں پہ جمائے وہ اب مکمل طور پہ جیسے بات ختم کر چکا تھا۔

”او کے سر۔“ وہ خود کو کمپوز کرتا اٹھ کھڑا ہوا۔

”جتنا بھی وقت آپ کے ساتھ کام کیا بہترین رہا۔“ اس نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

”انشاء اللہ ملتے رہیں گے۔“ ایم ڈی نے اٹھتے ہوئے اس سے ہاتھ ملایا۔ وہ فائلز اٹھاتے ہوئے باہر نکل آیا۔ امن اسی وقت اندر آ رہی تھی۔ اسے دیکھ کے رکی اور گہری مسکراہٹ اس کے لبوں کو چھو گئی۔

”میں نے کہا تھا نہ باری۔ میں تمہیں تباہ کر دوں گی۔“ اس کے قریب آتے ہوئے وہ ایک غرور سے بولی تھی۔ باریال کے چہرے پہ بہت خوبصورت مسکراہٹ چل اٹھی تھی۔

”تم خود کو سنبھال لو امن۔ میرے لئے یہی کافی ہے۔ اپنا خیال رکھنا۔“ سادہ سے لہجے میں کہتا اس کی سائیڈ سے نکلتا وہ اس کا دل دھڑکا گیا تھا۔ امن سکندر خان کو لگا تھا۔ تباہ باریال نہیں وہ ہوئی تھی۔ سب ختم ہو گیا تھا۔

سب کچھ۔۔۔ وہ اندر جانے کی بجائے مرے مرے قدموں سے باہر مڑ گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

سردی ابھی اپنے جوبن پہ نہیں آئی تھی۔ پھر بھی درختوں سے جھڑتے زرد پتوں نے ہر طرف دسمبر تان رکھا تھا۔ سوکھے پتوں پہ چلتی وہ جیسے ان کی آواز سننے کے لئے وہاں آئی تھی۔ ابراہیم حیات اس کے ساتھ ساتھ چلتا کبھی کبھی حیران سی نظر اس پہ ڈال بھی لیتا اور پھر فوراً نظر ہٹا لیتا۔

”خان زادی آج چپ کیوں ہیں؟“ بالآخر اس نے پوچھنے کی ہمت کر لی تھی۔

”میں چاہتی تھی آج بات تم شروع کرو ابراہیم۔“ اس نے اگلے ہی لمحے جواب دیا تھا۔ وہ حیران ہوا تھا۔

”ہمیشہ صرف میں بولتی ہوں۔ تم بس سنتے ہو۔ میں دیکھتی ہوں تم نظر چرا لیتے ہو۔ آج میرا بھی دل کیا۔ تم بولو تو بولو تم دیکھو تو دیکھو۔ میں نہ بولوں گی نہ دیکھوں گی۔“ وہ اس سے آگے بڑھ گئی۔ ابراہیم رک گیا۔ وہ یونہی نرم قدموں سے پتوں پہ چلتی رہی۔ وہ کچھ دیر اس بہار جیسی لڑکی کو خزاں کے موسم سے اٹکھیلیاں کرتے دیکھتا رہا پھر دوڑ کے اس کے پاس آ گیا۔

”کبھی کبھی میں سوچتا ہوں۔ محبت کیا ہوتی ہے؟ میں حیران بھی ہوتا ہوں چاہوں نہ چاہوں یہ کسی امر نیل کی طرح آپ کو لپیٹتی چلی جاتی ہے۔ کوئی پناہ ہی نہیں۔ دل ایک ہی پل میں اداس بھی خوش بھی۔ مطلب کسی لحاظ سے بالکل مکمل اور کسی لحاظ سے بالکل ادھورا۔ اور اب جا کے مجھے پتہ چلا بہار کا موسم بھی تو ایسا ہوتا ہے۔ دھوپ، بارش، پھول اور زرد پتے ہر رنگ سمیٹے ہوئے مکمل سی بھی ادھوری رہتی ہے۔ اور میں مان گیا۔

محبت بہار کی طرح ہوتی ہے۔

اس کے رنگ دل کو درد سادیتے ہیں۔

اس کی بارش آنکھوں کو نم سا کر دیتی ہے۔

اور اس کا جانا بالکل خزاں کر دیتا ہے۔

میں آج سے دعا کروں گا ہر رشتہ روٹھ جائے بس کبھی مجھ سے محبت نہ روٹھے۔۔۔“ وہ اس کے ہم قدم ہوا تھا۔ بہت پیاری مسکان اس پری جیسی خان زادی کے لب چھو گئی تھی۔



ناول ”محبت لفظ ہے لیکن“ ابھی جاری ہے۔ اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی 5 تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

قسط نمبر 13

اس دن وہ واقعی نگین سے اور نگین اس سے یوں لپٹ لپٹ کے روئی تھی جیسے وہ دونوں واقعی آخری دفعہ مل رہی تھیں۔ دونوں نے کتنے ہی پل ایک دوسرے کو خود میں سموئے رکھا تھا۔ ماں جائیوں کی محبت بھی خشک سالی کے قریب ہو جانے والی اچانک بارش کی طرح مقدس ہوتی ہے۔ جس طرح وہ بارش ہر سوٹی کو معطر کر دیتی ہے، قلب و جان مہک سے اٹھتے ہیں۔ بالکل اسی طرح خون کے رشتوں کا احساس ہوتا ہے۔ انگ انگ سے پہچان لی جانے والی مہک اٹھتی ہے اور روح تک کو معطر کر لیتی ہے۔ وہ دونوں اس وقت اسی خوشبو کو جیسے ایک دوسرے میں منتقل کر رہے تھے۔ لب بالکل خاموش تھے۔ آنسو کلام کر رہے تھے اور دل دعا میں مصروف تھے۔ کیا سمجھنا تھا نگین کی دھڑکنیں اسے بتا رہی تھیں اور کیا سمجھنا ہے سین سمجھ رہی تھی۔

خاموشی کی زبان میں کلام مکمل تھا۔ سہ نے سماعتوں کو کمزور کرنا تھا کہ خاموشی کی طاقت ان کی پہنچ سے کہیں دور تھی لیکن کامل تھی۔ اور اس دن حویلی کی دہلیز پار کرتے ہوئے سین کے قدم واقعی من من کے ہو گئے تھے۔ چند قدم کا فاصلہ اس نے کتنی ہی صدیوں میں کیا تھا۔

حویلی کے بڑے سے پھاٹک سے دور ہوتی گاڑی کے شیشے سے باہر دیکھتی سین واقعی یوں محبت سے اس بڑے سے پھاٹک کو تکتی رہی تھی جیسے وہ واقعی اسے بھی آخری بار دیکھ رہی تھی اور لال حویلی نے سر جھکاتے ہوئے گواہی دی تھی۔

”ماں باپ کی دہلیز پار کر جانے والی ہر لڑکی بدکردار نہیں ہوتی۔ کچھ گھر کے اہلیسوں سے پناہ کے لئے باہر کے مردوں پہ بھروسہ کر لیتی ہیں۔ آگے ان کی قسمت۔“ اور اس لال حویلی نے اپنی اس بیٹی کی اچھی قسمت کی دعا کی تھی۔

حویلی کے نظروں سے اوجھل ہوتے ہی سین چادر میں منہ چھپا کے رو دی تھی۔

☆.....☆.....☆

وہ ہمیشہ اللہ پاک پہ یقین رکھنے والوں میں رہا تھا لیکن بزنس میں یہ دوسری بار تھا جب اچانک ہی اسے سخت پریشانی نے آگھیرا تھا۔ وہ ہر قسم کے حالات سے لڑنا جانتا تھا۔ لیکن پھر بھی تھا تو انسان۔ اپنے تاثرات وہ بہر حال نہیں چھپا پایا تھا۔ لالہ اسے پریشان دیکھ کر عجیب سی شرمندگی میں گھرنے لگی تھی۔

”آپ میرا مکان بچ دیں۔“ رات کو وہ تھکا ہارا گھر آیا تو لالہ نے فوراً اسے صلاح دی۔

”پاگل ہو۔ ایسا نہیں سوچتے۔ اللہ پاک خیر کرے گا۔“ باریال نے بیڈ پہ بیٹھے ہوئے اسے تسلی دی اور جوتے اتارنے لگا۔
 ”مجھے ویسے بھی اب اس کی ضرورت نہیں۔ امی لوگ بھی پتہ نہیں کہاں چلے گئے۔ اس وقت میں وہ بہترین کام آ سکتا ہے۔“
 ”لالہ! پلیز.....“ اس بار اس نے قطعی لہجے میں اسے ٹوک دیا تھا۔ وہ اس بارے میں مزید بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس کے سامنے زمین پہ بیٹھ گئی۔ باریال کی نظریں اس کے خوبصورت چہرے پہ جم سی گئیں۔

”میں نے آپ کی زندگی مشکل کر دی۔“ اس کی کٹورا آنکھیں پانیوں سے بھر نے لگیں۔ باریال اسے بے بسی سے دیکھتے ہوئے دونوں ہاتھوں کی پوائنٹنگ فنگرز ملاتے ہوئے لبوں پہ جما گیا۔ نظریں ہنوز لالہ کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔ کچھ دیر تک لالہ اس کے جواب کی منتظر رہی پھر اٹھ کر مڑنے لگی۔ جب باریال نے اچانک اس کا ہاتھ تھام کر اسے اپنے ساتھ بٹھالیا۔ وہ چپ چاپ زمین کو تکتی بیٹھ گئی۔
 ”لالہ! آزمائش اللہ کی طرف سے ہوتی ہے اور اس میں پورا اترنے کے لئے فرار نہیں، دعا کی جاتی ہے۔ تم بس دعا کرو۔ اللہ پاک سبب بنا دے گا۔ اور پلیز آئندہ اس بارے میں بات نہ کرنا۔ ہم لوگ بیٹیوں، عورتوں کا مال کھانا حرام سمجھتے ہیں۔ وہ تمہارا حق ہے۔“
 ”میری چیز آپ کی نہیں ہے؟“ وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے شکوہ کر گئی۔

”بالکل ہے۔ لیکن تم میری ہو میرے لئے بس یہی کافی ہے۔“ اس نے لالہ کی کمر میں بازو حائل کرتے ہوئے استحقاق سے کہا تھا۔ لالہ اس بار کچھ نہ بول سکی تھی۔

”اور اب دعا کرو تم میرے لئے۔ تم اور دیدے میرے ساتھ ہونا انشاء اللہ میں کبھی نہیں ہار سکتا۔ یہ چھوٹی پریشانیاں تو کچھ بھی نہیں، بڑے بڑے پہاڑ سر کر جاؤں میں۔“ وہ مسکرایا تھا۔ لالہ نے روشنی سی چاروں اور بکھرتی محسوس کی تھی۔ خلوص بھرے لوگوں کی مسکراہٹ کتنی پر نور ہوتی ہے اس نے دل سے تسلیم کیا تھا۔

☆.....☆.....☆

”تم.....؟“

وہ اس سے جتنی بار بھی ملا تھا حادثاتی طور پہ ملا تھا لیکن پھر بھی اس کی آنکھوں اور اسکے چہرے میں ایسا کچھ تھا کہ باریال اسے دیکھتے ہی پہچان گیا تھا۔ دروازہ کھولتے ہی جب وہ اس کے سامنے آیا تو بے اختیار وہ پکار بیٹھا تھا۔ سامنے والے کے چہرے پہ بہت پیاری مسکراہٹ چل اٹھی تھی۔

”دیکھ لیں۔ آپ تو ہمیشہ مجھے غلط جگہ پہ ٹکراتے ہیں۔ میں نے آپ کو صحیح جگہ ڈھونڈ لیا۔“ اس کے گال کی لمبی سی لکیر کافی گہری ہوئی۔ باریال کو اس سے عجیب سی شناسائی محسوس ہوئی تھی۔

”اصل میں آپ کے آفس گیا تھا۔ کچھ کام کے سلسلے میں۔ وہاں سے یہاں کا ایڈریس ملا لیکن مجھے یہ پتہ نہیں تھا کہ یہ آپ ہوں

گے۔“ اس نے تفصیلی بات کی۔

”اچھا اندر آ جاؤ۔“ باریال نے اسے راستہ دیا۔ ضیاء علی خان نے بس ایک لمحہ سوچا تھا اور قدم اندر دھر دیا تھا۔ دل کی دھڑکن جیسے محو رقص ہوئی تھی۔ عجیب سی خوشی اس کے اندر سرایت کرنے لگی تھی۔ خوشبو سی اس کا حصار کرنے لگی تھی۔ وہ کہیں آس پاس تھی۔ یقین کامل تھا۔ باریال اسے لیے لاؤنج میں آ گیا۔ وہ گہری نظروں سے ارد گرد کا جائزہ لے رہا تھا۔

”کس سلسلے میں ملنا چاہتے تھے؟“ وہ کچن کے قریب رکھی کرسی سنبھال گیا۔ باریال کچن کی طرف جاتے ہوئے بولا۔

”بزئس.....“ ضیاء مسکرایا۔

”میں کہیں انویسٹ کرنا چاہتا تھا۔ کسی دوست نے آپ کا بتایا لیکن مجھے قطعی علم نہیں تھا کہ آپ وہی ہیں..... میرے محسن۔“ ضیاء کے چہرے پہ وہی دوستانہ مسکراہٹ تھی جو اس کی شخصیت کا خاصہ تھی۔

”محسن..... مطلب..... دوست کہو، بھائی کہو۔ قسمت میں ملنا ہی ایسے لکھا تھا۔ خیر کیا لو گے؟“

”اپنا گھر ہے اب تو کھانا کھا کے جاؤں گا۔“ وہ بے تکلفی سے مسکرایا تھا۔ باریال کو اس کا انداز بے حد اچھا لگا تھا وہ بھی خلوص سے مسکرا دیا تھا۔

”وائے ناٹ، شیور۔“ وہ کندھے اچکا گیا تھا۔

”ابھی پھر چائے بنا لیتا ہوں۔“ باریال نے کہا۔

”میں بھی مدد کر دیتا ہوں۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ ضیاء علی خان کو اس گھر کا حصہ بننے میں صرف پل لگانے تھے اور وہ کامیاب رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

ننگین سب گھر والوں سے بالکل الگ سی ہو گئی تھی۔ زریاب لالہ کی اسے زندگی کی طرف موڑنے کی ساری کوششیں بیکار گئی تھیں۔ وہ اب صرف تب بولتی یا چیختی تھی جب اسے دورہ پڑتا۔ گاؤں میں کسی کی شادی کا ڈھول بجتا۔ شادیانے کی تال گونجتی۔ کوئی فاریا پٹاخہ کی آواز سنائی دے جاتی۔

وہ آہستہ آہستہ شعور کو کہیں بہت پیچھے چھوڑ رہی تھی۔ حال کہیں پیچھے رہ گیا۔

ادھر سبین اس دفعا ایسی گئی کہ پھر مڑ کر نہ دیکھا تھا۔ کافی دن بعد جب اس سے رابطہ نہ ہوا تو سہرا ب کو بھیجا گیا لیکن وہاں جا کر اسے پتہ چلا کہ وہ تو ان چھٹیوں کے بعد یہاں آئی ہی نہیں۔ نہ صرف انتظامیہ ادارہ بلکہ اس کی تمام دوستوں نے بھی یہی بتایا کہ وہ چھٹیوں کے بعد آئی ہی نہیں۔

سہرا ب حویلی آیا تو غصے سے اس کا برا حال تھا۔ لال حویلی پہ جیسے ایک اور قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ سب رو رہے تھے اور ننگین خوب

تالیاں مار مار کے ہنسی۔ خوب ہنسی، خوب روئی۔

نجانے کیوں سہراب کو وہ کچھ مشکوک سی لگی لیکن فی الحال وہ اس کے جھنجھٹ میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ اسے ساری توجہ سین پر رکھنی تھی۔ اسے ڈھونڈنا تھا۔ اس بے عزتی کا بدلہ لینا تھا جو وہ اس کے دامن پہ لگا گئی تھی۔ ڈرائیور کے مطابق ہمیشہ کی طرح وہ اسی جامعہ کے سامنے ہی اسے چھوڑا تھا لیکن وہ اس کے بعد کہاں گئی۔ وہ نہیں جانتا تھا۔

”اور دیں لڑکی ذات کو ڈھیل۔ کہا بھی تھا لیکن نہیں۔“ سہراب دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ نگین کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔ اس کا دل کر رہا تھا اپنے ہاتھوں سے اس وحشی انسان کا کیجہ نکال کے چبا لیتی۔ زریاب لالہ کا اب خیال نہ ہوتا تو وہ کربھی لیتی لیکن بہر حال اسے خوشی تھی وہ سین کو ان کے چنگل سے بچا چکی تھی۔ اسے پورا یقین تھا وہ اس کی خاک کو بھی نہیں پہنچ سکتا تھا اور یہ چیز ویسے بھی اسے تاؤ دلا رہی تھی۔ ایسے میں نگین کی چھوٹی سی غلطی زریاب لالہ کو کوئی بھی نقصان پہنچا سکتی تھی۔

”سارا گاؤں تھو تھو کرے گا اب ہم پہ۔“ سہراب لب کچلتے ہوئے دھاڑا۔

”سہراب! برداشت سے کام لو۔ تم ڈرائیور سے کہو تیار کرے گاڑی۔ میں خود جاؤں گا شہر۔ لڑکی کا معاملہ ہے کسی بھی قسم کی جلد بازی معاملہ بگاڑ سکتی ہے۔ حوصلہ رکھو۔ میں سب سنبھال لوں گا۔“ انہوں نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے تسلی دی اور اندر چلے گئے۔ سہراب لب کچلتا نگین پہ نظر جما گیا۔ نگین کے مرجھائے لبوں پہ مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔ سہراب کی آنکھوں میں الجھن بڑھی تھی۔ کچھ تو تھا اس اجڑی خانزادی کے دل میں..... لیکن کیا..... وہ الجھتا چلا گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

سین کا پتہ چلنا تھا نہ چلا۔ زریاب نے ہر طرح سے اسے تلاش کیا تھا۔ اپنے آدمیوں کے ذریعے بھی اور ہر طرح کا اثر و رسوخ بھی استعمال کر کے دیکھ لیا تھا۔ لیکن بے کار۔ کچھ بھی کارآمد ثابت نہیں ہوا تھا۔

ادھر سہراب نے زریاب لالہ کے جاتے ہی نگین کو جالیا تھا۔

”کہاں ہے سین؟“ اس نے نگین کے سر کے بال کھینچتے ہوئے پوچھا تھا۔

نگین درد سے اف کرنے کی بجائے قہقہہ لگا گئی۔

”اس کا مطلب، کچھ تو کالا ہے دال میں۔“ وہ اس قدر بری طرح اپنا نچلا لب کچل گئے تھے کہ اس میں سے خون رسنے لگا تھا۔

نگین کے دل کو نجانے کیوں عجیب سی خوشی ملی۔

”بول..... کہاں ہے سین؟“

”تھو۔“ نگین نے اس کے منہ پہ تھوک دیا تھا۔ سہراب نے ایک جھٹکے سے اس کے بال چھوڑے تھے پھر قہر باز نظروں سے اسے

گھورتے ہوئے آستین سے چہرہ صاف کیا تھا۔

”تو زمین کھود لے، آسمان کو جالے لیکن سین کو نہیں ڈھونڈ پائے گا۔ ساری عمر تیرے اس گورے چہرے پہ کا لک رہے گی۔ باہا باہا..... آئے گا جب مہلت پوری ہوگی..... تیرا کیا ہوگا سوچ، تیرا کیا ہوگا۔“ وہ بے ڈھنگے پن سے ہنسنے لگی تھی۔

”میرا تو جو ہوگا دیکھ لوں گا۔ پہلے اس آفتاب خان کا بیچ تو ختم کر لوں، اس کے لہجے میں کمینگی در آئی۔“

”کرتا ہوں کچھ۔ بس دیکھنے کے لئے ہوش میں رہنا۔“ زہر بھرے لہجے میں کہتا وہ اٹھے قدم پیچھے جانے لگا۔ نگین کے چہرے پہ وحشت سی لہرائی تھی اور وہ کمینگی سے قہقہے مارنے لگا تھا۔

وہ ہاتھ سے اس کی طرف اشارہ کرتا اور اور زیادہ زور سے ہنستا۔ وہ باہر نکل گیا تھا..... اور نگین پتھری اس کی بات کے معنی تلاشتی رہی۔

☆.....☆.....☆

”خیریت، اتنے پیسوں کی تمہیں کیا ضرورت پڑ گئی وہ بھی اس قدر اچانک؟“

فون پہ باء کا نام جگمگاتا دیکھ کر اس نے بد دلی سے کال اٹینڈ کی تھی اور فوراً ہی ان کی بات نے اسے مزید تپا دیا تھا۔ وہ ضبط سے لب کچل گیا۔

”آپ جانتے ہو باء۔ ضیاء علی خان کو عادت نہیں وضاحت دینے کی۔ آپ بے شک نہ دیں پیسے۔“ اس کی آواز میں عجیب سی سرد مہری تھی۔ ان کی جان ابھی تک ناراض تھی ان سے۔ سہراب علی خان کے دل کو کچھ ہوا۔

”صبح تک تمہارے اکاؤنٹ میں پیسے پہنچ جائیں گے اور کچھ.....“ اس بار ان کا لہجہ مکمل طور پہ مفتوح تھا۔

”نہیں۔ اور یہ اپنے آدمیوں کو ذرا مجھ سے دور رکھیں۔ ورنہ اب میرے اختیار میں صرف میں ہوں۔ یاد رکھا کریں باء۔“ اس نے تلخی سے کہتے ہوئے کال کاٹ دی تھی۔ جہاں اسے پیسے کا سن کے اطمینان ہوا تھا دوسری طرف سہراب علی خان اس کے لہجے کی سرد مہری پریشان کر گئی تھی۔ جتنا ضیاء علی خان کو وہ جانتے تھے وہ جو چاہتا وہ کر کے رہتا تھا اور اس بار جتنے پیسوں کی ڈیمانڈ اس نے کی تھی وہ کافی زیادہ تھی۔ انہیں اب جلد از جلد معلوم کروانا تھا کہ وہ کیا کرنے لگا تھا۔

”اس لڑکی نے تو دماغ ہی خراب کر دیا ہے اس لڑکے کا۔ پھر اس کے چکر میں نہ ہو.....“ انہیں لالہ بری طرح یاد آئی تھی۔ سوچ سوچ کے دماغ ماؤف ہونے لگا تھا۔

☆.....☆.....☆

”گاؤں والوں کی نظریں دیکھو ذرا، ایک ایک آنکھ میں نشتر ہے۔ اس بد ذات نے ہمیں کہیں منہ دکھانے کے لائق نہیں چھوڑا۔“

ابھی ابھی وہ زمینوں کا چکر لگا کے ڈیرے پہ پہنچے تھے۔ اور سہراب خان کو سارے راستے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ہر کوئی اس کی طرف ہی انگلی

اٹھائے اشارہ اور سرگوشیاں کرنے میں مصروف ہیں۔

”کیا کر سکتے ہیں اب خان۔“ دوران گن صاف کرنے بیٹھ گیا۔

”کچھ تو کرنا پڑے گا دوران کہ لاٹھی بھی ٹوٹ جائے اور سانپ بھی مر جائے۔“

اس کی بات پہ دوران چونکا۔

”کیا مطلب خان؟“

”مطلب صاف ہے دوران۔ کوئی ایسا درد جس سے لال حویلی کے ماتھے پہ لگا یہ دھبہ بھی مدھم پڑ جائے اور ہماری راہ بھی آسان

تر ہو جائے۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے خان؟“ دوران واقعی نہیں سمجھ پا رہا تھا۔ سہرا ب خان کی سبز ہریلی آنکھوں میں خون سا چھلکنے لگا تھا۔

”بس یوں سمجھو کہ لوگ ہمارے داغ کو بھول کر ہمارے درد میں شریک ہو جائیں گے۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے اسے

دیکھا۔

”بہن بھاگ گئی تو غیرت مند بھائی نے خودکشی کر لی۔ کس منہ سے واپس گاؤں آتا۔“ انہوں نے جیسے پلان بتایا تھا۔ دوران کی

آنکھوں کی چمک بتا رہی تھی کہ وہ بات سمجھ گیا تھا۔ مسکراہٹ نے اس کے لبوں کا بھی احاطہ کیا تھا۔ دونوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں جیسے

ساراپلان ترتیب دے ڈالا تھا۔

☆.....☆.....☆

رات کے نجانے کون سے پہر عجیب سے احساس سے اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ اس نے چہرہ موڑ کے لالہ کی طرف دیکھا۔ وہ سو

رہی تھی اور اس کا ہاتھ باریاں کے سینے پہ دھرا تھا۔ نیند میں وہ اس کے بے حد قریب آ گئی تھی۔ وہ چپ چاپ اس کا چہرہ دیکھے گیا۔ اس کے

چہرے کی گلابی رنگت زردیوں کی پناہ میں تھی۔ وہ مر جھاسی گئی تھی۔ اس کے گلابی ہونٹ عجیب بے رنگ سے ہو گئے تھے۔ وہ برنس کی ٹینشن

میں رہتا تھا اور دیدے بے چاری اپنے کاموں میں، ایسے میں ان میں سے کوئی بھی شاید اسے دھیان نہیں دے پایا تھا اور اپنے لئے تو وہ

جیسے مر ہی چکی تھی۔ باریاں کو افسوس ہونے لگا۔

اس نے نہایت آہستگی سے سینے پہ دھرا لالہ کا ہاتھ تھام لیا اور اگلے ہی لمحے وہ پریشان ہو کر اٹھ بیٹھا تھا۔ لالہ کا ہاتھ بے حد سرد تھا۔

اس کے اس طرح جھٹکا لے کر اٹھنے پہ بھی وہ بے حس و حرکت رہی تھی۔

”لالہ!“ باریاں نے فوراً اس کے گال تھپتھپاتے ہوئے اسے پکارا تھا۔ وہ کسمسا کے چہرہ اس کے پہلو میں چھپا گئی۔

”لالہ! آنکھیں کھولو یار۔“ وہ پریشان ہو گیا تھا۔ اسے یوں بے حس و حرکت دیکھ کر وہ فوراً دیدے کے پاس بھاگا۔ وہ سمجھدار

تھیں۔ پھر جیسی لالہ کی حالت تھی وہ بہتر سمجھ سکتی تھیں۔ انہوں نے آتے ہی باریال کو اس کے پاؤں اوپر کرنے کو کہا تھا۔ باریال نے تکیے اٹھا کر اس کے پاؤں کے نیچے رکھ دیئے۔ دیدے نے لالہ کے سر کے نیچے سے تکیہ نکال دیا اور اس کا ہاتھ سہلانے لگیں۔ باریال نے انہیں دیکھا تو دوسرا ہاتھ خود تھا م لیا۔

”تم جاؤ دودھ لے آؤ۔ نیم گرم ہو اور چینی بھی ڈالنا تاکہ کچھ طاقت آئے اس میں۔“ دیدے نے اسے ہدایت کی۔ وہ فوراً اٹھ گیا۔ وہ واپس آیا تو لالہ جاگ چکی تھی۔ اس کی رنگت بھی کچھ بحال تھی۔ باریال اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

”تم اسے یہ پورا گلاس ختم کرواؤ۔ جب یہ سو جائے تب تم سونا۔“ انہوں نے اٹھتے ہوئے باریال کو ہدایت کی وہ سر ہلا گیا۔

”اور لالہ..... خود کو اور تکلیف نہ دو بیچے۔“ انہوں نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے اسے سمجھایا۔ وہ سر جھکائے گود میں رکھے ہاتھوں کو دیکھتی رہی۔

”لالہ!“ باریال نے دودھ کا گلاس اس کے قریب لاتے ہوئے اسے پکارا۔

”مجھے نہیں پینا پلیز۔“ اس نے ہاتھ سے گلاس پرے کرتے ہوئے کہا۔

”لالہ! تنگ نہ کرو۔ تم جانتی ہو اس پیریڈ میں تمہیں کتنی طاقت کی ضرورت ہے۔ اس طرح قطرہ قطرہ مرنا بھی تو خودکشی ہے۔“ وہ اس کے سامنے آ بیٹھا۔

”ولی قسم سے میرا دل نہیں کرتا کچھ بھی کھانے کو پینے کو۔“ اس کی آواز بھگینے لگی۔

”اچھا۔ آج سے پھر تمہیں کھلانے پلانے کی ذمہ داری میری۔ دیکھتا ہوں کیسے نہیں کھایا پیا جاتا۔“ اس نے آہستگی سے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا تھا۔ لالہ کی آنکھیں بے بسی سے چھلک اٹھیں تھیں۔ اس نے نرمی سے ہاتھ کھینچ لیا۔

”ولی! نہ چھو اکریں مجھے۔ میرا جسم آپ کا وجود بھی ناپاک کر دے گا۔“

”اتنا غلط کیسے سوچ لیتی ہو یار۔“ باریال کو افسوس ہوا۔

”تم کیا سمجھتی ہو ساری عمر اپنے دامن کو پاک رکھنے والا مردگی کا گند آسانی سے اٹھا لیتا؟“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

”مجھے تم پہ یقین ہے لالہ۔ تم اب بھی ویسی ہی ہو پاک اور معصوم۔ میں مانتا ہوں تمہارے ساتھ حادثہ ہوا ہے لیکن حادثوں پہ ہمارا اختیار کہاں ہوتا ہے یار۔ اس پہ صبر کرو تو پھل ہے اور اجر ہے۔ ہر تگی کے بعد کشائش ہے۔“ وہ کسی بزرگ کی طرح اسے سمجھا رہا تھا۔

”اچھا، اب دودھ پی لو۔ صبح نہر کنارے لے جاؤں گا۔“

کبھی اس نے شاویز سے سنا تھا۔ سردیوں میں لالہ کو صبح سویرے دھند میں گم نہر کنارے سے عشق ہے اور اس کے لئے وہ کچھ بھی کر سکتی ہے۔ نجانے کیسے یہ بات اس کے ذہن میں رہ گئی تھی۔

”سچ میں۔“ وہ فوراً مچلی تھی۔ باریال کے لبوں پہ خوبصورت مسکان پھیل گئی۔

”میں جھوٹ نہیں بولتا یا۔ چلو اب جلدی سے یہ خالی کرو۔ پھر سوئیں گے تو صبح آنکھ کھلے گی ناں۔“

اس بار لالہ نے تیزی سے گلاس لبوں سے لگا لیا تھا۔ جیسے اسے ڈر ہو باریال اپنی بات سے پھر نہ جائے۔ اس کی پھرتی دیکھ کر وہ واقعی حیران ہوا تھا۔ زندگی سے بھرپور اس لڑکی کے دکھ نے ایک بار پھر اس کے اندر تاسف بھرنا شروع کیا تھا۔ وہ سر جھٹک گیا۔

☆.....☆.....☆

وہ سب کچھ پلان کر چکے تھے۔ ہر طرح سے تیاری مکمل تھی۔ ایک سرد موسم اوپر سے ان علاقوں کے دریا کے قریب ہونے کی وجہ سے دھند بھی زیادہ پڑتی تھی۔ سب کچھ با آسانی ہونے والا تھا۔ بقول سہراب علی خان انہیں اب اس ساری جاگیر کا واحد وارث بننے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ انہیں نہ کسی کا ڈر تھا نہ کوئی شرمندگی۔ پھر قسمت اس سے اچھا موقع پھر کب دیتی؟

سین کا واقعہ ابھی تازہ تازہ تھا۔ لوگوں کے ذہن میں ایسے وقت میں زریاب لالہ کی خودکشی کو با آسانی بٹھایا جاسکتا تھا۔ ہر بندہ مان لیتا۔ کسی بھی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ اور وہ اس موقع کو بالکل بھی ضائع نہیں کرنا چاہتے تھے۔ یہ موقع انہیں قدرت نے دیا تھا اور وہ فائدہ اٹھانے والوں میں تھے۔ ان کے مطابق خدا ان کا ساتھ دے رہا تھا۔

انسان کی سب سے بڑی بھول یہی ہے۔ شیطان کی راہ پہ چل پڑنے کے باوجود خود کو خدا کی پناہ میں محسوس کرتا ہے جبکہ خدا اچھے لوگوں کو ان سے پناہ میں لے لیتا ہے۔ کبھی جلد کبھی دیر..... لیکن وہ کامیاب ہوتے ہیں۔ اور دھوکہ کھانے والے یہ لوگ خسارہ ہی خسارہ پاتے ہیں۔ رسی لمبی ضرور ہوتی ہے لیکن فقط اسی لئے کہ انہیں پھر راہ نہ ملے۔ یہ وعید کئے گئے ہیں اور ان کا ٹھکانہ جہنم ہے۔

سہراب علی خان بھی اپنے محسنوں کی قبر کھودتے وقت قدرت کا ہر قانون بھلا بیٹھا تھا۔ وہ پلان کر رہا تھا اور قدرت دیکھ رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

صبح وہ وعدے کے مطابق لالہ کو نہر کنارے لے گیا تھا۔ ٹھنڈی تازہ ہوائ نے واقعی اس کے اعصاب پہ اچھا اثر ڈالا تھا۔ گلابی شال اوڑھے وہ اس زرخیز منظر میں بہاری معلوم ہو رہی تھی۔ باریال نے پہلی بار اس کی ڈھیروں تصویریں لیں اور اس سے بار بار مختلف پوز بنواتا رہا۔ کبھی کبھی وہ ہنس ہنس کے پاگل ہو جاتی۔ کبھی چپ چاپ ویسے ٹھہر جاتی جیسے وہ کہتا۔

وہ تھک گئی تو باریال نے اسے نہر کے پل کے ساتھ نیچے جاتی سیڑھیوں پہ بٹھا دیا۔ آٹھ بجے کے قریب دھند چھٹنے لگی تھی۔ پانی اور سورج کی کرنوں کا میل ہوا تو ہر سوسونا سا چمکنے لگا تھا۔

باریال اب اس کے قریب بیٹھا لچ باکس سے سینڈ وچ نکال رہا تھا۔

”مجھے یہاں کبھی اتنی خوشی نہیں ملی جتنی آج ملی۔“ لالہ نے دورا بھرتے سورج کو تکتے ہوئے اعتراف کیا تھا۔

”تب میں ساتھ نہیں تھا۔“ باریال نے مسکراتے ہوئے سینڈ وچ اس کی طرف بڑھایا۔ وہ ہاتھ بڑھا کے لینے لگی۔

”میں کھلا رہا ہوں ناں۔“ اس نے منع کر دیا۔ لالہ کو بائٹ ہی لینا پڑا۔

”تم خود کھاتی ہو تو آدھا چھوڑ دیتی ہو اور یہ میں نے صبح سویرے اتنی محنت سے بنائے ہیں۔ ذرا سی ناقدری بھی برداشت نہیں کروں گا۔“ اس نے مصنوعی خفگی سے کہا۔ لالہ مسکرا دی۔

”ایک بات تو بتاؤ لالہ! تم مجھے ولی کیوں کہتی ہو۔“ اس نے خود بھی نوالہ لیتے ہوئے اچانک پوچھا۔ لالہ نے نظریں اس کے چہرے پہ جمادیں۔

”عورت کا ولی وہی ہوتا ہے نہ جو اسے عزت دے، اس کو مان دے، اس کی حفاظت کرے، اس کے سر پہ ہاتھ رکھے۔ میرے جیسی لڑکی کو ہر طرح سے پناہ دینے والے کو میں ولی نہ کہوں تو کیا کہوں۔ آپ نے تو اس وقت اپنا لیا جب سکے بھی میرے وجود سے خار کھانے لگے تھے۔“ اس کے لہجے میں سچائی تھی۔

”تم مجھے باری کہتی تب بھی مجھے اچھا لگتا لیکن.....“ باریال نے اس کے لبوں کے قریب لگی بریڈ انگلی پہ اٹھالی۔

”لیکن.....؟ آ پکو ولی اچھا نہیں لگتا۔“ وہ اداس ہوئی۔

مجھے تمہارا ولی کہنا بہت اچھا لگتا ہے۔ سب سے الگ بھی کوئی پکارتا ہے مجھے۔ اور تمہیں الگ ہی ہونا چاہیے تھا۔“ اس نے مسکراتے ہوئے بات مکمل کی تھی۔ لالہ بھی مسکرا دی تھی۔ ابھرتے سورج نے اس مسکراتے کپل کی بلانیں لے لی تھیں۔

☆.....☆.....☆

رات کے آخری پہر میں بے حد سکون ہوتا ہے۔ یہی وقت ہوتا ہے جب خوش قسمت دل رب سے گفتگو کرتے ہیں لیکن اس روز فجر کے قریب لال حویلی میں قیامت جاگ اٹھی تھی۔

زریاب ولی خان کی اچانک موت کی خبر سارے گاؤں پہ قیامت بن کے ٹوٹی تھی۔ سہراب خان لاش لینے خود شہر نکل گئے تھے اور صبح جب وہ میت لے کے نکلے تو ایک اور بڑی خبر ان کی منتظر تھی۔

زریاب ولی خان کی بیوی بچہ غائب تھے۔ ادھر جنازہ اور دوسری طرف بالکل اچانک ان دونوں کا غائب ہو جانا۔ وہ لوگوں کو تو دشمن کی کارروائی کا کہہ دیتے لیکن اندر سے پیچ و تاب کھائے بیٹھے رہے۔

ان کے پیچھے کیا ہوا تھا۔ سوچ سوچ کے پاگل ہو گئے تھے وہ۔ پہلے سین اور اب اس طرح جنت بی بی..... ضرور کچھ تو تھا جو انہیں اندر سے تنگ کر رہا تھا۔ نکلن کا تو اب حال برا تھا۔ زریاب کی لاش کو بھی وہ نہ پہچان پائی تھی۔ تو اور کون تھا جو اس طرح ان کا پلان خراب کر سکتا تھا۔ بی بی عورت تھیں اور ولی بچہ لیکن پھر بھی وارث زندہ رہا تو کبھی نہ کبھی ان کے لئے خطرہ بن سکتا تھا۔ اب سین کے ساتھ ساتھ انہیں

بھی ہر حال میں ڈھونڈنا تھا۔

پھر صرف دو ماہ بعد ضیاء علی خان ان کی زندگی میں آیا تو انہیں لگا واقعی ان کے سامنے آنے والا سب ختم ہو چکا تھا۔ بس اس سب کا کوئی وارث تھا تو ضیاء علی خان ہی تھا۔ وہ کامیاب ٹھہرے تھے اللہ نے ان کی مدد کی تھی اور انہیں سرخرو کر دیا تھا۔

اور واللہ..... ظالم واقعی سخت دھوکے میں ہے۔ صرف تین ماہ کا وقت ہی گزرا تھا جب سچ ان کے سامنے آیا تھا۔

اپریل کی ایک نیم پتی دو پہر میں اللہ لوک کو کھانا کھلاتی وہ صنوبر تھیں جو ان کے ساتھ ساتھ بات بھی کئے جا رہی تھیں۔ سہراب علی خان کسی کام کے لئے انہیں ڈھونڈتے ہوئے وہاں آئے تھے۔ اور ان کی بات نے ان کے قدم جکڑ لئے تھے۔ وہ اللہ لوک کو بتا رہی تھیں۔ ”خان بہت ظالم ہو گئے ہیں۔ اپنی ہر حد بھول چکے ہیں۔“ ان کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں اور نوالہ کھلاتے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔ سہراب خان کا دل دھک سے بیٹھا تھا۔ یہ کس حدود کی بات کر رہی تھی صنوبر۔

”انہوں نے لالہ کو بھی نہیں چھوڑا۔ اور ولی کو بھی نہ چھوڑتے۔ مجھے معاف کر دیں اللہ لوک۔ میرے پاس اور کوئی چارہ نہ تھا کہ ولی اور بی بی کو یہاں سے بھگا دیتی۔ مجھے معاف کر دیں میں آفتاب کا کا کے خاندان کو در بدر کرنے سے نہ بچا سکی۔“ وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رو دی تھیں۔

اور اسی رات ان کا کمرہ ان کی چیخوں سے گونج اٹھا تھا۔ ملازم دوڑتے آئے تھے لیکن کسی کی ہمت نہ تھی کوئی آواز دیتا۔ اسی رات ہی ان کی قسمت کا بھی فیصلہ سنایا گیا۔ بیوی کا مرتبہ لے لیا گیا اور انہیں ایک لونڈی کا درجہ دے دیا گیا۔ جہاں وہ ہمیشہ رہے گی۔ اپنی موت تک..... اور اس بات کو کوئی نہیں جان پائے گا۔

”مورے زندہ ہیں۔“ اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

ڈائری میں آگے سین کے ملنے اور اس کی بیٹی کی عمر اور اس کی دوسری ہر معلومات کافی تفصیل سے دی گئی تھیں۔ ساتھ اور اگلا پلان بھی۔

اسے ایک دم ہی اس سرخ ڈائری سے خون کی بدبو آنے لگی تھی اور ساتھ زور کی ابکائی۔ اس نے جھٹکے سے ڈائری دور اچھال دی تھی۔ دل میں درد سا اٹھا تھا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کے رو دی تھی۔

☆.....☆.....☆

زندگی نے کا بری طرح ہر بات ان کے سامنے لا کے رکھ دی تھی کہ نہ تو وہ اس سے منہ پھیر سکتی تھیں نہ اپنی کسی بھی بات سے مکر سکتی تھیں۔ ضمیر پہ بس خلش اور کسک کی دستک رہتی۔ سکون نہیں تھا۔

لالہ کو وہ کتنا سنا تھی اور وہ اور سین بھابی خاموش سی سنے جاتیں۔ ادھر شہزاد نے شادی کے بعد آتے ہی رنگ دکھانا شروع کر دیا

تھا۔ اسے ہر چیز میں اپنی مرضی کرنا آتا تھا۔ وہ سننے والوں میں سے نہیں تھی۔ سنانے والوں میں سے تھی اور اس بار زریہ بیگم جیسی عورت بھی چپ ہو کے رہ گئی تھیں۔ ایک دو بار حمزہ سے شکایت کی اس نے صاف جواب دیا۔

”امی پلیز! آپ کی اپنی پسند ہے آپ ہی بینڈل کریں۔ میں نے آپ کا مان رکھ لیا کافی ہے۔“

اس کے بعد تو اسے کہنے کی جرات بھی نہیں ہوئی۔ صبح کا گفتگرات گئے واپس آتا۔ خوشی تو جیسے اس کے چہرے سے روٹھ سی گئی تھی۔ زریہ اسے دیکھ دیکھ کے کڑھتیں اور لالہ کو یاد کرتی۔

انسان بھی کتنا عجیب ہے۔ پچھتاوا ہمیشہ اس وقت کرتا ہے جب وقت ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔

ادھر نمرہ جیسی کھلکھلاتی ہر جگہ آزادی سے گھومنے والی لڑکی چار دیواری میں قید ہو کے رہ گئی تھی۔ دروازہ بھی کسی کے لئے کھول دیتی تو قیامت آجاتی تھی۔ آغا اسے روئی کی طرح دھنک دیتا تھا۔ ہر وقت نمرہ کی کردار کشی کرتا اور اس پہ شک کی تیرنگہ ڈالے اس کی روح چھلنی کر دیتا۔

”لالہ کے پاس جاؤں گی۔ وہ معاف کر دے تو شاید خدا بھی میرے بچوں پہ رحم کر دے۔“ انہوں نے دور آسمان کو تکتے ہوئے کہا تھا اور ایک بے بس سا آنسو ان کے گال پہ لڑھکتا چلا گیا۔

☆.....☆.....☆

وہ گھر واپس آئے تو بلیک کرو لادروازے پہ کھڑی تھی۔ باریال سمجھ گیا ضیاء آیا ہوگا۔ وہ لالہ کو کمرے میں چھوڑ کے دیدے کے کمرے میں آ گیا۔

”کوئی آیا تھا دیدے؟“

”تمہارا دوست تھا۔ میں نے کہا بھی کہ اندر انتظار کر لے لیکن اس نے مناسب نہیں سمجھا۔“ دیدے نے بتایا تو وہ باہر آ گیا۔ اب کی بار ضیاء گاڑی کے قریب ہی ٹھہرا تھا۔

”اندر آ جاؤ یار۔“ باریال نے وہیں سے پکارا تو وہ سر ہلاتا اندر آ گیا۔

”اندر انتظار کر لیتے۔ اس طرح باہر رکنا مناسب نہیں لگتا۔“

”ماں اکیلی تھیں گھر پہ تو..... خیر میں چاہتا ہوں ہم فائل بات کر لیں۔“

”آفس میں کہو تو وہیں آ جاتا ہوں۔“ ضیاء نے ہوشیاری سے بات بنائی۔

”نہیں یار۔ تم سے تو نہ جانے روح کا رشتہ ہے۔ کبھی بھی گھر آ جاتا کرو۔“ وہ مسکرایا تھا۔

”اصل میں، میں چاہتا ہوں کہ میں صرف انویسٹ کروں اور پھر آپ کے ساتھ رہ کر یہ سب سیکھوں۔ مجھے کام کرنا نہیں آتا لیکن

لگن بہت ہے۔ ویسے کام کی ضرورت تو نہیں ہے مجھے لیکن بس یہ ایڈونچر..... میں کچھ نہ کرنا چاہتا ہوں سو.....“ اس نے تفصیل بتائی۔
 ”مجھے خود خوشی ہوگی اگر تم میرے ساتھ کام کی شروعات کرو۔ مجھے خود بھی مدد کی ضرورت پڑتی ہے۔ ویسے بھی ان دنوں لالہ کے لئے وقت نکالنا مشکل ہو جاتا ہے تمہارے آنے سے یہ بھی ہینڈل ہو جائے گا۔“ اس نے خوش دلی سے کہا تھا اور لالہ کے نام پہ ضیاء کا دل ڈوب سا گیا تھا۔ وہ کتنے حق سے اس کا نام لے رہا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے یہ حق گنوا دیا تھا پھر بھی اس وقت اسے باریال کا لالہ کا نام لینا اچھا نہیں لگا تھا۔

”خیریت؟ لالہ..... آپکی.....؟“ وہ جانتا تھا پھر بھی انجان بنا۔

”بیوی ہے میری..... طبیعت ذرا صحیح نہیں ہے اس کی۔“ باریال کا لہجہ محبت سے بھرا تھا۔

ضیاء بے ساختہ نچلا لب کچل گیا۔ تبھی اس کی نگاہ اٹھی تھی۔ گلابی شال میں لپٹی وہ لڑکی بلاشبہ لالہ تھی۔ اس کی آنکھوں میں وہی چمک اور بے ساختگی ابھرا آئی تھی جو لالہ کے سامنے آتے ہی اس کی آنکھوں میں آ جاتی تھی۔

لالہ کی نگاہ بھی اس پہ پڑ چکی تھی۔ اس کا کچھ دیر پہلے خوشی سے دمکتا کھلا چہرہ ایک دم فق ہوا تھا۔ خوف سے اس کی آنکھیں پھٹنے لگی تھیں۔ اسے زور کا چکر آیا تھا۔ لالہ نے گرل کو تھاما تھا اور ضیاء ایک دم اٹھا تھا۔

باریال نے اسے اٹھا دیکھ کر حیرت سے مڑ کر دیکھا تھا۔

”ولی.....“ وہ چلائی تھی۔ باریال نے بھاگ کے اسے تھام لیا تھا اور خود سے لگائے اندر لے گیا تھا۔ ضیاء نے ایک زبردست مکا دیوار میں جڑ دیا تھا۔ وہاں اس کا مزید رکنا محال تھا۔ وہ پلٹ گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

ابھی کچھ سکون محسوس ہوا تھا۔ اسے لگنے لگا تھا کہ وہ اب اس حادثے کو بھول کے آگے بڑھنے لگی ہے تو قسمت ایک بار پھر ضیاء علی خان کو یوں سامنے لے آئی تھی۔

باریال نے اسے خوش خبری دی تھی کہ کسی بھی قسم کی مشکل سے پہلے ہی حل نکل آیا تھا۔ ضیاء علی خان ایک مضبوط پارٹنر کے طور پہ اس کے پاس چلا آیا تھا۔ ضیاء کا تعارف اس نے بہترین دوست کے حوالے سے کروایا تھا۔ لالہ بالکل خاموش سی ہو گئی تھی۔ اس کی وجہ سے پہلے بھی باریال پریشانی میں گھرا تھا۔ اب اگر وہ اسے بتا دیتی کہ ضیاء ہی وہی آدمی ہے تو وہ بزنس کے ساتھ ساتھ ذہنی انتشار کا بھی شکار ہو جاتا۔ اور وہ اب اسے مزید پریشان کرنا چاہتی تھی لیکن یہ بھی چاہتی تھی کہ ضیاء کم از کم گھر نہ آئے۔

اس نے باریال سے درخواست کی تھی کہ کم از کم دفتر کے لوگوں کو گھر سے باہر ہی رکھے اسے اب اجنبی لوگوں سے ڈر لگتا ہے۔

”کم آن یار۔ ضیاء بہت اچھا انسان ہے دوست ہے میرا۔ باقی کسی کو لایا ہوں کبھی گھر۔“ اس نے مسکرا کے ٹالا تھا۔ لالہ کے دل

میں ٹیس سی اٹھی تھی۔ کاش وہ ضیاء کی اچھائیاں اسے بتا سکتی لیکن فی الحال اسے خاموش رہنا تھا۔ وہ باریال کو مزید دکھ نہیں دے سکتی تھی۔
 ”اچھا، جب تک میری یہ حالت ہے پلیز تب تک کوشش کریں زیادہ گھر نہ لائیں اسے۔ سچ میں میری حالت عجیب ہو جاتی ہے۔“

باریال اٹھ کر اس کے پاس آ گیا تھا۔

”بالکل خیال رکھوں گا اور کوئی حکم۔“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مسکرایا اور وہ پرسکون ہو کے نفی میں سر ہلا گئی۔

☆.....☆.....☆

سب سے پہلے وہ ابراہیم کو لے کر سیدھا فارم ہاؤس پہنچی تھی۔ ابراہیم پہلے تو ہچکچا رہا تھا۔ پھر اوزگل کی حالت دیکھ کر اسے مجبوراً ماننا پڑا۔ فارم ہاؤس کے رہائشی علاقے میں آتے ہی اس نے ابراہیم کو وہیں انتظار کرنے کا کہا تھا اور خود اندر آ گئی تھی۔ باہر آتی گل بی بی اسے دیکھتے ہی خوشی سے آگے بڑھی تھیں۔

”اوزگل بچیا!“

”گل بی بی۔ ضیاء یہاں کسی لڑکی کو لایا ہے؟“ وہ ان کا استقبال نظر انداز کرتے ہوئے تیزی سے بولی۔

”ہاں لیکن.....“

”کہاں ہے۔ جلدی بتائیں وہ ٹھیک تو ہے۔“

”ہاں۔ اوپر کمرے میں ہے۔“ انہوں نے حیرت سے بتایا۔ وہ انہیں حیران چھوڑ کر تیزی سے اوپر بھاگی۔

کمرے کا دروازہ کھولتے ہی وہ سامنے ہی اسے نظر آئی تھی۔ لمبے سیاہ بالوں میں برش کرتی لڑکی اسے بے حد مطمئن لگی۔ اسے دیکھ کر اس کی خوبصورت آنکھوں میں حیرت سی جا گئی تھی۔ اوزگل اندر آ گئی۔

”تم.....“

اس نے بال سمیٹ لئے تھے اور اوزگل کو دیکھنے لگی۔

”کون ہو تم؟“ نجانے کیوں اسے لگا وہ لالہ نہیں ہے۔ کوئی اور ہے۔

”میں زمزمہ..... خان لایا ہے یہاں مجھے۔“ اس نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔

”اوہ۔ سوری میں سمجھی یہاں کوئی اور..... خیر سوری۔“

زمزمہ نے اطمینان سا اس کے چہرے پہ لہراتے دیکھا تھا۔ وہ پلٹ چکی تھی۔

”آپ لالہ کو ڈھونڈنے آئی تھیں۔“ اس نے کہا اور اوزگل کے قدموں کے ساتھ جیسے دل بھی رکا تھا۔ وہ تیزی سے پلٹی تھی۔

”لالہ کو بھی یہاں لایا گیا تھا۔“ وہ اب چٹیا بنا رہی تھی، ساتھ بول بھی رہی تھی۔ اس کی آواز میں دکھ تھا۔
 ”لیکن اسے واپس بھیج دیا گیا۔“ نظر اٹھا کے اوزگل کو دیکھا۔
 ”پوری طرح برباد کرنے کے بعد۔“
 ”کیا مطلب؟“ وہ لرز گئی۔

”مطلب تو مجھے خود آج تک سمجھ نہیں آیا۔ میں ایک طوائف جسے ضیاء علی خان نے یہاں پناہ دی اور آج تک ایک بری نگاہ تک نہ ڈالی۔ اور لالہ ایک پارسا اور خان نے اسے تارتار کر ڈالا۔“
 ”ضیاء ایسا نہیں کر سکتا۔ کبھی نہیں۔ وہ میرا بھائی ہے۔ میں جانتی ہوں اسے۔“ اس کا دل درد سے پھٹنے کو تھا۔
 ”بالکل۔ خان ایسا بالکل بھی نہیں کر سکتے۔ میں اس کی زندہ مثال ہوں۔ لیکن یہ سب خان نے نہیں خان کے باپ نے کیا۔
 خان کونشے میں دھت اس حد کو پار کرنے پہ مجبور کر دیا لیکن خیر اب تو سب تباہ ہو چکا۔ وقت پلٹ نہیں سکتا..... یا شاید پلٹ بھی آئے۔“ بے
 فکری سے لمبی چوٹی پیچھے اچھالتی اس نے کہا تھا۔
 ”آپ کی تعریف پوچھ سکتی ہوں۔“

”ضیاء کی بہن ہوں۔ لیکن مجھے بہت دیر ہو گئی۔“ اس کی آواز کمزور تھی۔
 ”ابھی بھی دیر نہیں ہوئی۔ مقدر ساری بازی مات کبھی نہیں رکھتا۔ کچھ نہ کچھ شہہ بھی بچا کے رکھتا ہے۔ اب زندگی کا داؤ کھیلنے والے
 پہ ہے وہ کیسا داؤ کھیلتا ہے۔“ وہ مسکرائی تھی۔
 ”ویسے ایک سچ کہوں گی۔ پہلے خان کو اور اب آپ کو دیکھ کر مجھے واقعی حیرت ہو رہی ہے۔ سہرا ب علی خان جیسا شیطان اتنے
 اچھے بچے کیسے جنم دے سکتا ہے۔“

”ماں بھی بہت بڑی طاقت ہے۔ باپ کی برائی پہ ماں کی اچھائی غالب آجائے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ ضروری نہیں فرعون کے
 ساتھ جینے مرنے کی قسم کھانے والی آسیہ اس کا رنگ لگا کر ہی جے۔ قسم صرف جینے مرنے کی ہوتی ہے اس کے رنگ میں رنگنے میں نہیں۔ اور
 الحمد للہ ہم سب پہ اپنی ماں کا رنگ گہرا ہے۔“ وہ مضبوطی سے کہتی پلٹ گئی تھی۔
 ”اللہ پاک اس شیطان کے شر سے تم سب کی حفاظت فرمائے۔ آمین۔“ زمزمہ نے دل سے دعا کی تھی۔

☆.....☆.....☆

تین دن سے مسلسل ہونے والی بارش سے سردی میں ایک دم سے ہی تیزی آئی تھی۔ دیدے کو بخار تھا کل سے۔ وہ ان کے لئے
 بنی بنا رہی تھی جب باریال، ضیاء کو لئے گھر آیا۔ دونوں کے کپڑے بھیکے ہوئے تھے۔ باریال، ضیاء کو لے اندر ہی چلا گیا۔ وہ چپ چاپ

انہیں نظر انداز کئے کام میں مصروف رہی۔

”مقدر ہے ناں۔ میرا حصہ بن جانے کے باوجود تم مجھ سے کتنی دور ہو۔“ مسکراتی اداس سی آواز پہ وہ جھٹکا کھا کے پلٹی تھی۔ ضیاء سلیب سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔

”ولی کہاں ہیں؟“ لالہ کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

”چینج کر رہا ہے۔“ ضیاء نے توجہ سے اسے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

وہ نکلنے لگی۔ ضیاء اس کے سامنے آ گیا۔

”اس دن کا انتظار کرو لالہ۔ جب میں تمہیں دوبارہ پا لوں۔“

”مومن ایک سوراخ سے بار بار نہیں ڈسا جاسکتا ضیاء علی خان۔“ لالہ کی آواز زخم زخم تھی۔

”دیکھ لو گھر کے اندر تک تو آ گیا ہوں۔ تمہارے اندر بھی سانس لے رہا ہوں بس اب تم تک پہنچنے کا راستہ ڈھونڈنا ہے۔ مل جائے گا وہ بھی۔“ اس کی آواز میں مستی سی گھلی تھی۔

”تمہیں کیا لگتا ہے میں وہ سب بھول جاؤں گی۔“

”میں بھی یہی کہہ رہا ہوں میں بھی نہیں بھولا پارہا۔“ اس کا ڈمپل گہرا ہوا۔

”تم کبھی بھول بھی نہیں پاؤ گے ضیاء..... تڑپ تڑپ کے مرو گے تم۔“ اس نے بد عادی۔

”چلو۔“ وہ دو قدم آگے آیا۔

”مر تو جاؤں گا ناں۔“ مسکراتی نظریں لالہ کے چہرے پہ جمادیں۔

”بس یہ بھی کافی ہے۔“ وہ ویسے ہی سکون سے بولا تھا جو اس کے وجود پہ طاری رہتا تھا۔ لالہ کو اس کی بے حسی پہ غصہ آیا تھا۔ وہ تیزی سے اس کے پہلو سے نکلتی چلی گئی تھی۔ ضیاء علی خان نے پلکیں موند کر جیسے اس کا گلابی عکس آنکھوں میں قید کیا تھا۔

☆.....☆.....☆

وہ آج بے حد خوش تھا۔ اتنے عرصے بعد اس نے نہ صرف لالہ کو اپنے سامنے دیکھا تھا۔ بلکہ اس سے بات بھی ہوئی تھی۔ اس حالت میں وہ کس قدر معصوم اور اداس لگ رہی تھی۔ یہ رنگ اسے اور بھی خوبصورت بنا گئے تھے۔ اسے لگ رہا تھا یہ سب رنگ اس کی بدولت ہیں۔ ضیاء علی خان کی بدولت۔ اس کی خوبصورتی پہ حق صرف اس کا تھا۔ باریال اس کے سامنے بہت کمزور تھا۔ ایک دفعہ وہ اسے مکمل اعتماد میں لے لیتا پھر کسی بھی طرح وہ لالہ کو حاصل کر سکتا تھا اور اس وقت تک کسی نہ کسی طرح لالہ سے ملاقات ہو جانا اس کے لئے بہت معنی رکھتا تھا۔ وہ لاؤنج میں داخل ہوا تو اوڑگل اس کی منتظر تھی۔

”لالہ کے گھر سے آرہے ہو؟“ سوال اس قدر اچانک تھا کہ وہ ساکت رہ گیا تھا۔

”کون لالہ؟“ اگلے ہی پل وہ ہمیشہ کی طرح اپنا اعتماد بحال کر چکا تھا۔

”سین پھچھو کی بیٹی۔ مسز بار یال۔“ اوزگل کے لہجے میں تلخی بھرا آئی۔ مسز بار یال پہ ضیاء کی پیشانی سلوٹ زدہ ہوئی۔

”یہ شادی نہیں۔ بس لالہ کی مجبوری ہے۔“ اسے لگاب کوئی بات بنانا فضول ہے۔

”تو کیوں کیا اتنا مجبور.....؟“ اسے شاکد لگا اور شرمندگی بھی۔ بی بی اس کا گناہ جان چکی تھیں۔ وہ اس بار نظریں جھکا گیا۔

”اور اتنا گناؤنا کام کرنے کے بعد اب جب وہ اپنے گھر میں بس گئی ہے تو وہاں بھی تم پہنچ گئے۔ کیوں خود کو سہراب علی خان کا

خون ثابت کرنے پہ تلے ہو ضیاء۔“

”میں انہی کا خون ہوں۔“ وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔

”ہا..... واقعی میں بھول گئی تھی کہ تم اسی شخص کے بیٹے ہو جس نے اپنی بیوی کو طلاق دے کر مردہ قرار دے دیا۔“

ضیاء کے بڑھتے قدم رکے۔

”اور پھر لونڈی بنا کے اسے بڑی شان سے استعمال بھی کرتا رہا۔“

”مطلب کیا ہے آپ کا بی بی.....“ وہ غصے سے پلٹا۔

”مورے زندہ ہے ضیاء..... اور جو کچھ تم نے لالہ کے ساتھ کیا اتنے سالوں سے سہراب علی خان مورے کے ساتھ کر رہے ہیں۔

کتنا آسان ہے نا تم باپ بیٹے کے لئے عورت سے کھیلنا۔“ اس کے لہجے میں نفرت پھنکار رہی تھی۔

”میں نے جو کچھ کیا اس میں میرا قصور نہیں۔ اور مورے زندہ ہے آپ کو کیسے پتہ۔“ وہ اب اس کی آنکھوں میں دیکھتا اس کے

سامنے کھڑا تھا۔

”یہ پڑھ لو۔ سہراب علی خان کا اعمال نامہ۔ اپنے ہاتھوں سے لکھا۔ پھر بھی یقین نہ آئے تو حویلی جا کر پرانے حصے کے زیر

زمین زندان کو کھلو الینا۔ اللہ لوک بھی زندہ ہیں اور ان سے میں مل بھی چکی ہوں۔“ نفرت سے سرخ ڈائری اس پہ اچھالتی وہ باہر نکل گئی تھی۔

ضیاء نے حیرت سے اسے باہر جاتے دیکھا تھا پھر جھک کر وہ بدنما رنگ والی ڈائری اٹھالی تھی۔ جو دیکھنے میں بھی خون سے لتھڑی محسوس

ہو رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

جوں جوں وہ وہ سرخ لفظ پڑھتا جا رہا تھا۔ اسے خود اپنی ذات سے نفرت ہوتی جا رہی تھی۔ کوئی انتقام نہ تھا۔

کوئی ذاتی خار نہ تھی۔

نہ ہی کوئی زیادتی۔

صرف ذاتی لالچ تھا۔۔۔ طمع تھا۔

محسنوں سے نفرت تھی۔

اور جائیداد کی ہوس۔

کیا کچھ داؤ پہ لگایا گیا۔

کتنے رشتے، کتنے اعتبار داؤ پہ لگائے گئے تھے۔

اور وہ اس کا تو کردار تک غلیظ کر دیا گیا تھا جسے ساری عمر کوٹھکی چوکھٹ سے بھی وہ پورے قد سے بچا لایا تھا۔ اور سہراب علی خان نے۔

سب سے تکلیف دہ تحریر اس کتاب میں اس کی ماں تھی۔ اس عورت کا ہر درد، ہر اذیت کس قدر لذت سے تحریر کیا گیا تھا۔ آخری

صفحے ابھی بہت کچھ پانے کی حسرت دکھا رہے تھے اور ابھی سخت ڈپریشن کے عالم میں آخری کچھ صفحات پلٹتے ایک نام نے اسے چونکایا تھا۔

”باریال ولی خان..... زیریاب ولی خان کی آخری نشانی..... ایک آخری خطرہ۔“ اور نیچے پھر اس کی کچھ تفصیل تھی۔ اس نے

کانپتے ہاتھوں سے اس ایگریمنٹ کی کاپی نکالی جو اس کے اور باریال کے مابین ہوا تھا لیکن اسے اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ تبھی وہ اسے

ایک دراز میں ڈال کر بھول گیا تھا۔ اس وقت صرف وہی تھا جو اس کے خدشے کی تصدیق یا نفی کر سکتا تھا۔ اور جیسے ہی اس نے وہ ایگریمنٹ

کھول کے باریال کے آئی ڈی کارڈ کی فوٹو کاپی چیک کی۔ اس کا خدشہ صحیح نکلا تھا۔ وہ باریال تھا۔ اس کا چچا زاد بھائی۔ آفتاب ولی خان کا

صحیح وارث۔

اس نے تھک ہار کے سر بیڈ کے کراؤن پہ گرا دیا تھا۔

پہلی بار اس کی ہر خواہش دم توڑتی جا رہی تھی۔

دولت نہیں چاہیے۔

جائیداد نہیں چاہیے۔

لالہ بھی نہیں چاہیے۔ وہ مجھے ڈیز رو نہیں کرتی۔ سانپ کا بچہ بھی سانپ ہی ہوتا۔

وہ باریال کو ہی ڈیز رو کرتی ہے۔

فیصلے ہوتے گئے تھے۔

اس کی بند آنکھوں سے بہتے آنسو اس کے بھرے بھرے سفید گال بھگونے لگے تھے۔ درد شدید تر تھا۔

☆.....☆.....☆

سچ کہا تھا کسی نے۔ ایک در بند ہوتا ہے اللہ پاک دس دروازے اور کھول دیتا ہے۔ اسے ابھی کوئی مسئلہ ہوا نہیں تھا اور اللہ پاک نے ضیاء علی خان کی صورت اسے ایک اچھے دوست کی صورت نواز دیا تھا۔ وہ بزنس کی سمجھ بوجھ میں بہترین تھا۔ باریال اس کی ذہانت کا دل سے قائل ہو چکا تھا۔ صرف چھ ماہ کے مختصر عرصے میں وہ دونوں دور دراز علاقوں میں بھی باریال کے خوابوں کے مطابق ایک مختصر لیکن بہترین ہوٹل چین بنانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اور اس میں زیادہ کریڈٹ بلاشبہ ضیاء علی خان کو ہی جاتا تھا۔ اس نے دن رات ایک کر دیا تھا اور اس کے تعاون کی وجہ ہی تھی کہ باریال لالہ کو مکمل وقت دے پاتا تھا۔ ان چھ ماہ میں ضیاء دوبارہ ان کے گھر نہیں گیا تھا۔ باریال کے بے حد اصرار پہ بھی اس نے منع کر دیا تھا۔

لالہ پہلے تو کچھ دن اس کے نہ آنے پہ بھی دہلتی ہی رہی۔ پھر ایک دم سے باریال کو اتنا مصروف اور مطمئن دیکھ کر وہ بھی مطمئن ہو گئی تھی۔ پھر ضیاء دوبارہ گھر نہیں آیا تھا۔ یہ بھی اس کے لئے اطمینان بخش بات تھی۔ اس کی صحت کافی اچھی ہو گئی تھی۔ اداسی کی جگہ عجیب سی خوشی اس کا احاطہ کرنے لگی تھی۔

دیدے اور باریال اس کا بہت خیال رکھتے۔ وہ آہستہ آہستہ در دکو بھول کر شکر اپنانے لگی تھی۔ زندگی نے جیسے بہت کچھ لے کر بے حد نواز بھی دیا تھا۔ بس کبھی کبھی ماں کی یاد سک سی دے جاتی تھی۔ وہ لاکھ ان سے خفا رہتی تھی لیکن وہ تو ماں تھیں۔ اس نے تو یہی سنا تھا، ماں اپنی اولاد سے کبھی نہیں روٹھتی لیکن اس کی ماں نے تو یوں منہ پھیرا تھا جیسے وہ واقعی ان کے لئے ہمیشہ کے لئے مر گئی تھی۔ شایہ انہیں ہمیشہ اس سے زیادہ عزیز رہا تھا لیکن اتنا عزیز تھا کہ وہ اس کے لئے خود اسے بھی چھوڑ سکتی ہیں یہ اندازہ اسے اب ہوا تھا۔ پھر بھی وہ اب خود کو سنبھالنا سیکھ چکی تھی۔ اس حادثے نے جو سب سے بڑی چیز اسے سکھائی تھی۔ وہ شکر تھا۔ وہ شکر کرنا سیکھ گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

پچھلے سات ماہ کی الیکشن کمپین نے انہیں نہیں تھکا یا تھا جتنا ضیاء کا ان چند ماہ میں ان سے دوری نے انہیں بوڑھا کر دیا تھا۔ ان چند ماہ میں ایسا انوکھا کیا ہو گیا تھا کہ وہ ان سے اس قدر دور ہو گیا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پائے تھے۔ جہاں تک لالہ والے معاملے کا تعلق تھا اس کے بعد سے وہ ذرا ناراض تھا لیکن بہر حال ان سے رابطے میں تھا لیکن اب تو نہ وہ ان کی کال اٹھاتا تھا نہ ہی ان سے ملتا تھا۔ کئی بار وہ بنا بتائے اس سے ملنے کے لئے اچانک گھر فارم ہاؤس گئے لیکن نہ جانے اسے کیسے خبر ہو گئی اور وہ ان سے پہلے ہی وہاں سے نکل گیا تھا۔ ان چند ماہ میں اس سے نمل کر انہیں اپنی جان نکلتی محسوس ہوئی تھی۔

انہی دنوں مینے کے پیپر ختم ہوئے تو بآ نے انہیں گاؤں بلا لیا۔ ایک سیاسی دوست کی طرف سے گل مینے کے لئے رشتہ بھیجا گیا تو یہ پہلی بار تھا جب سہرا علی خان نے بالکل الگ سوچا۔ گل مینے میں ان کی جان بستی تھی اور اس خاندان میں اس کی شادی نہ صرف خود مینے

کی زندگی سنور جاتی بلکہ ضیاء کو بھی ایک بہترین پارٹنر مل جاتا۔ ان کی زندگی ہر لحاظ سے مکمل تھی۔ اب وقت آ گیا تھا وہ بچوں کے لئے بروقت مضبوط فیصلہ لے لیتے۔

اس بات سے انجان کہ کچھ فیصلے قدرت بس اپنے اختیار میں رکھتی ہے ان میں انسان کی ایک ذرے جتنی بھی مرضی کی گنجائش نہیں رہتی۔

☆.....☆.....☆

دروازے پہ ہونے والی دستک سن کر نجانے کیوں اسے عجیب سا احساس ہوا۔ دیدے نماز پڑھ رہی تھیں۔ وہ خود کو بڑی سی چادر میں چھپاتی دروازے کی طرف آ گئی۔

”کون۔“ اس نے دھیرے سے پوچھا۔

”لالہ.....“ آواز نے گویا اس کا دل دھڑکا دیا تھا۔ اتنے دن بعد کسی اپنے کی آواز۔ اس نے فوراً دروازہ کھول دیا تھا اور سامنے کھڑی پھپھو سے لپٹ گئی تھی۔ انہوں نے بھی اس کا بھرا بھرا وجود خود میں سمو لیا تھا۔ وہ دونوں کتنی ہی دیر ایک دوسرے سے یونہی لپٹے روتی رہیں۔

”لالہ! بری بات بیٹا۔ اندر آنے دو انہیں۔“ دیدے انہیں نہیں جانتی تھیں لیکن جان گئی تھیں مدت بعد کسی اپنے کو لالہ کی یاد آئی تھی۔ انہوں نے محبت سے لالہ کو ہدایت کی۔ وہ شرمندہ سی پھپھو کو لے کر اندر اپنے کمرے میں آ گئی۔

”کیسی ہولالہ؟“ پھپھو نے اس کا خوبصورت گلابی چہرہ چھوتے ہوئے پوچھا۔

”میں ٹھیک ہوں بالکل۔ آپ کیسی ہیں پھپھو۔ حمزہ، اقراء..... اقراء خوش تو ہے ناں۔“ وہ سوال پہ سوال پوچھنے لگی۔

”تمہیں کیا لگتا ہے لالہ! زرینہ کی فطرت بدل سکتی ہے۔“ انہوں نے اداسی سے کہا۔

”کیا مطلب پھپھو؟“ وہ جی بھر کے حیران ہوئی۔

”بنالالچ کے کب میں تمہارے یا تمہارے باپ کے در پہ آئی ہوں بیٹا۔“

”ایسا نہ کہیں پھپھو۔ وہ گھر بھی آپ کا تھا۔ یہ بھی۔ آپ کا جب دل کرے آپ آ جایا کریں۔“ وہ خوش تھی۔ بے حد خوش۔

”اقراء کی زندگی خار خار ہے بیٹا۔ وہی خار جو کبھی میں تمہاری راہ میں بہت خوشی سے بچھاتی تھی وہ سب نجانے کیسے اقراء کے راستے میں بچھ گئے۔“

”اللہ نہ کرے پھپھو۔“ وہ کانپ گئی۔

”اللہ پاک تو بار بار ہمیں روکتے ہیں کہ ہم ایسا نہ کریں۔ لیکن ہم کر جاتے ہیں ناں۔ اور یہ بھول جاتے ہیں کہ رب نے وعید کی

ہے سب پلٹ کے آتا ہے اچھا یا برا..... ہر عمل..... اور دیکھو لالہ! میرا کیا میری اقراء کے آگے آگیا۔ مجھے معاف کر دو لالہ۔ میری نمرہ کی زندگی آسان ہو جائے گی۔“ وہ دونوں ہاتھ جوڑے رو دی تھیں۔ لالہ بے بس سی انہیں دیکھے گئی تھی۔ لب جیسے سل گئے تھے۔ آنسو البتہ اب بھی آنکھوں سے رواں تھے۔



ناول ”محبت لفظ ہے لیکن“ ابھی جاری ہے۔ اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی 5 تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

بشری سیال کا بہت خوبصورت نیا ناول

میری رقص

ہر ماہ باقاعدگی سے کتاب گھر پر پیش کیا جا رہا ہے
نئی اقساط پڑھنے کیلئے وزٹ کریں

kitaabghar.com

دُرشن بلال کا بہت خوبصورت نیا ناول

تم میرے پاس رہو

ہر ماہ باقاعدگی سے کتاب گھر پر پیش کیا جا رہا ہے
نئی اقساط پڑھنے کیلئے وزٹ کریں

kitaabghar.com

اور الیکشن کے بالکل آخری دنوں میں ضیاء علی خان ان کے ساتھ آ ملا تھا۔ ان کی الیکشن کمپین میں اس نے اتنے زبردست طریقے سے سب بیچ کیا تھا آخری دنوں میں کہ حریف انگشت بدندان رہ گئے تھے۔ اس نے نہ صرف ارد گرد کے سبھی قبضوں کے سبھی بڑے بزرگوں سے ملاقات کی تھی۔ بلکہ اپنے علاقے کے لوگوں کو بھی بیٹھک میں کھلی دعوت دی تھی۔ ان کے مسائل اور ان کی شکایات سنیں تھیں۔ کھلے دل سے باء کی غلطیوں کو قبول کیا تھا اور ان سے وعدہ کیا تھا کہ نہ صرف ان غلطیوں کا ازالہ کیا جائے گا بلکہ انشاء اللہ عوام کی ترقی کے لئے خاطر خواہ کام بھی کیا جائے گا۔ عوام نوجوان قیادت اور اس کے دوستانہ طرز عمل سے بے حد خوش تھے۔ اور ان میں اک نئی امید سی بیدار ہونے لگی تھی۔

”یہ کہاں لکھا ہے کہ حالات ہمیشہ ایک جیسے رہیں گے۔ کبھی نہیں بدلیں گے۔ امیر ہمیشہ امیر رہے گا اور غریب ہمیشہ غریب۔“

ضیاء علی خان آج اپنے علاقے کے لوگوں سے باء کی جگہ مخاطب تھا۔ صحن میں کچھی چار پائیوں پہ بیٹھے لوگوں کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ کالے رنگ کی شلوار قمیض پہ کندھے پہ سفید روایتی چادر ڈالے وہ ان سب کی سر راہتی نظروں کا مرکز تھا۔

”تاریخ گواہ ہے بادشاہ گداگر بن کے گلیوں کی خاک چھانتے نظر آئے اور گدا تخت نشین۔۔۔ پلٹ زندگی کی ریت ہے۔۔۔ وقت پہنچ رہا ہے۔ گھومتا رہتا ہے۔ کبھی زوال کبھی عروج۔۔۔ ایک وقت نہیں رکتا۔۔۔ بدلنا ہوتا ہے۔ بدلنا ہی اچھا ہوتا ہے۔ اور آپ لوگ یقین رکھیں۔ وقت ایک بار پھر بدلنے لگا ہے۔ وقت بہت لگا۔ اچھے وقت کو پلٹ کھاتے۔۔۔ لیکن وقت آ گیا ہے۔ بہت قریب۔۔۔ انشاء اللہ اب آپ لوگ دیکھیں گے۔ آپ کے سب درد ختم ہو جائیں گے۔ صرف خوشحالی آپ کا، اس علاقے کا مقدر ہوگی۔“ اس نے کہتے ہوئے سامنے بڑی سی رنگین کرسی پہ بیٹھے سہراب علی خان کو دیکھا تھا۔

”حقدا کو اس کا حق ملنے کا وقت آ گیا ہے۔۔۔ وقت کی پلٹ کبھی غلط نہیں ہوتی۔۔۔ سب ٹھیک کر دیتی ہے“ اس نے باء کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر فخر سے مسکرا دئے تھے۔ ضیاء خاموش ہوا تھا اور جو بلی کی بیٹھک تالیوں کے شور سے گونج اٹھی تھی۔

”اتنا نامور تو میں اتنے سالوں میں نہیں ہوا جتنا ان چند دنوں میں تم نے مجھے کر دیا۔“ لوگوں کے جاتے ہی سہراب علی خان نے اسے خود سے لگاتے ہوئے رشک سے کہا تھا۔

”کیونکہ شاید یہ آپ کا حق نہیں تھا“ اس کی خوبصورت آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھری۔ سہراب علی خان اس کے اندر کی بات نہیں سمجھ سکتے تھے۔ تبھی مسکرا دئے تھے۔

”واقعی بچپا! حق تو یہ سب تمہارا ہی ہے۔۔۔ اور تم نے آج ثابت بھی کر دیا کہ تم ہیں اس سب کے اصلی وارث ہو“ انہوں نے ضیاء کا شانہ چھپھپایا۔

”لیکن اب میری جیت یقینی ہے۔ تم نے خاصا نامور کر دیا ہے اپنے ساتھ مجھے بھی۔“

”کرنا پڑتا ہے باء۔۔۔ بدنام ہونے کے لئے نامور ہونا بھی تو ضروری ہوتا ہے نہ۔۔۔“ ضیاء علی خان۔۔۔ نے مسکراتے ہوئے چھتے لہجے میں کہا تھا۔ سہراب چونکے تھے۔ لیکن ضیاء کے لبوں پہ مسکراہٹ دیکھ کے سر جھٹک گئے۔

”سب کے اعتماد کا خون کرنے والے کس قدر آسانی سے خود اعتماد کر لیتے ہیں“ ضیاء علی خان نے وہاں سے جاتے ہوئے حیرت سے سوچا تھا۔ اسے اب اپنے باپ کی کم عقلی پہ افسوس ہو رہا تھا۔

”آپ ایک اچھے پلئیر نہیں ہو باء“ درمیانی باری (کھڑکی نما دروازہ) کر اس کرتے ہوئے اس نے تاسف سے سر ہلاتے ہوئے سرگوشی کی تھی۔۔۔

☆.....☆.....☆

جب سے اس نے سنا تھا۔ اس کی حالت خراب تھی۔ رورو کے اس نے حلیہ بگاڑ لیا تھا۔ اوپر سے کھانا پینا بھی چھوڑ دیا۔ اوزگل ابھی خود کو نہیں سنبھال پار ہی تھی کہاں اب گل مینہ کی یہ حالت۔۔۔

”باء میرے ساتھ ایسا کیسے کر سکتے ہیں گل۔۔۔ میں مینہ۔۔۔ ان کی سب سے لاڈلی بیٹی۔ اور وہ یوں بنا مجھ سے پوچھے کسی کے ساتھ بھی میرا رشتہ طے کر دیں گے۔“ وہ روتے ہوئے اوزگل سے بولی تھی۔ جو مسلسل پیر کے انگوٹھے سے قالین کی نہ جانے کون سی نادیدہ میل کھرچ کھرچ کے اتارنے کی کوشش میں لگی تھی۔

”پھر لڑکا بھی اتنا بڑا ہے عمر میں مجھ سے۔“

”اتنے امیر ہیں وہ۔ باء سے بھی زیادہ شاید“ اوزگل اٹھ کے کھڑکی کی طرف آگئی۔ باہر بارش ہونے والی تھی۔ اس نے پردہ ہٹا کے کھڑکی کھول دی۔

”ہاں تو کیا ہوا۔ ہمارے پاس بھی تو سب کچھ ہے۔ اور پھر دولت ہی تو سب کچھ نہیں ہوتی نہ زندگی میں“ مینہ منہ بسورے دلیل دینے لگی۔

”ہمارے لئے نہ سہمی۔ باء کے لئے تو ہے نہ۔۔۔ دولت ہی سب کچھ ہے ان کے لئے“ دور بادلوں میں گم آسمان کو کھولتے ہوئے وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولی تھی۔

”باء ایسے نہیں ہیں۔“ مینہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”گل آپ میرے لئے بات کریں نہ باء سے۔ آپ تو جانتی ہیں نہ سب کچھ“ وہ الگ اس کے بازو کے ساتھ لپٹ گئی۔ اوزگل کے دل میں درد سا ہونے لگا۔ دور لان کے اس کو نے یہ نظر جم گئی جہاں پرانے درخت پہ جھولا بندھا تھا۔ دوپریاں تھیں۔۔۔ جو ایک دوسرے میں مگن تھیں۔ بارش ہو رہی تھی۔

”میں ابراہیم سے محبت کرتی ہوں گل“ مینے نے اس کے کندھے پہ سر رکھے سرگوشی کی تھی۔۔

”عیسیٰ لالا کتنا خوش قسمت ہے۔۔ گی نے پیار کیا ہے انہیں“ ایک پری شرارت سے قہقہے لگاتے ہوئے بولی تھی۔

”سین پٹو گی مجھ سے“ دوسری پری شرمائی تھی۔ اور اس نے دیکھا تھا۔۔ ہر سو بارش غائب ہونے لگی تھی۔ بہاری چھانے

لگی۔۔ سماں پھول پھول ہوا تھا۔ منظر تک خوش تھے خوشی سے نہال تھے۔۔ اوزگل کے خشک ہونٹ خود بخود مسکرا دئے تھے۔ اور ابھی اس کی

نظر درخت کی سب سے اوپر والی شاخ پہ پڑی تھی۔ یلکھت اس کی آنکھیں خوف سے پھٹنے لگیں تھیں۔ اس نے دیکھا دونوں پریاں اب بھی

بڑے مزے سے شرارتوں میں مگن تھیں۔ اوزگل نے بولنے کی کوشش کی۔ چلا کر انہیں خبردار کرنا چاہا۔ لیکن آواز جیسے دم ہی توڑ گئی۔ وہ چلا نہ

سکی۔ درخت کے اوپر بیٹھی اس چیل کی شکل والی چڑیل نے اپنے دونوں پر پھیلائے اور زور سے چیخ مار کر زور سے پر جھٹک دئے۔ سوء

(راکھ) سی اڑی تھی۔ اور ہر طرف دھواں سا چھا گیا تھا۔

”اوزگل!!“ مینے نے اس کا کندھا ہلایا۔

”ہاں“ وہ بری طرح چوکی۔۔

”بتائیں نہ کریں گی باء سے میرے لئے بات“ مینے کے لہجے میں التجا تھی۔

”نہ بھی کر سکتی تب بھی مینے اب تمہیں اور ابراہیم کو کوئی جدا نہیں کر سکتا۔ اس حویلی کی بیٹی کی خوشیاں اگر اس لال حویلی کے خون

آشوب دامن سے دور ہی لکھی گئیں ہیں تو ایسا ہی سہی۔ لیکن اوزگل کی کہانی ایک سہی۔ سین اور مینے خوش رہیں۔ یہ بھی کافی ہے۔۔۔“ اس

نے مطمئن لہجے میں کہتے ہوئے بہن کو خود میں سمیٹ لیا تھا۔ اس کے لہجے میں کچھ تو ایسا تھا کہ گل مینہ کے اندر بھی اطمینان دوڑ گیا تھا۔۔۔

☆.....☆.....☆

گاڑی پارک کرتے ہوئے اس نے کال ملائی۔ دوسری طرف بیل جا رہی تھی۔ اس نے مطلوبہ جگہ پہ گاڑی پارک کی اور باہر نکل آیا۔

”ہیلو۔۔۔“ وہ آفس کی سیڑھیوں پہ قدم رکھ رہا تھا۔ جب ضیاء کی بھاری آواز سنائی دی تھی۔ وہ شاید نیند سے جاگا تھا۔

”کہاں ہو ضیاء؟“ باریال نے پوچھا۔

”گاؤں میں ہوں باء کے پاس۔ ان کی الیکشن کمپین میں ضرورت تھی میری“ باریال کی آواز سنتے ہی ضیاء کے لہجے میں عجیب سی

خوشی اور اپنائیت سرايت کر گئی تھی۔

”اچھا۔ کب تک ہو وہاں۔؟“ باریال کا لہجہ واضح طور پہ دھیما پڑا تھا۔

”ایک ہفتے تک تو ہوں ادھر۔ آپ بتائیں کام ہے کوئی؟“ وہ فوراً بولا۔

”کام تو تھا لیکن۔۔۔۔“ باریال سوچ میں پڑ گیا۔

”آپ بتائیں نہ۔ یہاں رہنا اتنا بھی ضروری نہیں۔“ وہ اصرار کرتے ہوئے بولا تھا۔

”نہیں بس چھوٹا سا کام ہے۔ میں خود بیچ کر لوں گا۔ تم بس ایک کام کرنا فون آن رکھنا اپنا اور جیسے ہی فری ہو شہر آفس آ جانا۔“

ایک میٹنگ ہے ارجنٹ انڈیا کے ایک بڑے بزنس میں ہیں۔ ان کے ساتھ۔ انہیں ہمارے یونیک آئیڈیاز کافی پسند ہیں اور وہ اسی سلسلے میں ملنا چاہتے ہیں۔ تم یہاں ہو گے تو میں گھر کی طرف سے بے فکر رہوں گا، اس نے تفصیل بتاتے ہوئے اپنی چیمبر سنبھالی تھی۔

”چلیں ٹھیک ہو گیا۔ آپ دیدے کو میرا نمبر دے دینا۔ میں جلد ہی انشاء اللہ واپسی کی کوشش کرتا ہوں۔“

”گڈ بوائے“

”آپ بے فکر ہو کے جائیں۔ میں پیچھے سب سنبھال لوں گا،“ اس کے لہجے میں اعتماد تھا۔ باریال نے مطمئن ہو کر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد کال بند کر دی تھی۔ اور ضیاء کتنی دیر اس کے جانے کے بعد لالہ سے کسی طرح ملنے اور اسے ساری سچائی بتانے کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ کچھ بھی تھا لیکن بہر حال اسے لالہ کی نظروں میں پھر سے اپنا ایک اچھا عکس دیکھنے کی شدید خواہش تھی۔

☆.....☆.....☆

دائی سکیئر نے نیلے کمبل میں لپٹا وہ سفید گلابی سا وجود اس کے حوالے کیا تو نہ جانے کیوں اس کے ہاتھ کپکپا سے گئے۔ اس نے کانپتے ہاتھ آگے بڑھائے اور وہ ننھا سا وجود سنبھال لیا۔ نظریں اس کے دائیں گال پہ بنے نیل پہ جم گئیں۔ ہلکا سا نیلا داغ۔۔۔ جیسے چوٹ کا ہوتا ہے۔۔۔

اس کی آنکھیں جلنے لگیں تھیں۔

کل رات کا منظر پوری شان سے آنکھوں کے سامنے آ گیا تھا۔

اسے دیر ہو گئی تھی اور گھر واپسی پہ اسے دروازہ کھلا ملا تھا۔ اور اوپر سے کمبل میں چھپی اقراء باہر چارپائی پہ ہی بیٹھے بیٹھے سو گئی تھی۔

شک کی چنگاری سی تن من میں جا گئی تھی۔ اسے لگا وہ ضرور کسی اور کے لئے یہاں بیٹھی تھی۔ کسی اور کے لئے خوار ہو رہی تھی۔

شیطانی سوچ انسانیت پہ ایک دم اتنا حاوی ہوئی کہ وہ یہ بھی بھول بیٹھا تھا کہ وہ پریگنٹ تھی اور اس کی صحت بھی اچھی نہ تھی۔۔۔

غصے سے تن فن کرتا وہ اس کے سر پہ پہنچا تھا اور نیند میں گم کمزور سے وجود کو دھکے سے دہلا دیا تھا۔

”آ۔۔۔ آ۔۔۔ غ۔۔۔ ا“ وہ کپکپاسی گئی۔ آنکھیں ایک دم سے ہی نیند سے عاری ہو گئیں۔

”بے شرم۔ کس یار کے لئے بیٹھی ہے یہاں“ اس نے آؤ دیکھا تھا نہ تاؤ۔ تھپڑوں اور کموں کی بارش کر دی تھی اس ناتواں وجود

پہ۔ وہ اس بار نہ چینی نہ چلائی۔ ہر شکوہ دم توڑ گیا۔ لیکن آغا کی لغویات سن کر اماں کی آنکھ کھل گئی اور انہوں نے آغا پہ سولہ لعنتیں بھیج کر اسے

چھڑایا اور اپنے کمرے میں لے گئیں۔ لیکن کچھ دیر بعد ہی انہیں دوبارہ آغا کو جگانا پڑ گیا تھا۔ اقراء کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔

وہ فوراً قریبی مائی کو بلا لایا تھا اور فجر کے کچھ دیر بعد ہی وہ ننھی پری اس کے ہاتھوں میں چلی آئی تھی۔ بچی وقت سے پہلے پیدا ہوئی تھی پھر بھی کافی صحت مند تھی۔

”کتنی بار منع کرتی تھی۔ بیوی کی قدر کر۔ پھر اقراء جیسی بیوی جو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے تیرے ساتھ ہوئی۔ تھا کیا تیرے پاس۔ اب ہو جا خوش۔ مل گئی آزمائش تجھے بھی۔ اب اسے مارنا۔ اس پہ نظر رکھنا۔“ اماں نے کمرے سے نکلتے ہوئے اسے نہ مبارک دی نہ ہی خوش ہوئیں۔ طعنے مارتی کچن کی طرف چلی گئیں۔

”اقراء کیسی ہے۔؟“ دائی اماں باہر آئیں تو اس نے تیزی سے پوچھا۔

”ٹھیک ہوگی؟؟“ انہوں نے الٹا سوال کیا۔

”تم نے بیچاری کا کیا حال کر رکھا ہے۔ چہرہ نیل و نیل ہے اس پھول جیسی لڑکی کا۔ حیوان ہوتے ہیں تم جیسے مرد۔ اللہ پوچھے تم جیسوں کو۔ اور اب دن نکلتے ہی ہسپتال لے جاؤ یا چاہو تو یہیں مار دو اچھا ہے جان چھوٹے تم جیسے حیوان سے، وہ بھی غصے میں بڑبڑاتی باہر نکل گئیں تو وہ ننھا وجود سنبھالے مرے مرے قدموں سے وہ اندر چلا آیا۔

سامنے ہی اقراء نڈھال سی آنکھیں موندے پڑی تھی۔ وہ ساری رات نہیں سو پائی تھی۔ اس کی آنکھیں اور چہرہ سوچ چکا تھا۔ اور گال پہ ویسا ہی نیل کا داغ تھا جیسا بچی کے گال پہ۔ بس اس کا داغ بہت بڑا تھا۔ ہونٹ ایک سائڈ سے پھٹ گیا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے چلتا اقراء کے قریب آ کے بیٹھ گیا۔ آہٹ پہ اقراء نے آنکھیں کھولیں تھیں۔ اور پھر آہستگی سے واپس بند کر لیں تھیں۔ مدت ہوئی اس نے کسی بھی قسم کا گلہ شکایت کرنا چھوڑ دیا تھا۔ ابھی بھی بس ایک آنسو ضبط کی حد توڑتا بند آنکھوں سے پھسلتا تیکے میں جذب ہو گیا تھا۔ آغا کی آنکھیں جلنے لگیں۔

”اقراء۔۔۔“ اس نے دھیرے سے اقراء کا کمزور سا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔

اقراء نے آنکھیں نہ کھولیں۔ اس نے آہستگی سے لب اس کے ہاتھ پہ دھردے۔ آنسو پٹپ اس کے ہاتھ کی پشت پہ گرنے لگے۔ اقراء نے کپکپاتی پلکیں اٹھائیں۔

”آئم ساری۔۔۔ مجھے معاف کر دو۔“ بچی کو ایک طرف لٹا تا وہ دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے بچوں کی طرح بلک اٹھا تھا۔

اقراء نے ٹپ کر اٹھنے کی کوشش کی۔ لیکن اٹھ نہ سکی۔ آغا نے تیزی سے آگے بڑھ کر اسے اٹھنے میں مدد دی۔

”میں نے کبھی آپ سے شکایت کی آغا“

”کاش تم کرتیں اقراء۔“

”نہیں آغا۔ رشتوں میں جب اعتماد کی جگہ شک لے لے تو لفظ تو کیا احساس بھی معنی کھودیتے ہیں۔ میں نے آپ کو کھو دیا تھا۔

اور شاید بہت جلد آپ مجھے بھی کھودیتے۔ جہاں شک آجائے وہاں رشتے کہاں باقی بچتے ہیں۔“ اسے بولنے میں بھی تکلیف ہو رہی تھی۔
 ”ہمارا رشتہ تو باقی ہے نہ ابھی اقراء۔ مجھے دیر نہیں ہوئی،“ آغا کے لہجے میں منت تھی یقین بھری۔
 ”کمزور تو ہو گیا نہ آغا،“ اقراء کے لہجے میں تاسف تھا۔ دکھ تھا۔

”رشتے کمزور ہو جائیں تو انہیں مضبوط کیا جاسکتا ہے۔ بس ٹوٹنے سے بچ جائیں تو کوئی مشکل نہیں،“ آغا دل سے مسکرا دیا تھا۔
 ”باقی باتیں بعد میں کریں گے ابھی تم دونوں کو ہاسپٹل لے کے جانا ہے۔ میں اماں کو بھیجتا ہوں تمہارے پاس۔ ذرا گاڑی کا بندوبست کر لوں،“ اس کے گال تھپتھپتا وہ باہر نکل گیا تھا۔ اقراء نے اس کے اس روپ کی واپسی پہ دل ہی دل میں رب کا شکر ادا کیا تھا اور اس ننھی پری کا بھی جو کم از کم اس کے لئے بہت نیک ثابت ہوئی تھی۔

☆.....☆.....☆

”اقراء کی بیٹی پیدا ہوئی ہے۔ ہم ہسپتال میں ہیں،“ کل رات سے دل میں عجیب سے وہم اٹھ رہے تھے۔ عجیب سی اداسی قلب و روح پہ سوار ہو رہی تھی۔ بالآخر اس نے پھپھوکا نمبر ملا لیا۔ دوسری طرف کال اٹھاتے ہی پھپھو نے اسے خوشخبری سنائی تھی۔ خوشی کے ساتھ ساتھ اسے حیرت بھی ہوئی تھی۔
 ”کب پھپھو۔“

”آج صبح ہی۔ ڈیلیوری گھر پہ ہی ہوئی لیکن کمزوری بہت تھی اقراء کو تو آغا ہسپتال لے آیا،“
 ”لیکن ابھی تو کافی وقت تھا نہ اقراء کی ڈیلیوری میں، بے بی ٹھیک ہے،“ اس نے بے اختیار ہی پوچھا تھا۔ دوسری طرف محسوس کی جانے والی خاموشی چھا گئی تھی۔

”پھپھو۔ اقراء اور بچی ٹھیک ہی نہ؟؟“ وہ پریشان ہوئی۔
 ”بیٹا آغا نے کل بہت بری طرح مارا اقراء کو اور اسی وجہ سے وقت سے پہلے،“ پھپھو کا لہجہ بھگینے لگا۔
 ”لیکن وہ دونوں ٹھیک ہیں۔ تم آؤ گی ملنے؟؟“

”ہاں میں شام میں ہی آتی ہوں ولی کے ساتھ،“ اس نے ایک پل سوچے بنا فوراً حامی بھر لی تھی۔ صاف دل والے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ گلہ کرنا یا دلوں میں میل رکھنا انہیں آتا ہی نہیں۔ وہ بس محبت کرنا جانتے ہیں۔ اور لالہ ایسی ہی تھی۔

☆.....☆.....☆

باریال شام کو دیر سے گھر لوٹا تھا لیکن اقراء کی بیٹی کا سن کر اس نے فوراً لالہ سے چلنے کے لئے کہا تھا۔
 ”اس وقت۔۔ ابھی تو آپ اتنا تھکے ہوئے ہو،“ لالہ متذنب تھی۔

”لو تھکا کیوں ہو۔ سارا کام تو بولنے اور سوچنے کا ہوتا ہے۔ چائے کا ایک کپ پلا دو۔ فریش ہو جاؤں گا۔“
”سچ میں“

”ہاں ہار جاؤ۔ جلدی سے چائے لاؤ۔ میں تب تک فریش ہوں“ اس کے کہنے پہ وہ سر ہلا کے باہر چلی گئی۔
صرف آدھے گھنٹے بعد ہی وہ اقراء کے سرہانے کھڑی اس ننھی پری کو داری ہوتی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ بہت پیاری تھی۔
اس نے کچھ کچھ لالہ کے ہی رنگ چرائے تھے۔

”لالہ یہ تمہاری طرح لگتی ہے“ باریال نے بھی اسے دیکھتے ہی کہا۔
”ہاں واقعی۔۔ مجھے بھی بالکل ایسا لگا اسے دیکھتے ہی جیسے لالہ کا بچپن سامنے آ گیا ہو“ پھپھو نے مسکراتے ہوئے تائید کی۔
”شاید اس لئے کہ میں نے اس سارے وقت کے دوران لالہ کو دل سے سوچا“ اقراء نے مسکراتے ہوئے کہا۔
”ارے اتنا سوچا تھا مجھے“ لالہ کو عجیب سی خوشی محسوس ہوئی۔

”تو ملنے آ جاتی“ وہ بے اختیار ہی کہہ گئی۔ اقراء کی نظر بے اختیار آغا کی طرف اٹھی وہ شرمندگی سے نظریں چرا گیا۔
”کس منہ سے ملنے آتی۔ ہر وقت تمہیں یاد کر کے تم سے کی گئی ہر ایک زیادتی کی دل ہی دل میں تم سے اور اپنے رب سے معافی مانگتی رہی“ اس کی آواز بھرا گئی۔ لالہ نے اسے خود سے لگایا۔

”تم نے تو ہمیشہ میرا ساتھ دیا تھا اقراء۔۔ خدا گواہ ہے تم سے تو آج تک مجھے کبھی کوئی شکایت نہیں رہی“ وہ پیار سے اس کے بال سہلا رہی تھی۔

”لیکن امی نے تو۔۔“ اقراء بولنے لگی۔

”پھپھو اور میری بات کلئیر ہو چکی ہے۔ پلیز بھول جاو پرانی باتوں سے“ لالہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

”میں نے لالہ سے معافی مانگ لی تھی“ پھپھو نے بڑے دل سے بیٹی کے سامنے اعتراف کیا تھا۔ اور تب اقراء نے حیرت سے آغا کی طرف دیکھا تھا جو محبت بھری نظروں سے ایک بار پھر اسے ہی دیکھے جا رہا تھا۔ اسے خدا کے انصاف پہ ایک مرتبہ پھر سچے دل سے یقین آ گیا تھا۔ کچھ حساب دنیا میں ہی ہوتے ہیں اور بڑے زبردست ہوتے ہیں۔ وہ تھک گئی تھی تبھی کسی سے مزید بات کئے بنا ہی لالہ کے پہلو میں سر چھپا کے آنکھیں بند کر لیں تھیں۔ سب ایک بار پھر ننھی پری کی طرف متوجہ ہو چکے تھے۔

☆.....☆.....☆

سفید شلوار قمیض کے اوپر سرمئی رنگ کی شال اوڑھتے ہوئے اس نے ایک طائرانہ نظر سامنے قد آور آئینے میں اپنے سر پر پہ ڈالی تھی۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی اسے کچھ خاص محسوس نہیں ہوا تھا۔ اتنا صاف ستھرا سراپا بھی غلاظت کا ڈھیر محسوس ہوا۔

”ضیاء علی خان۔۔ ایک زانی۔۔ ایک ریپسٹ۔۔“ اس نے طنز یہ اپنے خوبصورت سراپے پہ لعنت سی بھیجی تھی جیسے۔ پھر لب کچلتا بیڈ پہ بیٹھ کے چلی بند کرنے لگا۔ کہ دروازہ کھلا اور اوڑگل اندر آئی۔

”لگتا ہے باء اس دفعہ اور شان سے جیتیں گے“ اس نے اندر آتے ہی چھتے لہجے میں کہا تھا۔

”شاید۔۔“ ضیاء نے اس کی طرف دیکھے بغیر مختصر جواب دیا۔

”شاید نہیں یقیناً۔۔ آخر اس بار دوشیطان مل کر کمپین چلا رہے ہیں“ اس کی بات پہ ضیاء کے ہاتھ ایک پل کے لئے رکے۔ لیکن سرویسے ہی جھکا رہا۔ پھر اس نے اپنا کام مکمل کیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

”کئی دفعہ جیت ہار سے زیادہ بھاری پڑتی ہے۔ آپ اپنا دل مت جلایا کریں سوچ سوچ کے“ وہ اب بھی اس کی طرف دیکھے بنا اب پر فیوم چھڑک رہا تھا۔

”تم مورے اور اللہ لوک سے“

”ہششش“ ضیاء نے تیزی سے مڑ کر اس کے منہ پہ ہاتھ رکھ کر اسے مزید بولنے سے منع کر دیا۔

”یہاں بولتے وقت یہ مت بھولا کرو کہ یہ وہی لال حویلی ہے۔ ہر راز پنہاں کر لینے والی اور وقت آنے پہ ہر راز عیاں کرنے والی۔۔۔ وقت کا انتظار کرو۔ باقی رہے دوشیطان۔۔ تو شیطان کہاں باقی رہتے ہیں۔ اللہ پاک خیر کرے گا“ خوبصورت لہجے میں بہن کے گال تھپتھپتا وہ باہر نکل گیا تھا۔ اور اوڑگل کو لگا اس کی سانسیں بھائی کے ہم قدم ہوئیں تھیں۔ اس نے فوراً اپنے خوبصورت بھائی کی لمبی زندگی کی دعا مانگی تھی۔۔

☆.....☆.....☆

واپسی پہ وہ واقعی بے حد خوش تھی۔ اس کا کھلا کھلا چہرہ دیکھ کے باریال بھی مسکرا اٹھا تھا۔ رشتوں سے پیار کرنے والی اس لڑکی نے کتنی آزمائش دیکھی تھی۔ اور اب قدرت مہربان ہوئی تھی تو ایک ایک کر کے سب رشتے پلٹنے لگے تھے۔

”کاش کسی دن سین آنٹی بھی پلٹ آئیں۔ وہ تو بالکل بھول ہی گئیں ہیں لالہ کو“ اس نے موڑ کاٹتے ہوئے دعا کی تھی۔

”ولی۔۔“ لالہ نے پکارا تو وہ چونکا۔

”ہاں“

”کیا آپ ایک ہیپلپ کر سکتے ہیں“

”کیا۔؟“ اس کے سوال پہ وہ حیران ہوا۔

”آغا بہت لائق لڑکا ہے۔ اقراء سے ایک دوبار تفصیلی بات میں اس کے کیریئر کے بارے میں پتہ چلا تھا مجھے۔ کافی شاندار رہا

تھا اس اکیڈمک ریکارڈ۔ آپ اسے اپنے ساتھ کر لیں۔ اس طرح آپ کو بھی اچھا ہیلپر مل جائے گا اور آغا کو بھی اچھی کمپنی۔ اقرار بتا رہی تھی وہ بدل رہا ہے۔ پھر سے پہلے والا ہو رہا ہے۔ ایسے میں آپ کے ساتھ رہے گا تو اور سدھر جائے گا“ اس کی بات پہ باریال کا تہقہہ جاندارتھا۔

”توبہ ہے۔ تم بھی نہ لالہ۔۔ مجھ سے کیا سیکھے گا“

”بس سیکھ جائے گا۔۔ میں کہہ رہی ہوں نہ۔۔“ اس نے کہا۔

”چلو ٹھیک ہے۔ کل ہی کرتا ہوں کچھ۔ اور کوئی حکم“ وہ مسکراتے ہوئے نفی میں سر ہلا گئی۔

”اچھا کل صبح کی فلائٹ سے مجھے لندن جانا ہے۔“ اس نے اچانک بتایا

”لندن۔۔۔ وہ کیوں۔؟“ لالہ کا دل ڈوب سا گیا۔

”کچھ میٹنگز ہیں آفیشل۔۔ دعا کرنا اگر یہ میٹنگز کامیاب رہیں تو انشاء اللہ ملک سے باہر بھی ہمارا بزنس پھیلے گا۔“

”لیکن کیا ضرورت ہے ولی۔۔ یہ سب کچھ ہے نہ ہمارے پاس۔ بہت ہے“ وہ اداس ہوئی۔

”نہیں لالہ۔ پیسے کی بات نہیں ہے۔ بس یہ میرا جنون ہے۔ اور اللہ پاک جب راستہ بنا رہا ہے تو میں اس کا فائدہ کیوں نہ

اٹھاؤں۔“

”لیکن آپ جانتے ہیں مجھے اب آپ کی عادت ہو گئی ہے“ وہ تیزی میں کہہ گئی۔ خوبصورت مسکراہٹ نے باریال کے لبوں کا

حصار کیا تھا۔

”سچ میں“ شرارت لہجے سے عیاں تھی۔

”میں جھوٹ نہیں بولتی آپ جانتے ہیں“

”مطلب تمہیں مجھ سے محبت ہونے لگی ہے“ اس کا لفظوں میں خوشی تھی۔

”آپ ہیں ہی محبت کے قابل“

”یار پاگل کرو گی کیا آج۔۔ گاڑی نہ نکرا بیٹھوں آج“ وہ شریر سا اس کی اور جھکا۔

”ولی۔ پلیز آگے دیکھیں“ وہ اسے دھکا دیتے ہوئے آہستگی سے چلائی۔

”لو۔ ادھر اتنے اونچے خواب دکھاتی ہو اور ادھر قریب آنے کی کوشش کرو تو۔۔۔“ وہ منہ بنا کر سیدھا ہو بیٹھا۔

”جی۔ کیونکہ محبت کے قابل آپ ہیں۔ میرا یہ غلیظ وجود نہیں“ وہ باہر دیکھتے ہوئے بولی تھی۔ سب کچھ یاد آنے لگا تھا۔ دکھ ایک

بار پھر روح کے زخم کریدنے لگا تھا۔

”لالہ۔۔۔ پھر وہی بات۔۔۔ تم جانتی ہو میں اپنی ہر حد جانتا ہوں۔ اور تمہیں بھی۔ تم ایک امانت ہو میرے پاس۔ جب تک تم خود مکمل طور پہ میرے ساتھ کے لئے تیار نہیں ہو میں زبردستی نہیں کروں گا۔ لیکن یہ بات تو طے ہے کہ ہم سفر تہی ہو۔ میری دوستی، میری محبت میں تم کوئی کمی کبھی نہیں پاؤ گی“ وہ اب گھر کی گلی میں لڑنے لگا تھا۔

”باقی رہا میرا اور تو صرف تین دن ہیں۔ اتنا ٹائم ہے ہمارے پاس۔ ورنہ پیچھے ضیاء ہے۔ تو فکر کی کوئی بات نہیں“ اس نے بے فکر لہجے میں کہتے ہوئے گاڑی گھر کی طرف موڑتے ہوئے ہارن بجایا تھا۔ یہ دیکھے بغیر ہی کہ اس کی بات پہ لالہ کی کھلتی رنگت ایک دم زرد پڑ گئی تھی۔۔۔

☆.....☆.....☆

باریال لندن کے لئے روانہ ہو چکا تھا۔ اس نے سبہ پہر سے پہلے پہلے سارے کام نبٹائے تھے اور باقی باء کے ذمہ لگا کے اجازت لی تھی۔ باء اس طرح اس کے اچانک جانے پہ پریشان تو تھے لیکن پھر اس کی خوشی کے لئے اجازت دے دی۔ وہ سبہ پہر سے پہلے پہلے اسے شہر کے لئے نکلتا تھا۔ اسے کسی بھی طرح لالہ سے ملنا تھا۔ اسے سب کلنیر کرنا تھا۔ ہر غلطی کی معافی مانگنا تھی اور اسے بتانا تھا کہ وہ گمراہ تھا۔ اپنی اصلیت سے ناواقف تھا۔ لیکن یہ بات اٹل تھی کہ وہ اسے بے حد پیار کرتا تھا اور کرتا ہے۔ ضیاء علی خان کو بس وہ مکمل کرتی تھی۔ اور کوئی نہیں تھی۔ اور اگر وہ نہیں تھی تو زندگی کہاں تھی۔۔۔ سب کچھ بے معنی تھا۔

سبہ پہر سے کچھ پہلے باء ایک قصبے کی طرف نکلے تھے۔ تو وہ حویلی کی پچھلی طرف آ گیا۔ جانے سے پہلے اس نے باء کے کمرے سے چابیاں اٹھالیں تھیں۔ اس کے پاس چابی تھی سوا سے اوزگل کی طرح خفیہ راستہ ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ اس نے زنگ آلود تالے پہ اک نگاہ ڈالی اور اس کے موافق چابی دیکھنے لگا۔ دل نہ جانے کہوں بے طرح دھڑکنے لگا تھا۔ اس نے ایک چابی کو منتخب کرتے ہوئے وہ تالے کے اندر گھمائی۔ ذرا سے تردد کے بعد کھٹاک کی زوردار آواز سے تالا کھل گیا تھا۔ اس نے پرانے بوسیدہ سے دروازے کو زور سے دھکا لگایا تو وہ بھی زوردار چرچراہٹ کرتا کھل گیا۔ اندر کا منظر ایک دم روشنی سے نہا گیا۔ یہ زیر زمین زندان تھا۔ اور ابھی نیچے سیڑھیاں جارہیں تھیں۔ اس نے کچھ سوچتے ہوئے قدم اندر رکھ دئے۔۔۔

”مہلت مک گئی۔۔۔ مہلت ٹول شوئے“

اور اس کی سانس رک گئی۔ اللہ لوک کی آواز۔۔۔ وہ تیزی سے سیڑھیاں اترتا گیا۔ آواز اور قریب آتی گئی۔۔۔

”تمہارا کیا ہوگا۔۔۔ رسی کھنچ گئی۔ حساب شروع ہو گیا“ وہ پشتوں میں کہتے ہوئے قہقہے لگائے جارہی تھی۔ اور ضیاء کے سامنے اب زندان کے تنگ و تاریک کمرے تھے۔ انسان کے قد سے بھی چھوٹی چھتوں اور انسان کے جسم کی لمبائی سے تنگ کوٹھڑیاں۔۔۔ وہ پاگلوں کی طرح اس کمرے کو ڈھونڈنے لگا جہاں سے اللہ لوک کی آواز آرہی تھی۔ تبھی کسی رسی سے اس کا پیرا لچھا تھا اور وہ درمیانی کھلی گلی میں منہ کے

بل گرا تھا۔

”بسم اللہ“ لمبے الجھجھے بالوں والی وہ دراز قد خوبصورت عورت مچل کے سلاخوں کے قریب آئی تھی۔ ضیاء نے حیرت سے سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا اور اس نے ضیاء کو۔ دو خوبصورت نیلی آنکھیں جیسے پتھری ہوئیں تھیں۔ ضیاء روشنی میں تھا اور اس کا ایک ایک نقش بہت واضح تھا۔

”گلو۔۔۔“ وہ عورت بلند آواز میں بڑبڑائی۔

”ضیاء علی خان“ اور دوسرا جملہ مکمل اور واضح تھا۔

”کون ہو تم؟“ وہ نہیں پہچان پایا تھا۔ تبھی فوراً پوچھا تھا۔ اس عورت کے لبوں پہ مسکان بکھرتی چلی گئی تھی۔

”اللہ لوک۔۔۔ ضیاء۔۔۔ ضیاء آیا ہے۔“ وہ چلائی تھی۔ اور سارا زندان کڑیوں کی جھنکار سے گونج اٹھا تھا۔ سب مریل گلے سرڑے وجود ان کی طرف متوجہ ہو چکے تھے۔

”ہاں میں ہوں ضیاء علی خان۔ لیکن آپ کون ہیں؟“ وہ اب پریشان ہوا تھا۔

”ماں ہے نہ تبھی تجھے فوراً پہچان گئی۔ اولاد کیا جانے متا کے رنگ۔ یہ تو ماں ہوتی ہے اولاد کو ہر رنگ میں پہچان جاتی ہے“ سامنے ہی ایک زندان سے اللہ لوک کی آواز آئی تھی اور ضیاء علی خان وہیں دوبارہ ڈھے سا گیا تھا۔ جہاں سے ابھی بمشکل اٹھا تھا۔ اور اس وقت وہ کڑیل مرد ماں کے ہاتھوں پہ سر رکھ کے زار زار رو رہا تھا۔ کہ وہ ان کے ہر درد سے واقف تھا۔ پڑھ کے اپنے دل پہ تحریر کر چکا تھا ان کا ہر کرب۔۔۔

”بس تھوڑا سا انتظار کر لیں مورے اور اللہ لوک۔۔۔ میں رہوں نہ رہوں آپ سب کو اپنا مقام دلوا کر رہوں گا“

اور وہاں سے جاتے وقت اس نے ان دونوں کو وعدہ سوچنا تھا۔ نہ جانے کیوں اللہ لوک کو لگا وہ اسے آخری بار دیکھ رہی ہیں۔

”تمہیں اسے روک لینا چاہیے تھا۔“

”وہ کہاں رکتا۔ پھر واپس ہی آئے گا تو کیوں روک لیتی“

”مجھے اس کے پیچھے سفید سایہ نظر آیا۔۔۔ مجھے نہیں لگتا وہ واپس آئے گا“

”اللہ نہ کرے اللہ لوک۔۔۔ وہ کانپ گئیں۔

”حساب ہوتا ہے نہ پگلی۔ حق ہا۔۔۔ حساب شروع ہو گیا۔ حساب شروع ہو گیا“ وہ دوبارہ اپنے اسی وجد میں گم ہو گئیں تھیں۔

”یا اللہ پاک میرے بیٹے کی حفاظت کرنا“ صنوبر نے دل سے دعا شروع کی تھی۔۔۔

☆.....☆.....☆

شام کے قریب وہ شہر پہنچا تھا۔ اور گھر آتے ہی سو گیا تھا۔ ابھی تھکن بھی نہیں اتری تھی جب اسے دیدے کی کال موصول ہوئی تھی۔

”ضیاء بچے لالہ کی طبیعت خراب ہو گئی ہے اچانک سے“ وہ پریشان سا اٹھ بیٹھا۔

<https://facebook.com/hayyabukhari110/>

جلد لالہ کے پاس پہنچنا چاہتا تھا اور ادھر لالہ ضیاء کے ساتھ دیدے کے ہوتے ہوئے مکمل محفوظ ہوتے ہوئے بھی خود کو بالکل غیر محفوظ محسوس کر رہی تھی۔ درد سوا ہوتا جا رہا تھا اور ساتھ اس، رات والا خوف بھی۔

”دیدے یہ مجھے مار دے گا۔ دیدے میں مر جاؤں گی۔ یہ میرا جسم نوچ کھائے گا“ اچانک ہی اس کی حالت ہڈیانی ہونے لگی تھی۔ ”ابراہیم بی فاسٹ“ وہ رات کسی کالے آسیب کی طرح ضیاء کے سامنے بھی ناچنے لگی تھی۔ دوزم کوئل ہاتھ اس کے مضبوط ہاتھوں میں کسمساتے اسے اب بھی محسوس ہو رہے تھے۔ خود سے نفرت پھر سے بڑھنے لگی تھی۔

”ابراہیم تیز چلاؤ“ اس نے دوبارہ کہا تھا۔ ابراہیم نے سپیڈ بڑھا دی تھی۔

گاڑی سے وہیل چیئر پہ بٹھانے اور پھر ڈاکٹر کے کمرے تک لانے میں اسے ضیاء نے ہی سنبھالا تھا۔ دیدے مسلسل اس پہ پڑھ پڑھ کے پھونک رہی تھیں۔ ابراہیم گاڑی پارک کر کے وہیں ٹھہر گیا۔ ڈاکٹر نے ضیاء کو باہر جانے کے لئے کہا۔ دیدے بھی وہیں رک گئیں۔ کچھ دیر بعد ہی ڈاکٹر باہر آئی تھی۔

”آپ کی مسز کی کنڈیشن ٹھیک نہیں ہے۔ بچہ کافی دیر سے ڈیلیوری کی پوزیشن میں ہے لیکن انہیں پین کیوں نہیں اسٹارٹ ہوئے یہ حیرت انگیز ہے۔ ہمیں فوری طور پہ آپریٹ کرنا پڑے گا۔ لیکن۔۔۔“

”لیکن کیا۔۔۔ کیا ڈاکٹر؟؟؟“ وہ جو ”آپ کی مسز“ کے لفظوں کے سحر میں کھوسا گیا تھا۔ ایک دم چونکا۔

”زچہ کا ہم ابھی کچھ نہیں کہہ سکتے لیکن بچہ۔۔۔ میرا مطلب ہے بچے کے لئے کچھ بھی کہنا قبل از وقت ہو سکتا ہے لیکن مجھے لگتا ہے۔ ہم شاید ہی اسے بچا پائیں“

”آپ جلدی سے آپریشن شروع کریں۔ میرے لئے لالہ کی زندگی زیادہ اہم ہے اس بچے سے“ اس نے فوراً فیصلہ سنایا تھا۔ ڈاکٹر اسے مزید ہدایات دینے لگی۔

☆.....☆.....☆

وہ قدرت کی ستم ظریفی پہ حیران تھا۔ لالہ اس کے بے حد قریب آ کے اس سے ہمیشہ کے لئے دور چلی گئی تھی۔ وہ اس کا حاصل لا حاصل نہ تھی کہ ملتا تو واہ شد نہ ملتا تو آہ شد۔ وہ تو اس کا سب کچھ تھی۔ اس کی ذات۔۔۔

اس کا من۔۔۔

اس کی سانس سانس لالہ کے نام سے چلتی تھی۔

وہ تو لازم تھی۔۔۔

اس کے ہونے سے ضیاء علی خان کا ہونا تھا۔

وہ نہیں تھی تو ضیاء علی خان کی کوئی جگہ نہیں بچتی تھی۔

لیکن قدرت نے اسے نواز کے چھین لیا تھا۔ اور یہ سب اس کے باء کی وجہ سے ہی ہوا تھا۔ وہ جنہیں وہ سب سے زیادہ اپنے قریب مانتا تھا۔ نہ جانے کیسی فطرت لے کے پیدا ہوئے تھے۔ سب کی خوشیاں نگل جاتے تھے۔

اور اسے اب قدرت کی فیاضی پہ بھی حیرت تھی۔ وہ بچہ اس کا تھا۔ لالہ اس کے حق میں نہ ہوتے ہوئے بھی اس کا حصہ جتنے جا رہی تھی۔ یہاں سب لالہ کو اس کی بیوی سمجھ رہے تھے۔ کچھ لحوں کے لئے ہی سہی سب کچھ کتنا مکمل ہو گیا تھا۔ فارم پہ دستخط بھی اس کے لئے گئے۔ لالہ کی زندگی کے بدلے اس نے بچے کی زندگی لکھ دی۔

”مجھے لالہ زیادہ عزیز ہے اسے کچھ نہیں ہونا چاہیے“ اس نے بار بار ڈاکٹر کو تاکید کی تھی۔
کئی بار اس، فارم کو دیکھ کے اپنے اور لالہ کے نہ ہوئے رشتے کو محسوس کیا تھا۔ روح تک وجد میں آئی تھی۔ عشق کے گھنگر و تن من میں چھنک سے اٹھے تھے۔

”خدا گواہ ہے میں پاک تھا۔ میرا عشق پاک تھا۔ کبھی جو ایک پل کے لئے لالہ کے بارے میں کچھ غلط سوچا ہو۔ بس باء کے لئے جو کیا سو کیا۔ لیکن خدا گواہ ہے میں نے حد سے گزرنا نہیں سوچا تھا۔ لیکن زمزمے نے کہا تھا۔ کچھ حسن اور شر میں نشہ دیتے ہیں تو کچھ یاد نہیں رہتا۔ اور لالہ۔۔۔ میں تم سے ہار گیا۔۔۔ تمہیں ہار گیا۔۔۔“ وہ بکھرا بکھرا سا اندر آیا تھا۔ دیدے کو ریڈور میں جائے نماز بچھائے دعا میں مصروف تھیں۔

”آپ کی وائف ابھی ریکوری میں ہیں اگر چاہیں تو مل سکتے ہیں۔“

نرس نے گویا اسے زندگی کا سندیسہ سنایا تھا۔ وہ تیزی سے لالہ کے پاس آیا تھا۔ لالہ کی حالت کچھ بہتر تھی۔ لیکن اب بھی بار بار دایاں ہاتھ بیڈ کی سائیڈ پہ مار دیتی۔ ضیاء نے آگے بڑھ کر اس کا وہ ہاتھ تھام لیا۔ لاشعوری طور پہ درد کو ضبط کرنے کی کوشش میں لالہ نے اس کے ہاتھ میں سخت دباؤ ڈالا تھا۔

”ولی۔۔۔ بہت درد ہو رہا ہے“ لالہ کی پکار پہ اس کی آنکھیں جل اٹھیں تھیں۔

”مجھے معاف کر دو لالہ۔۔۔“ اس کی آواز پہ لالہ نے جھٹکے سے ہاتھ چھڑوانا چاہا تھا۔

”کچھ دیر تک میں تمہارے درد بانٹ سکتا ہوں۔ میرے ہاتھ میں رہنے دو اپنا ہاتھ“ اس نے منت کی تھی۔

”میں ہمیشہ دھوکے سے تمہارے ہاتھ آتی ہوں۔“ وہ بمشکل بول پائی تھی۔

”تمہارے ہر درد کے لئے میں شرمندہ ہوں لالہ۔“ اس کا لہجہ بھینکنے لگا تھا اور تھیلی بھی۔ لالہ کا دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔

”ضیاء پلیز مجھے اکیلا چھوڑ دو“

”میں ایسا نہیں ہوں لالہ۔ وقت میری گواہی دے گا۔ تم بس ایک بار مجھے معاف کر دو“
 ”کیوں۔ تمہیں کیا لگتا ہے میں مر جاؤں گی کہ جاتے جاتے تمہیں معاف کر دوں“
 ”اللہ نہ کرے“ وہ بے اختیار رڑپا۔

”میرے پاس، وقت نہیں ہے لالہ۔ پھر قسمت ایسا موقع دے نہ دے۔ میں تم سے بات کر پاؤں نہ کر پاؤں۔ میں نے ہر خواہش چھوڑ دی ہے۔ تمہاری چاہ تک لالہ۔۔۔ بس ایک خواہش۔۔۔ تم مجھے معاف کر دو۔ شاید کہ میں وہ رات بھول سکوں۔ شاید کہ میں تمہارا یہ درد بھول سکوں۔ ورنہ تو آج کے بعد یہ رہا سہا سکون بھی جاتا رہے گا“ اس کا لہجہ نکھرا ہوا تھا۔ ہاتھ میں اب بھی لالہ کا ہاتھ تھا۔ جس پہ کبھی اس، کا دباؤ بڑھتا کبھی ڈھیلا پڑ جاتا۔ اس لمس سے وہ با آسانی لالہ کے درد کا اندازہ کر سکتا تھا۔
 ”خدا کی قسم لالہ۔۔۔ ضیاء کا اعتبار کرو لالہ۔۔۔ ضیاء علی خان کو اگر ساری عمر کسی چیز کی سب سے زیادہ پرواہ رہی ہے تو وہ اس کا کردار ہے۔۔۔ ضیاء علی خان ایسا نہیں ہے لالہ“
 ”میرے اعتبار سے کیا ہوگا ضیاء۔ تم میرا مان، میرا کردار، میری ان چھوٹی حرمت واپس کر سکتے ہو۔ میرے اتنے اعلیٰ کردار کے مالک شوہر کے سامنے میری آنکھیں اٹھا سکتے ہو۔ میرا فخر واپس لا سکتے ہو۔ لالہ ہر مرد کو معاف کر سکتی ہے لیکن تمہیں نہیں۔ کبھی نہیں۔“
 ”کیوں۔ اتنا غصہ صرف میرے لئے کیوں۔ تو اس بچے کو کیوں جنم دے رہی ہو یہ تمہیں لمحہ لمحہ میری یاد دلائے گا اسے بھی ختم کر دیتی“

”ولی نے وعدہ کیا ہے ہم اسے کسی بے اولاد جوڑے کو دے دیں گے اسے جنم دینا میری مجبوری ہے لیکن اسے پالنا نہیں۔۔۔ ضیاء علی خان کا کوئی بھی روپ ہو مجھے اس سے نفرت ہے ضیاء۔۔۔ نفرت۔۔۔ آئی ہیٹ یو۔۔۔ تم مر کیوں نہیں جاتے ضیاء۔۔۔ جاؤ مر جاؤ۔۔۔ جاؤ ضیاء مر جاؤ تم“ وہ ہانپیر ہوئی تھی۔ درد کی شدت میں اضافہ ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں تھیں۔
 ”ڈاکٹر“ وہ چلایا۔
 نرسین دوڑتی ہوئیں ان کے پاس آئیں تھیں انہوں نے ضیاء کو باہر جانے کو کیا تھا۔ اور لالہ کو دیکھنے لگیں تھیں۔ ضیاء لالہ کو تکتا لے لے قدم واپس ہوا تھا۔۔۔

☆.....☆.....☆

لالہ کے بیٹا ہوا تھا۔ ننھا سا وجود سب سے پہلے اس کے ہاتھ آیا تھا۔ آسمانی رنگ کے خوبصورت کمرے میں لپٹا وہ روئی کے گال جیسا سفید نرم وجود بالکل اس کا روپ چرا کے لایا تھا۔ اس کے ہاتھ میں آتے ہی اس نے آنکھیں کھولیں تھیں۔ بہت بڑی اور خوبصورت آنکھیں۔ بالکل لالہ کی آنکھیں۔ کٹورا۔۔۔ اور اس کے نچلے لب میں تل بھی تھا۔ وہ یک ٹک اسے دیکھے گیا۔ بچہ کافی صحت مند تھا اور ہوشیار

بھی۔ پوری آنکھیں کھولے وہ بھی ضیاء کو یوں دیکھے جارہا تھا جیسے اسی کام کے لئے دنیا میں آیا ہو۔

”کیا ہوا ضیاء؟“ دیدے نے سجدے سے سر اٹھایا تو اسے یوں ٹھہرا دیکھ کے پوچھا۔ ان کی آواز پہ ضیاء مڑ کر ان کی طرف آگیا۔

”بیٹا ہے ماشاء اللہ“ دیدے نے محبت سے وہ ننھا وجود تمام لیا۔

”لالہ۔۔؟“ انہوں نے پیار سے بچے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”پتہ نہیں۔ اور تو کچھ نہیں بتایا“ وہ واپس آپریشن تھیر کے دروازے پہ آگیا۔ تبھی نرس باہر آگئی تھی۔

”مریضہ کو خون کی اشد ضرورت ہے۔ آپکو جلد از جلد خون کا انتظام کرنا ہوگا اور ان دواؤں کا بھی“ نرس نے ایک چٹ اسے

پکڑائی تھی۔ وہ تیزی سے باہر لپکا تھا۔ لالہ کا خون گروپ B تھا اور اس کا خوش قسمتی سے AB+ وہ تیزی سے دوائیں لے کر واپس آیا

تھا۔ کچھ دیر بعد ہی وہ لالہ کے برابر لیٹا تھا۔ اس کی رگوں کا خون قطرہ قطرہ لالہ کے اندر جارہا تھا اور ضیاء علی خان ایک مرتبہ پھر قدرت کے

نوازنے پہ حیران تھا۔ کم تھا لیکن اس کے لئے بہت تھا۔ اس نے جیسے ان چند گھنٹوں میں ساری زندگی جی لی تھی۔۔۔

☆.....☆.....☆

باریال واپس آچکا تھا۔ لالہ کو دودن گزرنے کے باوجود بھی ہوش نہیں آیا تھا۔ باریال لالہ کو لے کر جس قدر پریشان تھا اسی قدر

ضیاء کا بھی جین گم تھا۔ باریال کے واپس آتے ہی ایک تو سب جان چکے تھے کہ باریال لالہ کے ہزبنڈ ہیں۔ دوسرا اب وہ اس کے اتنا

قریب نہیں جاسکتا۔ باریال یا کوئی نرس واحد ذریعہ تھے لالہ کی خیریت جاننے کی۔ دیدے گھر جا چکیں تھیں۔ بچہ ان کے ساتھ ہی تھا۔

باریال ہر وقت لالہ کے ساتھ رہتا تھا۔

لالہ کی طبیعت ٹھیک ہوتی تو وہ آرام سے خود کو کہیں اور بڑی کر لیتا لیکن ابھی وہ لالہ کو چھوڑ کر بھی نہیں جاسکتا تھا۔

زرینہ اور اقراء بھی آگئے تھے اور ساتھ سبین کو بھی لائے تھے۔ ضیاء سبین پھپھو کی سادہ اور پرفور شخصیت دیکھ کر باپ سے اور متنفر

ہوا تھا۔ کس قدر محبت زدہ لوگ کس قدر تکلیف اور ظلم کا شکار ہوئے تھے۔

اور آج لالہ کی یہ حالت۔۔۔ ذمہ دار وہی تھے۔ کوئی خون کے رشتوں سے یہ انتقام کیسے لے سکتا ہے۔

دیدے کے ساتھ گزرے ان چند دنوں میں اسے ماں کا پیار ملا تھا اور سبین کس قدر محبت سے انہوں نے ان کے سلام کا جواب

دیا تھا۔ اسے خود پہ اپنے خون پہ شرمندگی ہونے لگی تھی۔ دل چاہتا تھا بتا دے سب۔ لیکن ابھی اسے کچھ داؤ کھیلنے تھے۔ سہراب علی خان کو

جنگ کے معنی بتانے تھے۔ جنگ تبھی مزہ کرتی ہے جب دونوں شاہ سوار مقابلے کے ہوں۔ اور وار بھی سامنے کے ہوں۔ اسے سامنے سے

وار کر کے باپ کو لڑائی کے اصل معنی بتانا تھے۔ پلان تیار تھا۔ بس اسے پہلا اور آخری داؤ چلنا تھا۔ بنی بنائی بساط الٹ جانی تھی۔

دوسرے دن شام کے بعد لالہ کو ہوش آیا تھا۔ وہ سب باری باری اس سے ملے تھے سوائے سبین کے۔ باریال نے انہیں کچھ دیر

صبر کرنے کے لئے کہا تھا۔

”وہ جذباتی ہو جائے گی آنٹی اور آپکو دیکھ کے رو پڑے گی۔ تو آپ تھوڑا سا ویٹ کر لیں۔“ سین خود بھی سمجھتی تھیں۔ تبھی رک گئیں۔ لالہ نے بچے کے بارے میں سوال تک نہ کیا تھا۔ باریال سمجھ گیا تھا وہ اپنے فیصلے پہ قائم تھی۔ رات ہوتے ہی سین اندرائیں تھیں۔ لالہ آنکھوں پہ ہاتھ دے لیٹی تھی۔ وہ دھیرے دھیرے چلیں اس کے پاس آٹھہریں۔۔

”لالہ۔۔۔“ بہت مشکل سے انہوں نے یہ نام پکارا اور دوسری طرف گویا کرنٹ سا دوڑا تھا۔ گردن جھکے سے اس طرف مڑی تھی۔ وہ تو پہلے سے رو رہی تھی۔

”امی“ اور سین نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے اسے خود میں سمولیا۔ یوں کہ وہ لیٹے لیٹے ان کی گود میں سر چھپا گئی۔

”کیوں امی۔۔۔ آپ نے ایسا کیوں کیا امی میرے ساتھ۔ آپ کو ہمیشہ سے شاوریز عزیز تھا۔ مجھ سے زیادہ۔ بیٹا چاہیے تھا نہ آپکو۔ اور بیٹی چاہیے بھی کیوں میں نے تو آپکی عزت خاک میں ملا دی نہ“ وہ روتے ہوئے گلہ کرتی جا رہی تھی۔ سین خود رو رہی تھیں۔ اور نفی میں سر ہلائے جا رہی تھیں۔

”میں نے سنا تھا بیٹیاں ماں کی پرچھائی ہوتی ہیں۔ بیٹی کی بات ماں اور ماں کی بات بیٹی بنا کہے سمجھ جاتی ہے۔ لیکن تم تو بیٹی ہو کے کبھی مجھے سمجھ ہی نہیں سکیں لالہ۔ ساری عمر تم نے مجھے غلط ہی سمجھا لالہ۔۔۔ باریال بہت اچھا سہی۔ مشکل وقت میں آگے آنے والا سہی لیکن تھا تو ایک مرد ہی نہ۔ ایک مرد میری بیٹی کو سہارا دے رہا تھا کافی تھا۔ میں خود بھی اس پہ بوجھ بن جاتی۔ کیا یہ ٹھیک تھا۔ پھر شاوریز کا رویہ۔۔۔ اماں کی ڈیٹھ کی خبر تک تمہیں نہ دینے دی اور اچانک ہی جب پتہ چلا کہ اماں نے مکان بھی تمہارے نام کر رکھا ہے تو باپ کے پاس چلا گیا۔ مجھے وہاں کن حالات کا سامنا رہا کاش تم سمجھ سکتی۔ اس ایک ایک پل میری آنکھ میرے لب میرے دل میں تم دعا کی صورت رہی۔ ایک پل بھی میں تمہیں نہیں بھولی۔ میرے آنگن میں تو بس ایک ہی پھول کھلا تھا لالہ۔۔۔ میں اسے کیسے بھول سکتی تھی“ وہ اس کی پیشانی پہ لب رکھ کے سسک اٹھیں تھیں۔

”سین۔۔۔۔“ بھاری پشتون لہجے پہ وہ دونوں بری طرح چونکیں تھیں۔ سین نے بے ساختہ اس طرف مڑ کر دیکھا تھا اور سکتے میں آگئی تھیں۔

”جنت بی بی“ وہ اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکیں تھیں۔ دیدے نے آگے بڑھ کر اسے سینے سے لگا لیا تھا۔ دونوں ایک بار پھر سے سسک اٹھیں تھیں۔ لالہ اور باریال خود حیران تھے۔ ضیاء کے چہرے پہ البتہ اطمینان تھا۔ جیسے وہ اس سب سے پہلے سے واقف ہو۔

”لالہ۔۔۔“ دیدے تو خوشی سے بول نہیں پارہیں تھیں۔

”جی بی بی۔۔۔ لالہ میری ہی بیٹی ہے“

”دیدے یہ۔۔؟“ باریال ماں کے پاس آیا۔۔

”یہ تمھاری پھپھو ہیں باری۔۔ چھوٹی پھپھو۔۔ سین۔۔ بتایا تو تھا تمھیں۔“ اور سین نے پہلی بار اسے خود سے لگا لیا تھا۔
زریاب لالا کی واحد نشانی۔۔ ان کے خاندان کا اکلوتا چشم و چراغ۔۔

سب کچھ ایک دم سے کتنا مکمل ہو گیا تھا۔ وہ سب مسکرا رہے تھے اب۔۔ اور ضیاء علی خان کی آنکھیں جلنے لگیں تھیں۔ یہی کاملیت ان کی شراکت بھی ہو سکتی تھی۔ اگر ان کے باء نے محبت کا بیج بویا ہوتا۔ لیکن انہوں نے تو خار بوئے تھے۔۔ جواب ان سب کو کاٹنے تھے۔ کہ یہی مکافات عمل ہے۔ ان سب کو مسکراتا چھوڑ کر وہ باہر نکل آیا تھا۔

☆.....☆.....☆

سہراب علی خان نے جیت حاصل کی تھی اور شاندار جیت حاصل کی تھی۔ کتنے ہی علاقے فارنگ اور ضیاء علی خان کے نام سے گونج اٹھے تھے۔

سہراب علی خان بے حد خوش تھے۔ وہ بار بار ضیاء کا نمبر ملاتے رہے تھے۔ لیکن ضیاء ہر بار ”باء ابھی بہت بڑی ہوں بعد میں کال کرتا ہوں“ کہہ کر کال کاٹ دیتا۔ زندگی کی اتنی بڑی خوشی سہراب علی خان نے اکیلے منائی تھی۔ صرف غیر لوگوں کے ساتھ۔۔

☆.....☆.....☆

سفید رنگ کے سادہ سے کپڑوں میں ملبوس وہ عورت بے حد نفیس اور خوبصورت تھی۔ اس کا شوہر بھی اس کی طرح ہی باوقار شخصیت کا حامل تھا۔

”حال ہی میں ہم اس فارم ہاؤس میں شفٹ ہوئے ہیں اور ڈاکٹرز کے مطابق میں ماں نہیں بن سکتی تھی ہم نے بچہ ایڈاپٹ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ڈاکٹر اربعہ ہمیں اچھی طرح جانتی ہیں تبھی انہوں نے ہمیں بتایا آپ کے بارے میں تو ہم ان کے تھرو ہی آپ سے ملنے آگئے۔“

وہ بولتی بھی بہت پیارا تھا۔ باریال کو وہ بچے کے لئے پرفیکٹ کپل لگا تھا۔ لالہ نے بچے کو دیکھا تک نہیں تھا۔ سواب بچے کو رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اچھا تھا لالہ کے لئے بھی۔ اور باریال بھی اب اسے زندگی کی طرف آسانی سے واپس لاسکتا تھا۔ یہ بچہ ساتھ رہتا تو شاید لالہ اس حادثے کے حصار میں رہتی۔ اس نے ڈاکٹر اربعہ کی تسلی کے بعد بچان کے حوالے کر دیا تھا۔

ہسپتال سے باہر آتے ہی وہ بلیک شیشوں والی کرو لائیں سوار ہوئے اور گاڑی آگے بڑھ گئی۔
”لالہ نے تو بچے کو دیکھا تک نہیں ضیاء“ زمزمہ نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے تاسف سے کہا۔

”وہ مجھ سے نفرت کرتی ہے۔ اور اسے بھی میرے وجود کا حصہ سمجھو زمزمہ“ اس نے لب کچلتے ہوئے جواب دیا تھا۔

”تم دونوں پہ کسی کو شک تو نہیں ہوا“ ضیاء نے اب ابراہیم سے پوچھا۔

”ڈاکٹر رابعہ کی تسلی کافی تھی۔ وہ ہمارے کپل کو جانتی ہیں یہ بات باریال کے لئے تسلی بخش تھی، ابراہیم نے جواب دیا۔

”زمر مہ اب یہ بچہ تمہارے پاس میری اور لالہ کی امانت ہے۔ اسے باریال کی طرح بنانا، ضیاء کی طرح نہیں۔ تاکہ کوئی لالہ اس سے نفرت نہ کر سکے“ دائیں ہاتھ سے آنکھیں صاف کرتا اس نے نے سائیڈ پے گاڑی روکی اور نیچے اتر گیا۔

”انہیں فارم ہاؤس پہنچا دینا۔ میں خود آ جاؤں گا“

ابراہیم نے اس کی حالت کے پیش نظر چپ چاپ ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ ضیاء علی خان کو اس وقت تنہائی چاہیے تھی۔ وہ گاڑی بڑھالے گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

بچے کے ننھے سے ہاتھ تھامے وہ کتنی دیر ان پہ لب جمائے بیٹھا رہا۔

”کیا نام رکھو گے اس کا۔“

”ابدال۔۔۔ ابدال ولی خان“

”ولی خان“ وہ چونکی۔

”ہاں ولی خان۔۔۔ کیونکہ اسے لالہ نے جنم دیا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ ولی خان کی نسل جیسا ہی صاف ستھرا نکلے یہ“

”خون تو تمہارا ہے۔۔۔ پاگل“ زمر مہ مسکرائی۔

”کو کھو تو لالہ کی تھی۔۔۔ پھر میں بھی اتنا برا نہیں ہوں“ اس کی نم آنکھیں اب ننھے سے ہاتھ پہ رکھیں تھیں۔ جیسے وہ آنسو چھپا رہا تھا۔

”میں جانتی ہوں خان۔۔۔“

”کاش لالہ جانتی۔۔۔“ وہ آنکھیں صاف کرتا اٹھ کھڑا ہوا۔

”خیر۔۔۔ میں نے یہ فارم ہاؤس اور شہر کی ایک دو اچھی دکانیں تمہارے نام کر دیں ہیں۔ ابراہیم باقی سب بھی تمہیں سمجھا دے گا۔“

”ابراہیم۔ مطلب۔۔۔؟“ زمر مہ تیزی سے اٹھ کر اس کے پاس آئی۔

”آپ کہیں جارہے ہیں؟“

وہ کچھ بولا نہیں۔ بس کچھ دیر اسے دیکھتا رہا۔ پھر آہستگی سے بڑے وقار سے اس کے سر پہ ہاتھ رکھا اور خود سے لگا لیا۔

”اپنا خیال رکھنا زمر مہ۔ اور یاد رکھنا۔ تم لالہ کی طرح ہی ہو۔ بس تم بھٹک گئیں وہ بھٹکی نہیں۔ میں تم سب کو اللہ پاک کے حوالے کرتا ہوں“ ضبط سے کہتا وہ باہر نکل گیا تھا۔ زمر مہ پکارتی رہ گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

سہراب علی خان جیت کے بعد پہلی بار کسی بڑے مجمع سے خطاب کر رہے تھے۔ کہ دوران خان کی کال موصول ہوئی۔ دوران چونکہ ضیاء کے حوالے سے ہر خبر دیتا تھا تو انہوں نے مائیک منشی کے حوالے کر کے فوراً کال پک کی تھی۔

”خان۔۔۔ چھوٹے خان نے پریس کانفرنس رکھی ہے کچھ دیر بعد“

”کیا مطلب“ انہیں سمجھ ہی نہیں آئی۔

”پورے ملک کے چینلز اور نیوز پیپرز کو دعوت ہے خان۔ مجھے تو گڑبگڑتی ہے کچھ“ دوران فکر مند تھا۔

”کچھ نہیں ہوگا۔ بہت سمجھدار ہے میرا بیٹا“

”لیکن خان۔۔۔؟“

”تم بس اس پہ نظر رکھو۔ اور مجھ سے رابطے میں رہنا“

”جی خان“ انہوں نے کال بند کر دی تھی۔ لیکن اب چہرے پہ اطمینان کی جگہ سوچ کی گہری چھاپ تھی۔

☆.....☆.....☆

یہ نیویارک کی ایک تنگ گلی کے تنگ ہوٹل کا بیسمنٹ تھا۔ جہاں ہر سنڈے شباب و شراب میں لوگ اپنے درد گم کرنے آتے۔ وہ اکثر یہاں اپنا غم بھلانے آیا کرتا تھا۔ لیکن حیرت انگیز طور پہ نہ تو اسے کبھی شراب کی طلب ہوتی تھی نہ ہی شباب کی۔ وہ خود ان دونوں میں کھوجانا چاہتا تھا۔ لیکن ایسا کیوں نہیں ہوتا تھا وہ نہیں جان پاتا تھا۔ بس جوس آرڈر کرتا ساری رات گزارتا وہاں کے لوگوں کو دیکھتے اور صبح ہوتے ہی نکل جاتا۔

آج بھی وہ یہی کر رہا تھا۔ جب اس کی نظر اس لڑکی پہ پڑی۔ جسے دو غیر ملکی لڑکے نشے کی حالت میں زچ کر رہے تھے۔ وہ بے حد خوبصورت تھی۔ اور پاکستانی تھی وہ پہلی ہی نظر میں پہچان گیا تھا۔ وہ اکیلی تھی اور نشے سے اس کی حالت بھی غیر تھی۔۔۔ شاید تبھی وہ دونوں اس کے پیچھے پڑ گئے تھے۔ اسے بس چند سیکنڈز لگے تھے وہ اٹھا اور اس لڑکی کے قریب جا کے اس کی کمر کے گرد بازو پھیلا دئے۔

”کیا یار کہاں چلی گئیں تھیں تم۔ کب سے ویٹ کر رہا ہوں۔“ اس نے اس قدر مضبوطی سے اسے خود سے لگایا تھا کہ نہ تو وہ مزاحمت کر سکتی تھی نہ ہی کسی کو بتا سکتی تھی کہ وہ اسے نہیں جانتی۔ لڑکے فوراً سائیڈ پہ ہو گئے تھے۔

اس نے لیمن جوس آرڈر کیا اور اسے اپنے قریب بٹھالیا۔ لیمن جوس لینے کے بعد وہ کچھ سنبھل گئی تھی۔

”مجھے گھر چھوڑ دیں“ کافی دیر بعد وہ ہی بولی تھی۔

”چلیں“ وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

”آپ کا نام“ راستے میں اس نے پوچھا۔

”عبداللہ۔۔۔ اور آپکا۔۔۔؟؟“

”امن۔۔ امن سکندر خان۔۔ اکیلے ہیں“ اس نے دوسرا سوال کیا۔

”جی“ سادہ سا جواب آیا۔

”آپ بھی اکیلی ہیں اور شاید بکھری ہوئی بھی“

”جی۔۔“ امن نے بھی مختصر جواب دیا۔

”دوسروں کے لئے خود کو ضائع نہیں کرتے۔ سمیٹ لیں خود کو“ عبداللہ نے مشورہ دیا۔

”دوست ہوتا کوئی تو سمیٹ لیتا۔ بندہ خود کہاں خود کو سمیٹ سکتا ہے“ امن مایوس تھی۔ عبداللہ نے کچھ پل سوچا تھا۔

”دوستی کریں گی مجھ سے“

”آپ سے۔۔ ریلی“

”جی“ وہ مسکرایا۔ سادہ سا مضبوط مرد اور ویسا ہی سادہ مگر مضبوط لہجہ۔

”بالکل“ امن انکار نہیں کر سکتی تھی۔ اسے محسوس ہوا تھا۔ وہ اس کے ساتھ خود کو محفوظ تصور کر رہی تھی۔ جیسے باری کے ساتھ کرتی

تھی۔ اور یہ اسے اچھا لگ رہا تھا۔ اور اس بار وہ دیر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اب وہ دونوں اپنی زندگی کے بارے میں ایک دوسرے سے بات کر رہے تھے۔۔ اپنے بارے میں سارے سچ بتا رہے تھے۔ ایک ایک سچ۔ انہیں ایک دوسرے سے کچھ نہیں چھپانا تھا۔ کیونکہ وہ بہترین دوست بننے والے تھے۔۔ سے مسکرایا تھا۔ کہ وہ یہ سب پہلے سے جانتا تھا۔

☆.....☆.....☆

ضیاء علی خان کی شام کی پریس کانفرنس نے قیامت مچا دی تھی۔ اس نے نہ صرف اپنے جرم کا اعتراف کیا تھا بنا لڑکی کا نام ظاہر کئے بلکہ باپ کے سارے گناہ اور ان کے خلاف ٹھوس ثبوت بھی پیش کر دیئے تھے۔ اس نے نہ صرف خود کو قانون کے حوالے کرنے کا اعلان کیا تھا بلکہ عدالت عظمیٰ سے اپیل کی تھی کہ اس کے باپ کے خلاف بھی کارروائی کر کے انہیں قراقری سزا دی جائے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ اس لڑکی کا رپ اس سے نشے میں سرزد ہوا۔ ورنہ وہ قابل احترام تھی اور رہے گی۔ ہر طرف جیسے کہرام برپا ہو گیا تھا۔

لالہ۔۔۔ بار یال اپنے آفس میں۔۔۔ دیدے، سین، اوزگل، باء، مینہ، زمزمہ سب سکتے میں تھے۔ بار یال فوراً آفس سے نکلا

تھا۔ لالہ نے اس کا اپنا نام چھپا جانے پہ اور ساری اصلیت سننے کے بعد اسے دل سے معاف کیا تھا۔

اس نے چپکے سے دیدے کے موبائل سے ضیاء کا نمبر نکالا تھا۔ اسے ایک مجرم کو اس کے اعتراف پہ مبارکباد دینی تھی اور جو جرم

اس سے کروایا گیا تھا بنا خواہش کے اس کی معافی دینی تھی۔ کچھ دیر بعد ہی ضیاء کے نمبر پہ رنگ جا رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

رات تاریک تھی۔ اور سرد بھی۔ ابراہیم اور مینہ ہاتھ تھامے بھاگے چلے جا رہے ہیں۔ کچھ سال پہلے والا ہی منظر ہے۔ لیکن اب ان کے پیچھے آنے والا کوئی نہیں ہے۔

عظیم الشان سٹڈی کی جھوٹی چیر پہ بیٹھا وہ حیران پریشان مرد بار بار کسی کوفون ملا رہا ہے لیکن کوئی اس کا فون نہیں اٹھا رہا۔ تبھی بھاری دروازہ شور سے کھلتا ہے اور اوڑگل اندر آتی ہے۔۔

☆.....☆.....☆

ضیاء علی خان کی کرو لافارم کی طرف رواں دواں تھی۔ اسے سب سے ایک بار ملنا تھا۔ کہ تبھی موبائل بجا۔ اس نے ایک نظر ڈالی۔

نیا نمبر تھا۔ اس نے کال پک کر لی۔

”میں نے تمہیں معاف کیا ضیاء۔۔ کاش تمہارا باپ تمہیں ہی بخش دیتا۔“

”لالہ“ وہ بے اختیار پکار اٹھا تھا۔ تبھی اچانک دور بڑھی بان سامنے آئے تھے۔ ضیاء کے پاؤں بریک پہ پڑے تھے۔ ٹائر چر چرائے تھے۔ گاڑی جھولتی ہوئی فٹ پاتھ پہ چڑھ گئی تھی۔ اس کی سائیڈ والی کھڑکی کھل گئی تھی

”تم ٹھیک ہو ضیاء“ لالہ نے پریشانی سے پوچھا۔ ضیاء مسکرایا۔

”اب تو موت بھی آجائے تو غم نہیں لالہ۔۔“ اور تبھی تیز گرم سلاخ سی اسے سینے میں گھسی محسوس ہوئی تھی۔ اس نے جھٹکے سے سر اٹھایا۔ وہ دوران اور اس کے وہی بدر گے تھے۔ وہ مسکرا دیا تھا۔

”خوش رہو لالہ“

”ضیاء۔۔“ وہ چلائی تھی۔ دوران نے دوبارہ ٹریگر دیا تھا۔

”اوائے“ وہ باریال کی گاڑی تھی۔ اس نے آواز دیتے ہی فائر کھول دیا تھا۔ اسے اسی کی امید تھی۔ وہ بھی فائر کرتے تیزی سے گاڑی میں سوار ہوتے بھاگ گئے تھے۔ باریال تیزی سے ضیاء کی طرف آیا تھا۔ ضیاء ہوش ہوا اس کھو چکا تھا۔ خون اس کے پہلو سے ہوتا سڑک بھگور ہا تھا۔ باریال اسے اٹھا کے اپنی گاڑی کی طرف لے جانے لگا۔۔

☆.....☆.....☆

”کس کا نمبر ملا رہے ہیں باء“ وہ خانے ان کی گود میں سر رکھ کے زمین پہ بیٹھ گئی۔

”دوران کا۔۔ مینے کا۔۔ ابراہیم کا۔۔ آج کوئی بھی فون نہیں اٹھائے گا“

”بس دوران اٹھالے۔ وہ ضیاء کو کچھ نہ کہے“ وہ تڑپے۔

”کیوں باء۔۔ آپ تو بڑے اونچے کھلاڑی ہیں نہ۔۔ تو آج یہ گھبراہٹ کیوں۔ آج آپ کا مقابلہ قدرت سے ہو گیا اس لئے“

”وہ عجیب سا مسکراتی۔ باء خاموش رہے۔

”ویسے باء میں نے آج حساب لگایا۔ اور میں حیران رہ گئی۔ آپ کے حساب سے تو آپ نے گیم کھیلی نہ۔۔۔ پہلے زریاب۔۔۔ پھر سین اور پھر نگین۔۔۔ کتنا مکمل کھیل تھا نہ۔۔۔ لیکن وقت کا حساب دیکھیں باء۔۔۔ اب کس کو چننا ہے قدرت نے۔۔۔ آپ کو نہیں باء۔۔۔

ضیاء کو۔۔

گل مینہ کو۔۔۔

اوزگل کو۔۔

اٹھیں نہ باء۔۔ حکم دیں۔۔ جاؤ مینہ اور ابراہیم کو ڈھونڈ کے قتل کر دو۔۔۔ وہ ہنسنے لگی۔۔

”زریاب۔۔۔ ضیاء۔۔۔

سین۔۔۔ مینہ۔۔۔

اللہ لوک۔۔۔ اوزگل۔۔۔

کتنی زبردست رہی نہ داستان۔۔۔ ہا ہا ہا انصاف ہو گیا۔۔۔ اتنا مکمل۔۔۔ ہا ہا ہا تیری حد کم گئی۔۔۔ تیری حد کم گئی۔۔۔ وہ تعجبے لگانے لگی۔ اس کے خوبصورت گلابی ہونٹوں سے رال بہنے لگی اور موٹی موٹی آنکھیں عجیب وحشت زدہ سی ہو گئیں۔ وہ تالیاں بجاتی اٹھی اور باہر بھاگ گئی۔۔

”حد کم گی۔۔ حد کم گئی“

سہراب علی خان کا فون مسلسل بجنے لگا تھا۔ انہوں نے مری مری سی نگاہ ڈالی۔ دوران تھا۔ انہوں نے فوراً کال پک کی۔

”آپ سے غداری صرف موت خان۔۔ چھوٹے خان کو سزا مل گئی ہے۔“

فون ان کے ہاتھ سے زمین پہ جا گرا تھا۔ انہوں نے گود میں رکھا ریو اور اٹھایا اور کپٹی پہ رکھ کے ٹریگر دبا دیا۔ اس فائر کی آواز سے لال حویلی کی چھت پہ بیٹھے سارے کالے گدھ اور چیلیں اڑ گئے تھے۔۔۔

☆.....☆.....☆

قدرت کا انصاف مکمل تھا۔ سب کچھ حق داروں کو لوٹا دیا گیا تھا۔۔

لال حویلی ابراہیم اور گل مینہ کو سوئپ دی گئی تھی۔ سین، صنوبر اور اللہ لوک بھی ان کے ساتھ تھیں۔ باقی سب قیدیوں کو بھی ہر سہولت دے دی گئی تھی زندگی کی۔ ضیاء کو فارم ہاؤس میں ہی دفنایا گیا تھا۔ باریال اسے نہیں بچا سکا تھا۔ اور اسے پہلی بار پتہ چلا تھا کہ ضیاء

ہی اس کا بھائی تھا جسے وہ واقعی پچانا چاہتا تھا لیکن بچا نہیں سکا تھا۔ اور یہ ملال اب ساری عمر ساتھ رہنا تھا۔
 زمزمہ نے سب کو بتایا تھا کہ وہ ہی ضیاء کی بیوی ہے
 اللہ لوک کو نہ جانے کیسا سکون آ گیا تھا۔ وقت پلٹا تھا۔ اور اب وہ سفید کپڑوں میں کھلے بالوں والی اوزگل کے قہقہے سنتی اور خود
 خاموش رہتی ہے۔۔

زمزمہ کے بارے میں سب کو یہی پتہ چلا کہ ضیاء کی بیوہ ہے۔ باریال اسے ضیاء کے حوالے سے جان کر اور بھی خوش ہوا تھا اور
 لالہ سے یہ بات چھپالی گئی تھی کہ وہ بچہ لالہ کا ہی بیٹا ہے اسے ضیاء اور زمزمہ کا بیٹا بتایا گیا تھا۔
 باریال نے لالہ، دیدے کے ساتھ اپنے گھر میں رہنا ہی پسند کیا تھا۔
 ضیاء کی قبر اس کی وصیت کے مطابق فارم ہاؤس میں ہی بنائی گئی تھی۔ اور واقعی اس کی قبر خوش قسمت تھی اس سے زیادہ کہ وہاں
 لالہ ہر جمعرات نہ صرف دیا جلاتی بلکہ اس کے لئے دعا بھی کرتی تھی۔
 محبت لفظ ہے لیکن کبھی کبھی ساری قسمت کو حصار میں لے لیتی ہے۔ جکڑ لیتی ہے۔ اور آخری دم لے کے ہی ہمیں محبت کے قابل
 بنادیتی ہے۔۔ ضیاء علی خان کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہوا تھا۔ وہ اب لالہ کی نظروں میں سرخرو تھا۔۔ جب نہ سانسیں رہیں تھیں نہ زندگی۔۔
 ہاں مگر وہ اک لفظ باقی تھا۔۔۔
 وہ ہے نہ ایک لفظ "محبت"

✽ ختم شد ✽

رنگارنگ کہانیوں سے سجا، خوبصورت اور دلکش

سوہنی ڈائجسٹ

SohniDigest.Com

اگر آپ بھی لکھ رہے ہیں اور اردو قارئین کی تلاش میں ہیں تو اپنی کہانیاں Inpage میں کمپوز (ٹائپ)
 کر کے پورے اعتماد کے ساتھ سوہنی ڈائجسٹ میں بھیجئے۔ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔
 ابھی sohnidigest@gmail.com پر ای میل کریں۔